دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
اکتوبر 2009
معراج رسول
عید مبارک

چینی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ — 11
قارئین کی کرم فرمائیاں کج ادائیاں
[illegible]

عکس در عکس — پروین زبیر — 18
اچانک تکمیل کی صورت اختیار کرنے والا انتظار
کسی ایک کا جس [illegible] منتظر تھی

شکست خواب — شکیل ادریس — 59
خوابوں بھری زندگی اور بارشوں کی چاہ
رکھنے والی لڑکی کا فسانہ دل گداز

[illegible] — [illegible] — 67
عمرانی زبان کے لبادے میں
ملبوس سراغرسی کی جرم پرور تحریر

وقت کا قیدی — ثمر عباس — 77
اس شخص کی کہانی جسے سرِ راہ
ایک قیمتی شے مل گئی تھی

گرداب — اسما قادری — 88
[illegible]
کی تکمیل [illegible] کی کہانی

جہد بقا — مریم [illegible] — 131
محبت کے سفر [illegible]
[illegible] کا پُراثر قصہ

مدد — مرزا ظفر بیگ — 141
اندیشوں کی کوکھ سے جنم لینے والا امید و
امکان کے درمیان سفر کرتا جرم پارہ

دولت محبت اور راجا — کاشف زبیر — 145
ہر مشکل اور مصیبت کا توڑ رکھنے والے
جلیل کی معرکہ آرائیاں ..... کج ادائیاں

پرواز — طاہر جاوید مغل — 160
ایک ویران جزیرے میں [illegible]
خیال میں [illegible] بچاری کا احوال

بل — محمد [illegible] — 207
قومی، سماجی اور معاشرتی حوالوں کی
عکاس ایک تعمیری سوچ کی نمائندہ تحریر

فیصلہ — محمد [illegible] صدیقی — 213
ارادے کی تکمیل کے لیے ہر قدم اٹھا
لینے والے ایک کم ہمت آدمی کا احوال

دنیا گول ہے — احمد اقبال — 217
اس شخص کا قصہ جو ترقی و کامیابی کی
آخری منازل طے کر رہا تھا

تلاش گمشدہ — کاشف زبیر — 250
تلاش و جستجو سے شروع ہو کر قتل پہ
ختم ہونے والی واردات کا ماجرا

www.pkdigest.com

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

اکتوبر 2009ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ گردشِ ایام میں موسمِ گرما کی تپش اب ہلکی ہلکی خنکی میں بدل رہی ہے۔ ہوا میں لو کے تھپیڑوں کی جگہ خزاں کے اداس سرسراتے جھونکوں نے لے لی ہے۔ موسم اور وقت نہ تو رُکتے ہیں... نہ انتظار کرتے ہیں۔ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، رہ جاتی ہیں یادیں جو موسم کی نسبت سے بیتے دنوں کی یاد تازہ کرواتی ہیں بقول شاعر

رنگ، خوشبو گلاب کا موسم

پھر سے آیا عذاب کا موسم

گزشتہ کئی موسمِ گرما ہم سب پر عذاب کے مانند گزرے اور آخر کار یہ گرمیاں بھی گزر ہی گئیں۔ یہ اور بات کہ لوڈشیڈنگ کا سفر جاری ہے اور اس پر نہ تو وقت کی گردش نے اثر ڈالا نہ بدلتے موسموں سے فرق پڑا اور نہ ہی حکمرانوں کے وعدوں اور سخت گرمی کے باوجود بجلی کی نامہربانی مہربانیوں میں بدلی۔ سو آپ سب کو خوشگوار خنک شاموں کی آمد مبارک۔

تادمِ تحریر آئی سی سی چیمپئنز ٹرافی جاری ہے اور پاکستان کی کامیابیوں کا سلسلہ بھی۔ روایتی حریف بھارت کے خلاف پول میچ میں پاکستان کی کامیابی کو شائقینِ کرکٹ بڑی کامیابی سے تعبیر کر رہے ہیں، خدا کرے ایسا ہی ہو۔ کامیابی کو شایانِ شان اور جوش و خروش سے سب مناتے ہیں، ناکامیوں کو بھی حوصلے سے برداشت کر لینا چاہیے۔ "کرکٹ بائی چانس" ہر ٹیم جیت کی اُمید پر میدان میں اترتی ہے۔ کامیابی کا سہرا صرف ایک سر پر سجتا ہے... دعا گو ہیں کہ اس بار کامیابی کا سہرا صرف پاکستانی ٹیم کے سر رہے اور میدانِ کرکٹ میں وکٹری اسٹینڈ پر سب سے سربلند ہمارا سبز ہلالی پرچم دکھائی دے (آمین)

اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں جہانِ ستدیدہ میں جہاں آپ کے محبت نامے منتظرِ اظہار ہیں!

ملک محمد اسماعیل اوچ شریف سے لکھتے ہیں "سرورق تو سرورق ہوتا ہے۔ سرورق پر کیا تبصرہ کرنا۔ ایک چیز جو دیکھنے میں آئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہیروئن اور ولن تو بناتے ہیں مگر ہیرو نہیں بناتے۔ یوں سرورق ہیرو کے بغیر ہوتا ہے، یہ ناچیز کی بات... تمام تبصرے اچھے تھے۔ روپ بہروپ اچھی کہانی تھی کیا بھی کی کمی محسوس ہو رہی ہے... مرزا امجد بیگ کا کردار کافی اچھا تھا... کاشف زبیر نے پہلی بار اچھوتے موضوع پر بہترین کہانی لکھی جس میں پوری کہانی کا گلہ نامہ وار ان سے بے خبر... موت میں ڈاکٹر نے پتا... رفی ڈکٹ کی بیوی کو پوری کی ہے رو کے وہ ... خوب کردیا... کہانی پسند آئی۔ سرداشت... ارشن نے خود کو ایک غلط آدمی سے بچایا بلکہ وہ بھی بدکردار کو بدلی کرنے تک پہنچایا، بہت اچھی کہانی تھی۔ راز دار میں ولایت کو دوسرے کی پوری بات نہ سننے کی سزا ملی اگر وہ حوصلے سے راجر کی پوری بات سن لیتا تو بچ جاتا اس لیے کہا جاتا ہے کہ کم بولیں اور زیادہ سنیں۔ پرواز میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ اسرار احمد پچھ خاص نہیں تھی لیکن اچھی رہی تھی۔ تبادل میں سپرپاور اور تیسری دنیا کے ملک کی سیاست کو موضوع بنایا گیا، حقیقت پر مبنی بہت اچھی کہانی تھی۔ جو حکومتیں اپنے اقتدار کو عزیز رکھتی ہیں ان کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ یہی حکومتیں عوام کی دنیا خراب کر رہی ہیں اور اپنی آخرت... گرداب روایتی کہانی ہے کہ یہاں ملک، خان، چودھری اور وڈیرے جو کرتے پھریں انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ گرداب آگے چل کر شہریار اور ماہ پارو کے گرد گھومے گی۔ عافیت میں مارتھا نے خود قتل کر کے لائل کو بچایا۔ ایسا تو ہمارے مشرق میں نہیں ہوتا پھر مغرب میں کیسے ہو گیا (ان ہونی کہیں بھی ہو سکتی ہے)۔ جال میں مورگن نے جیکولین کو پانے کی خاطر ڈرامہ اور وکیل کو مع دفتر کے اڑانے کی زبردست منصوبہ بندی کی مگر ڈور سا بچ گئی۔ مورگن بے چارے کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ اسے کہتے ہیں جو بوؤ گے وہ کاٹو گے۔ گم گشتہ لمحے، یہ تھا پہلا رنگ۔ صوفیہ اور ارسلان نے زبردست منصوبہ بندی سے نہ صرف شادی کر لی بلکہ تانیا سے فیکٹری بھی ہتھیا لی۔ تانیا بے چاری اپنی جذباتیت سے مار کھا گئی اس لیے کہتے ہیں کہ جذبات سے نہیں عقل سے سوچو جو کہ خواتین میں نہیں ہوتی۔ دشمن موسم عجیب کہانی تھی۔ طراح جیسا کرنے کا قاتل کیا اتنی بھونڈی منصوبہ بندی کرتا ہے؟ دیسے اقبال صاحب کی کہانیوں میں یہ موضوع ہوتا ہے اور سمجھ میں آتی ہیں۔ بہرحال، اس دفعہ جاسوسی مجموعی طور پر اچھا تھا۔"

فاطمہ گل، لاہور سے لکھتی ہیں "شمارہ ستمبر 2009ء کا ٹائٹل کچھ خاص متاثر نہ کر سکا۔ کیونکہ ڈائجسٹ کے میرے ہاتھوں میں آنے سے پہلے بڑے بھائی کے ہاتھوں سرورق کا حشر نشر ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے اپنی من پسند محفل میں پہنچے۔ محمد کامران پہلے انعام کے حق دار قرار پائے، مبارکاں۔ ویسے تین رنگ نہیں دو رنگ ہوتے ہیں۔ کس روز ہم نے اسٹیپ کٹنگ اور لیئر کٹنگ کے بارے میں تو سنا ہے لیکن کراکنگ کے بارے میں نہیں۔ مجھے سندس جیسا آپ کی پکار کار آمد ثابت ہوئی۔ نغمی شاہ رخ حاضر ہوئے لیکن افسوس کہ بلیک لسٹ میں۔ آمنہ پٹھانی آپ کا نام آمنہ پنجابی ہونا چاہیے۔ عابد خان ہر بار بلیک لسٹ دشمنوں سے بھری پڑی ہوتی ہے کیا؟ جو آپ کہہ رہے ہیں۔ آنٹی نوشی اس مرتبہ نظر نہیں آئیں، ان کی کمی محسوس ہوئی۔ محمد کبیر عباسی حاضر نہیں ہو سکے پورا کرنے کے لیے سوال لیے پورے نہیں ہوئے۔ گرداب میں قسمت ہر بار ماہ پارو پر مہربان ہو جاتی ہے اور وہ چودھری کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے۔ جارڈ نے شہریار کا منصوبہ ناکام بنا دیا۔ پرواز میں خاور پیچھے پیچھے پھر پھنس گئے۔ سارے ثبوت ہاتھ سے نکل گئے۔ چودھری عزیز دولت کے لالچ میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ سرورق کے دونوں ہی رنگ اچھے تھے۔ روپ بہروپ، پجاری، راز دار، جال، سفاک اچھی کہانیاں تھیں۔"

شان احمد گھنگرو ریکی کے شو سے محمد پور دیوان سے "ستمبر کا جاسوسی ملا تو حسبِ سابق محفل میں اپنا خط نہ پا کر شدید دکھ ہوا کہ اتنی مشکل سے خط لکھا وہ بھی پہلے کی طرح دوسری مرتبہ بھی شائع نہ ہوا۔ سرورق پر موجود خاتون کا تعلق تائیوان یا جاپان یا پھر ایسے ملک سے ہے جہاں کے لوگوں کی شکل و صورت

میں یکسانیت ہوتی ہے۔ اوپر ہاتھ میں سگریٹ دبائے موجود شخص ہنس رہا ہے یا گھور رہا ہے، اس کا پتا نہیں چل رہا۔ محمد کامران شہزاد کو خط اپنا تعریف سے بھرپور خط لکھنے کی وجہ سے پہلے انعام کا حق دار قرار دیا گیا۔ چودھری دل بہار انجم کیا خوب لکھا ہے۔ دو باتیں وہ ملاتا تھیں وہ ہمسائی کے بھائی کی لاتیں۔ محمد سلیم شبلی واقعی آپ کی طبیعت خراب ہے۔ زیڈ ایس کے اسماعیل نے ایسی کون سی کامیابی حاصل کرلی ہے کہ جو دوسرے لوگ حاصل نہیں کر سکے اور جل رہے ہیں۔ اگر یہ واقعی جمہوریت کا دور ہے تو دوسروں کی آرا کو آپ جلاپے سے کیوں تشبیہ دے رہے ہیں؟ اس بار ابتدائی صفحات پر اثر نعمانی مرحوم کی کاوش روپ بہروپ نظر آئی۔ پہلی مرتبہ ترجمہ کے بجائے مصنف کے طور پر اثر نعمانی کی تحریر سامنے میں آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ روپ بہروپ کچھ خاص نہیں لگی۔ مترجم تو وہ بہت اچھے ہیں۔ کاشف زبیر کی پجاری ایک درمیانے درجے کی کہانی تھی۔ ثمر عباس کی سزا میں جج مارٹن ایک خود غرض شخص تھا۔ یوں تو وہ دوسن اور اپنے دوسرے ہم مزاج بدکردار ساتھیوں کے ساتھ مل کر ناانصافی کرتا رہا مگر جب بیٹی کی بات آئی تو دوسن کو سزا دلوانے کے لیے شدت پسند بن گیا۔ محمد فاروق انجم کی راز دار وہی مخصوص فارمولا ٹائپ کی کہانی تھی جس میں یا تو شوہر بیوی کو قتل کرتا ہے یا پھر بیوی شوہر کو ٹھکانے لگاتی ہے۔ راجہ نے بوڑھے کو اچھا پھنسایا۔ پچھلے کچھ عرصے سے سرورق کے رنگ کچھ پھیکے پھیکے سے آرہے ہیں۔ گم گشتہ لمحے کے ساتھ نیا نام خوشیہ شبیر کا نظر آیا۔ نام تو نیا ہے مگر تحریر سے پختگی جھلکتی ہے جس سے پتا چلتا ہے وہ کافی تجربہ کار مصنفہ ہیں۔ (آپ نے صحیح پہچانا ہے)۔ تانیا کو ارسلان اور اس کی بہن نے دھوکا دیا۔ سچ ہے کہ کسی پر اندھا اعتبار نہیں کرنا چاہیے جیسا تانیا نے ارسلان کے اوپر کر رکھا تھا۔ اتنے قریب رہنے کے باوجود بھی وہ ارسلان اور اپنی بہن کی بدنیتی سے بے خبر رہی۔ ایچ اقبال کی دشمن موسم بھی ٹھیک ہی تھی۔ جال میں مورگن نے اپنی باوفا بیوی کو ایک آوارہ عورت کی خاطر ختم کرنا چاہا مگر اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں خود جا گرا۔"

قیصر عباس ناقوری اٹھارہ ہزاری سے حاضر ہیں "اس مرتبہ ستمبر کا جاسوسی ملا تو سرورق کو دیکھ کر جوکہ جاسوسی سے بھرپور تھا، خوشی ہوئی۔ کامران شہزاد زام ملک کو ٹاپ آف دی لسٹ ہونے پر مبارکباد۔ کہانیوں میں اثر نعمانی کی روپ بہروپ، جاسوسی اور سسپنس پر مشتمل تحریر تھی جس میں شہزادہ علی کا کردار پاکیشیا سیکرٹ سروس کے علی عمران کے مشابہ تھا۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ ادھورا ادھورا محسوس ہوا۔ حالانکہ دوسرا رنگ ایچ اقبال کی دشمن موسم زبردست تحریر تھی۔ انکل طاہر جاوید مغل کی پرواز تیز رفتاری سے جاری ہے۔ خاور کے ساتھ لبرز آصف نے بے حد برا کیا۔ خاور کا حال دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کوئی بات نہیں، عشق اپنا خراج وصول کرتا ہے۔ اسما قادری کا سلسلہ گرداب بھی ٹھیک جارہا ہے۔ مریم کے خان کی تحریر سراسر ابہام جاسوسی کے شایانِ شان کہانی تھی جسے مصنفہ نے بڑی عرق ریزی سے لکھا۔ کاشف زبیر کی پجاری اور ثمر عباس کی سزا اچھی کہانیاں ثابت ہوئیں۔"

کوہسار سے نورالہدیٰ کی شاعری اور چلبلی باتیں "جاب کی مصروفیت کی وجہ سے بڑے عرصے کے بعد محفل میں حصہ لے رہی ہوں۔ چاہتی تھی کسی کے ذہن کے کونے کھدرے میں ہمارا نام بھی ہے یا کھو ہو چکا ہے خیر... (انکل سمیت آپ سب کو یاد ہیں)۔ ٹائٹل گرل پر کیا تبصرہ کریں، بہ قول وقاص اس پر تبصرہ کرنے والے بہت۔ البتہ اوپر موجود شخص کو دیکھ کر ہماری شاعرانہ طبیعت بھڑک اٹھی اور بے اختیار ایک عدد شعر سرزد ہو گیا۔ (ارشاد)۔

اب کیوں روتے ہو ٹائٹل گرل کے شانوں پہ
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

بس بس زیادہ تعریف کی ضرورت نہیں۔ ایسے اشعار تو ہم سے اٹھتے بیٹھتے سرزد ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہائے، یہ کیا؟ ادھر تو پہلے ہی ... موجود ہے۔ کہیں ہمارا شعر سن کے تو محسوس نہیں ہو گیا۔ اس کو دیکھ کے تو ... کھلکھلا رہے تھے۔ ارے، اپنے یہ پیلے پیلے دانت تو اندر کریں۔ آخر آپ کوئی اچھا سا ٹوتھ پیسٹ کیوں نہیں استعمال کرتے؟ (آپ ہی بجھا دیں)۔ چودھری دل بہار کے دانت نظر نہیں آرہے غالباً موصوف کی بتیسی ان کی جیب میں ہے۔ الف اے حسنی کی حرکت دیکھی آپ نے انکل جی؟ کیسے دیدہ دلیری سے مکھن لگایا جا رہا ہے آپ کو۔ صدف محمود کی طرف سے کبیر عباس کو آوارہ کا لقب مل گیا۔ سلیم شبلی کا تبصرہ پڑھ کر موصوف کی عقل سلیم پہ رونا آیا۔ محترم تبصرے اور خلاصے میں فرق پہچانتے ہیں آپ؟ سرفراز چودھری عرف چاچو جی، بڑے پر پرزے نکال لیے ہیں ہماری غیر موجودگی میں۔ لگتا ہے آپ کا "ٹھو" کرنا پڑے گا۔ ارے، انجم ہجر کا نام پڑھ کر دل میں بڑی گدگدی ہوئی۔ عدالت مثل اور مس روز کے تبصرے اچھے تھے۔ شاباش بہنو... یونہی رہو اسی طرح۔ آمنہ پٹھانی نے بھی اچھا لکھا۔ غائب دوستوں کے لیے ہماری شاعرانہ طبیعت کے مطابق ایک شاندار شعر عرض ہے۔ اجازت ہے انکل جی؟

گئے کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
کچھ تبصرہ نگار تھے جو محفل چھوڑ گئے

کہیں واہ واہ... (واہ... کیا کہنے مکرر...) اسما قادری کیا خوب لکھ رہی ہیں گرداب میں۔ یقین جانیں گرداب پڑھتے ہوئے یاد ہی نہیں رہتا کہ روزہ بھی رکھا ہے۔ پرواز میں خاور پر تشدد کی انتہا دیکھ کر تو ہمارے ہاتھوں کے طوطے پرواز کر گئے جو شاہ خاور کو پھر بھی ہنستا دیکھ کر واپس بلانے پڑے۔ اثر نعمانی (مرحوم) نے کیا خوب چکر چلایا۔ شہزادے کے ڈائیلاگ پڑھ کے تو ہم ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئے۔ امی کی گھورتی ہوئی نظروں کو دیکھ کر مجبوراً اپنے آپ کو آپے میں رکھنا پڑا۔ جاب کی مصروفیت کی وجہ سے ابھی اتنا ہی شمارہ پڑھ سکی ہوں۔ میری طرف سے آپ کو بہت بہت مبارک عید کی۔"

ایس ایس ناز کی دوہازی چوک ملتان سے عجلت پسندی "لیجیے جناب ہم نے بھی آپ کی محفل میں قدم رکھ ہی دیے، خوش آمدید کہیں یا نہیں۔ (ہماری مجال کہ انکار کریں... خوش آمدید... ویلکم)۔ ہم پھر بھی آتے رہیں گے۔ ہم جاسوسی کے پرانے قاری ہیں لیکن خط لکھنے کی سعادت پہلی بار حاصل کر رہے ہیں۔ عدالت مثل جی، نوشی چودھری، آمنہ پٹھانی آپ کو میری طرف سے سلام۔ محمد سلیم شبلی اور عبدالسلام صدیقی صاحب ہمیں بھی یاد کرلیں۔ شکر ہے ہمارے پیارے شہر ملتان کی نمائندگی آپ اچھے طریقے سے نبھا رہے ہیں۔ کہانیوں میں پرواز اور گرداب زبردست جارہی ہیں۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے اگلی بار بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گے۔"

محمد کبیر عباسی، مری سے اپنے تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں "ارے واہ چکر تو ہم محبوب کی گلی کے نہیں لگاتے جتنے جاسوسی کی محبت میں بک اسٹال کے لگاتے ہیں۔ اس دفعہ تو تبصرہ بھی بھیجا تھا چنانچہ بے چینی سوا تھی۔ ڈائجسٹ ملتے ہی اپنے تبصرے کی تلاش شروع کر دی مگر یہ کیا؟ تبصرہ تو تبصرہ اس دفعہ تو

میرا نام تک شامل نہیں۔ خیر بقول فراز

حسرت اس تبصرے پہ جو پہنچنے سے ہی رہ گیا

ٹائٹل کسی بھی بک کا فرسٹ امپریشن ہوتا ہے اور انجان قاری سے تعارف کا بھی باعث بنتا ہے۔ چنانچہ ہم تو اسے بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اس دفعہ ڈاکٹر انکل کی مردہ مار قسم کی حسینہ تو متاثر کرنے میں ناکام رہی تاہم اپنی حالت پر روتا بلکہ سسکتا شخص اور کھلے دروازے سے جھانکتا پستول بدست بازو (ہمیں تو بازو ہی نظر آرہا ہے) نے جہاں ٹائٹل کو کچھ انفرادیت دی وہاں سرورق کے رنگوں کے رائٹرز کو بھی ایک عمدہ موٹیویشن دی۔ بہر حال، مجموعی طور پر ٹائٹل کافی عرصے کے بعد جاسوسی سے بھرپور اور ہمارے عزیز ڈائجسٹ کے شایانِ شان تھا۔ (جناب ہزار ہا شکریہ!) چودھری دل بہار! آپ تصویر کا دوسرا پہلو بھی تو دیکھیں۔ اگر انکل کی قینچی نہ ہو تو پورا ڈائجسٹ لیڈیز کے احمقانہ تبصروں سے ہی بھرا ہو۔ مس روز اصل پریشانی تو آپ نے روز کے معنی بتا کر دور کی۔ ورنہ ہمیں تو کسی سے روز کی اسپیلنگ پوچھ کے اچھی خاصی ڈکشنری کے ساتھ مغز ماری کرنا پڑتی۔ ایمن انجم زیڈ ایس کے سے کافی متاثر نظر آتے ہیں کہ تبصرے کے بجائے خلاصہ تحریر کیے جا رہے تھے۔ صدف محمود، آپ تو میرے مذاق کا مائنڈ کر گئے اور جواب میں انتہائی کڑوی بات کر گئے جو آپ کی چھوٹی سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ آمنہ پٹھانی، کبھی آپ کہتی ہیں آپ پختون ہیں اور کبھی پٹھان بن جاتی ہیں، واقعی ایک زبان تو صرف مردوں کی ہوتی ہے۔ ویسے آپ نے میرے تبصرے کی تعریف کی تھی اس لیے ہاتھ ذرا ہولا رکھا ہے۔ عدالت جی، امید رکھیں اس دفعہ تو آپ کا نام کرسی صدارت پر آیا کہ آیا۔ سرفراز چودھری آپ کے تبصرے کی تعریف کی ضرورت تو نہیں نا؟ نورالہدیٰ، انجم، عائشہ تبسم، زید پرویز، ڈاکٹر توبیہ وغیرہ کے بغیر محفل ادھوری تھی ہے۔ پلیز دوستو، اپنی حاضری کو یقینی بناؤ۔ گرداب عام سا موضوع ہونے کے باوجود مزہ دے رہی ہے۔ کہانی پر رائٹر کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ حقیقت سے قریب تر ڈائیلاگز دلچسپی میں اضافہ کررہے ہیں۔ پرواز کا ایپی سوڈ تو اچھا تھا مگر شاہ خاور پر اتنا تشدد ہوا لیکن وہ پھر بھی ہماری پنجابی فلموں کے ہیرو کی طرح گنڈاسا لہراتا ہوا دشمنوں کے کشتوں کے پشتے لگا رہا ہے۔ ایچ اقبال کی دشمن موسم خلاف توقع کافی بور رہی ورنہ ایچ اقبال تو کہانی میں اتنا تجسس بھر دیتے ہیں کہ ادھر ادھر کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ دوسرا رنگ، نئی رائٹر نے لکھا۔ وقت گزاری کے لیے اچھا تھا۔ اولین تحریر غالباً جاسوسی کے اولین شماروں میں شائع ہوئی ہوگی۔ جو آپ نے دوبارہ شائع کی۔ (جی نہیں، آپ کی سوچ غلط ہے)۔ رائٹر نے کہانی کا تانا بانا بہت دلچسپ انداز میں بُنا۔ مزاحیہ ڈائیلاگز بھی اچھے تھے مگر پھر بھی جانے کیوں اتنا مزہ نہیں آیا۔ شاید یہ اس دور کے لیے تو فٹ تھی مگر اس دور میں مس فٹ۔ مختصر تحریروں میں سزا اور متبادل ہی پڑھی ہیں جو درمیانے درجے کی رہیں۔ کنز میں کافی زیادہ تھیں اگر آپ کہیں تو میں ہر ماہ لیٹسٹ جوکس آپ کو بھیج دیا کروں؟ (ضرور)۔ اس کے علاوہ کچھ تجاویز بھی ہیں اگر آپ اجازت دیں تو اگلے ماہ پیش کروں؟ (اجازت ہے)۔"

چاچا نجم نجومی فرام نجم پورے اپنے ستاروں کی روشنی میں فرماتے ہیں "ماہ ستمبر کے شمارے کے سرورق کی حسینہ کے رخ روشن پر ہلکا سا تبسم اس امر کا غماز تھا کہ ریوالور میں بارود کے بجائے پانی بھرا گیا ہے۔ محفل چٹکی مکھنٹ چٹکی حسب معمول ملکی سیاسی منظرنامہ پیش کررہی تھی۔ کامران شہزاد کے زور دن چلے [illegible] دل بہار تمہارا مشورہ سر آنکھوں پر لیکن بھتیجے بات یہ ہے کہ ستارہ گردش میں ہو [illegible] انعام حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ تو ہم جان کے کھا چکے ہیں ساتھی اکثر۔ باقی بھتیجے اور بھتیجیوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اثر نعمانی صاحب کی روپ بہروپ پڑھی جو انتہائی منفرد اور دلچسپ انداز تحریر لیے ہوئے تھی۔ شہزادہ علی قلی خان اور آغا قیامت کے کردار بہت پسند آئے۔ کہانی پڑھ کر آپ کو بہت سی دعائیں دیں کہ آپ نے اتنی اچھی کہانی کو ماہنامہ جاسوسی کی زینت بنایا۔ پرواز میں چودھری خاور اپنے سسر کی مہمان نوازی زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا اور جان کی بازی لگا کر ان کے مہمان خانے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ویسے خاور سے بہتر! اجوال جانے سے پہلے تو ایک بار مجھ سے زائچہ بنوا لیتا تو ٹھیک تھا۔ گرداب جو پہلے ایک سپاٹ اور بور کہانی محسوس ہو رہی تھی، اب انتہائی دلچسپ موڑ مڑ رہی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ رنگوں میں دوسرا رنگ پہلے نمبر پر تھا۔ چھوٹی کہانیوں میں اسرار ابہام اور متبادل پسند آئیں۔"

جعفر عباس بستی جلیل تحصیل وضلع ملتان سے لکھتے ہیں "ستمبر کا شمارہ 5 تاریخ کو ملا۔ کافی عرصے کے بعد تبصرہ لکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ سب سے پہلے اشتہارات پھلانگتے ہوئے چٹکی مکھنٹ چٹکی کی محفل میں داخل ہوئے۔ کامران شہزاد کا تبصرہ واقعی نمبرون تھا۔ ہمیں ان کی اس بات سے اتفاق ہے کہ آپ کی ان تھک محنت سے مکھنٹ چٹکی کم ہے۔ مس روز اور الف اے حسنی یوکی کے تبصرے اچھے تھے۔ سب سے پہلے اپنا پسندیدہ سلسلہ پرواز پڑھا۔ اس مرتبہ کی قسط شاندار تھی۔ کہانی کے ہیرو خاور صاحب کی مشکلات کم ہونے کے بعد بڑھتی جارہی ہیں۔ خاور کے لیے جو خاموش کردار بلقیس بیگم ادا کررہی ہے، وہ لاجواب ہے۔ اس کے بعد اسما قادری کی گرداب پڑھی جو لاجواب کہانی ہے۔ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے مصنفہ کو داد دینے کو دل کرتا ہے کہ انہوں نے ایسی کہانی لکھی۔ اسما قادری واقعی اس کہانی پر بڑی محنت کر رہی ہیں۔ ماہ پارہ تو مشکلات کا شکار ہے۔ کہانی میں کردار نگاری، سسپنس اور ایکشن کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے جو پڑھنے والے کو نگاہیں نہیں اٹھانے دیتا۔ اثر نعمانی کی روپ بہروپ محبت کے موضوع پر ایک دلکش تحریر تھی۔ ترجمہ شدہ کہانیوں میں موت پسند، جال اور سفاک پسند آئیں۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ گم گشتہ لمحے، خوشیہ شبیر صاحبہ کی کہانی اچھی کاوش تھی۔ کیا یہ محترمہ کی پہلی کاوش ہے؟ کیونکہ ان کا نام ہمارے لیے نیا ہے۔ البتہ سرورق کا دوسرا رنگ، دشمن موسم، ایچ اقبال کی اچھی کاوش تھی۔ سفر بہ سفر، آستین کا سانپ ثابت ہوئیں۔"

طاہر اقبال ایڈ محمد طیب کی جہن آباد سے مختصر شکایت "ستمبر کے جاسوسی کا سرورق ڈاکٹر انکل کی فنکارانہ مہارت کا شاہکار تھا۔ جاسوسی کے ابتدائی صفحات کی تحریر روپ بہروپ ایک بے حد دلچسپ داستان تھی جس میں مزاح اور تجسس کے حسین امتزاج نے کہانی کو چار چاند لگا دیے۔ طاہر جاوید مغل کی تحریر پرواز قارئین کے ایک وسیع حلقے کو اپنے سحر میں گرفتار کیے ہوئے ہے۔ طاہر جاوید مغل بہت اچھا لکھتے ہیں اور کردار نگاری میں ان کو غیر معمولی مہارت حاصل ہے اور ان کے کردار حقیقی زندگی سے بالکل قریب دکھائی دیتے ہیں۔ اسما قادری کی تحریر گرداب بھی بتدریج ابھار تک جاتی جارہی ہے۔ اس بار سرورق کے دونوں رنگ ہی سرورق سے مطابقت رکھتے تھے۔ سرورق کا پہلا رنگ گم گشتہ لمحے اسرار و تجسس سے بھرپور تھا۔ اس کہانی نے آغاز سے لے کر انجام تک اپنی

دلچسپی برقرار رہی۔ سرورق کا دوسرا رنگ دشمن موسم ایک لاجواب تحریر تھی۔ اس داستان میں موجود ہر کردار انگوٹھی میں نگینے کے مانند فٹ تھے۔ تاہم آخر میں یہ داستان کچھ فلمی رنگ اختیار کر گئی۔"

عدا شکل کا تجزیہ مرغزار کالونی گجرات سے ''سرورق کی دوشیزہ کے بال فلپائنی، آنکھیں چائنی، ناک جاپانی، ہونٹ پاکستانی جبکہ دانت ہندوستانی تھے۔ مختلف ملکوں کی سفیر لڑکی اس خطرے سے بے خبر انجان نظر آتی تھی جو ایک خطرناک پسٹل کی صورت تھا۔ سرورق پر موجود وحشت ناک آدمی اس صورت حال سے لطف اندوز ہونے کی ناکام کوشش میں تھا۔ سرورق کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد پھولوں اور کلیوں اور جگنوؤں اور پریوں کی حسین محفل یعنی چٹکی، نکتہ چینی میں حاضری دی۔ حسب معمول ہمارا نام غائب تھا۔ کامران بھائی کو مبارکباد۔ خط بھی اچھا تھا۔ چودھری دل بہار انجم کی ایک بات عبدالسلام صدیقی کے بارے میں (ہمسائی کے بھائی کی لاٹھیں...) بڑی پسند آئی۔ ہاہاہا... مگر آپ کی یہ بات غلط ہے کہ صرف مردوں کی ہی آنکھیں دوشیزہ (عورت) سے دو چار (چار) ہو سکتی ہیں۔ صنف نازک کی آنکھیں صنف نازک سے ہی ملیں ہمارے لیے یہی بہتر ہے۔ آپ بھی مردوں سے ہی آنکھیں ملایا کریں۔ ان سے آنکھیں چار یا مت کریں ورنہ ہم آپ کو... سمجھ لیں گے۔ مس رودا کا خط زبردست تھا۔ محمود وقاص! لگتا ہے اس بار کچھ عقل آ ہی گئی آپ کو۔ اب اس کو سنبھال کر رکھنا۔ ورنہ پہلے جیسا حال ہوگا۔ ایف اے حسنی یہ کوئی بھیا! تبصروں کو پسند کرنے کا شکریہ مگر کرسی صدارت کی اب حسرت نہیں رہی۔ شجاع چودھری ڈیئر تمہارے پنجابی محاورے پر خوب ہنسی آئی۔ سدھر جاؤ۔ محمد امین انجم! سالگرہ کی خوشی میں مٹھائی غریبوں میں بانٹ دیجیے گا۔ اس طرح نیکی بھی کر لیں گے آپ۔ سندس جبیں نے اے ہے کسانہ سے جو بات پوچھی ہے اس کا جواب ہمیں بھی چاہیے۔ عابد خان! مجھے بھی آپ کی بات سے اتفاق ہے۔ مصدق محمود دانش اب آپ شعر نہیں لکھتے؟ ہمارے دل کی بات مت چھیڑیں۔ تصویر الحسن صاحب کا خط اچھا نہیں لگا۔ بڑے بھائی کے بارے میں کس قدر غلط تھے۔ قیصر عباس! اتنا تو بتا دیں... ل ہو جو سرورق پر نظر ڈال کر ہی سسپنس کی لہر میں ڈوب جاتے ہو۔ آمنہ پٹھانی ڈیئر! ثابت قدم رہنا۔ گرداب اس بار خوب سسپنس لیے ہوئے تھی۔ ماہ بانو بے چاری پر بہت ترس آیا۔ اس کی ماں اور خالو کے قتل پر دکھ ہوا۔ کشور کی صورت چودھری انگار کو خوب سزا ملے گی۔ پرواز میں ہنگامے پر ہنگامے جاری ہیں۔ پولیس کا کردار روایتی چودھریوں کی طرح بہت بھیانک تھا۔ روپ بہروپ بڑی دلچسپ تحریر تھی۔ سرورق کے دونوں رنگ اس بار ملتے جلتے تھے۔ چھوٹی کہانیوں میں عافیت، جال اور رازدار بیسٹ کہانیاں تھیں۔"

اے اے زیدی کی انٹری آرا ایس سے کچھ آرائیاں ''جا شکل اس مرتبہ کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ کی عملی تفسیر نظر آرہا ہے۔ حسینہ خود پر پستول تانے منہ چھپائے مسٹر ڈاکو کو دیکھ کر مسکرا رہی ہے کہ میری قاتل آنکھیں اس پستول سے زیادہ خطرناک ہیں موصوف... ویلڈن اپ! حاشیے میں نظر آنے والے موصوف شاید نہیں یقیناً حسینہ کے تیر نظر سے بری طرح گھائل ہیں۔ ویلڈن ذاکر انکل! اشتہارات سے منہ موڑتے ہوئے پہنچے اپنی بزم یاراں ماہتاب میں۔ ٹاپ آف دی لسٹ اس دفعہ محمد کامران شہزاد (بھکر) قرار پائے۔ تبصرہ گڈ ہے جی! اگر ماہ رمضان نہ ہوتا تو میں آپ کو لڈو کھینچ مارتا پیارے۔ چودھری دل بہار کا تیکھا تبصرہ پسند آیا۔ مس رودا شکوے اور شکر بے ادا کرتی نظر آئیں۔ محمد امین انجم! سالگرہ مبارک ہو۔ عدا شکل کا تبصرہ پسند آیا۔ سرفراز چودھری کا تبصرہ جاندار بلکہ مزے دار تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پرواز کا مطالعہ کیا۔ شاہ خاور بے گناہ ہو کر بھی گناہگار بن گیا ہے۔ شاہ خاور ضرور کامیاب ہوگا۔ کاشف زبیر کی پجاری نے آخر تک اپنے سحر میں لیے رکھا۔ بہت ہی زبردست کہانی تھی۔ کاشف انکل! آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ اسما قادری کی گرداب بہت اچھی جا رہی ہے۔ میاں بیوی کی محبت پر مبنی عافیت ایک لاجواب کہانی تھی۔ محمد عمر نعمان کی متبادل کے بدلے کوئی جاسوسی سے لبریز کہانی ہوتی تو مزہ آجاتا۔ رازدار بہت ہی فرسٹ کلاس اسٹوری تھی۔ راہبت کو اپنی ایک بری عادت لے ڈوبی، بے چارہ۔ سزا میں جج مارٹن نے ولسن کو سزا دی تو سزائے موت۔ ایک اچھی کاوش رہی۔ آصف زبیر کی موت پسند شاندار رہی۔ حضرت انسان کو سمجھنے کے لیے عقل و شعور کی جو منازل چاہئیں وہ شاید ہی کوئی طے کر سکے کیونکہ موسم کی طرح بدل جانے والا یہ انسان آج تک خود کو نہیں سمجھ پایا تو دوسروں کو جاننے کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے۔ سرورق کے کلرز اس مرتبہ بھی لائٹ ہی رہے۔"

رضوان تنولی کریڈوبی، اورنگی ٹاؤن کراچی سے حاضری دیتے ہیں۔ ''ستمبر 2009ء کا جاسوسی نگاہوں کے سامنے موجود ہے۔ محفل چٹکی، نکتہ چینی میں اس ماہ جاسوسوں کی نمائندگی کرنے پر محمد کامران شہزاد کو مبارکباد۔ مس رودا اپنے آپ کو انگریزی والا روز (گلاب) ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ ویسے مس رودا آپ گلاب دین یا گلاب خان تو ہو نہیں سکتیں اس لیے ہم آپ کا نام رکھ دیتے ہیں مس گلابو۔ کیسا لگا آپ کو یہ نام؟ دیگر ساتھیوں سے گزارش ہے کہ مس رودا کو آئندہ سے مس گلابو کے نام سے لکھا اور پکارا جائے۔ آمنہ پٹھانی آپ بھاگنے والی نہیں ہیں تو پھر بھلا کوئی آپ کو کیسے بھگا سکتا ہے۔ عدا شکل آپ وضاحت کیجیے کہ آپ کو میرا نام کہاں سے اور کس طرح مشکل لگا۔ چودھری سرفراز! آپ نے جس کامیابی اور خوب صورتی کے ساتھ چودھریوں کے جھنڈے گاڑے ہیں اچھے لگے اور جو پوچھتے تھے مزاج یار کی بابت، اپنے ذیشان بدر میران کو بلیک لسٹ میں آرام فرماتے ہوئے دیکھ کر افسوس ہوا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ پرواز میں خوب گولیاں وغیرہ چل رہی تھیں۔ چودھری عزیز اور چودھری رونق کا کام تو اوکے ہو گیا ہے اور دونوں عالم بالا کی سیر کرنے پہنچ گئے ہیں۔ پرواز سے ریورس گیئر میں اثر نعمانی کی روپ بہروپ میں آ کر دم لیا۔ چلو اب شہزادہ علی ڈھیلا مار ریاست والا کا کردار پسند آیا۔ بونگا شہزادہ آخر میں کتنا سیانا نکلا۔ کاشف زبیر پجاری کے ہمراہ تھے۔ اپنے کاشف جی آپ اوشینا کو اس کے ماں باپ ماریا اور کاؤنٹ ڈی سلوا سے ملوا ہی دیتے تو کیا حرج تھا۔ آصف زبیر کی موت پسند، ایک ایسے ماہر نفسیات کی داستان جو خودکشی کے مریضوں کا علاج کر کے انہیں خودکشی سے بچالیتا ہے۔ ثمر عباس کی تحریر سزا ایک باپ کی مشکل اور تکلیف سے پُراثر داستان بہتر رہی۔ مریم کے خان اپنے بہترین تحفے اسرار ابرام کے ہمراہ تھیں۔ اسرار و تحیر میں ڈوبی بے پناہ سنسنی خیز کہانی اس ماہ کا تحفہ خاص تھی۔ محمد عمر نعمان، متبادل کے ہمراہ تھے۔ یہ تیسری دنیا کے ملک کے عوام کی بدبختی ہی تو ہے ان کو جو بھی حکمران ملے انہوں نے اپنے ہی ملک اور اپنی ہی عوام کی جڑیں کھوکھلی کیں اور واحد سپر پاور کا تو اصول یہی ہے کہ جب تک غدار سے کام نکلتا ہے، نکالے جاؤ اور جب وہ غدار ان کے لیے ناکارہ ہو جائے تو پھر ایک ڈھونڈو ہزار ملے... محمد عثمان کی جاسوسیت سے لبریز داستان عافیت کے انجام نے چونکا دیا۔ یعقوب جمیل نے اپنے جال کے ہمراہ جلوہ دکھایا۔ سور گن اپنی بیوی کے لیے کھودے گئے گڑھے میں خود ہی گر پڑا۔ مرزا ظفر بیگ، سفاک کے ہمراہ تھے۔ اپاہج بچہ اغوا کرنے والے تھیڈ اور گارون ایسے انجام کو پہنچے کہ جس کے وہ مستحق تھے۔ سرورق کا پہلا رنگ توصیف شبیر کی گم گشتہ لیے اس شعر کی مکمل تفسیر تھی کہ

وفا ہوتی اگر خون کے رشتوں میں
تو یوسف نہ بکتے مصر کے بازاروں میں

ایچ اقبال کی کاوش دشمن موسم، سنسنی اور تجسس سے لبریز داستان تھی۔"

مصدق محمود دانش گاؤں ککنگ سہال ضلع گجرات کی باتیں ''اس بار ستمبر کا رسالہ 31 اگست کو ملا۔ خلاف معمول سرورق کی جاپانی دوشیزہ نرم بستر پر بیٹھے تو نوکر افراز کو خوب صورت پوز سے نواز رہی تھی جبکہ ایک آہنی ہاتھوں والا نامعلوم اور اجنبی (قاتل) شخص مس جاپانی کے گول چہرے کو پسٹل سے نشانہ بنا رہا تھا۔ سرورق پر موجود تیسرے آدمی کے پاگل اور نفسی ہونے میں کم از کم ہمیں تو کوئی شک نہیں تھا۔ موصوف انگلیوں میں سگریٹ دبائے دیوانگی سے ہنس رہے تھے۔ بزم و حسن سے مزین سرورق کا پوسٹ مارٹم کر کے ہم نے چٹکی، نکتہ چینی میں انٹری دی تو محمد کامران شہزاد کا نام قرعہ فال میں اول تھا، مبارکباد۔ کہانیوں پر تبصرے بھرپور تھے مگر یادوں، دوستوں سے روٹھے روٹھے تھے جناب! چودھری دل بہار کا مزاحیہ خط بے اختیار ہمیں ہاہاہا کرنے پر مجبور کر گیا۔ انداز اور الفاظ خوب تھے۔ اچھا لگا تبصرہ۔ مس رودا یعنی مس گلاب کا پھول جیسا خط مہکتی خوشبو دے رہا تھا۔ قیصر عباس ناخوری کا تبصرہ بھرپور اور دلچسپ تھا، پسند آیا۔ آمنہ پٹھانی صاحبہ! چودھری سرفراز کو حاسدانہ اور مرجانہ ہو گیا ہے۔ مرچیں نہ لگیں ان کو تو موصوف کو چین نہیں آتا۔ ملک عطاء الرحمن نے تو ہر دوں کی اور جیلی کی فرمائش کر دی جسے پورا کرنا اب مصنف صاحب کا کام ہے۔ پرواز میں شاہ خاور کے ستارے بدستور گردش میں ہیں۔ شاید اگلی قسط میں حالات شاہ خاور کے حق میں ہو جائیں گے۔ اس بار کہانی رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھی۔ چودھری عزیز کا انجام ایسا ہی ہونا تھا۔ گرداب ماہ بانو اور شہریار کی وجہ سے پرواز سے آگے پرواز کر رہی ہے۔ اثر نعمانی کی روپ بہروپ معاشرے کی عکاس کہانی تھی، اچھی لگی۔ سرورق کے رنگوں میں توصیف شبیر کا چٹکتا رنگ گم گشتہ لیے منفرد انداز کی بہترین تحریر تھی۔ دوسرا رنگ ایچ اقبال کی تحریر دشمن موسم درمیانے درجے کی تھی۔ ملک کے صدمے پر گہرا دکھ ہوا مگر کئی مشکلات سے بچ بھی گئی۔ چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں سزا، اسرار ابرام اور عافیت بڑی پسند آئیں۔ مجموعی طور پر جاسوسی زبردست لگا۔"

نوشی چودھری حافظ آباد سے ''ستمبر 2009ء کا جاسوسی کا شمارہ اس وقت سامنے ہے۔ سرورق اس دفعہ حسین تو نہیں البتہ سنگین ضرور ہے۔ مس سرورق اس دفعہ مسز سرورق سے حسن و جمال میں مات کھاتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ محترمہ کی چپٹی ناک، سپاٹ آنکھیں یعنی مجموعی طور پر بے کشش چہرہ ہمیں اسے حسینہ کہنے کی اجازت نہیں دے رہا۔ حسب معمول ایک عدد پسٹل سے سنسنی ابھارنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ ذاکر انکل سے مودبانہ گزارش ہے کہ پلیز کچھ تو نیا پن لائیں۔ جاسوسی کے سرورق آج کل بری طرح یکسانیت کا شکار ہیں۔ سرورق کے پوسٹ مارٹم کے بعد اشتہارات سے صرف نظر کرتے ہوئے سیدھے ہم خطوط کی محفل میں پہنچے ہیں تو ادارے میں آپ کی حساس طبیعت کے طمطراق حروف سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اس ماہ مبارک میں بھکر کی گرمی سے مرجھائے ہوئے کامران شہزاد زکوٰۃ کے حق دار قرار پائے۔ چودھری دل بہار انجم آپ اکیلے ہی چلے آئے۔ ماہ نور کہاں ہے؟ تصویر الحسن بھی بڑا افسانوی اور رومانٹک سا نام ہے آپ کا۔ میاں سرفراز چودھری صنف نازک جن، بھوت نہیں پریاں ہوتی ہیں تھوڑی تذکیر و تانیث پر توجہ مرکوز کرو۔ ایم افضال ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں۔ عدا شکل آپ زحمت نہ کریں ڈیئر بدولت پچھلے سال ہی ٹاپ پر آچکے ہیں، سو کوئی حسرت نہیں اور ہاں سیکرٹس یوں سرعام نہیں پوچھا کرتے، اوکے۔ یو کے پی صاحب ہم نے تو اپنے بھائی کا نام علی چودھری لکھا تھا لیکن انکل کی لاڈلی قینچی کو شاید پسند نہیں آیا۔ اس کے علاوہ مس رودا، مصدق محمود دانش، آمنہ پٹھانی اور عبدالسلام صدیقی کے تراشے تیر زیادہ نکیلے تھے۔ کہانیوں کے محور میں الجھے تو پھر گرداب نے ہمیں جکڑ لیا تو پھر ابھرنے نہ دیا اور یہ جاودانہ نہیں ہے۔ اسما قادری بڑی محنت سے کہانی کے تانے بانے بن رہی ہیں۔ کہانی کا پلاٹ گو کہ پرانا ہے پھر بھی یہ ایک دلچسپ اسٹوری ہے اور اسا تی شہریار صاحب کو پیچھے سے بتا دیں۔ ماہ بانو کو دیکھ کے جو آپ کو کچھ کچھ ہوتا ہے یہ اسی بہت کچھ ہونے کی ابتدا ہے جسے یار لوگ محبت کہتے ہیں۔ پرواز میں وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ آصف جاہ کی اذیت پسندی کے نئے روپ کے سوا کچھ بھی نیا پڑھنے کو نہیں ملا۔ باقی وہی مار دھاڑ اور بھاگ دوڑ۔ روپ بہروپ میں اثر نعمانی کے کہنہ مشق قلم کا ایک اور روپ پڑھنے کو ملا۔ شہزادے علی گجی خان کا کردار پسند آیا۔ اس ہنستی مسکراتی تحریر میں کہیں بھی بوریت کا احساس غالب نہیں آیا۔ اسرار ابرام، سائنس فکشن پر مبنی انتہائی انٹرسٹنگ اسٹوری تھی۔ ایک اچھے مقصد کی خاطر لیری شہرت حاصل کرنے کی خواہش سے دستبردار ہوا تو حیرانی ہوئی کہ مغربی لوگ تو خود غرضی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ طبع زاد ہو یا ترجمہ شدہ جس کہانی پر کاشف زبیر کا نام ہو وہ میں پہلی فرصت میں پڑھنا پسند کرتی ہوں۔ تاریخی پس منظر کی حامل پجاری سے ثابت ہوا کردار بدل جاتے ہیں لیکن داستان ظلم ہر دور میں ایک سی ہے۔ عورت کو ہر دور اور ہر معاشرے میں استحصال کا نشانہ بنایا گیا ہے کہ اب کہیں وہ خود بکتی ہے اور کہیں اسے بکاؤ بنا دیا گیا ہے لیکن ایک بات تو طے ہے، ایک معمولی صورت کی تھین یا کردار عورت کا مقابلہ تو کوئی مس ورلڈ بھی نہیں کر سکتی۔ (واہ کیا زوردار تقریر کی ہے)۔ آصف زبیر کی موت پسند کے بارے میں یہی کہا گیا ہے شاید کہ چراغ تلے اندھیرا۔ رنگوں میں ایچ اقبال کی دشمن موسم پہلے نمبر پر رہی۔"

مبشر ریاض ولد محمود ریاض اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں ''اس ماہ کا شمارہ 3 ستمبر کو ملا۔ سرورق پر ایک صاحب بلاوجہ ایک حسینہ پر پستول تانے کھڑے تھے جبکہ حسینہ شان بے نیازی سے مسکرائے جا رہی تھیں اور ان کی آوارہ لٹیں ماتھے پر ادھر سے ادھر جھول رہی تھیں جیسے گھڑی میں لگا پنڈولم جھولتا ہے۔ محفل یاراں میں اس بار پہلا انعام محمد کامران صاحب کو ملا سو حسب معمول گلی ہندی روٹین کے مطابق مبارکباد دینگی۔ اب پیج یا قبول کرنا کامران صاحب کا کام۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی پرواز پڑھی۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری گردو پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ دھڑکنوں کو سنبھالتے اور پسینا پونچھتے ہوئے قسط مکمل کی۔ شاہ خاور پر آج کل برے حالات آئے ہوئے ہیں تاہم وہ مردانہ وار ان کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ روپ بہروپ ایک مزاحیہ کہانی تھی جس کو پڑھتے ہوئے قہقہے سنبھالنے مشکل ثابت ہوئے۔ شہزادہ علی کا کردار خاصا جاندار تھا۔ پجاری بلاشبہ ایک شاندار کہانی تھی جس کے ایک ایک لفظ سے سنسنی ٹپکتی رہی۔ کہانی کے اختتام تک ہمارا انہماک قابل دید تھا اور اینڈ میں اس کہانی کے بارے میں لگائے ہوئے تمام اندازے غلط ثابت ہو چکے تھے اور یہی اس کہانی کا حسن تھا۔ موت پسند میں ماہر نفسیات خود ہی مریض نکلے۔ اسرار ابرام ہم جیسے نوجوانوں کے لیے ایک خوب صورت تحفہ ثابت ہوئی۔ ایک ایک لفظ سنسنی اور اسرار و تحیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ مصنف نے ایک مضبوط پلاٹ پر شاندار تحریر لکھی۔ گرداب ظلم، مظلوم اور انصاف کے ٹرائنگل پر مبنی ایک روایتی کہانی ہے تاہم اسما قادری کے انداز بیاں اور کرداروں پر مضبوط گرفت کے باعث [illegible] کی سند حاصل کیے ہوئے ہے۔ عافیت شیزوفرینیا کے مریضوں پر مبنی ایک معلوماتی کہانی ثابت ہوئی۔ قدم بقدم پر ایڈونچر، بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور اچھوتے اینڈ کے باعث یہ کہانی بھی پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی کا سامان لیے ہوئے تھی۔ سفاک میں گارون کا کردار ایسا تھا جو ہر کام میں صرف اپنا مفاد مقدم رکھتے ہیں۔ گم گشتہ لالچ، حرص اور لالچ پر مبنی ایک ایسی داستان تھی جس میں ہر فرد نے اپنا ہی لالچ دیکھا تاہم سب ہی نقصان میں رہے۔

www.pkdigest.com

کسی نے دولت کھوئی اور کوئی رشتوں کے حوالے سے تہی داماں ہوا۔ کردار نگاری، واقعات کے تسلسل اور مصنف کے انداز بیاں نے اس کہانی میں جان ڈال دی۔ ویل ڈن مس خوشیہ شبیر۔ دشمن موسم تجسس، تھرل اور سسپنس پر مشتمل داستان تھی۔

اپنی مقبول جاوید احمد صدیقی، راولپنڈی سے ”ستمبر کے تازہ شمارے کی آن بان دیکھ کر اس کی شان کو سلام کرنے کو جی چاہا۔ سب سے پہلے تو اثر نعمانی کا تیار روپ بہروپ پورا مرچ کر بولا ہوا تو کھانا، کامیاب اور عقل و دانش سے بھرپور شاہکار مزہ دے گیا۔ دونوں سلسلے تو اب لازوال و بے مثال ہیں اور قارئین کو اپنی گرفت میں جکڑے رکھتے ہیں۔ گرداب جیسی داستانوں کا تو انتظار کیا جاتا ہے۔ محیرالعقول واقعات، دل گداز موڑ، ان جانے جھٹکے اور سسپنس و تجسس سے بھرپور کہ دل کے اندر و ترقی چل جائے۔ مغل صاحب پرواز میں ہمارے ہیرو پر کیوں اتنا ظلم کروا رہے ہیں۔ مغل صاحب کی ذہانت میں کالے پانی میں سزاؤں کے محکمے کے انچارج تو نہ تھے؟ اتنی خوب صورتی سے گہرائی اور تفصیل لیے ہوئے تمام مناظر کو اجاگر کرنا مغل صاحب ہی کا کام ہے۔ پھر داستان میں رومانوی ٹچ بھی ان ہی کا خاصہ ہے۔ اس دفعہ دونوں رنگ مزہ دے گئے۔ گم گشتہ لمحے میں بہنوں کے مضبوط رشتوں کی نزاکتوں بھری داستان تانیا کے فہم و شعور سے عاری ارسلان، صوفیہ کی اندرونی کثافت کو اجاگر کرتی ہوئی انجام تک پہنچی ہے۔ ایچ اقبال کی دشمن موسم تو لازوال شاہکار ثابت ہوئی۔ تمام داستان مکالموں کے ذریعے اتنی سسپنس اور تیزی سے بڑھتی چلی جاتی ہے کہ قاری تو مجرم کو پکڑنے کے تجسس میں تیزی سے کہانی میں کھو کر آخر تک پہنچ کر دم لیتا ہے اور بڑے ہی انوکھے، عجیب اور غیر متوقع انجام سے محظوظ ہوتا ہے۔ جواری کاشف زبیر کی ایک اور اچھوتی کہانی۔ انسان اپنے مرتبے کو بھی پس پشت ڈال کر دولت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ محض اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے۔ شرجیل بہزاد کے روپ میں چونکا دینے والی کہانی لے کر آئے ہیں۔ جو طریقہ اور فیصلہ جج نے بہ حیثیت باپ کے کیا، وہ ناقابل فراموش تھا۔ موت پسند دراصل نفسیاتی کہانی تھی مگر الٹ ہو گیا تمام کام۔ اچھی رہی مگر ذرا انہونی سی لگی۔ راز دار بہترین کہانیوں میں سب پر تھی۔ جلد بازی اور دوسرے کی پوری بات نہ سننا اور بغیر غور کیے اجنبی کو اعتماد میں لے کر کچھ کہہ بیٹھنا راز دار اب ہمارے ہی کام آئے گا۔ یہ پھول بھی تھی اور چونکا دینے والے انجام کی کہانی قاری کے لیے انتہائی دلچسپی کا باعث تھی ہے۔ اسرار و ابہام ایک اچھے موضوع کی داستان تھی لیکن ذرا المیہ ہلکا ہونے کے باعث زبردست نہ رہی۔ سپر پاورز کی سیاست کے پس منظر میں لکھی گئی متبادل نے ایک اور پہلو بھی ہمارے سامنے کھول دیا اور مسعود صاحب ختم ہو گئے۔ عافیت اس شمارے کی بہترین کہانیوں میں سے ہے۔ ویسے بے وفائی کا شاہکار دنیا میں مرد ہی ہے ورنہ عورت اس ذات کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتی۔ جال تو مغربی معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر ہے اور صنوبر گن نے ایک گل سے دو فائدے حاصل کرنا چاہے اور قاتل مجھے مار اپنی بیوی کو بھی جرم میں شامل کر کے آخر کار رسی کے پھندے میں پھنس گیا۔“

چشمہ چراغ سے سائر کلو کر کا انتقام ”کاسل پر روپ بہروپ کی ملکہ بہت اچھی لگ رہی تھی، آنکھوں سے دل میں اتر گئی۔ پیچھے ایک بدصورت سا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس پر ہاتھ رکھ کر ملکہ حسن کے دیدار کیے۔ قسط وار کہانیوں میں گرداب پہلے نمبر پر آ گئی ہے۔ اسما قادری صاحبہ نے گرداب لکھ کر میدان مار لیا ہے۔ پرواز میں ہر لمحہ صورت حال بدل جاتی ہے۔ شکریہ چاچا جی کہ آپ ایچ اقبال صاحب کو منا کر لے آئے ہیں۔ اگر یہ کچھ عرصہ اور نہ آتے تو میں بھی جاسوسی والوں سے روٹھ جاتا۔ سرورق کے رنگ بہت اچھے تھے۔ ایسے ہی رنگ ہونے چاہئیں تمام دوستوں کی طرف سے ...

حسینہ فرام ملتان کو ہمارے تبصرے ”سرورق کی حسینہ مقتل کے سامنے بہادری سے ... مصنف کرخت ... روتی ہوئی ... بالکل پیچھے پڑ گئے۔ سرورق کی حسینہ میں کوئی حسن نام کی کوئی چیز نہیں تھی مگر پھر بھی ... اس کے بعد مغل ... کی جانب بڑھتے جہاں کوئی صدارت پر کامران صاحب تشریف فرما تھے۔ دل بہار صاحب لگتا ہے آپ کو ہمسائی کے بھائی کی لاتوں کا خوب تجربہ ہے۔ وقاص صاحب، آپ نے حسینہ کی تعریف نہ کر کے ثواب کمانے کا موقع کیسے گنوا دیا ہے۔ ایف اے حسنی صاحب، یہ منتظر اتوں پر منتظر ماری کے لیے سب سے ضروری چیز منتظر ہوتا ہے جو آپ کی کھوپڑی میں ناپید ہے۔ امید صاحب آپ کو ہماری طرف سے بھیجا گیا سالگرہ کا گفٹ یقیناً پہنچ گیا ہوگا۔ مصدق صاحب ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ آپ آوارہ نہیں ہیں اور دوسری طرف خوشی چودھری کو اپنے خلوص کا اتنا یقین کیوں دلایا جا رہا ہے۔ قیصر صاحب، آپ نے حماقتوں کی حد ہی کر دی کہ سرورق کی حسینہ کو اتنا تیز کر دیا کہ وہ بیک وقت آپ کو باوقار، عیار، سنجیدہ اور مسکراتی ہوئی دکھائی دی۔ مصطفیٰ صاحب چٹکی، کوئی چٹکی میں نہ آیا لوں۔ سرفراز صاحب، ڈاکر انکل تو حقیقت پسند ہیں۔ وہ جو محسوس کرتے ہیں وہی پیش کرتے ہیں۔ آمنہ بھائی جی، کبیر عباسی کے تبصرے کی آپ نے اتنی زیادہ تعریف کر دی۔ ویسے صنف کرخت کو اتنا سر چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صنف ذہین یعنی میری صنف کے تمام تبصرے ذہانت سے پر تھے جو مجھے بہت پسند آئے۔ نور الہدیٰ، عائشہ نصیر اور حجر ناطق کے دعا کا تیز تبصروں کا انتظار ہے۔ سب سے پہلے اسما قادری کی گرداب پڑھی۔ پرانا موضوع ہونے کے باوجود بہت اچھی تحریر ہے۔ پرواز کافی تیز رفتار جا رہی ہے۔ اپنے پسندیدہ مصنف کی پجاری بہت پسند آئی۔ اس ماہ کے دونوں رنگ اپنا خاص تاثر قائم نہیں کر سکے۔ اثر نعمانی کی روپ بہروپ کافی اچھی اور سبق آموز تحریر تھی۔ اس کے علاوہ عافیت، متبادل بہت اچھی اور سبق آموز کہانیاں تھیں۔“

ہمایوں سعید رومیو (بنوں) کی پسندیدگی ”ستمبر کا شمارہ 2 کو ملا۔ سرورق پر حسب معمول ایک سرسری نظر ڈال کے اور حسب معمول اشتہارات کو نظر انداز کر کے فہرست میں پہنچ کر دم لیا۔ اپنے پسندیدہ اثر کو دیکھ کر حسب معمول دل خوش ہوا اور حسب معمول محفل یاراں میں انٹری دی۔ کامران بھائی کو بے نیازی سے کرسی صدارت پر بیٹھا پایا۔ ویل ڈن، ایک خوب صورت تبصرہ لکھنے پر بہت بہت مبارک باد تحفہ۔ حسب معمول دوستوں کا لڑنا جھگڑنا چھوڑ کر واپس فہرست پر آیا اور خلاف معمول گرداب میں چھلانگ لگائی کیونکہ اگست والی قسط کے آخری لمحات بے حد سنسنی خیز تھے۔ ویل ڈن اسما جی! حساس اور روایتی موضوع پر اتنی خوب صورت کاوش۔ اس کے بعد خاور کے موجودہ حالات جاننے کے لیے بذریعہ پرواز ڈسکہ پہنچے مگر اپنے یار خاور کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ سوائے ٹھنڈی آہیں بھرنے کے۔ اس کے بعد سرورق کے رنگوں میں خود رنگنے کی کوشش کی مگر دوسرا رنگ ایچ اقبال کا دشمن موسم ہمارے دل پر اٹیک کرنے میں کامیاب ہوا۔ مختصر کہانیوں میں کاشف زبیر کی پجاری اور مریم کے خان کی اسرار و ابہام بے حد پسند آئی۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے مکتوبات شائع نہ ہو سکے۔

مہر وا ے ذکی سیال، خانیوال۔ بلیک زیرو، پاکپتن، گجرات۔ ایم احمد ہاشمی، بونیر۔ عابد خان بلوچ، خانیوال۔ رمضان پاشا، کراچی۔ محمد سلیم شبلی، ملتان۔ عبدالسلام صدیقی، ملتان۔ قاری عبدالماجد اشرفی، رحیم یار خان۔ لکی کنول، چکوال۔ ایم عشرت عباسی، آزاد کشمیر۔ حفیظ اللہ قیصرانی، ڈیرہ غازی خان۔

گھر بیٹھے چھ ماہ کے شارٹ ٹرم کورسز

بذریعہ خط و کتابت (عمر اور تعلیم کی کوئی قید نہیں)

انگلش لینگویج۔ بیوٹی پارلر اینڈ پینٹنگ۔ ڈرافٹس مین سول۔ فوٹو گرافی۔ فرسٹ ایڈ میڈیکل۔ جرنلزم۔ الیکٹریشن۔ لائبریرین۔ ویڈیو/ٹی وی ٹیکنیشن۔ نیوز رپورٹنگ۔ پبلک ریلیشن آفیسر۔ ڈرافٹس مین مکینیکل۔ سکول ٹیچنگ میتھڈ۔ لیڈی ٹیلرنگ۔ یوگا۔ موبائل فون ریپئرنگ۔ ڈرائنگ ماسٹر۔ انٹیریئر ڈیزائننگ/فائن آرٹس۔ بوتیک اینڈ فیشن ڈیزائننگ۔ امپورٹ ایکسپورٹ۔ طب نبوی۔ ریفریجریشن اینڈ ایئر کنڈیشننگ۔ کمپیوٹر ہارڈ ویئر۔ فزیو تھراپی۔ آٹو کیڈ۔ کوکنگ اینڈ بیکنگ۔ موٹر سائیکل ٹیکنیشن۔ انٹرنیٹ/ویب سائٹ اپریشن۔ کمپیوٹر کورس۔ پلمبر۔ کارپینٹر۔ ہومیو ڈاکٹر۔ ہوم اکنامکس۔ مارکیٹنگ۔ پولٹری فارمنگ۔ چائلڈ کیئر۔ میجک کرنا سیکھئے۔ عربی بول چال سیکھئے۔ سائنس اور زراعت۔ بوائلر انجینئرنگ۔ فٹر۔ باغبانی (پھل اور سبزیاں)۔ ہائی جین/پبلک ہیلتھ

ایک مکمل کورس کی فیس 1750 روپے ہے۔ نام پتہ اور کورس کا نام SMS کرنے کیلئے موبائل نمبر 0345-7917181 یا خط لکھیں۔ کورس ڈاکیہ گھر ڈیلیور کرے گا اور فیس وصول کرے گا۔ جس کو مکمل کر کے آپ کالج بھجوا دیں گے۔ طلباء کو سرٹیفکیٹ/ڈپلومہ جاری کیا جائے گا جو گورنمنٹ سے منظور شدہ ہوگا۔ نوٹ: صرف وہی طلباء SMS کریں جو فیس ادا کر کے کورس منگوانا چاہتے ہیں۔

DAE

گھر بیٹھے داخلے

میڈیکل ڈپلومہ/انجینئرنگ ڈپلومہ

میٹرک، سائنس یا آرٹس کے طلباء بذریعہ خط و کتابت ڈپلومہ ان ہومیوپیتھک، حکمت، نرسنگ، ڈسپنسر، ایکسرے ٹیکنیشن، الٹراساؤنڈ ٹیکنیشن، ڈینٹل ٹیکنیشن، لیبارٹری ٹیکنیشن، فزیو تھراپی، ویٹرنری اسسٹنٹ (جانوروں کا علاج)، گائناکالوجی اسسٹنٹ، الیکٹریکل، الیکٹرونکس، سول، مکینیکل ٹیکنالوجی، آرکیٹیکچر، ٹیکسٹائل اینڈ فیشن ڈیزائننگ، کمپیوٹر۔

ایڈمیشن فیس: 2000 روپے ماہانہ فیس: 500 روپے کل مدت: ایک سال (چھ چھ ماہ کے دو سمسٹر) نام پتہ اور کورس کا نام SMS کرنے کیلئے موبائل نمبر 0305-6482061

نوٹ: صرف وہی طلباء و طالبات SMS کریں جو فیس ادا کر کے کورس منگوانا چاہتے ہیں پراسپکٹس اور داخلہ فارم ڈاک کے ذریعے آپ کے گھر موصول ہو جائے گا۔ ڈپلومہ گورنمنٹ سے منظور شدہ ہوگا۔ رزلٹ کا انتظار کرنے والے طلبہ بھی داخلے کے اہل ہیں۔

گھر بیٹھے داخلے ایگزیکٹو ایم بی اے (ایگزیکٹو مینیجر ان بزنس ایڈمنسٹریشن)

سپیشلائزیشن ان: مارکیٹنگ۔ فنانس۔ HRM۔ ہوٹل مینجمنٹ۔ ہاسپٹل مینجمنٹ۔ میڈیکل سٹورز مینجمنٹ۔ لاء ایڈمنسٹریشن۔ کنسٹرکشن مینجمنٹ۔ ٹیکسٹائل مینجمنٹ۔ ویئر ہاؤس مینجمنٹ۔ ایگری مینجمنٹ۔ الیکٹریکل۔ سول۔ مکینیکل۔ پٹرولیم۔ کیمیکل۔ گیس اینڈ آئل مینجمنٹ۔ کیمیو مینجمنٹ (دو مضامین کا کورس اکٹھا بھیجا جائے گا)

ایسے طلباء و طالبات جن کی تعلیمی قابلیت بی اے، بی ایس سی، بی کام، بی سی ایس، ایم بی بی ایس، ڈی اے ای اور بی ایس سی انجینئرنگ ہے اور وہ گھر بیٹھے مندرجہ بالا کورس بذریعہ خط و کتابت کرنا چاہتے ہیں وہ اپنا نام، کورس کا نام، والد کا نام اور مکمل ایڈریس لکھ کر موبائل نمبر 0306-4829917 پر SMS کریں یا فون کریں پراسپکٹس اور داخلہ فارم آپ کے گھر موصول ہو جائے گا کورس گورنمنٹ سے منظور شدہ ہوگا رزلٹ کا انتظار کرنے والے طلبہ بھی داخلہ کے اہل ہیں کورس گھر بیٹھے اسائنمنٹ کے ذریعے ہوگا اور امتحان بھی گھر بیٹھے ہی ہوں گے داخلہ فیس -/2000 روپے ماہانہ فیس -/1000 روپے

چیئرمین چوہدری خالد سعید گل نیشنل انسٹیٹیوٹ آف مینجمنٹ سائنسز NIMS ستیانہ روڈ بالمقابل آئیڈیل سویٹس اینڈ بیکرز نزد APTECH بٹالہ کالونی فیصل آباد۔

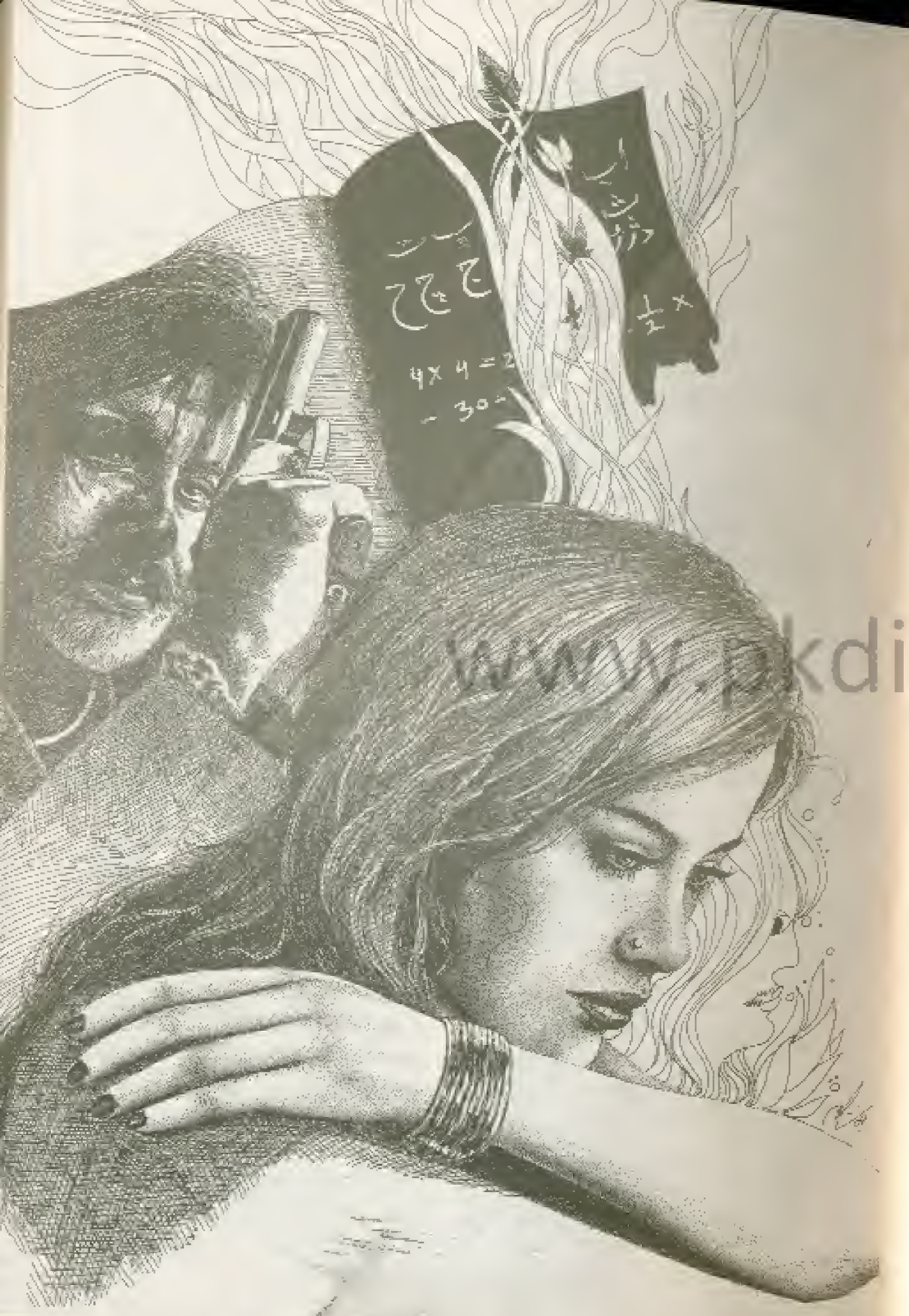

عکس در عکس

پروین زبیر

بقائے حیات کا سفر ایک فطری تسلسل ہے ..... جو رکتا نہیں رواں دواں رہتا ہے ..... اور اس تسلسل کو جاری و ساری، متحرک رکھتا ہے ..... ایک جذبہ ..... جذبۂ محبت ..... ایک نوجوان کی آئیڈیل پرستی سے شروع ہونے والی کہانی جو ایک انجانے شخص کے سحر میں گرفتار تھا ..... اس کے محسوسات کا دائرہ صرف ایک عکس کے گرد گھومتا تھا ..... پل بھر میں ریشم کے تاروں کے مانند جکڑ لینے والا عکس ..... اس کی زندگی کا محور و مرکز تھا۔

اچانک کھیل کی صورت اختیار کرنے والے کردار..... کسی ایک کی ہار میں دوسرے کی زندگی مضمر تھی۔

"دھائیں دھائیں گولیاں چل رہی تھیں... آٹھ دس آدمیوں نے اسے گھیر لیا تھا لیکن وہ اکیلا ان سب کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں گنیں تھیں اور وہ... وہ کبھی لیٹ کر... کبھی بیٹھ کر... کبھی چھلانگ لگا کر... اپنے آپ کو گولیوں سے بچا بھی رہا تھا اور دونوں ہاتھوں سے فائرنگ کر کے ان کو ٹھکانے بھی لگا رہا تھا... ڈھشم... ڈھشم... دھائیں..."

وہ ہاتھوں کے اشاروں کے ساتھ ساتھ منہ سے بھی فائرنگ کی آوازیں نکال کر منظرنامے میں بھرپور رنگ بھر رہا تھا... اسی کی عمر سے کچھ چھوٹے بڑے لڑکے حیرت سے آنکھیں اور منہ کھولے پوری توجہ سے اس کی لفاظی سن رہے تھے۔

"پھر ایک ایک کر کے اس نے اپنے سارے دشمنوں کو مار دیا... مسکرا کر میری طرف دیکھا... آنکھ ماری اور چلا گیا۔" اس نے بات ختم کر دی۔

"تو... ادھر تھا؟" ایک لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں... میں ادھر ٹیلے کے اوپر سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔" اس نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا۔

"اور اس سے پہلے... جب شیر شاہ کو پولیس نے چھاپہ مار کر پکڑنے کی کوشش کی تھی... تو اس نے پولیس سے بھی مقابلہ کیا اور بہت سے پولیس والوں کو مار کر اور زخمی کر کے بھاگ گیا تھا... تب بھی تو نے سب کچھ دیکھا تھا؟" دوسرے لڑکے نے پوچھا۔

"ہاں بالکل! میں ادھر سے دودھ لانے جا رہا تھا۔ بھینس والے چاچا کا باڑا گھر سے دور ہے نا... تو راستے میں تو سب کچھ ہو رہا تھا... میں نے ادھر کیکروں میں چھپ کر سب کچھ دیکھا تھا۔" ولی رحمٰن نے گردن اکڑا کر اپنے آپ کو کچھ معتبر ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تجھے ڈر نہیں لگتا ولی! اگر تجھے کوئی گولی لگ جائے... تو پھر؟" ایک لڑکے نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"ڈر ور مجھے کسی چیز سے نہیں لگتا... ولی رحمٰن ڈرنے والی چیز نہیں ہے۔ میں رات میں بھی بھی... اندھیرے میں اکیلا... پل تک جا کر واپس آ سکتا ہوں۔ تم میں سے کوئی جا سکتا ہے؟" ولی نے سامنے بیٹھے لڑکوں کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تو اس کے لہجے میں ان سب کے لیے تضحیک صاف محسوس ہو رہی تھی۔

"نہیں نہیں... ہمیں تو بہت ڈر لگتا ہے۔ میں تو رات کے اندھیرے میں گھر سے نکلتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں۔" بخت بادشاہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"بے کار ہے... ڈرپوک ہو تم سب کے سب... میں تو سوچ رہا ہوں، شیر شاہ سے پکی دوستی کر لوں۔ کیا بہادر بندہ ہے؟ کیا لڑتا ہے؟ کیا گن چلاتا ہے؟ کیا چاقو چلاتا ہے؟ کتنے بھی لوگ سامنے آ جائیں... ڈرتا ہی نہیں کسی سے... بس میں بھی اسی کی طرح ہیرو بننا چاہتا ہوں۔ دیکھ لینا تم سب! ایک دن میں بھی شیر شاہ کی طرح ٹھائیں ٹھائیں... ڈھشم ڈھشم کرتا نظر آؤں گا بلکہ اس سے زیادہ اچھی گن چلاؤں گا... راکٹ چلاؤں گا... اور... اور..." وہ اور نہ جانے کیا کیا کہنا چاہ رہا تھا کہ اچانک اسے لگا جیسے اس کا دایاں کان کسی شکنجے میں جکڑ گیا ہو۔ تکلیف کی شدت سے وہ زور سے چلایا اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو بابا کی قہر آلود نظروں سے سامنا ہوا۔ اس کی چیخ اس کے حلق میں ہی رہ گئی اور ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر پڑا تو آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ تھپڑ کے زوردار اثر نے اس کا چہرہ گھما دیا۔ اس نے دیکھا،

www.pkdigest.com

اس کے سارے دوست جو بڑے انہماک سے اس کی لن ترانیاں سن رہے تھے، سب غائب ہو گئے تھے اور وہ اکیلا بابا کی مار اور گالیوں کا سامنا کرنے کے لیے وہاں رہ گیا تھا۔

”خدائی خوار! تو ایک قاتل، ڈاکو، غنڈا اور بدمعاش بننا چاہتا ہے... شرافت کو بیچ کر کھا گیا ہے کیا؟ او خدایا! دس میں سے نو ٹھیک ٹھاک ہیں... یہ ایک گندا انڈا میرے گھر کیوں بھیج دیا...؟“ بارِیش عبدالرحمٰن نے اپنے چودہ سالہ بیٹے کو مزید ایک تھپڑ سے نوازنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے فریاد کی... اور اس عرصے میں ولی رحمٰن نے موقع غنیمت دیکھ کر دوڑ لگا دی۔

”اوئے خبیر و شیطان کا بچہ! ابھی ٹھیک کرتا ہے تم کو...“ عبدالرحمٰن نے بھاگتے ہوئے بیٹے کو لپک کر پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ چھلاوے کی طرح چھلانگیں لگاتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ عبدالرحمٰن نے پہلے تو غصے میں چیختے چلاتے ہوئے اپنی پشاوری چپل پاؤں سے اتار کر اسے ماری۔ نشانہ خطا گیا تو اس نے دوسری چپل بھی پورے زور سے اس کی طرف پھینکی لیکن وہ اچانک مڑ کر نالے پر بنے پل سے نیچے اتر گیا۔ عبدالرحمٰن نے غصے میں ایک دو پتھر بھی اس کی طرف پھینکے مگر بے کار رہا... کیونکہ وہ اس عرصے میں پل کے نیچے کیکر کے جھنکاڑ میں کہیں غائب ہو چکا تھا۔

عبدالرحمٰن بکتا جھکتا بیٹے کو برا بھلا کہتا... اللہ میاں سے اس کی فریاد کرتا ہوا گھر کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ولی نے پل کے نیچے سے جھانک کر اوپر کی طرف دیکھنے کی کوشش کی تو اس کے وہی سارے آوارہ گرد دوست اوپر بیٹھے اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

”چلا گیا رحمٰن چاچا... آجا اوپر...“ ایک نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ ٹوپی ہاتھ میں لیے سر کھجاتا ہوا ان کے پاس آ گیا۔

”بہت بہادر ہے تو ولی! تو تو کسی سے نہیں ڈرتا... پھر چاچا کے جوتے سے کیسے ڈر جاتا ہے؟“ ایک نے شریر لہجے میں پوچھا۔

”ابھی کیا کرے... بابا ہے...“ ولی نے منمناتے ہوئے کہا تو اس کا سر اور آنکھیں ابھی جلتی ہوئی تھیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے بڑی بڑی لن ترانیاں کر کے... اپنا جو ایک ہیرو والا خاکہ بنانے کی کوشش کی تھی، وہ بابا کے ایک تھپڑ اور دو چار گالیوں نے آن واحد میں زمیں بوس کر دیا تھا۔ اب پھر سے اسے بڑی محنت کر کے نئے نئے جھوٹ گھڑنے پڑیں گے۔

ولی رحمٰن اپنے دس بہن بھائیوں میں ساتویں نمبر پر تھا۔ عبدالرحمٰن حافظ قرآن اور مسجد کا پیش امام تھا۔ اس کی دو بیویاں اور دس بچے تھے۔ سارے بچے نہ صرف دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے بلکہ قرآن بھی حفظ کر رہے تھے۔ کچھ کر چکے تھے اور کچھ مصروف تھے۔ ان سارے بہن بھائیوں میں ایک ولی تھا جسے دینی تعلیم تو کیا... کسی بھی قسم کی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی دلچسپیاں کچھ اور تھیں۔

”تم آخر بڑے ہو کر بننا کیا چاہتے ہو؟“ ایک دن اس کی بڑی بہن نے اس سے پوچھا۔

”میں... میں... میں شیر شاہ بننا چاہتا ہوں۔“ اس نے سوچ سوچ کر آخر کہہ ہی دیا۔ اس کی بہن پہلے تو حیران رہ گئی پھر ہنسنا شروع کر دیا تو ولی گھور گھور کر اسے دیکھتا رہا۔

”کیوں... کیوں ہنس رہی ہو؟“ اس نے بگڑے تیوروں سے بہن کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”پتا بھی ہے... شیر شاہ نے کتنے قتل کیے ہیں؟ کوئی گنتی نہیں۔ اور تو! تو ایک چوہے کا بچہ بھی نہیں مار سکتا... اور چلا ہے شیر شاہ بننے... بھائی! رہنے دے۔ تو بھی ہماری طرح شرافت سے دینی تعلیم حاصل کر... قرآن حفظ کر... اور بن جانا کسی مسجد کا پیش امام... اسی میں تیری عافیت ہے... ورنہ بابا تک تیرے یہ خیالات پہنچ گئے نا تو تیری خیر نہیں ہے۔ بابا تجھ کو [illegible] کے بابا... کچھ عقل آئی بات۔“ بہن نے اسے اس کی اوقات یاد دلائی تو وہ چپ چاپ اسے گھورتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہوا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

شیر شاہ ایک ایسا کردار تھا جس کی دہشت نہ صرف مقامی طور پر بلکہ دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ پہلے وہ اسلحہ اور ہیروئن کی اسمگلنگ کرتا تھا پھر پولیس سے مقابلوں کے بعد اب وہ قتل، خوں ریزی اور دہشت گردی جیسے جرائم میں بھی پولیس کو مطلوب ہو گیا تھا۔ اشتہاری مجرم کی حیثیت سے اس کے سر کی قیمت بھی لگ چکی تھی۔ پولیس ہر دم اس کی تلاش میں رہتی تھی اور وہ چھلاوے کی طرح جگہیں بدل بدل کر چھپتا پھرتا تھا۔

☆☆☆

لکڑی کی کھردری ٹیبل کو کپڑے سے رگڑتے رگڑتے اس کی نظریں خود بہ خود ریک پر رکھے ٹی وی پر جیسے جم کر رہ گئیں۔ وہاں اسکرین پر اسے شیر شاہ کا چہرہ نظر آیا تھا۔

چمچوں اور پیالیوں کی کھنکتی آوازیں... گاہکوں کا اونچی آوازوں میں باتیں کرنے کا شور... کام والے لڑکوں اور کاؤنٹر پر بیٹھے چاچا گل خان کے زور زور سے آرڈر کے پیسے لینے اور دینے کا ہنگامہ... بلند آواز سے چلنے والے ٹی وی کی آواز کو اس طرح گڑبڑا رہے تھے کہ خبریں پڑھنے والوں کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔

خبرنامہ چل رہا تھا اور اس میں شیر شاہ کے بارے میں کوئی خبر نشر کی جا رہی تھی جبکہ اسکرین پر اس کی تصویر بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ کام چھوڑ کر جلدی جلدی چلتا ہوا ٹی وی کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا اور سر اٹھا کر شیر شاہ کی اسکرین پر نظر آنے والی تصویر کو پُرشوق نظروں سے دیکھتا رہا... جبکہ سننے پر توجہ کم ہونے کے باوجود خبر اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

شیر شاہ نے کسی دولت مند شخص کو... جو کئی کمپنیوں کا مالک تھا، اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے حفاظتی گارڈز نے شیر شاہ کے لوگوں پر فائرنگ کر دی۔ انہوں نے جوابی فائرنگ کی تو اس کے دو گارڈز کے علاوہ وہ تاجر خود بھی گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔ پولیس کے پہنچنے پر زوردار مقابلے کے بعد شیر شاہ اپنے ساتھیوں سمیت بھاگنے میں کامیاب ہو گیا... اور اب پولیس اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی۔

ولی نے تحسین آمیز نظروں سے شیر شاہ کی تصویر کو دیکھتے ہوئے آنکھ ماری اور ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلتی چلی گئی۔ شیر شاہ کی خبر ختم ہو کر دوسری خبریں شروع ہو چکی تھیں چنانچہ وہ ٹی وی کے سامنے سے ہٹ کر دوبارہ ٹیبل کی طرف آ گیا۔

بابا نے اس کے کرتوت دیکھتے ہوئے [illegible] کا مستقبل پڑھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ ولی ان کا کھوٹا سکہ ہے۔ ان کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ پڑھائی کی طرف متوجہ نہیں ہو سکا تھا۔ ان کی مار چوٹ کی مار بھی اسے دن بھر کی آوارہ گردی سے باز نہ رکھ سکی تو انہوں نے بڑی برائی سے بچانے کے لیے چھوٹی برائی قبول کر لی اور اپنے دوست گل خان کے چائے کے ہوٹل پر اسے ملازم رکھوا دیا اور اسے ہدایت کر دی کہ اس سے تھوڑا سختی سے کام لے۔ چنانچہ ولی صبح چھ بجے ہوٹل پہنچ جاتا... چولہے میں لکڑی کے گٹکے ڈال کر آگ جلاتا... برتن صاف کرتا... پھر لکڑی کی بنچیں اور ٹیبل پر کپڑا مار کر جھاڑو لگاتا... پانی بھر کر رکھتا... اسی اثنا میں گاہک آنا شروع ہو جاتے... انڈے، پراٹھے اور چائے کے آرڈر شروع ہو جاتے اور وہ ایک ٹیبل سے دوسری ٹیبل پر دوڑتا رہتا۔

گیارہ بجے سے بارہ بجے تک اسے ایک گھنٹے کی چھٹی ملتی تھی جس میں وہ اپنے آوارہ گرد دوستوں کے ساتھ خوب گپ شپ کرتا۔ اچھلتا کودتا اور کھا پی کر بارہ بجے دوبارہ کام پر پہنچ جاتا... جہاں دوپہر اور پھر رات کے کھانے کا سلسلہ چلتا رہتا۔ رات نو بجے اس کی چھٹی ہو جاتی تو وہ ہوٹل سے نکلتا اور طویل فاصلہ پیدل طے کرتا ہوا پل پر سے گزرتا... کیکروں کے جھنڈ کے پاس سے ہوتا ہوا پتھریلے راستے پر چلتا ہوا اپنی بستی میں پہنچ جاتا۔ گھر میں داخل ہوتا تو عموماً سب سونے کے لیے لیٹ چکے ہوتے تھے۔ بس ایک دو جاگ رہے ہوتے تھے۔ اکثر اس کی بڑی بہن اس کے لیے دروازہ کھولتی۔ بابا بستر پر بیٹھا تسبیح پڑھ رہا ہوتا اور اس کے سلام کا جواب ایک بڑی ”ہوں“ کی شکل میں دیتا۔ وہ تھکن کا احساس لیے بستر پر گرتا اور بے خبر سو جاتا۔

اس کی زندگی کا یہ تھکا دینے والا اور بے زار کن معمول چلتا رہتا اگر اس کی زندگی میں وہ پورے چاند کی رات نہ آتی جب وہ چھٹی ہونے پر ہوٹل سے نکل کر گھر جانے کے لیے کیکروں کے جھنڈ کے قریب سے نہ گزرتا۔

آج سردی کچھ زیادہ ہونے کے سبب گاہک بہت کم تھے تو گل چاچا نے اسے کچھ جلدی چھٹی دے دی۔ وہ خوشی خوشی ہوٹل سے نکل کر گھر کی طرف چلا تو چاندنی رات، ماحول کی فسوں خیز خاموشی اور اس کے اندر کی خوشی نے طبیعت میں ایک ہلکی سی سرخوشی پیدا کر دی اور وہ پہلے ہلکی اور پھر بلند آواز میں اپنا پسندیدہ گیت گاتا ہوا... پتھریلے راستوں پر چلتا جا رہا تھا۔ بلند آواز میں گانے سے سردی کا احساس بھی زائل ہو رہا تھا اس لیے وہ خوب اونچی اونچی تانیں لگاتا ہوا ”یا قربان... یا قربان“ گاتا جا رہا تھا۔

ایسے ہی اپنی دھن میں گنگناتا ہوا، گاتا ہوا وہ کیکروں کے جنگل کے پاس سے گزرنے لگا تو اسے ایسا لگا جیسے کسی نے ”شش“ کر کے اسے آواز دی ہو... لیکن وہ سنی ان سنی کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا... تو پھر اسے وہی ”شش“ کی آواز سنائی دی۔

معائنہ

مریض: ڈاکٹر صاحب، اگلے ہفتے میری شادی ہو رہی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ شادی سے پہلے اپنے دماغ کا معائنہ کرا لوں۔

ڈاکٹر: یہ معائنہ شادی کے بعد کیا جاتا ہے، ازراہِ کرم آپ چھ مہینے بعد تشریف لائیں۔

☆☆☆

اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ سرمایہ اور محنت میں کیا فرق ہے تو ایسا کرو کہ کسی دوست کو کچھ رقم ادھار دے دو۔ ادھر دی ہوئی رقم تمہارا سرمایہ کہلائے گی اور اسے واپس لینے کے لیے تمہیں جو جدوجہد کرنا پڑے گی، اسے محنت کہا جائے گا۔

www.pkdigest.com

اب کی بار اس نے واضح طور پر یہ آواز سنی تو ٹھٹک کر رک گیا اور اپنی بائیں جانب دور تک پھیلے کیکروں کے اس طویل وعریض جھنڈ میں گھور گھور کر دیکھنے لگا جہاں تیز چاندنی کے باوجود اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

ہر طرف چھائے ہوئے گمبھیر سناٹے میں... اکیلے، تنہا کھڑے ولی کو اپنے دوستوں کے سنائے ہوئے جن بھوتوں کے قصے یاد آنے لگے۔ وہ کچھ خوف زدہ سا ہوا... اور اس نے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”ٹھہرو۔“ دبے ہوئے لیکن کرخت لہجے میں اسے روکا گیا تو اس کے قدم زمین میں جیسے گڑ سے گئے۔

اس نے آنکھیں پھاڑ کر اس طرف چھائے ہوئے اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی کوشش کی جدھر سے آواز آئی تھی۔

”کک... کون؟... کون ہے؟“ ولی نے سہمے اور گھبرائے ہوئے لہجے میں آواز دی تو اسے اس طرف سے جھاڑیوں میں کچھ سرسراہٹ سی سنائی دی۔ کیکر کی کچھ شاخیں ہلیں اور اندھیرے میں ایک چہرہ نمودار ہوا۔

گھنی، سفید ڈاڑھی، مونچھیں، لمبے سفید بال اور گھورتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں... ولی اس چہرے کو دیکھ کر گھبرا گیا... اسے یقین ہو گیا کہ آج وہ کسی جن کے ہتھے چڑھنے والا ہے... اور اس بات نے اسے خوف زدہ کر دیا کہ اب یہ مجھے پکڑ کر میرا خون پیے گا اور میری لاش پر سے گوشت نوچ نوچ کر کھائے گا۔ تصور میں اپنے آپ کو پنجر کی شکل میں دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گیا اور سرپٹ دوڑ جانے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ دوبارہ وہ کرخت آواز سنائی دی۔

”رکو! بھاگنے کی کوشش مت کرو۔“ یہ آواز سن کر وہ پھر رک گیا۔

”میں اگر بھاگا تو اس کا ہاتھ میرے پیچھے پیچھے آئے گا... اور کتنی ہی دور بھاگ جاؤں... وہ ہاتھ لمبا ہوتے ہوتے آخرکار مجھے پکڑ ہی لے گا۔ جنوں کے ہاتھوں میں ایسی ہی طاقت ہوتی ہے... بھاگنا بے کار ہی ہے۔“ وہ ٹھہرا کر رکا اور اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس جن سے جان چھڑانے کی ترکیب سوچتا رہا۔ اچانک اسے بابا کا بتایا ہوا طریقہ یاد آ گیا۔

”جب بھی جن بھوتوں، چڑیلوں کا خوف محسوس ہو... فوراً معوذتین پڑھنا شروع کر دو اور اس چیز پر پڑھ کر پھونک دو جس سے خوف محسوس ہو رہا ہو۔ انشاء اللہ کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا اور خوف بھی دور ہو جائے گا۔“

اسے بابا کے الفاظ یاد آئے تو اس نے بوکھلاہٹ میں بلند آواز نکالی۔

”قل اعوذ برب الناس...“ ابھی اس نے اتنے ہی الفاظ کہے تھے کہ وہ چہرہ ہنسنے لگا۔ بلند آواز میں وہ ہنسا اور گویا ہوا۔

”تم مجھے کوئی جن بھوت سمجھ رہے ہو شاید... ادھر دیکھو میری طرف... غور سے... میں انسان ہوں... صرف انسان... سمجھے... یہ دیکھو...“ وہ ان الفاظ کے ساتھ آگے بڑھا تو اس کا پورا جسم جھاڑیوں سے باہر آ گیا۔

ولی نے دیکھا، وہ ایک بوڑھا اور کبڑا شخص تھا۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی اور کاندھوں کے درمیان اس کا ابھرا ہوا کُب صاف نظر آ رہا تھا۔ اور جب وہ اپنی جگہ سے کچھ آگے آیا تو ولی کو اس کی چال میں واضح لنگڑاہٹ محسوس ہوئی۔ شاید کسی ٹانگ میں کوئی مسئلہ تھا۔ ایک بوڑھے اور کسی حد تک معذور شخص کو دیکھ کر ولی کا خوف کافی کم ہو گیا۔

”تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ولی نے اس سے پوچھا۔

”میں بہت بھوکا ہوں... مجھے کھانا چاہیے... تم مجھے کھانے کو کچھ لا کر دے سکتے ہو؟“ بوڑھے نے اس سے کہا تو وہ کچھ حیران سا ہوا۔

”بھوک لگی ہے تو ادھر گل چاچا کے ہوٹل پر جا کر کھانا کیوں نہیں کھا لیتے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں چل نہیں سکتا۔ میرے پاؤں میں چوٹ لگی ہے... تین چار دن سے ادھر پڑا ہوا ہوں۔ اب بھی بڑی مشکل سے اٹھ کر تمہارے سامنے آیا ہوں۔“ بوڑھے نے ہاتھ میں پکڑی موٹی سی شاخ کے سہارے بہ مشکل اپنا وزن دوسری ٹانگ پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔

”تو یہاں جنگل ویرانے میں کیوں پڑے ہو؟ گھر کیوں نہیں جاتے؟“ ولی اس کی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔

”شش! آہستہ بولو... میرے دشمن میری تاک میں ہیں۔ وہ مجھے جان سے مارنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی... شکر ہے میری جان تو بچ گئی لیکن ٹانگ میں اور بازو میں گولیاں لگ گئیں۔ اسی وجہ سے میرا چلنا پھرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ورنہ میں کبھی تم سے کھانے کے لیے نہیں کہتا۔“ اجنبی بوڑھے نے ایسے انداز میں کہا کہ ولی کو اس پر ترس آ گیا۔ پھر اس نے اپنے دشمنوں سے مقابلے کی ایسی خبر سنائی تھی کہ ولی تجسس میں پڑ گیا تھا۔

”پہلے یہ تو بتاؤ... تمہارے دشمن کون تھے؟ ان سے تمہارا مقابلہ کہاں ہوا؟ اور تم نے ان میں سے کسی کو مارا یا نہیں؟“ اس نے تجسس آمیز حیرت سے پوچھا۔

”بتاؤں گا... سب بتاؤں گا... لیکن کچھ کھانے کے بعد... ابھی تو تین دنوں کی بھوک نے مجھے اتنا کمزور کر دیا ہے کہ بات کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔“

بوڑھے نے کمزور ہوتی ہوئی آواز میں کہا، تب بھی ولی نے اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچھ کہنا چاہا۔ اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ بوڑھے نے بے زاری سے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

”بس! میں نے کہا نا... کھانے کے بعد...“ اس نے آخری الفاظ کہہ کر ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا تو ولی نے اس کی آنکھوں میں کچھ چنگاریوں کی جھلک سی دیکھیں۔ اس نے سر جھکا کر قدم آگے بڑھا دیے۔

اس کا تجسس اسے مہمیز کر رہا تھا اور وہ تیز قدموں سے چلنے کے بجائے رفتار بڑھا کر دوڑنے لگا۔ جلد ہی گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بستی میں بجلی نہ ہونے کے سبب جلد ہی اندھیرا پھیل جاتا تھا اور لوگ سرِشام کام نمٹا کر جلد ہی سو جاتے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی بستی میں سناٹے کا راج تھا۔

حسب عادت اس نے پہلے دروازے کی جھریوں سے جھانک کر اندر دیکھا۔ صحن خالی پڑا تھا۔

”اس کا مطلب ہے... آج بابا کمرے میں سویا ہوا ہے... میدان صاف ہے... چلو ولی!“

اس نے دروازے کے ایک پٹ کو پکڑ کر آہستہ سے آگے کھینچا اور بیچ والی جھری میں انگلیاں ڈال کر لکڑی کا کنڈا کھولا۔ اندر داخل ہو کر... ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے دبے قدموں سے برآمدہ پار کیا اور کمرے میں جھانکا۔ فرش پر بستر بچھا ہوا تھا اور اس کے سارے بہن بھائی لائن سے لیٹے سو رہے تھے۔ برابر والا کمرا اماں بابا کا تھا جہاں سے بابا کے خراٹوں کی بلند آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا... واپس پلٹا اور برآمدے میں جلتی لالٹین کی مدھم روشنی میں کونے میں بنے ہوئے باورچی خانے میں گیا۔

اسے پتا تھا کہ اس کی بہن نے اس کے حصے کا کھانا الگ ڈھانک کر رکھا ہوگا۔

دو موٹی موٹی روٹیاں اس نے کپڑے میں لپیٹیں اور گوشت کے شوربے سے بھرا پیالہ اٹھا کر وہ واپس بیرونی دروازے کی طرف مڑ گیا۔ تیرہ تاریخ کا چاند سر پر آ کر تیز چاندنی بکھیر رہا تھا۔ فضا چاندنی کے فسوں میں گھولی ہوئی خاموش تھی۔ وہ تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا تو اس کے پیروں کے نیچے آنے والے سنگ ریزوں کی آواز اس خاموشی کو مجروح کرنے لگی... جو اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی لیکن وہ رک نہیں سکتا تھا۔ جلدی جلدی قدم بڑھاتا وہ کیکروں کے جھنڈ کے پاس پہنچ گیا۔

جس جگہ وہ بوڑھے کو چھوڑ کر گیا تھا... وہ خالی تھی۔ رات کی خاموشی اور جھینگروں کی جھائیں جھائیں کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔

”اے! تم کہاں ہو؟ میں کھانا لے آیا ہوں... آ جاؤ... اے... باہر آؤ!“

اس نے وہاں کھڑے کھڑے کئی آوازیں دیں لیکن بوڑھا نہ تو خود نظر آیا نہ ہی اس کی موجودگی کے کوئی آثار نظر آئے۔ ”شاید وہ ڈر گیا ہوگا کہ میں بستی سے لوگوں کو بلا کر نہ لے آؤں... وہ اسے پکڑ نہ لیں۔“ ولی نے سوچا پھر آواز لگائی۔

”او بے! ڈرو نہیں... میرے ساتھ کوئی نہیں ہے... میں اکیلا آیا ہوں... تمہارے لیے کھانا لایا ہوں... آ جاؤ۔“

ولی نے پھر آوازیں دیں لیکن اس جانب سے کوئی اشارہ نہیں ملا۔

ولی نوعمر ہونے کے باوجود تیز دماغ اور طرار ذہن رکھتا تھا۔ اسے بوڑھے کی باتوں پر بالکل بھی یقین نہیں آیا تھا۔ اس کی کہانی میں کئی جھول تھے اور وہ سوچ رہا تھا۔

”پکی بات ہے... اس کی جو عمر ہے اور جو حالت ہے... اس میں وہ اتنے حوصلے سے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتا... تو یا تو دشمنوں سے مقابلے کا بیان غلط ہے... یا پھر یہ آدمی وہ نہیں ہے جو یہ نظر آتا ہے۔ اس کے غیر معمولی دودھیا بال اور ڈاڑھی کچھ جچ نہیں کر رہے اس کے چہرے سے... کہیں اس نے بھیس تو نہیں بدلا ہوا ہے؟“

ولی کے ذہن میں شیر شاہ کا خیال آیا تو وہ اچھل پڑا۔

”او یا قربان!“ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے اور مارے تجسس کے وہ بے قرار ہو گیا کہ وہ باہر آئے تو وہ اس سے پوچھے کہ وہ شیر شاہ تو نہیں ہے۔ چاچا گل خان کے ہوٹل پر چوبیس گھنٹے چلنے والے ٹی وی پر اس نے پچھلے ہی دنوں شیر شاہ کے بارے میں خبر سنی تھی کہ کئی وارداتوں میں مطلوب ہونے کے سبب پولیس کو شیر شاہ کی تلاش تھی اور آخرکار پولیس نے ہائی وے کے نزدیک کسی ویران جگہ پر شیر شاہ اور اس کے ساتھیوں کو گھیر لیا تھا۔ دونوں پارٹیوں کی طرف سے زبردست مقابلہ ہوا... لیکن شیر شاہ نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اگرچہ اس کے چند ساتھی پکڑے بھی گئے لیکن پولیس شیر شاہ کا سراغ لگانے میں ناکام رہی۔ اس مقابلے میں کچھ پولیس والے زخمی بھی ہوئے تھے لہٰذا اب شیر شاہ کے کھاتے میں ایک مزید واردات کا اضافہ ہو گیا تھا۔ خبروں میں یہ بھی

www.pkdigest.com

بتایا گیا تھا کہ شیر شاہ کے گروہ کے بیشتر لوگ پکڑ لیے گئے ہیں۔ وہ اس وقت شدید زخمی ہے۔ تنہا ہے اور کہیں روپوش ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ وہ جلد ہی اسے زندہ یا مردہ حالت میں پکڑ لے گی۔

ولی نے یہ سب سوچتے ہوئے کھانا کیکروں کے جھنڈ میں اسی جگہ رکھ دیا جہاں بوڑھے کو دیکھا تھا اور خود کچھ دور پڑے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

دور دور تک پھیلی ہوئی چاندنی میں آس پاس کا ماحول پوری طرح روشن تھا۔ یہ چھوٹا سا پتھریلا راستہ جو ٹیڑھا میڑھا گھومتا ہوا اس کی بستی تک جا رہا تھا... سامنے دور تک پھیلا ہوا کیکروں کا بہت بڑا جھنڈ... جو نہ جانے کیسے کیسے حشرات الارض اور جھینگروں کی آوازوں سے گونجتا محسوس ہو رہا تھا... بائیں طرف دور نظر آنے والا پل... جس پر سے بڑی سڑک گزرتی تھی اور اس کے نیچے سے شاید کوئی برساتی نالہ بہتا تھا جس کی نمی کے سبب پل کا وہ سارا نچلا حصہ جنگلی پودوں اور درختوں سے اٹا ہوا تھا... اور اس نالے کے آس پاس کی کچھ زمین صاف کر کے اس کی بستی کے کچھ لوگوں نے سبزیاں کاشت کی ہوئی تھیں۔ گاجر، مولی اور پالک کے پتے سرسبز نظر آ رہے تھے۔

اسے بیٹھے ہوئے کچھ دیر ہو چلی تھی۔ اس نے بے زاری سے ایک بار پھر سامنے نظر ڈالی تو چونک اٹھا... تھوڑی دیر پہلے اس نے جو کھانا کیکروں کے جھنڈ میں رکھا تھا، وہ غائب تھا۔

وہ اٹھا اور تیزی سے اس جھنڈ میں داخل ہوا۔

''اے... مجھے معلوم ہے... تم یہیں کہیں ہو... میرے سامنے کیوں نہیں آ رہے ہو؟ میرے سامنے آؤ... نہیں آئے تو میں تمہیں کھانا لا کر نہیں دوں گا... اور بستی کے لوگوں کو بتا بھی دوں گا تمہارے بارے میں... کہ تم...''

اس کی آواز وہیں گھٹ کر رہ گئی کیونکہ کسی نے اس کی کمر پر کچھ مارا تھا۔

ولی نے پلٹ کر دیکھا تو وہی کھڑا تھا... اپنے سفید بالوں اور ڈاڑھی کے ساتھ۔ ولی نے غصے میں اسے کچھ کہنا چاہا تو اس نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی دوبارہ اٹھائی۔

''اب اگر مجھے دھمکیاں دینے کی کوشش کی تو دوبارہ ماروں گا۔ بیٹھ جاؤ اور مجھے کھانا کھانے دو۔''

اس نے ولی کو چھڑی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا پھر اس نے جلدی جلدی بے تابی سے لقمے بنا بنا کر منہ میں رکھنا شروع کیے۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بہت بھوکا ہے اور جلد سے جلد سب کچھ کھا لینا چاہتا ہے... مگر اس جلدی میں اس کی ڈاڑھی رکاوٹ پیدا کر رہی تھی جس کے سبب وہ کچھ جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو رہا تھا۔

ولی اس کے سامنے بیٹھا دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس نے کہا۔

''تم یہ ڈاڑھی اتار کیوں نہیں دیتے... کھانا آرام سے کھا لیا جائے گا۔''

بوڑھے نے چونک کر اسے دیکھا تو ولی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تمہارے بال اور تمہاری ڈاڑھی مصنوعی ہیں۔ تم نے بھیس بدلنے کے لیے لگائے ہوئے ہیں۔''

بوڑھے کی آنکھوں میں ایک لمحے کو حیرت لہرائی... پھر اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر ہاتھ میں پکڑا ہوا نوالہ واپس روٹی کی چنگیر میں رکھ دیا۔ ''میں تمہیں بچہ سمجھا تھا... ناسمجھ... نادان... لیکن تم نے جان لیا کہ میری ڈاڑھی مصنوعی ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ تم... شیر شاہ ہو۔'' ولی کی بات سن کر وہ سچ مچ حیرت زدہ ہو گیا۔

''تمہیں کیسے معلوم... کیسے معلوم کہ میں شیر شاہ ہوں؟'' بوڑھے کی آواز میں یک لخت بے پناہ سختی آ گئی اور اس نے بجلی کی سی تیزی سے نہ جانے کہاں چھپایا ہوا پستول نکال کر اس پر تان لیا۔

''بتاؤ... بتاؤ... ورنہ ابھی گولی مار دوں گا۔'' اس نے ڈپٹ کر کہا تو ولی ایک لمحے کے لیے ڈرا... لیکن پھر اس کی فطری دلیری ابھر آئی۔ وہ مسکرایا اور بوڑھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے گولی مار دی تو تمہیں کھانا کون لا کر کھلائے گا؟ تمہیں اپنے پاؤں کے زخم کے لیے دوائیں بھی چاہئیں ہوں گی... وہ کون لے کر آئے گا؟ کب تک اس ویرانے جنگل میں جانوروں کی طرح چھپے رہو گے؟ اگر بارش ہو گئی... پھر؟''

وہ معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

بوڑھا کچھ دیر شعلے برساتی آنکھوں سے اسے گھورتا رہا... پھر آہستہ آہستہ یہ تاثر نرم پڑتا چلا گیا۔ آخر میں وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''میں نے تمہیں سمجھنے میں بڑی غلطی کی... میں نے تمہیں نو عمر سمجھ کر نادانی، ناسمجھی اور بچپن کے بھولپن کی توقع کی تھی... لیکن تم نے بہت جلد میرے خیال کو غلط ثابت کر دیا... اب مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے پہچانا کیسے؟''

''بہت آسانی سے... میں بچپن سے تمہارے کارنامے بڑے شوق سے سنتا رہا ہوں۔ اخباروں میں... ٹی وی میں...

تمہارے بارے میں خبریں چلتی رہتی ہیں اور میں ان خبروں کو ہمیشہ پوری توجہ سے پڑھتا اور سنتا رہا ہوں۔''

''کیوں؟'' بوڑھے نے بے صبری سے پوچھا تو ولی خوش دلی سے مسکرایا۔

''بتاؤں گا... یہ بھی بتاؤں گا... پہلے میری بات تو پوری ہونے دو۔

''تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ابھی چند دن پہلے ہی ٹی وی پر تمہارے بارے میں دو تین دن خبریں چلتی رہی تھیں... کہ ہائی وے پر پولیس نے تمہیں تمہارے ساتھیوں سمیت گھیر لیا تھا۔ انہوں نے تم پر فائرنگ کی... تم نے ان پر فائرنگ کی... کچھ ادھر گرے... کچھ ادھر گرے... لیکن تم زخمی حالت میں پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔'' ولی نے مزے لے لے کر کہا۔

''سب بکواس ہے... ڈراما ہے۔'' بوڑھے نے غصے سے بھڑک کر کہا۔

''مجھے کیا پتا؟ میں تو یہ جانتا ہوں کہ بندہ ہو تو اتنا بہادر... کہ کتنے ہی دشمنوں میں گھر جائے... پر بہادری سے لڑتا ہوا، بھڑتا ہوا... ڈشم... ڈشم... ڈشم... فائرنگ کرتا ہوا... دو چار کو ادھر ادھر گراتا ہوا صاف بچ کر نکل جائے... جیسے تم نکل آئے... تمہاری ٹانگ میں گولی لگی ہے شاید... ہے نا؟'' ولی نے بولتے بولتے سوال کر دیا تو بوڑھے نے غیر ارادی طور پر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں جانتا تھا کیونکہ خبریں میں نے پوری دیکھی اور سنی تھیں... تمہارے پولیس مقابلے کی... اور اس میں وہ پولیس افسر پورے یقین سے کہہ رہا تھا کہ ہماری چلائی ہوئی کم از کم تین گولیاں تو شیر شاہ کو یقینی لگی ہیں... کہاں کہاں لگی ہیں تمہیں گولیاں؟'' اس نے پھر بولتے بولتے سوال کر دیا۔

''ٹانگ میں دو اور ایک بازو میں۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''اوہو... پھر تو تم بہت تکلیف میں... اور بہت مشکل میں ہو گے۔ زخموں کی تکلیف، بھوک اور بے آرامی... بغیر دوا کے زخم یقیناً خراب ہو رہے ہوں گے۔ تھوڑے دن اور گزرے تو زہر پھیل جائے گا تمہاری ٹانگ اور بازو میں... اور تم اس جنگل میں چھپے چھپے ایک چوہے کی طرح مر جاؤ گے۔'' ولی نے کچھ مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا تو بوڑھا غصے سے چلایا اور اس نے چھڑی اٹھا کر ولی کو مارنا چاہی تو وہ بیٹھے بیٹھے ہی اپنے آپ کو جھکائی دے کر صاف بچا گیا۔

''تم نے غلط بولا ہے... بالکل غلط... میں شیر شاہ ہوں شیر شاہ... ایسے نہیں مر سکتا... چوہوں کی طرح... خبردار! جو اب مجھے ایسا بولا۔ اب چھڑی نہیں... گولی مار دوں گا تجھے خانہ خراب۔''

''ٹھیک ہے... ٹھیک ہے... مجھے بھی پسند نہیں تیرا ایسے مرنا... لیکن مجھے تیرا ایسے بزدلوں کی طرح چھپا رہنا بھی اچھا نہیں لگتا... باہر نکل... اپنا علاج کروا... پیٹ بھر کر کھانا کھا... اور پھر دشمنوں کے لیے طوفان بن کر ہلا بول... مرد بن مرد!''

ولی نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اسے اور بھڑکانے کی پوری کوشش کی اور اس کوشش نے بوڑھے کی آنکھوں میں چنگاریاں اور شرارے بھر دیے لیکن اس نے حیرت انگیز طور پر اپنے اوپر قابو پانے کی پوری کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔

''اوئے خدائی خوار! کس مٹی کا بنا ہوا ہے تو... تجھے شیر شاہ جیسے آدمی سے ڈر نہیں لگتا؟ ساری دنیا جس سے تھر تھر کانپتی ہے تو اپنی بکواس سے اس کی اوقات دو کوڑی کی کر رہا ہے... اوئے! اوئے تو نے تو شیر کو بکری بنا ڈالا بدبخت...'' بوڑھے نے آزردہ ہو کر سر پر ہاتھ مارا۔

''یہی تو میں نہیں چاہتا کہ جسے میں شیر سمجھتا ہوں... وہ بکری کی طرح میں میں کرتا رہ جائے۔ میں اپنے ہیرو کو زیرو بنتے نہیں دیکھ سکتا۔'' ولی نے اطمینان سے کہا تو مارے حیرت کے بوڑھے کی آنکھیں پیشانی پر چڑھ گئیں۔

''ہیرو...؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں ہاں ہیرو! لوگ پتا نہیں کیسی کیسی فلم کے ہیرو کو پسند کرتے ہیں، پر میں تو شیر شاہ کو ہیرو سمجھتا ہوں... سچ مچ کا ہیرو۔ اصلی زندگی میں ہیرو جیسے کارنامے انجام دینے والا... کبھی شکست نہ کھانے والا... کسی سے نہ ڈرنے والا... پر اب تیری حالت دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ تو ہیرو نہیں رہے گا۔'' ولی نے اس میں غیرت بیدار کرنے کی کوشش کی۔

''کیوں... ایسا کیوں سمجھتا ہے تو؟ میری ٹانگ میں گولیاں لگی ہیں... اس لیے چل پھر نہیں سکتا... میرے کچھ ساتھی مارے گئے اور کچھ پکڑے گئے ہیں۔ پولیس نے مار مار کر ان سے میرے سارے ٹھکانوں کا پتا پوچھ لیا ہوگا۔ جہاں بھی جاؤں گا، پولیس کا پھندا وہاں موجود ہوگا۔ اس لیے کسی ٹھکانے پر نہیں جا سکتا اور یہی وجہ ہے کہ اس ویرانے میں چھپا ہوا ہوں۔ ذرا میرے زخم ٹھیک ہو جانے دے پھر دیکھ کیسے سبق سکھاتا ہوں ایک ایک کو... شیر شاہ... شیروں کا بادشاہ ہے۔ سیکڑوں گیدڑ مل کر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے... اصلی ہیرو... فلمی ڈھکوں کی طرح کا ہیرو نہیں... سمجھا؟''

www.pkdigest.com

شیر شاہ نے جس طرح کے خیالات کا اظہار کیا اسے سن کر ولی کے چہرے پر اندرونی مسرت کے واضح آثار جھلکے۔

''ٹھیک ہے تو پھر آج سے تیرے کھانے اور دواؤں کی ذمے داری میری۔ کیا میں کسی ڈاکٹر سے تیرے لیے دوائیں لکھوا کر بازار سے خرید کرلاؤں؟'' ولی نے اسے پیشکش کی تو وہ کچھ گھبرا سا گیا۔

''نہیں نہیں... کسی ڈاکٹر کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل کاغذ قلم لے کر آنا... میں خود لکھ دوں گا دوائیوں کے نام۔''

بوڑھے نے جلدی سے کہا تو ولی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پُرخیال نظروں... سے اسے دیکھتا رہا پھر اچانک ہی بولا۔

''جب تم یہاں چھپے ہوئے ہی ہو تو یہ فضول ڈاڑھی اور بال لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور ہاں، یہ کپڑے کب سے ہو گئے تم؟''

بوڑھے نے جواب دینے کے بجائے لمبی سفید ڈاڑھی اور بال چہرے سے ہٹا کر اسے پکڑوائے اور پھر پیچھے کی طرف ہاتھ لے جا کر کپڑے کی ایک پوٹلی سی نکال کر نیچے ڈال دی...

ولی کے سامنے ایک معمولی شکل و صورت اور سرخ آنکھوں والا پکی عمر کا آدمی بیٹھا ہوا تھا اور یہ چہرہ اسی شیر شاہ کا تھا جو وہ اخباروں اور ٹی وی پر دیکھتا رہا تھا... اس کے ہیرو کا چہرہ!

وہ اسے دیکھ کر مسکرایا پھر ہنس پڑا۔

اگلے دن وہ روشنی پھیلنے سے پہلے ہی بے دار ہو گیا۔ اس کی بہن باورچی خانے میں اس کے لیے ناشتا تیار کر رہی تھی۔ صرف وہ تھا جو صبح صبح چلا جاتا تھا، باقی سب تو اطمینان سے نماز فجر اور تلاوت کے بعد ناشتا کرتے تھے۔ اس لیے شیر بانو سب سے پہلے ناشتا بنا کر اسے دے دیتی کہ وہ گھر سے بھوکا نہ جائے۔

اس دن بھی وہ منہ پر دو چار چھپاکے مار کر باورچی خانے میں پہنچ گیا۔

''آجا ولی! تیرا ناشتا تیار ہے... بیٹھ جا... کھالے۔'' اس کی بہن نے چھوٹی سی پیڑھی سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں... ناشتا کرنے میں دیر ہو جائے گی۔ گل چاچا ڈانٹے گا۔ تو اس طرح کر... میرا ناشتا لپیٹ کر مجھے دے دے... میں وہاں جا کر کھالوں گا۔'' ولی نے کھڑے کھڑے کہا تو اس کی بہن نے دو موٹی موٹی روٹیاں اور تھوڑا سا دہی ایک تھیلی میں ڈال کر اسے پکڑا دیا۔

''دہی میں چینی ڈال دی ہے میں نے۔'' اس کی بہن نے آہستہ سے کہہ کر تھیلی اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

''اوہو... آج اتنی عیاشی... بابا کو پتا چلا تو تیری چائے میں بھی چینی بند ہو جائے گی۔'' ولی نے بھی اسی آہستگی سے کہا تو دونوں بہن بھائی مل کر ہنس پڑے اور وہ ہاتھ ہلاتا ہوا پھر ولی دروازے سے باہر نکل گیا۔

وہ باہر نکلا تو روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ بستی کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں بے ترتیبی سے بنے ہوئے کچے مٹی کے مکانات کے بوسیدہ سے دروازے بند تھے۔ اس کچی بستی میں ابھی زندگی سو رہی تھی۔ اس میں ولی کے خاندان کی طرح بیشتر وہی خاندان آباد تھے جو ملک کے شمالی علاقوں سے غیر یقینی حالات کے سبب اپنے گھر بار چھوڑ کر یہاں آباد ہو گئے تھے اور چھوٹے موٹے کام، محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے خاندان کے جینے کا سامان کر رہے تھے۔ ولی کے ماں باپ بھی اس کی پیدائش سے پہلے یہاں آ کر بس گئے تھے۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا بستی کی کچی گلیوں سے گزر کر جلد ہی اس پتھریلے راستے پر آگیا جو بستی کے باہر کیکروں کے جھنڈ کے سامنے سے گزرتا... گل چاچا کے ہوٹل کے سامنے سے ہوتا ہوا... بڑی سڑک والے پل تک جاتا تھا۔

اس کی ٹائر سے بنی بھاری پشاوری چپل کے نیچے آنے والے سنگ ریزے اس کی تیز قدمی کے سبب اچھل اچھل کر بہ آواز بلند احتجاج کر رہے تھے مگر وہ اڑا چلا جا رہا تھا۔

کیکروں کے جھنڈ میں اس مخصوص جگہ تک پہنچ کر وہ کئی بار اسے پکار چکا تھا۔

''شیر شاہ!... شیر شاہ! کدھر چھپے ہو تم؟ جلدی آؤ... میں ناشتا لایا ہوں۔ اوئے کدھر چھپے ہو تم... جلدی آجاؤ... ورنہ مجھے دیر ہو جائے گی۔ گل چاچا سے مار کھانی پڑے گی۔'' اس نے خاموش ہو کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر آواز لگائی۔

''ارے بابا آجاؤ! اتنا ڈرتا کیوں ہے تم... میرے ساتھ یا میرے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے... میں اکیلا ہی آیا ہوں۔'' اس نے پھر متوقع نظروں سے اس مخصوص جگہ پر جھانکا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

''تم کدھر ہے یار! شیر شاہ! شیر شاہ!'' اس کے بار بار آواز دینے پر بھی جب اسے کوئی نظر نہیں آیا تو اس نے جھنڈ میں گھسنے کا فیصلہ کیا۔ کل اسے ہلکا بخار تھا اور ولی کے ذہن میں یہ تھا کہ کہیں اس کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔

کیکر کی کانٹوں دار جھاڑیوں میں گھسنا اتنا آسان نہیں تھا لیکن وہ شیر شاہ کی خاطر گھس گیا۔ اندر گیا تو بائیں جانب کچھ شاخیں کاٹ کر راستہ سا بنایا گیا تھا۔ وہ ادھر مڑا تو پھر دائیں جانب ایسی ہی گزرگاہ سی دکھائی دی۔ وہ بے خوف آگے بڑھتا گیا۔

پھر اسے وہ نظر آ گیا۔ تھوڑی سی جگہ سے کیکروں کی جھاڑیاں کاٹ کر ایک صاف ستھری سی جگہ بنائی گئی تھی۔ بھربھری مٹی پر کوئی پرانی بوری بچھی ہوئی تھی اور اس پر وہ اپنی پرانی سی گرم چادر اوڑھے سکڑا ہوا سا لیٹا تھا۔ اس کی زخمی ٹانگ ایک پتھر پر ٹکی ہوئی تھی۔ سانولے چہرے پر سرخی اور تمتماہٹ تھی اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور اس کی ظاہری حالت سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ حال سے بے حال ہے۔

ولی لپک کر اس کے پاس پہنچا اور اس کا گال تھپتھپا کر اسے آوازیں دیں۔ کئی مرتبہ کی کوشش سے شیر شاہ نے آنکھیں کھولیں۔

''شیر شاہ! اٹھو... ہمت کرو... میں تمہارے لیے کھانا لایا ہوں، وہ کھاؤ اور... کاغذ قلم بھی لے کر آیا ہوں۔ مجھے اس پر دوائیوں کے نام لکھ دو، میں دوپہر کو لا کر دوں گا۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ اٹھو... شاباش...'' ولی نے بڑی مشکلوں سے اسے اٹھا کر بٹھایا۔ سامنے درخت کی جڑ میں پرانی سی پانی کی بوتل میں کچھ پانی تھا۔ وہ اور کھانا اس کے سامنے رکھا... پھر جیب سے ایک کاغذ اور قلم نکال کر اسے دیا۔

''پہلے اس پر دوائیوں کے نام لکھ دو... مجھے دیر ہو رہی ہے... پھر کھانا کھا لینا... دوائیاں میں دوپہر کو لا کر دوں گا۔''

شیر شاہ کے ہاتھ بخار کی شدت کے سبب لرز رہے تھے تاہم اس نے کوشش کر کے ضروری چیزوں اور دواؤں کے نام لکھ دیے۔

''لیکن میرے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔ میں یہ خریدوں گا کیسے؟'' ولی نے پریشانی سے چھ سات نام کاغذ پر دیکھتے ہوئے کہا تو شیر شاہ نے واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ سو روپے کا ایک نوٹ اس کو دے دیا۔ ولی چلا گیا۔

☆☆☆

کھڑکی پر ہونے والی بہت ہلکی سی دستک نے اسے چونکا دیا۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی جسے کبھی چوکیدار کی سیٹی یا پھر کسی آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز توڑ دیتی... اور پھر وہی خاموشی چھا جاتی۔

آج سردی بھی کچھ زیادہ تھی۔ وہ اپنے بستر میں نرم گرم لحاف میں لپٹی... بڑی دیر سے سونے کی کوشش کر رہی تھی لیکن نیند اس سے روٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت بھی وہ آنکھیں بند کیے اپنے خیالات کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی کہ وہ ہلکی سی دستک اسے چونکا گئی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پوری طرح کھل گئیں اور وہ سوچنے لگی کہ یہ کہیں اس کا وہم تو نہیں۔ ورنہ پچھلی گندی اور تنگ گلی میں کھلنے والی اس کھڑکی پر دستک دینے کون آئے گا؟

وہ اسی کشمکش میں تھی کہ دستک دوبارہ سنائی دی۔ اس نے لحاف ایک جھٹکے سے ہٹایا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دل سینے میں بڑی زور سے دھڑکا اور وہ کچھ خوف زدہ سی ہو گئی۔

گئی رات کے اس پہر... کون ہے جو اس کھڑکی پر دستک دے رہا ہے... شاید شیر شاہ!

ذہن میں یہ نام آتے ہی تلخی سی اس کے حلق میں پھیل گئی۔ ناگواری کے جذبات اس کے ذہن کو بوجھل کرنے لگے۔

''یہ منحوس اب تک زندہ ہے؟'' وہ چڑچڑے پن سے بڑبڑائی۔

''پولیس کے دعوے کے مطابق تو وہ بری طرح زخمی ہوا تھا اور ان کے خیال کی رو سے اب تک اسے مر جانا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کتنے کوے اور گدھ کھائے ہیں اس نے کہ یہ پھر بھی زندہ ہے... لعنت ہے۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔ دستک پھر سنائی دی اور اس مرتبہ کچھ بلند تھی اس لیے اسے اٹھنا پڑا۔ وہ انتہائی بےزاری سے کھڑکی کی طرف بڑھی اور آہستگی سے اس کی چٹخنی گراتے ہوئے کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا۔ باہر چٹکتی چاندنی کے نور کا ایک ریلا سا اس کے اندھیرے کمرے میں در آیا۔ حسب توقع طور پر ایک مکروہ چہرہ دیکھنے کے لیے نظر اٹھائی تو وہ لمحہ اس کی نظروں میں ٹھہر گیا۔

ذہن میں پٹاخے اور پھلجھڑیاں سی چھوٹیں اور وہ لپک کر آگے بڑھی۔ کھڑکی میں لگی سلاخوں کے اس پار... پورے چاند کی تیز روشنی میں اسے وہ چہرہ نظر آیا جس کی بعید ترین توقع بھی محال تھی۔ دونوں ہاتھوں سے سلاخیں تھامتے ہوئے اس نے اسے قریب سے دیکھا اور سرگوشی میں ایک نام اس کے لبوں پر تھرتھرایا۔

شاہ زیب!

ہاں... وہی تھا وہ... دراز قد، خوب صورت اور پروقار! اس کے بھورے بال ویسے ہی اس کے شانوں پر پھیلے، کھلتی ہوئی چاندنی میں سونے کی طرح دمک رہے تھے... بھوری آنکھیں اس کی جانب نگراں تھیں جن میں طویل عرصے کی پیاس جھانک رہی تھی۔

کھڑکی میں ماہ نور کا چہرہ طلوع ہوتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک بھرپور اور آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

مجھے یقین نہیں آتا... شاید میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں... شاہ زیب یہاں کیسے آسکتا ہے؟ وہ تو دو سال پہلے سرحد کے اس پار رہ گیا تھا... اور بہ قول شیر شاہ کے... اس نے خود شاہ زیب کو گولی مار کر کھائی میں پھینکا تھا۔

www.pkdigest.com

"تو پھر یہ کون ہے؟ کیا شاہ زیب کی روح ہے یا میرا واہمہ؟" وہ ناقابلِ یقین انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بڑبڑائی تو باہر کھڑے ہوئے شخص کے ہونٹوں پر مچلنے والی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

"میں واہمہ نہیں حقیقت ہوں... اور تمہاری تلاش میں صدیوں کا سفر طے کرکے یہاں تک پہنچا ہوں۔ میں تمہیں اپنے پاؤں کے چھالے ضرور دکھاتا لیکن کیا بتاؤں کہ تمہیں دیکھ کر میرے سارے زخموں کا اندمال ہوگیا ہے۔ مجھے شدت سے تڑپانے والی پیاس کی تسکین ہوگئی ہے۔ مجھے ننگے پاؤں... جلتے سورج کے نیچے... تپتے صحرا کے سفر کے بعد... تمہارے وجود کے نخلستان نے ساری تکلیفیں بھلادی ہیں۔ آج میری جنم جنم کی تلاش کو منزل مل گئی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں ماہ نور کہ میں کتنے کٹھن سفر کاٹ کر تم تک پہنچا ہوں۔"

اس کی آواز... اس کا ہمیشہ کی طرح دلکش اندازِ گفتگو... اس کی خوب صورت باتیں سن کر... دل کے اندر کہیں سے نالہ و فریاد کا ایک طوفان اٹھا اور وہ بلک کر رو پڑی۔

اس نے بے تابی سے اپنے ہاتھ کھڑکی کی سلاخوں سے باہر نکالے۔ شاید وہ اسے چھو کر یقین کرنا چاہتی تھی کہ واقعی وہ اس کے سامنے موجود ہے... اپنے وجود کی ساری حقیقتوں کے ساتھ! یہ دیکھ کر وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"بس ماہ نور! آنسوؤں کو روک لو... بے شک تمہارے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے لیکن اب میں آگیا ہوں نا... اب تمہیں اس ظالم کے چنگل سے چھڑانا ہی میری زندگی کا مقصد ہے... دیکھنا، ایک دن زندگی کی راہوں پر... تم ہی میری ہم قدم ہوگی۔"

"نہیں شاہ زیب! یہ میرے مقدر میں ہی نہیں ہے۔ بہت سیاہ بخت ہوں میں... اور میں نہیں چاہتی کہ میرے بخت کی سیاہی میرے ماں باپ اور بھائیوں کی طرح تمہیں بھی چاٹ جائے... اس لیے تم یہاں سے چلے جاؤ۔ بھولے سے بھی اس شیطان کے سامنے مت آنا۔ بہت ظالم ہے وہ... اتنا ظالم کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ایک بار تو وہ تمہیں مارنے کی کوشش کرچکا ہے۔ قدرت نے تمہیں زندگی بخش دی لیکن اب اگر تم اس کے ہتھے چڑھے تو وہ تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گا۔ تم... تم واپس چلے جاؤ۔ اس سے پہلے کہ اسے تمہارے آنے کی خبر ہوجائے... تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

وہ بہتے آنسوؤں کو ہتھیلی سے پونچھ رہی تھی اور پوری کوشش کررہی تھی کہ کسی طرح شاہ زیب کو واپس جانے پر مجبور کردے۔

"میں یہاں تک صرف تمہارے لیے آیا ہوں۔ مجھے واپس جانا تو ہے... لیکن تمہیں لیے بغیر نہیں جاسکتا۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔" اس نے زور دے کر کہا تو ماہ نور اور بے چین ہوگئی۔

"کیا تم اس کی بدخصلتی سے واقف نہیں ہو؟ کس طرح وہ مجھے تمہارے ہاتھوں سے زبردستی چھین کر لے آیا تھا... اور تم میرے پیچھے نہ آسکو... تو اس نے اپنی دانست میں تمہیں قتل کرہی ڈالا تھا... بس زندگی تھی جو بچ گئے... ورنہ..."

وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

"ماہ نور! ہمت کرو... اس طرح رونے سے زندگی سنورنے والی نہیں ہے۔ میں بڑے جوکھم اٹھا کر تمہیں لینے آیا ہوں... میرے ساتھ چلو۔" شاہ زیب نے اس کا ہاتھ ہولے ہولے تھپکتے ہوئے کہا۔

"یہ ممکن نہیں ہے شاہ زیب! میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی۔ وہ خود تو کہیں مفرور ہے لیکن اس کے آدمی ہر وقت میری نگرانی کرتے ہیں۔ مجھے تو اس گھر سے نکلنے کی بھی اجازت نہیں... مجھے میری ضرورت کی تمام چیزیں اس کے آدمی گھر پر پہنچا دیتے ہیں... بغیر کچھ کہے ہوئے... کبھی اس کے پیغامات بھی آتے ہیں... اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں بھی ہو... کسی بھی حال میں ہو... مجھ سے بے خبر نہیں رہتا۔

"مجھے ڈر ہے... تمہاری یہاں موجودگی زیادہ دیر راز نہیں رہ سکے گی۔ وہ خود نہ بھی آسکا تو اپنے آدمیوں سے تمہیں قتل کروا دے گا۔" اس نے سسکتے ہوئے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی اور پھر گویا ہوئی۔

"تم یہاں سے چلے جاؤ شاہ زیب! پلیز... مجھے تمہاری زندگی بہت عزیز ہے۔ میں چاہتی ہوں، تم زندہ رہو... ایک خوش گوار زندگی گزارو... اور مجھے ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ... بھول جاؤ... کہ ماہ نور نام کی کوئی بدنصیب لڑکی کبھی تمہاری زندگی میں تھی۔" یہ کہتے کہتے وہ بلک بلک کر رو پڑی اور اپنی پیشانی کھڑکی کی ٹھنڈی سلاخوں پر دے ماری۔

شاہ زیب نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر کیا۔ انگلی سے آنسو پونچھے۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور بھاری آواز میں بولا۔

"یہ ناممکن ہے ماہ نور! اگر میں تمہیں بھول سکتا تو اپنی زندگی داؤ پر لگا کر یہاں تک کیوں آتا؟ میں صرف تمہارے لیے آیا ہوں اور تمہیں لے کر ہی جاؤں گا۔ بس تم ہمت کرو... میرا انتظار کرو... میں پھر آؤں گا۔"

شاہ زیب نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے

گال تھپک کر تسلی دینے کی کوشش کی۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اپنی گرم چادر کو اچھی طرح لپیٹا اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر رخصت ہوگیا۔

ماہ نور کھڑکی کی سلاخوں پر سر رکھے اسے جاتا دیکھتی رہی... یہاں تک کہ وہ موڑ مڑ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

☆☆☆

آج جمعہ تھا اور وہ جلدی جلدی کام نمٹا رہا تھا کیونکہ گل چاچا جمعے کے دن اذان سے آدھا گھنٹا پہلے ہوٹل بند کردیتا تھا اور پھر تین بجے ہوٹل کھلتا تھا۔ اس وقفے میں سب کو چھٹی مل جاتی تھی تاکہ سب نمازِ جمعہ کا اہتمام کرسکیں۔

جیسے ہی ساڑھے بارہ بجے، گل چاچا نے تیز آواز میں بجنے والا ٹیپ ریکارڈر بند کیا اور سب کو کام سمیٹ کر باہر جانے کا آرڈر دے دیا۔ ولی نے بھی جلدی سے ہاتھ میں پکڑے چائے کے برتن سنک کے پاس رکھے... کاندھے پر رکھا رومال جھٹک کر گلے میں ڈالا اور ٹوپی سر پر جماتا ہوا ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ لیکن آج اس کا رخ گھر کی طرف ہونے کے بجائے بڑی سڑک کی طرف تھا۔ وہاں تھوڑی دور جاکر کئی دکانیں تھیں۔ انہی میں ایک میڈیکل اسٹور بھی تھا۔ اس نے جیب میں ٹٹول کر کاغذ کے اس پرزے کی موجودگی کو محسوس کیا اور تیز قدموں سے دور نظر آنے والی بڑی سڑک کی جانب روانہ ہوگیا۔ دوائیں خریدنے کے بعد واپسی میں آدھے گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔ کیکروں کے جھنڈ کی طرف آتے ہی اس نے ایک بار پھر آواز دی۔

"شیر شاہ!" مگر وہ باہر نہیں آیا تو وہ لپک کر خود ہی جھنڈ میں داخل ہوگیا۔ وہاں وہی صبح والی صورتِ حال تھی۔ شیر شاہ تیز بخار میں مبتلا نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔

"شیر شاہ! شیر شاہ اٹھو... اٹھو یار! میں تمہاری دوائیاں لایا ہوں۔" اس نے شیر شاہ کے تپتے ہوئے بدن کو جھنجھوڑا تو اس نے بہ مشکل اپنی آنکھیں کھولیں۔

"اٹھو... اٹھ کر بیٹھو... دوائی کھالو... یہ دیکھو، میں دوائی کے ساتھ ڈبل روٹی اور پانی کی بوتل بھی لے آیا ہوں اور یہ دودھ کا ڈبا بھی۔" ولی نے سب چیزیں شاپر کا منہ کھول کر اسے دکھائیں پھر اسے بہ مشکل اٹھا کر بٹھایا۔

"یہ دوائیاں دیکھ تو... سب ٹھیک ہیں نا؟ اگر ٹھیک نہیں ہیں تو مجھے بتا دو... پر جلدی... مجھے جمعہ پڑھنے جانا ہے۔" ولی نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔

"جلدی... جلدی... کیوں...؟" شیر شاہ بخار کی شدت سے بے حال تھا۔

"جمعہ پڑھنے جانا ہے... مسجد میں بابا کو اگر میں نظر آیا تو ٹھیک... نہیں تو وہ... مار مار کر میری کھال اتار کر کیل پر ٹانگ دے گا۔" ولی بولتا ہوا اٹھا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ اب وہ مسجد کی طرف دوڑ لگا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بہت کچھ معاف ہوسکتا ہے پر جمعہ چھوڑنا ناقابلِ معافی ہوگا... بابا ہڈیاں توڑ ڈالے گا۔

اب ولی کا کام کچھ بڑھ گیا تھا۔ ہوٹل کی نوکری کے ساتھ ساتھ اسے شیر شاہ کی خبر گیری بھی کرنا پڑ رہی تھی... اور وہ بھی ہزار احتیاطوں کے ساتھ... کہ اس کی کسی غلطی سے کسی کو اس کے بارے میں پتا نہ چل جائے کہ مفرور شیر شاہ کیکروں کے اس جھنڈ میں روپوش ہے۔

ولی اس کی خبر گیری کرتا رہا۔ کھانا، پانی اور دوائیں وہ اسے پابندی سے لاکر دیتا رہا۔

کبھی کبھی وہ تھوڑی دیر رک کر اس کے پاس بیٹھ بھی جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے درمیان وہ شیر شاہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کرتا۔

شیر شاہ کی حالت آہستہ آہستہ سنبھلتی جارہی تھی۔ زخموں کے بڑھتے ہوئے انفیکشن پر اس نے ہائی ڈوز اینٹی بایوٹک دواؤں کے ذریعے خاصی حد تک قابو پالیا تھا... اس لیے بخار بھی ختم ہوگیا تھا... اب وہ نہ صرف خود اٹھ کر بیٹھ جاتا بلکہ کھڑے ہوکر ولی کے سہارے سے چند قدم چل بھی لیتا تھا۔

ولی جیسا باتونی لڑکا اس کو بھی بولنے پر مجبور کردیتا تھا۔ اس کی ساری دلچسپی کا محور وہ داستانیں تھیں جس میں زبردست لڑائی بھڑائی... قتل و خوں ریزی اور ہتھیاروں کے چابک دستی سے استعمال کا ذکر ہوتا تھا۔

شیر شاہ نے صاف محسوس کرلیا تھا کہ لڑکا اس قسم کی داستانیں سنتے ہوئے غیر معمولی دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ باتوں باتوں میں ہتھیاروں کے استعمال کے بارے میں طرح طرح کے سوال کرتا اور شیر شاہ کی مہارت کے بیان پر اسے کھلے الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتا... اس کے اندر کے پرجوش لڑکے کی چھپی ہوئی شخصیت کو ظاہر کرتا تھا۔

وہ بھی اس کی دلچسپی کے پیشِ نظر کبھی اس کے ہاتھ میں اپنی جدید انداز کی گن پکڑا دیتا۔ کبھی پستول کھیلنے کو دے دیتا... اور کبھی چاقو کی شکل دکھا کر اس کی ہلاکت خیز کارکردگی کے بارے میں بتاتا... تو ولی کے جوش و جذبات دیدنی ہوتے۔

آخر ایک دن اس نے کہہ ہی دیا۔

"شیر شاہ! کیا تم مجھے اپنے جیسا بنا سکتے ہو؟" شیر شاہ

www.pkdigest.com

نے چونک کر اسے دیکھا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سکیڑ کر پُرخیال انداز میں اسے گھورتا رہا۔

''کیا بات ہے؟ کیا میں نے کوئی بہت مشکل کام کا کہہ دیا... جو تم چپ ہو کر مجھے گھورے جا رہے ہو۔'' ولی نے اس کے سپاٹ سے طرزِ عمل پر جھنجلا کر کہا۔ وہ توقع کر رہا تھا کہ جس طرح اس وقت شیر شاہ مشکل حالات میں تنہا یہاں چھپ کر رہ رہا ہے... اس کے سارے ساتھیوں سے رابطے ٹوٹ چکے ہیں... وہ زخمی اور بیمار ہے... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اتنے مشکل وقت میں صرف وہ تھا جو اس کے کام آیا تھا، اس کی جان بچانے کا سبب بنا تھا... ایسے میں تو ولی کی یہ فرمائش پوری کرنے کے لیے اسے دل و جان سے حاضر ہونے کی ہامی بھر لینا چاہیے تھی لیکن اس کا اس قدر ٹھنڈا رویہ ولی کے لیے کچھ تکلیف کا سبب بنا تھا۔

''نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' شیر شاہ ٹھنڈی سانس لے کر گویا ہوا۔

''میں دو چار دن میں ایسا نہیں بن گیا ہوں... ایک عمر گزر گئی ہے خطروں سے لڑتے ہوئے۔ دور سے دیکھتے ہوئے تمہیں میری زندگی کسی انگریزی فلموں کے ہیرو جیسی لگتی ہوگی لیکن مجھ سے پوچھو کہ جب کوئی ناانصافی روح پر زخم ڈالتی ہے تو اندر کیسی آگ لگتی ہے اور پھر کیا کچھ خون کے ساتھ جل کر کن عذابوں سے گزارتی ہے... اس کے بارے میں تو تم سوچ بھی نہیں سکتے... اس آگ میں کیا کیا جلتا ہے... جانتے ہو؟ سب سے پہلے اپنا گھر اور گھر والے... پھر اپنی ذات کی عزت اور شرافت... کردار و اخلاق... یہاں تک کہ انسانیت بھی... اگر کچھ باقی رہتا ہے تو صرف انتقام... میں نے یہ سب کھویا ہے... کھو چکا ہوں یہ سب... بس اب تو اس ڈھلوانی راستے پر بگٹٹ دوڑ رہا ہوں جو تباہی کے آخری کنارے... یعنی ذلت کی موت کی طرف لے جاتا ہے۔''

شیر شاہ کے منہ سے یہ ساری باتیں سن کر ولی کچھ حیران ہوا۔ وہ تو اسے سخت چٹان سمجھا تھا لیکن یہ چٹان اندر سے کچھ پلپلی سی کیوں ہے؟ یا اسے کچھ ایسا ہی لگا۔

''تو اگر تم کو یہ راستہ پسند نہیں ہے تو پلٹ جاؤ... واپس چلے جاؤ ادھر ہی... جدھر سے تم یہ غلط راستہ مڑے تھے۔'' اس نے ایک منطقی انداز اور سپاٹ سے لہجے میں کہا تو شیر شاہ کو فوراً اس کی ناپسندیدگی کا احساس ہو گیا۔ اس نے غور سے ولی کے کچھ پھولے ہوئے منہ کی طرف دیکھا اور ہنس پڑا۔

''اوئے خدائی خوار! یہ وہ راستہ ہے جس پر دو چار قدم بڑھاتے ہی واپسی کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ بندے کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ وہ آگے ہی آگے بڑھتا جائے۔ خیر... جانے دے... یہ دو تین دوائیاں ختم ہو گئی ہیں اور لانی ہیں۔'' شیر شاہ نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو ولی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''کیا ہوا؟ کیا بات ہے... ناراض ہے کیا؟'' شیر شاہ نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کس بات پر؟'' شیر شاہ نے پھر پوچھا۔

''تمہارا کتنا برا حال تھا... میں نے تمہارا کتنا خیال رکھا... تمہاری ساری ضرورتیں پوری کرنے کی کوششیں کیں... اور تم سے میں نے چھوٹی سی بات کی تو تم لمبا لیکچر دینے بیٹھ گئے۔'' ولی نے ناراض لہجے میں کہا۔

''چھوٹی سی بات... یہ چھوٹی سی بات ہے؟ بے وقوف! عمر لگ جاتی ہے ساری اس برائی کو اپنے اوپر لادنے میں... ایک بار اس دلدل میں اتر جاؤ تو واپسی نہیں ہوتی... سمجھ میں آئی بات۔'' اس نے پھر سمجھایا۔

''تو... واپسی کی ضرورت کیا ہے؟ جو راستہ انسان کو پسند ہو وہ اسے اختیار کرے اور آگے سے آگے بڑھتا چلا جائے... واپسی کا سوچے ہی کیوں؟'' ولی کے پاس اپنی منطق تھی۔

''اس راستے پر چلنے والے کا انجام شاید تم نہیں جانتے... میں بتاتا...'' شیر شاہ کہتے کہتے رکا تھا کہ ولی نے اس کی بات کاٹ دی۔

''جانتا ہوں... موت... موت ہے انجام... تو یہ بتاؤ کس انسان کا انجام موت نہیں ہے...؟ تمہارے جیسے شیر شاہ کا انجام موت... میرے بابا جیسے نیک اور متقی کا انجام موت... میرے اور مجھ جیسے بہت سے محروموں اور ناکاروں کا انجام بھی موت ہی ہے... جب سب کا یہی انجام ہے تو اس سے ڈرنا تو بے وقوفی ہے نا۔''

''لیکن اچھے لوگوں کی موت پر لوگ اس کا ماتم کرتے ہیں... اس کی محبت میں آنسو بہاتے ہیں... اس کی قبر پر فاتحہ پڑھتے ہیں... اسے ہمیشہ اچھے لفظوں سے یاد کرتے ہیں۔'' شیر شاہ نے اسے سمجھانے کی پھر کوشش کی۔

''یہ سب تو دوسرے کرتے ہیں... مرنے والا تو اپنی ساری خواہشیں، خوشیاں اور آرزوئیں دل میں لیے قبر میں سو جاتا ہے۔ ان سب باتوں سے اس کو کیا فائدہ... اس کی اپنی زندگی تو ترستے ہوئے اور اپنے آپ سے لڑتے ہوئے گزر گئی نا... اسے کیا ملا؟'' ولی کے پاس بحث کے لیے کافی کچھ تھا۔

''لیکن ایک آگے کی زندگی بھی ہے... ہمیشہ ہمیشہ کی...

دنیا میں بُرے کام کیے تو ہمیشہ جہنم میں جلنا پڑے گا۔'' شیر شاہ نے اسے ڈرایا۔

''جس نے اس دنیا کے جہنم میں زندگی کاٹ لی، اس کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا... یہاں وہاں... ایک سا ہے۔'' ولی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا تو شیر شاہ ہنس پڑا۔

''یار! تیری کھوپڑی میں جو دماغ ہے نا... وہ تیرے جسم کی عمر سے بہت بڑا ہے... تو نے شیر شاہ جیسے آدمی کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔'' شیر شاہ نے ہنستے ہوئے اس کے بالوں کو بگاڑا۔

''پھر... تم مجھے اپنے جیسا بناؤ گے؟'' ولی نے پُرامید لہجے میں پوچھا تو شیر شاہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ خوشی سے اچھلنے لگا۔

''لیکن ایک بات ہے... میں تمہارے کچھ امتحان لوں گا کہ تم میں میرا جیسا بننے کے لیے کتنی ہمت اور کتنی سمجھ بوجھ ہے۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو سمجھو شیر شاہ جونیئر بن جاؤ گے... اور اگر فیل ہو گئے تو میرا تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا... ٹھیک ہے؟'' شیر شاہ نے اسے صاف صاف بتا دیا۔

''ٹھیک ہے... ٹھیک ہے... منظور ہے... بولو کون سا امتحان دینا ہے؟'' ولی نے پُرشوق انداز میں کہا۔

''یہ لو... یہ میری گن ہے... اس کو کھولو... صفائی کرو اور پھر اسے دوبارہ جوڑو، میگزین ڈالو... پھر لوڈ کرو۔''

اور ولی بڑی خوشی سے امتحان کے لیے تیار ہو گیا۔

☆☆☆

گلی کا موڑ مڑتے ہی اسے وہ سفید دیواروں اور کالے لوہے کے دروازے والا چھوٹا سا مکان نظر آ گیا... اس نے باقی نشانیاں چیک کیں۔

گلی کے کونے پر اونچا سا گٹر کا ڈھکنا... دوسری جانب ٹاٹ کے چھپر کے نیچے پانی والے کی گاڑی کا گدھا بندھا ہوا... اور اس سے تھوڑا آگے چھوٹی سی پرچون کی دکان۔

''بالکل یہی ہے۔'' اس نے بولتے ہوئے آگے بڑھ کر لوہے کے دروازے پر دستک دی... پر اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد دوبارہ دستک دی۔

''کون ہے؟'' کسی عورت کی تھکی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

''میں ولی ہوں... شیر شاہ کا پیغام لے کر آیا ہوں... دروازہ کھولو۔'' ولی نے جواب دیا تو چند لمحوں کے بعد دروازہ کھل گیا اور اس وقت ولی کو یہ خیال آیا کہ چاند نہ تو مغرب سے طلوع ہوتا ہے اور نہ مشرق سے... بلکہ وہ تو اس چھوٹے سے کچے پکے مکان کے دروازے سے طلوع ہوتا ہے... اتنی ہی حسین تھی وہ لڑکی جو دروازے کی اوٹ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس کے چہرے اور گردن کی جلد اس قدر شفاف تھی کہ شیشے کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سیاہ آنکھوں میں جادو اور گالوں پر جھولتی بالوں کی لٹیں اس کے گلابی رخساروں کے چھلکتے رنگ کو اور بھی حسین بنا رہی تھیں۔ وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم کیا کہہ رہے تھے؟'' لڑکی نے اس کی محویت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

''تم ماہ نور ہو؟'' ولی نے گڑبڑا کر سوال کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شیر شاہ کا نام سن کر اس نے دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کا اشارہ کیا تو ولی اندر آ گیا۔ چھوٹا سا صحن عبور کر کے وہ ایک مختصر سے برآمدے میں سے گزر کر اس گھر کے واحد کمرے میں پہنچ گئے جو بیک وقت خواب گاہ اور نشست گاہ کا کام دیتا تھا۔ اس کی بغیر پلستر کی دیواروں پر چونا کیا ہوا تھا اور اس کی پچھلی دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو شاید پیچھے گندی گلی میں کھلتی تھی... کیونکہ اس میں سے آنے والی ہوا کے جھونکوں میں ولی کو ہلکی سی بدبو محسوس ہوتی تھی... اس پر ایک باریک سا پردہ پڑا ہوا تھا۔

ولی کو ایک لمحے کے لیے احساس ہوا کہ جیسے ہی اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا... کوئی وہاں سے ہٹا ہے۔ شاید کوئی موجود تھا۔

اس نے پلٹ کر ماہ نور کو دیکھا تو اسے اس کے چہرے پر کچھ گھبراہٹ کے سے آثار نظر آئے... جن پر اس نے بہت جلد قابو پا لیا اور وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''میں تمہارے لیے پانی لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔

ولی نے بیٹھتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک طرف بڑا سا پلنگ پڑا تھا جس پر شنیل کا بستر اور پائنتی پر ایک سرخ رنگ کا شنیل کا لحاف تہ کیا ہوا رکھا تھا۔ فرش پر خوب صورت قالین اور دروازے کی جانب قالین پر لمبی سی گدی اور اس پر گاؤ تکیے تھے جن میں سے ایک کے ساتھ ٹیک لگائے وہ بیٹھا ہوا تھا۔ دروازے کے قریب چھوٹی سی میز پر اسٹیل کی بڑی سی تھالی میں پھل رکھے ہوئے تھے۔

''ہم... تو گویا سب کچھ بہت اچھا چل رہا ہے۔ شیر شاہ مہینوں سے گھر نہیں آیا ہے... نہ اس نے کوئی پیسے بھیجے ہیں... لیکن لگتا ہے، اس کی بیوی کو کوئی کمی نہیں ہے۔''

وہ بڑبڑاتے ہوئے کھڑکی کو دیکھتا رہا... اور اسے اس وقت کا خیال آیا جب اسے کھڑکی کے پیچھے گلی میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا... اسے نفرت کا ناگوار سا احساس ہوا۔

اتنے میں ماہ نور شربت کا ایک بڑا گلاس لے کر اندر داخل ہوئی اور مسکراتے ہوئے اسے پیش کیا۔ ولی نے پھر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تو تھوڑی دیر پہلے اٹھنے والا نفرت کا تاثر دھندلا گیا اور اسے لڑکی کے چہرے پر حسن و خوب صورتی کا ایک انوکھا جہان نظر آنے لگا۔

''تم نے کہا کہ تمہیں شیر شاہ نے بھیجا ہے... میں کیسے مان لوں؟'' ماہ نور نے مسکرا کر کہا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

ولی کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا اور مٹھی اس کی طرف بڑھا دی۔ ماہ نور کی گلابی ہتھیلی پر سیاہ ڈوری میں بندھا... چاندی کا ایک تعویذ رکھا تھا۔

''ہاں! یہ شیر شاہ کا ہے... تمہیں کہاں سے ملا؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو گلابی ہونٹوں سے جھانکتے اس کے موتی جیسے دانت چمک کر اس کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگے۔

''او خدایا! مجھے اس جادوگرنی کے جادو سے بچانا'' اس نے دل ہی دل میں اپنے لیے دعا کی۔

''مجھے کہاں سے ملے گا... یہ مجھے اس نے خود دیا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ کہ شیر شاہ کی نشانی لے کر آنے والا اس کا پیامبر ہے۔''

''اچھا... تو تم اس کا کیا پیغام لے کر آئے ہو؟'' ماہ نور پھر مسکرائی۔

''اس نے کہا ہے کہ وہ بہت شدید زخمی ہے... اور پولیس اسے ڈھونڈ رہی ہے... اس لیے فی الحال وہ کہیں چھپا ہوا ہے... تمہیں پریشانی ہو گی اس لیے تھوڑا انتظار کرو... وہ آ جائے گا۔'' ولی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا جہاں اسے کسی قسم کی کوئی پریشانی نظر نہیں آ رہی تھی۔

''میرے لیے اس میں کیا پریشانی ہے... اس کے ساتھ تو ہمیشہ ہی ایسا ہوتا رہتا ہے... وہ مجرم، قاتل اور نہ جانے کیا کیا ہے... ہمیشہ بھاگتا رہتا ہے اور پولیس اس کے پیچھے بھاگتی رہتی ہے۔ یہی اس کی زندگی کا سب سے پسندیدہ کھیل رہا ہے... تو اس میں یہ سب تو ہوتا ہی ہے۔'' ماہ نور نے... بظاہر عام سے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا تھا لیکن کہیں نہ کہیں اس کی ''نہ'' میں تلخی کی جھلک بھی تھی۔

''وہ بہت زخمی اور بیمار بھی ہے۔'' ولی کو اپنے ہیرو کے بارے میں کہے جانے والے الفاظ کچھ اچھے نہیں لگے اور اس نے اس کی حالت بتاتے ہوئے غالباً اس کی بیوی سے ہمدردی کی توقع رکھی تھی۔

''وہ اکثر لڑائی جھگڑوں میں زخمی بھی ہو جاتا ہے... اور پھر کسی زخم کے خراب ہونے سے بیمار بھی... لیکن تھوڑے دن میں پھر ٹھیک ہو جاتا ہے... بہت مضبوط آدمی ہے وہ... تم فکر نہ کرو... اس دفعہ بھی ٹھیک ہو جائے گا... کچھ نہیں ہونے والا ہے اس کو۔'' ماہ نور نے بات ختم کی تو ولی اس کو گھور رہا تھا۔

''تم کیسی عورت ہو؟ تمہیں اپنے شوہر کے لیے ذرا بھی پریشانی نہیں ہے؟''

''ہاں... میں ایسی ہی عورت ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر زور سے ہنسی۔

''اچھا ٹھیک ہے... میں چلتا ہوں۔'' ولی نے چند بڑے بڑے گھونٹ لے کر شربت کا گلاس ختم کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہیں... تم میرے مہمان ہو... اتنی جلدی نہیں جا سکتے۔ میں نے تو تمہاری کوئی خاطر بھی نہیں کی ہے... ابھی نہیں... کچھ دیر بعد جانا... ابھی بیٹھو۔'' ماہ نور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ بیٹھتا چلا گیا۔ اس کے ہاتھ کے لمس نے اس کی مزاحمت کی قوت ختم کر دی۔

''تم بیٹھو... میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لاتی ہوں۔ شیر شاہ کے پیامبر کو میں نے بغیر کسی تواضع کے جانے دیا تو وہ ناراض ہو گا۔'' وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئی تو وہ بیٹھا سوچتا رہ گیا۔

''یہ کیا ہوا؟ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ...'' وہ ایک اَن جانی سی کشمکش میں مبتلا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر سر پکڑے بیٹھا رہا پھر ماہ نور کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا تو وہ دو پلیٹوں میں چاول لے کر آئی تھی... ایک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ لو، کھاؤ... آج میں نے پلاؤ بنایا ہے... جاتے ہوئے تھوڑا پلاؤ شیر شاہ کے لیے بھی دوں گی۔'' پھر وہ بھی بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھ کر کھانے لگی۔ ساتھ ساتھ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرتی رہی۔ ولی سے اس کے بارے میں پوچھتی رہی۔ ہنستی بولتی رہی۔ کھانا ختم ہوا تو اس نے پھلوں کا تھال اٹھا کر سامنے رکھ لیا اور پھل کاٹ کاٹ کر اسے بھی کھلاتی رہی اور خود بھی کھاتی رہی۔ کب کھانا ختم ہوا... پھل ختم ہوئے... چائے ختم ہوئی... اسے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ جب وہ برتن اٹھا کر باہر گئی تو اسے وقت کا خیال آیا۔

''اوہ میرے خدا! کتنی دیر ہو گئی۔ گل چاچا آج ضرور بابا سے شکایت کرے گا۔''

''اوئے عبدالرحمٰن! آج تیرا وہ خانہ خراب پھر غائب ہو گیا تھا کام پر سے... آج کا پیسا کٹ گیا اس کا۔''

جب بھی گل چاچا اس کی شکایت باپ سے کرتا تو اسے گھر پہنچ کر ضرور مار پڑتی تھی۔

''اوئے... بیڑا غرق... آج پھر شامت۔'' اس نے تیزی سے قدم بڑھائے تو ماہ نور اسی وقت ہاتھ میں پلاسٹک کا

www.pkdigest.com

شاپر لیے سامنے آگئی۔

”کیا ہوا... جارہے ہو؟ چلو ٹھیک ہے... یہ پلاؤ ہے... شیر شاہ کو دے دینا۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا اور ولی لپک کر جلدی جلدی بیرونی دروازے تک پہنچ کر باہر نکل گیا۔

”پھر آنا ضرور۔“ پیچھے سے اسے ماہ نور کی آواز سنائی دی تو اس نے قدموں کی رفتار اور تیز کر دی۔

☆☆☆

”تمہاری بیوی عمر میں تم سے بہت چھوٹی لگتی ہے۔ تم نے بہت دیر سے شادی کی ہے؟“ ولی نے سوال کیا تو وہ نوالہ منہ میں رکھتے رکھتے رک گیا۔

”ہاں... وہ عمر میں مجھ سے تقریباً پچیس سال چھوٹی ہے۔ میں اس سے پہلے دو شادیاں کر چکا ہوں... یہ میری تیسری بیوی ہے۔“ شیر شاہ نے نوالہ منہ میں رکھ لیا۔ وہ ماہ نور کا بھیجا ہوا پلاؤ بڑی رغبت سے کھا رہا تھا۔

”باقی دو بیویاں کہاں ہیں؟“ ولی نے پھر سوال کیا۔

”میری پہلی شادی تو ادھر ہمارے علاقے میں ہی ہوئی تھی۔ جب لوگوں کو پتا چلا کہ میں تو جرم کے راستے پر چلنے والا آدمی ہوں تو انہوں نے جرگہ بلایا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر جرگے نے میرے سارے کرتوتوں کا احوال سنا تو وہ مجھے بہت سخت سزا دیں گے... اس لیے میں ادھر سے بھاگ آیا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ میری بیوی کس حال میں ہوگی۔“ شیر شاہ نے انگلیاں چاٹتے ہوئے کہا۔

”اور دوسری بیوی؟“ ولی نے تجسس سے پوچھا۔

”ادھر آنے کے کچھ عرصے کے بعد ہی میں نے کپڑے کے ایک چھوٹے تاجر کی بیٹی سے دوسری شادی کی۔ اس سے دو بچے بھی ہیں۔ وہ ادھر سہراب گوٹھ پر رہتی ہے... کبھی کبھی جاتا ہوں اس کے پاس بھی۔“ شیر شاہ نے بتایا۔

”اور یہ تیسری بیوی؟“ ولی نے پوچھا تو شیر شاہ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ لہرائی۔

”ہاں... یہ بیوی... اس کی خوب صورتی مجھے بہت بھا گئی تھی۔ اس لیے میں نے اس سے شادی کر لی۔“

”یہ تمہیں کہاں ملی؟“ پتا نہیں کیوں ولی زیادہ سے زیادہ اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

”یہ... یہ ادھر پڑوسی ملک گیا تھا میں... اپنے کام کے لیے... آٹے کا ٹرک لے کر... ادھر ٹرک روک لیا گیا کیونکہ ہم غیر قانونی طور پر ادھر گئے تھے... جیسے ہی وہ لوگ پیچھے سامان چیک کرنے لگے میں اور میرا ساتھی لوڈر ٹرک سے کودے اور جدھر منہ اٹھا دوڑ پڑے۔ وہ دوسرا آدمی تو معلوم نہیں کدھر گیا، پر میں کئی گھنٹوں تک دوڑنے کے بعد ایک بستی میں پہنچ گیا۔ ٹوٹے پھوٹے مکان جلے ہوئے اور تباہی کا نشان نظر آرہے تھے لیکن کچھ ٹھیک حالت میں بھی نظر آئے۔ ٹمٹماتی روشنیاں زندگی کی علامت تھیں... یعنی وہاں کچھ لوگ تھے جو رہ رہے تھے۔

”میں بھوکا پیاسا... کئی گھنٹوں کا پیدل سفر طے کر کے وہاں پہنچا تھا۔ میری حالت بہت خراب تھی۔ میں بستی میں داخل ہو کر گر گیا۔ وہاں کے لوگوں نے مجھے اٹھایا اور میری مدد کی۔ کھلایا پلایا اور سونے کو جگہ دی۔

”وہیں میں نے ماہ نور کو دیکھا۔ اس سے پہلے میں نے زندگی میں کبھی اتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اس کا گھر، ماں باپ اور دو بھائی جنگ کا ایندھن بن چکے تھے اور وہ بے سہارا ہو کر اپنے منہ بولے چاچا کے گھر رہ رہی تھی۔ میں نے اس کے چاچا سے راہ و رسم بڑھائی۔ اپنی گٹھڑی اسے تحفے میں دی اور میٹھی میٹھی باتوں سے اسے شیشے میں اتار لیا۔

”’جب سے ماہ نور کا گھر اور خاندان تباہ ہوا ہے، تب سے میں نے اسے اپنے گھر رکھا ہوا ہے۔ اس کے کھانے پینے، اوڑھنے پہننے اور دوا دارو کا خرچہ میں ہی اٹھا رہا ہوں۔ اب اگر کوئی یہ خرچہ مجھے دے دیتا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے کہ وہ ماہ نور کو لے جائے۔‘

”بڈھے کی پلکوں کے نیچے اس کی چھوٹی آنکھوں میں مجھے حرص و لالچ صاف نظر آئی۔

”’اندازاً کتنا خرچہ ہوا ہوگا تمہارا؟‘ میں نے پوچھا۔

”’ہمارا کوئی... ایک لاکھ کا خرچہ ہوا ہوگا۔ جو ہم کو یہ خرچہ دے گا ہم ماہ نور کا ہاتھ اس کو پکڑا دے گا۔‘

”’اوئے خانہ خراب! کیا تم اس کو سونا کھلاتا تھا کھانے میں جو اتنا خرچہ بتا رہے ہو۔‘ میں نے اسے لتاڑا۔

”’اچھا... تمہارے خیال میں کتنا خرچہ ہوا ہوگا؟‘ بڈھے نے میری رائے پوچھی۔

”’زیادہ سے زیادہ پچیس ہزار۔‘

”’ٹھیک ہے... وہ دیوار کے سائے میں ایک بڈھی کو بیٹھا دیکھ رہے ہو... اس کا بھی گھر تباہ ہو چکا ہے۔ اکیلی رہ گئی ہے۔ اس کو بھی میں ہی کھلاتا پلاتا ہوں۔ اس پر میرا خرچہ اتنا ہی ہوا ہے جتنا تم نے بتایا ہے... چاہیے؟ لے جاؤ اسے۔‘ حریص بڈھا چالاک بھی بہت تھا۔

”’اچھا ٹھیک ہے... پچاس ہزار... اس سے آگے مت بولنا... ورنہ میں اپنا ارادہ ہی بدل دوں گا۔‘ میں نے اسے دھمکی دی۔

”’ٹھیک ہے... نکالو پیسا۔‘ بڈھے نے اسی وقت ہاتھ بڑھا دیا۔

”’کل... کل دوں گا پیسا... نکاح کا انتظام کرو... پیسا نکاح سے پہلے مل جائے گا۔‘ میں نے خوشی کی لہریں اپنے اندر دوڑتی محسوس کیں اور وہ اپنی پگڑی سنبھالتا ہوا اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے اپنی کمر کے گرد بندھی چمڑے کی پٹی کو چھو کر محسوس کیا جس میں میرے بہت سے پیسے محفوظ تھے اور مطمئن ہو کر سو گیا۔

”صبح کچھ لوگوں کے لڑنے جھگڑنے کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ میں جس کھنڈر ہوئے مکان کے بوسیدہ سے کمرے میں پڑا ہوا تھا، اس کی جھڑی ہوئی اینٹوں کے روزن سے مجھے باہر کا منظر نظر آیا۔ ماہ نور کے چاچا اور ایک جوان العمر آدمی کے درمیان کچھ جھگڑا ہو رہا تھا اور کچھ لوگ آس پاس کھڑے ان کی اس لڑائی کو دیکھ رہے تھے۔

”میں ان کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں کے درمیان وجۂ تنازع ماہ نور کی ذات ہے۔ نوجوان کا دعویٰ تھا کہ ماہ نور اس کی منگیتر ہے۔ بچپن سے ان کی منگنی طے تھی۔ اس لیے اس کی شادی کسی اور سے نہیں ہو سکتی اور چاچا عبدالرحیم کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ماہ نور کا ہاتھ کسی کے بھی ہاتھ میں تھما دے۔

”’تو ٹھیک ہے... اس کے بے سہارا ہونے کے بعد اس کی ساری ذمے داری ہم نے اٹھائی ہے... اس وقت تم کہاں تھے؟ اگر ماہ نور چاہیے تو اس پر میرا جو خرچہ ہوا ہے وہ مجھے دے دو اور اسے لے جاؤ۔‘ عبدالرحیم نے غصے سے جواب دیا تو نوجوان اور بھڑک اٹھا۔

”’او کوئی خوفِ خدا کرو... چند مہینوں میں تم نے اسے ایسا کیا کھلا پلا دیا جس کا خرچہ ایک لاکھ روپے ہو گیا؟ تم ماہ نور کی شادی میرے ساتھ کرو اور نہ صرف تم بلکہ تمہاری بیوی بھی میرے گھر کھائے پیے... اتنے ہی دن جتنے دن تم نے ماہ نور کو اپنے پاس سے کھلایا پلایا ہے۔‘

”’ہم نہیں مانتا اس بات کو... ام کو پیسا ملے گا تو ہم ماہ نور کی شادی کریں گے... اور جس سے پیسا ملے گا اس سے شادی کریں گے... تم کو ماہ نور چاہیے تو پیسا لے آؤ... نہیں تو بھاگ جاؤ۔‘

”عبدالرحیم نے حتمی لہجے میں کہا تو نوجوان کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو گیا۔

”’تم پیسے کی لالچ میں دو زندگیاں تباہ کرنا چاہتے ہو... میں جرگہ بلاتا ہوں۔ اس سے فیصلہ کرواؤں گا۔ میری منگیتر کو تم بیچ نہیں سکتے۔ میرا حق مار نہیں سکتے۔‘ وہ زور سے چلا چلا کر بول رہا تھا۔

”’جاؤ جاؤ... تمہارا بک بک سننے کا ٹائم نہیں ہے ہمارے پاس۔‘ عبدالرحیم اپنی پگڑی سنبھالتا ہوا واپس مڑ کر اپنے گھر میں چلا گیا اور وہ نوجوان پاؤں پٹختا ہوا بستی سے باہر کی طرف چلا گیا۔

میں تھوڑی دیر بعد اٹھ کر اس کے پیچھے گیا۔ وہ بستی سے کافی دور آگے ہی آگے چلتا جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا پھر ایک جگہ رک کر وہ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ وہ وہاں سر پکڑے بیٹھا تھا کہ میں پہنچ گیا۔

”’بہت پریشان ہو... کیا بات ہے؟‘ میں نے کہا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔

”’تم اپنی خباثت لے کر یہاں کیوں آگئے... تمہیں شرم نہیں آئی... اپنے پیسے کے بل بوتے پر تم میری منگیتر کو مجھ سے چھیننا چاہتے ہو... اپنی منحوس شکل لے کر اس بستی سے دفعان ہو جاؤ... ورنہ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔‘

”وہ ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے بہت اطمینان سے اپنے آپ کو بچایا اور پستول نکال کر اس پر فائر کر دیا۔ اس کے سینے پر یا شاید پیٹ پر کہیں گولی لگی اور وہ اچھل کر گرا تو ڈھلان سے لڑھکتا ہوا کھائی میں جا گرا۔

”بس... پھر میں نے ماہ نور سے نکاح کیا اور اسے لے کر یہاں آگیا۔ یہاں میں نے اس کو الگ گھر بنا کر دیا ہے۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا ہوں۔ میں ادھر ہوں یا نہ ہوں... پر اس کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتا۔“

شیر شاہ کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ولی کو جذبوں کی جھلک نظر آئی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے ماہ نور کے گھر میں جن منفی خیالات کو محسوس کیا تھا انہیں دل میں ہی رہنے دیا۔ اس کا بالکل بھی کوئی اظہار نہیں کیا... شیر شاہ پلاؤ کھاتا رہا اور وہ اسے دیکھتا رہا۔

”کل میں تم سے ایک کام اور کراؤں گا اور اس کے لیے تمہیں ایک دفعہ پھر میری بستی تک جانا ہوگا۔“ شیر شاہ نے ولی سے کہا۔

”تمہارے گھر... ماہ نور کے پاس؟“ ولی نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں... اس دفعہ کسی اور کے پاس بھیجوں گا... میں ایک خط لکھ کر دوں گا... وہ اسے پہنچانا ہوگا لیکن اس طرح کہ کسی کو بالکل بھی خبر نہ ہو۔“ شیر شاہ نے پانی پی کر بوتل خالی کر دی۔

”تمہاری بستی بہت دور ہے... مجھے ٹائم بہت لگتا ہے اور پھر میں تھک بھی جاتا ہوں۔“ ولی نے بےزاری سے کہا۔

”میں تمہیں پیسے دوں گا... تم بس میں یا پھر رکشے میں

www.pkdigest.com

چلے جانا۔ اب جاؤ... کل آنا... میں خط لکھ کر رکھوں گا۔ تمہارا دیا ہوا قلم اور کاپی میرے پاس ہے۔" شیر شاہ نے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا تو ولی وہاں سے اٹھ آیا۔

راستے بھر وہ یہی سوچتا ہوا آیا کہ شیر شاہ بے چارے کو تو پتا بھی نہیں ہے کہ اس کی نئی نویلی بیوی کیا گل کھلا رہی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی منظر تھا جب اسے بیرونی کھڑکی کے پاس کسی کی ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی۔

اس نے پچھلی کھڑکی کو اپنے لیے جنت کا دروازہ بنا رکھا ہے۔ پتا نہیں ادھر کون کون آتا ہے اور کیا کیا چیزیں اسے دے کر جاتا ہے۔ جس کا شوہر مہینے بھر سے گھر پر نہ ہو... نہ اسے کوئی پیسا بھیجا ہو... اسے نہ تو کسی چیز کی کمی تھی اور نہ کوئی پریشانی... گندی عورت! آخ تھو... اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

☆☆☆

موسم تیزی سے بدل رہا تھا۔ کراچی کی سردی تو یوں بھی مانگے کی ہوتی ہے۔ کوئٹہ سرد ہوتا ہے تو کچھ سردی کراچی کو بھی مستعار دے دیتا ہے... ورنہ یہاں کیسی سردی۔

اس نے بھی لحاف تہ کر کے رکھا اور ہلکا سا پنکھا چلا کر بستر پر لیٹ گئی۔ ابھی صرف دس بجے تھے۔ اس نے کچھ دیر ٹی وی دیکھا پھر اکتا کر اسے بند کر دیا۔ اب وہ چت لیٹی سامنے دیوار پر لگی گھڑی کی سوئیوں کو دیکھ رہی تھی جو آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھیں۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہی تھیں، اس کے دل میں ایک خوش گوار احساس تازہ ہو رہا تھا اور کان ایک ہلکی سی دستک کے منتظر تھے جو اس کے وجود میں خوشیوں کے پھول کھلا دیتی تھی۔

آخر کار بارہ بجے تک انتظار کے بعد وہ نرم سی دستک اس کے کانوں سے نہیں دل سے ٹکرائی اور وہ ایک لمحے میں بستر سے اتر کر کھڑکی تک پہنچ گئی۔ آہستگی سے چٹخنی کھول کر اس نے ایک پٹ کھولا۔ سامنے وہی دشمن جاں کھڑا تھا... ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں محبت کے دیے جلائے۔ وہ کھڑکی کے بالکل نزدیک آ گیا۔

"کیسی ہو ماہ نور؟" اس نے حسب عادت سوال کیا۔

"بہت بے چین... ہمارے درمیان حائل یہ سلاخیں کب تک دیوار بنی رہیں گی... بس یہی بے چینی مجھے سکون سے نہیں رہنے دیتی۔" ماہ نور نے سچ مچ کی بے چینی کا اظہار کیا۔

"فکر نہ کرو... بہت جلد میں تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا... بس تھوڑے دن کی بات ہے۔" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ لیکن مضبوط لہجے میں اسے تسلی دی۔

"شاہ زیب! اگر تم مجھے یہاں سے لے بھی گئے تو کیا فائدہ... تم جانتے ہو، میں اس کے نکاح میں ہوں۔ جب تک وہ مجھے طلاق نہیں دیتا ہم شادی تو کر نہیں سکتے... تو پھر میرے یہاں سے جانے کا فائدہ؟" ماہ نور نے آزردگی سے کہا۔

"ہاں... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ تم یہاں سے نکلو تو سہی پھر اس مسئلے کا حل بھی ڈھونڈ لیں گے۔" شاہ زیب نے کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں شاہ زیب! پہلے یہ مسئلہ حل ہو تو پھر آگے سوچا جا سکتا ہے... ورنہ تمہارے اور میرے درمیان شیر شاہ نام کا یہ سمندر تو حائل رہے گا اور اسے عبور کرنا نہ تمہارے بس میں ہے اور نہ میرے بس میں۔" ماہ نور کی آواز بھرا گئی۔

"اچھا یہ بتاؤ... اس دن وہ لڑکا جو آیا تھا جسے شیر شاہ نے بھیجا تھا، پھر دوبارہ تو نہیں آیا؟" شاہ زیب نے نہ جانے کیا سوچتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں... آیا تو نہیں لیکن آئے گا ضرور... شیر شاہ اسے میری خیر خبر لینے کے لیے بھیجے گا ضرور... لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" ماہ نور نے کچھ حیرت سے سوال کیا۔

"میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اسے ضرور معلوم ہوگا کہ شیر شاہ کہاں چھپا ہوا ہے۔ اگر تم اسے باتوں میں لگا کر پوچھ سکو تو سمجھو کہ مسئلہ حل ہو گیا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے تو میں خود اسے اپنے ہاتھ سے گولی مار آؤں... قاتل ہے وہ میرا... اتنا حق تو بنتا ہے میرا اس پر۔" شاہ زیب کے لہجے میں امید اور انتقام جھلک رہے تھے۔

"تم اسے نہیں جانتے۔ وہ کس قدر ظالم اور بدخصلت انسان ہے اس کا تم اندازہ کر ہی نہیں سکتے... اور جو تم کہہ رہے ہو کہ اسے گولی مار دو گے تو میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ تم اس کے سامنے بھی آؤ... بلکہ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ اسے پتا بھی نہ چلے کہ تم زندہ بچ گئے ہو۔ یہ تمہارے اور میرے حق میں بہتر ہوگا ورنہ اگر اسے بھنک بھی پڑ گئی کہ تم زندہ ہو تو وہ پاتال میں سے بھی ڈھونڈ کر تمہیں مار ڈالے گا۔ خدا کے لیے... کبھی اس کے سامنے مت جانا۔" ماہ نور نے بڑی دل سوزی سے فریاد کی تو شاہ زیب پُرخیال نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

"ماہ نور! وہ بھی آخر انسان ہی ہے نا... اور اس وقت تو ویسے بھی وہ اپنے سب ساتھیوں سے بچھڑ کر اکیلا... زخمی اور بیمار ہو کر کہیں چھپا ہوا ہے۔ اگر اس وقت اس سانپ کا سر کچل دیا تو ٹھیک ہے ورنہ اسے طاقت مل گئی تو پھر یہ قابو آنے والا نہیں ہے۔ اس وقت یہ سمندر سمٹ کر گندے پانی کا ایک چھوٹا سا جوہڑ بنا ہوا ہے اور اسی حالت میں اسے آسانی سے پاٹ کر راستہ بنایا جا سکتا ہے۔ مجھے کوشش کر لینے دو۔"

شاہ زیب اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ اندر سے بہت خوف زدہ تھی۔ شاہ زیب کو تو وہ رو کر صبر کر چکی تھی... اور جیسی بھی بھلی بری زندگی اس کو ملی تھی، اس کو کاٹنے کی کوشش کر رہی تھی... لیکن اچانک شاہ زیب کو زندہ اپنے سامنے پا کر وہ دو انتہاؤں میں گھر گئی تھی۔

شاہ زیب کی شکل میں زندگی اسے اپنی طرف بلا رہی تھی اور شیر شاہ کی شکل میں عفریت اس کی گردن سے چمٹا اس کا لہو پی رہا تھا اور وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیسے اس عفریت سے اپنی جان چھڑائے اور کیسے شاہ زیب کو اس کی ہلاکت خیزی سے بچائے۔

"شاہ زیب! تم کوشش کر سکتے ہو... لیکن اتنا بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ اس دنیا میں اب میرے جینے کی واحد وجہ تم ہو۔ اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو... تو میں خودکشی کر لوں گی۔" ماہ نور نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کھڑکی بند کر دی اور واپس بستر پر آ کر گر گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور کمرے کی خاموش تنہائی میں اس کی دبی دبی سسکیاں گونجنے لگیں۔

شاہ زیب کچھ دیر بند کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا پھر مڑا اور آہستہ آہستہ گلی سے باہر آیا۔

دور میدان کے ایک کونے میں اسے آگ جلتی نظر آئی تو وہ سمجھ گیا کہ چوکیدار سمندر خان ایک راؤنڈ لگا کر واپس آیا ہے اور اب چائے بنانے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس نے اپنی جیب ٹٹولی تو معلوم ہو گیا کہ چائے کی پتی کا پیکٹ اور دودھ کا ڈبا اس کے کوٹ کی جیب میں موجود ہیں۔

یہ رشوت وہ سمندر خان کے لیے لایا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا کچے راستے پر چلتا ہوا گراؤنڈ کے اس کونے پر پہنچ گیا جہاں سمندر خان نے اپنی جھونپڑی بنائی ہوئی تھی... اور اس وقت جھونپڑی کے سامنے آگ جلا کر چائے بنانے کی تیاری میں تھا کہ اس پر نظر پڑ گئی۔

"او یارا! تم آ گیا... آؤ ادھر آ جاؤ... بیٹھو!" اس نے اپنے مقابل رکھے ہوئے ایک بلاک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شاہ زیب اطمینان سے اس بلاک پر بیٹھ گیا اور جیب سے چائے کی پتی اور دودھ کا ٹیٹرا پیک نکال کر چوکیدار کی طرف بڑھایا۔

"دیکھو! میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں؟"

"او خیر... یہ تو چائے کا سامان ہے... پر چینی کدھر ہے؟" چوکیدار نے حریص نظروں سے پہلے ان چیزوں کو دیکھا پھر اس سے پوچھا تو اس نے ہنستے ہوئے دوسری جیب سے چینی کا پیکٹ بھی نکال کر پکڑا دیا۔

"اگر تم چینی نہیں لاتا تو ہم تم کو پھیکی چائے پلاتا... پر اب میٹھی پلائے گا۔" چوکیدار نے چائے کا مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پروا نہیں... سمندر خان! دوست کے ہاتھ کی بنی پھیکی چائے بھی میٹھی لگتی ہے... کیونکہ اس میں دوستی کی مٹھاس ہوتی ہے نا... اور تم میرے دوست ہو۔" اس نے کچھ ایسے انداز سے کہا کہ سمندر خان حیرت سے اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

"یارا! تم باتیں بہت اچھی کرتے ہو۔" سمندر خان نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

"صرف باتیں نہیں... میں کام بھی بہت اچھے کرتا ہوں... خاص طور پر دوستوں کے کام... ابھی دیکھو نا! تمہیں چائے کا تحفہ دینے کا کام کیا ہے نا میں نے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو سمندر خان ہنستے ہوئے گردن ہلاتا رہا۔ وہ دونوں چائے پیتے رہے۔ سردی کا موسم ویسے تو بس جا ہی رہا تھا... دن میں تو تیز دھوپ کے سبب اچھی خاصی گرمی ہو جاتی تھی لیکن صبح و شام اور پھر رات خنک ہو جاتے تھے۔ اس وقت بھی رات کی خنکی عروج پر تھی۔ ایسے میں جلتی ہوئی آگ کے پاس بیٹھ کر گرما گرم چائے پینے میں بہت لطف آ رہا تھا۔

"یارا! تم اتنی رات تک اِدھر اُدھر گھومتا رہتا ہے... نیند نہیں آتی ہے؟" سمندر خان نے رات زیادہ ہونے کا احساس دلایا تو اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"پریشانی نے نیندیں اڑا رکھی ہیں... جن لوگوں کے ساتھ اس وقت رہ رہا ہوں، ان کے پاس بس ایک کمرا ہے۔ لوگ زیادہ ہیں اس لیے جگہ تنگ پڑتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنا بندوبست کہیں اور کر لوں... بس دن میں مزدوری کرتا ہوں اور رات میں کوئی مناسب جگہ ڈھونڈنے کے لیے اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہوں۔ تم سے بھی کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ تمہیں تو اس بستی میں سب اچھی طرح جانتے ہیں... اور تم بھی سب کو جانتے ہو... کہیں بھی مجھے رہنے کے لیے ایک کمرا دلوا دو... تم توجہ ہی نہیں دیتے۔" اس نے خوش اندازی سے شکوہ کیا۔

"دیکھو یارا! ابھی تم نے ہم کو رشوت دیا ہے... تو ہمارا بھی فرض بنتا ہے تمہاری کچھ مدد کرے... انشاء اللہ جلدی میں تم کو کہیں نہ کہیں کمرا دلوا دے گا۔" سمندر خان نے وعدہ کیا پھر وہ کچھ دیر اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اٹھ گیا۔

سمندر خان چوکیدار تھا اور وہ تمام رات اس بستی کی

www.pkdigest.com

گلیوں میں ڈنڈا لیے گھومتا رہتا تھا۔ شاہ زیب کو خدشہ تھا کہ وہ کسی دن اسے ماہ نور کی کھڑکی پر کھڑا ہوا نہ دیکھ لے... اس لیے ضروری تھا کہ نہ صرف اس پر چیک رکھا جائے بلکہ بہتر ہے کہ اسے رشوتوں سے خوش کر کے مٹھی میں رکھا جائے۔ وہ یہی سوچتا ہوا اپنے ٹھکانے کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

جلدی جلدی اس نے برتنوں میں بچ جانے والا تھوڑا تھوڑا سا سالن جمع کیا اور اسے پلاسٹک کی ایک تھیلی میں ڈال دیا۔ اسی طرح روٹی کے وہ بچے ہوئے ٹکڑے جو گاہکوں کی پلیٹوں اور چنگیروں میں بچ جاتے تھے، وہ چپ چاپ ایک ٹوکری میں ڈالتا جاتا تھا۔ دوپہر اس کی چھٹی کے وقفے تک یہ اتنا ہو جاتا تھا کہ وہ بچا کھچا کھانا پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر لے جاتا تھا۔

"یہ لو... آج تمہارے واسطے بہترین کھانا لے کر آیا ہوں۔ سالن اتنا مزے دار بنا ہوا ہے کہ انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے... روٹی بھی بہت ہے۔" اس نے رومال میں بندھی وہ پلاسٹک کی تھیلی شیر شاہ کے سامنے رکھ دی۔

"خانہ خراب! پتا نہیں کس کس کا جھوٹا جمع کر کے لے آتا ہے... اور تعریف ایسا کرتا ہے جیسے میرے لیے اسپیشل پکوا کر لایا ہے۔" شیر شاہ نے پلاسٹک کی تھیلی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا جس میں سے روٹی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اور کنارے صاف نظر آ رہے تھے۔

"ابھی اسی کو اسپیشل سمجھو... یہ بھی نہ ملے تو تمہارا خانہ خراب ہو جائے گا۔ ویسے اب تمہاری ٹانگ کا زخم کافی بہتر ہو گیا ہے... تم تھوڑا تھوڑا چلنے لگے ہو... تو اپنے کسی محفوظ ٹھکانے پر چلے جاؤ۔ یہاں جنگل ویرانے میں کب تک پڑے رہو گے؟" ولی نے اسے مشورہ دیا۔

"میرے سارے ٹھکانے پولیس کی نظر میں آ چکے ہوں گے اور وہ ادھر گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔ میں نے وہاں قدم رکھا اور زیور ہاتھ میں... ابھی میں جا نہیں سکتا۔ اپنے کسی ساتھی سے میرا رابطہ ہو تو باہر کے حالات کا مجھے کچھ پتا چلے۔ پھر میں فیصلہ کروں گا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔" شیر شاہ نے روٹی کا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

شیر شاہ نے کھانا شروع کیا تو ولی اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں واپس جا رہا ہوں... شام کو پھر آؤں گا۔"

"بیٹھو... میں کھانا کھا لوں تو تم کو ایک خط دیتا ہوں... وہ تم لے جا کر اسے دینا جس کے بارے میں تم کو میں بتاؤں گا۔ جب تک ادھر بیٹھ کر ذرا میرا یہ پستول صاف کر دو۔"

شیر شاہ نے آخری جملہ کہا تو ولی بہ خوشی وہاں بیٹھ گیا۔

شیر شاہ نے اپنا ہلکا پھلکا سا پستول نیفے میں سے نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا جسے ولی نے لپک کر اٹھا لیا اور دونوں ہاتھوں میں لے کر الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایک پُر جوش خوشی کے تاثرات دیدنی تھے۔

"میں نے پستول کے بارے میں کچھ بتایا تھا... یاد ہے کہ نہیں؟ کیسے کھولتے ہیں؟ میگزین کیسے لگاتے ہیں؟ لوڈ کیسے کرتے ہیں؟ اور فائر کیسے کرتے ہیں... یاد ہے کہ نہیں؟" اس نے ولی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ چمکتی آنکھوں سے پستول کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ شیر شاہ سپاٹ سا چہرہ لیے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

کھانا کھا کر اس نے ایک لمبی ڈکار لی... پھر چادر سے ہاتھ پونچھ کر اس نے واسکٹ کی جیب سے ایک کاغذ نکالا جو تہ کیا ہوا تھا۔ وہ اس نے ولی کی طرف بڑھایا اور اسے مطلوبہ شخص کا نام پتا وغیرہ سمجھاتا رہا۔

"تم ابھی جاؤ... اس کو یہ خط دو اور ابھی جواب لکھوا کر لاؤ۔ وہ اس وقت سویا ہوا ہوگا... اور اسے نیند سے اٹھانے والے کا شامت آ جاتا ہے... پر تمہیں پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو میرا نام لینا... ایک دم سیدھا ہو جائے گا... سمجھ گیا؟"

ولی نے اس سے پرچہ لے کر کرتے کی جیب میں ڈالنا چاہا تو شیر شاہ نے ٹوک دیا۔

"خانہ خراب! ہم نے بولا ہے... خط چھپا کر لے جاؤ۔ جیب میں سے ساری دنیا کو نظر آ جائے گا... نکالو جیب سے اور کہیں چھپا کر رکھو۔" شیر شاہ نے کچھ غصے سے کہا تو اس نے وہ پرچہ جیب سے نکال کر اپنی ٹوپی میں چھپا لیا... ٹوپی دوبارہ سر پر رکھتے ہوئے اس نے ملامت آمیز نظروں سے شیر شاہ کو دیکھا۔

"ہم سے ایسے بات کرتا ہے جیسے ہم نوکر ہے۔ اگر بدقسمتی سے تم ہمارا ہیرو نہ ہوتا... تو میں کبھی تمہارے لیے کچھ نہ کرتا... بلاوجہ کی مصیبت پال لی ہے میں نے۔" ولی برا سا منہ بنا کر بڑبڑاتے ہوئے واپسی کے لیے مڑا تو شیر شاہ نے ہنستے ہوئے اس سے کہا۔

"اوئے! میرے بعد تو ہی ہیرو ہوگا۔ فکر نہ کر... جو کچھ شیر شاہ تجھے سکھائے گا، وہ کوئی دوسرا نہیں سکھا سکتا۔"

ولی اس کی بات سنتے ہوئے کیکروں کے اس جھنڈ سے باہر نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

"کون ہے خانہ خراب؟" وہ چیختا ہوا اٹھا تھا اور ساتھ

ساتھ سرہانے رکھا ڈنڈا بھی اٹھا لیا تھا۔ قریب تھا کہ دھائیں سے تھما کر وہ اس کو رسید بھی کر دیتا کہ اس کے منہ سے اگلا جملہ سنتے ہی وہ وہیں رک گیا... ڈنڈا بھی فضا میں ہی ساکت رہ گیا۔

"مجھے شیر شاہ نے بھیجا ہے۔" ولی نے اس سے کہا تھا۔

"کس نے بھیجا ہے؟" اس لمبے تڑنگے آدمی نے جلدی سے پوچھا تو ولی نے پھر دہرا دیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر ڈنڈا واپس رکھ دیا۔

"کدھر ہے وہ؟" اس نے اپنے سامنے کھڑے پندرہ سولہ سال کے لڑکے کو بہ غور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں... ویسے بھی اس نے منع کیا تھا بتانے کے لیے... اور یہ خط اس نے دیا ہے تمہیں۔" ولی نے ٹوپی سر سے اتار کر اس میں سے خط دیا۔

"سمندر خان کے نام..." اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا اور اوپر لکھا نام پڑھا۔

"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" اس نے ولی کو گھورا۔

"نہیں... جواب لے کر جانا ہے... اس نے یہی بولا ہے۔" ولی اطمینان سے اس کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا تو سمندر خان نے کاغذ کی تہیں کھول کر خط کا مضمون جلدی جلدی پڑھا۔ ایک دفعہ سرسری سا پڑھنے کے بعد اس کی پیشانی پر غور و فکر کی کچھ لکیریں نمودار ہوئیں اور اس نے دوبارہ بہ غور اس خط کو پڑھا۔ پھر اٹھ کر ٹوکری میں سے ڈھونڈ کر ایک بوسیدہ سا بال پین نکالا اور خط کی پشت پر سوچ سوچ کر کچھ تحریر کرتا رہا... پھر کچھ دیر لکھ کر کاغذ موڑ کر ولی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ولی نے اسی طرح اسے ٹوپی کے اندر رکھا اور جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ سمندر خان دوبارہ لیٹ کر سونے کی تیاری کرنے لگا۔

اس نے جھونپڑی سے باہر آ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ دور وہ گلیاں نظر آ رہی تھیں جہاں ایک میں ماہ نور رہتی تھی۔ اس کا دل کھنچنے لگا۔

"اتنا قریب آ کر بغیر ملے جانا نہیں چاہیے... بس کھڑے کھڑے ایک نظر دیکھ کر واپس چلا جاؤں گا۔" اس نے دل کے کہنے پر قدم اس طرف بڑھائے پھر دماغ نے سرزنش کی۔

"نہیں... وہ اچھی عورت نہیں ہے... جادوگرنی ہے... کہیں تجھ پر جادو نہ کر دے۔" ولی کے تصور میں اس کا گلاب چہرہ، ساحر آنکھیں اور جادو سراپا لہرایا۔

"بس تھوڑی دیر... کھڑے کھڑے... دو چار باتیں کر کے واپس چلا جاؤں گا... بیٹھنا تھوڑی ہے اس کے پاس۔"

دل نے پھر شرارت کی اور وہ دل کے کہنے پر اس کی گلی کی طرف بڑھتا چلا گیا... بلا ارادہ... بے بس... اور مجبور ہو کر!

تھوڑی دیر میں وہ اس کے دروازے پر تھا۔

"آؤ... اندر آؤ... باہر کیوں کھڑے ہو؟" وہ طلسم ہوش رُبا کا کردار اسے اپنی طرف بلا رہا تھا اور وہ اپنے آپ کو روکنے کی بھرپور اور ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"نہیں... میں تو بس... تمہاری خیریت... پوچھنے آیا تھا... تاکہ شیر شاہ کو... بتا دوں... میں جا رہا ہوں۔" ولی کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر الفاظ نکلے اور بہ مشکل تمام اس نے اپنے آپ کو جانے کے لیے راضی کیا۔ وہ مڑا ہی تھا کہ اس دشمنِ جاں نے ہاتھ پکڑ کر اسے دروازے سے اندر کھینچ لیا۔

"یہ کیا بات ہوئی... دروازے سے آ کر لوٹ جاؤ۔ ہم مہمان کو اس طرح کبھی جانے نہیں دیتے... آؤ! تھوڑی دیر بیٹھو... چائے پی کر جانا... بیٹھو۔" اس نے ہلکا سا دھکا دے کر اسے بٹھا دیا اور خود چائے بنانے چلی گئی۔

یہ بھی اچھا ہی ہوا... وہ جو پسینے پسینے ہو رہا تھا، اسے اپنے اوپر قابو پانے کی مہلت مل گئی۔

"شیر شاہ کا اب کیا حال ہے؟" جلد ہی وہ چائے بنا کر لے آئی اور ایک کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"اب تو بالکل ٹھیک ہونے والا ہے... اٹھ کر تھوڑا تھوڑا چلنے کا کوشش کرتا ہے۔ بخار بھی نہیں ہے... تھوڑے دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔" ولی نے چائے پر سے اٹھتی بھاپ کے پیچھے سے اس کے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے... تو گھر کیوں نہیں آتا؟" ماہ نور نے پھر سوال کیا۔

"پولیس اس کی تلاش میں ہے... سارے ٹھکانے پولیس نے دیکھ لیے ہیں... گھر بھی انہیں معلوم ہوگا... اس لیے فی الحال وہ کہیں نہیں جا سکتا۔" ولی نے وضاحت سے سمجھایا اور جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھر کر اسے ختم کیا۔

"کیا ہوا؟ اتنی جلدی کھڑے کیوں ہو گئے... بیٹھو تھوڑی دیر... باتیں کرو پھر چلے جانا۔" ماہ نور نے اسے اٹھتے دیکھ کر کہا۔

"نہیں... بہت دیر ہو گئی ہے... پھر کبھی آؤں گا۔" ولی نے باہر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا، ایسا کرو... جمعے کو آنا۔ میں اچھا سا کھانا بناؤں گی۔ تم میرے ساتھ کھانا... اور میں شیر شاہ کے لیے بھی دے دوں گی... آؤ گے نا؟" ماہ نور نے کہا۔

"کوشش کروں گا۔"

www.pkdigest.com

''نہیں... وعدہ کر کے جاؤ... پکا وعدہ... نہیں تو میرا اتنا سارا محنت سے بنایا ہوا کھانا ضائع ہو جائے گا۔''

''تم کھا لینا۔''

''میں اکیلی تین آدمیوں کا کھانا نہیں کھا سکتی... تم کو ضرور آنا ہے... وعدہ کر کے جاؤ... پکا وعدہ...''

اس دشمنِ جاں نے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں اپنی ساحر آنکھیں ڈال کر جب وعدہ لیا... تو اسے ہاں کرتے ہی بنی۔ اس کے اس دل رُبا انداز پر کون کافر انکار کر سکتا تھا؟ وہ بھی اثبات میں سر ہلاتا ہوا تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔

باہر جا کر کچھ دیر اس نے لمبی لمبی سانسیں لے کر اس جادو کو اتارنے کی کوشش کی جو اس کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ بہت دیر ہو گئی تھی، اس نے دوڑ لگا دی۔

☆☆☆

''جمعے کے دن میں نے اسے بلایا ہے... کھانا کھلانے کے لیے...'' ماہ نور نے شاہ زیب کو بتایا تو کھڑکی کی سلاخوں کے اس پار اس کا چہرہ ایک دم روشن سا ہو گیا۔

''اچھا... یہ تو بہت اچھی خبر ہے... کس وقت آئے گا وہ؟'' اس نے پوچھا۔

''جمعے کی نماز کے بعد۔''

''ٹھیک ہے... میں بندوبست کر لوں گا۔ ہو سکتا ہے یہ جمعہ ہی اس کی موت کا اور تمہاری آزادی کا دن ہو۔'' شاہ زیب کے لہجے میں امید تھی۔

''شاہ زیب! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو... کہ تم دوبارہ اس کے وار کا شکار ہو جاؤ۔'' ماہ نور پریشان تھی۔

''نہیں... مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں پوری کوشش کروں گا اس شیطان کو جہنم رسید کرنے کی... اور اگر اس کا پتا ٹھکانا مل گیا تو شاید مجھے مارنے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ پولیس یا اس کے کسی دشمن کو اس کا ٹھکانا بتا دوں گا... یہ کام وہی لوگ کر دیں گے۔''

''یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ شاہ زیب! تم اس کے سامنے مت جانا۔ بس خاموشی سے اس لڑکے کے پیچھے جا کر اس کا ٹھکانا دیکھ لو۔ اس کے بعد کسی کو اس کے بارے میں بتا دینا۔ وہ خود ہی اس کا انتظام کر دیں گے۔'' ماہ نور کچھ پُرسکون ہو گئی۔

''لیکن اس میں یہ بات یقینی تو نہیں ہے کہ اس کا دشمن یا پولیس والے اسے جان سے مار ہی دیں۔ ہو سکتا ہے وہ اسے پکڑ لیں اور اس پر مقدمہ چلائیں... تو اس کے زندہ رہنے سے تو ہمارا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔'' شاہ زیب نے اسے یاد دلایا۔

''اس کے جرائم کی فہرست بہت لمبی ہے شاہ زیب! اس نے جہاں اپنے دشمنوں کو قتل کیا ہے وہاں کئی پولیس والوں کو بھی مارا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی اسے زندہ رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ وہ اسے آرام سے گولی مار کر پولیس مقابلہ قرار دے دیں گے۔'' ماہ نور نے شاہ زیب کو کسی کے خون سے ہاتھ رنگنے سے باز رکھنے کو کہا۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ شاہ زیب جیسے نیک اور اچھے انسان کے ہاتھ شیر شاہ کے غلیظ خون سے آلودہ ہوں۔

''اچھا... دیکھتے ہیں۔ اس لڑکے کو آنے تو دو۔ ویسے اس کی دعوت میں کیا کھانا بناؤ گی... کچھ ہمیں بھی ملے گا یا نہیں؟'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں... کیوں نہیں... سب سے پہلے تو تمہارے لیے ہی نکال کر رکھوں گی۔ ویسے پلاؤ اور آب جوش اور دیسی گھی والے میٹھے چاول بنانے کا ارادہ ہے۔'' اس نے محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ دونوں کچھ دیر اور باتیں کرتے رہے پھر شاہ زیب جمعے کی رات آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

☆☆☆

جمعے کو وہ جلدی سو کر اٹھ گئی۔ ایک عجیب سی بے چینی نے اسے رات بھر سونے نہیں دیا۔ حالانکہ حالات کافی امید افزا تھے لیکن پھر بھی دھوسے اسے ڈرا رہے تھے۔ منہ اندھیرے اٹھتے ہی فجر کے فوراً بعد اس نے کھانا پکانے کی تیاری شروع کر دی اور ظہر کی اذان تک سب کچھ پکا کر فارغ ہو گئی۔ اس دن نماز میں بڑے خشوع و خضوع سے اس نے شاہ زیب کی سلامتی اور لمبی عمر کی دعائیں مانگیں... لیکن نہ جانے کیوں وہ شیر شاہ کی موت کی دعا نہیں مانگ سکی۔

کچھ دیر بعد ہی دروازہ بجا اور ولی اندر آ گیا۔ ماہ نور نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔ موسم بدل رہا تھا اور دھوپ میں کافی شدت آ گئی تھی۔ اتنی سب پیدل دور سے چل کر آنے کے بعد ولی کا چہرہ سرخ اور پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ ماہ نور نے اسے ٹھنڈا پانی لا کر پلایا اور پھر کھانا لگا دیا۔ کھانا بہت اچھا بنا ہوا تھا اور پھر ماہ نور جیسی حسینہ اپنے ہاتھ سے اس کی پلیٹ میں مختلف چیزیں ڈال رہی ہو... تو انکار کون کر سکتا ہے؟ ولی نے اپنی گنجائش کی آخری حد تک کھایا... اور جب اس نے آخر میں لسی کا گلاس ختم کیا تو اس سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا... وہ وہیں کشن پر لڑھک گیا۔

''او خدایا! میں نے کتنا کھا لیا ہے۔ بیٹھا نہیں جا رہا... تو اتنی دور واپس کیسے جاؤں گا؟'' اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر فریاد کی تو ماہ نور ہنسنے لگی۔

''تم تھوڑی دیر لیٹو... میں قہوہ بنا کر لاتی ہوں۔ قہوہ پی کر سب کچھ ہلکا پھلکا ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے... قہوے میں تھوڑا لیموں بھی ڈالنا۔'' اس نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

ماہ نور نے برتن سمیٹے اور انہیں دھونے بیٹھ گئی۔ وہ جان بوجھ کر دیر لگانا چاہتی تھی تاکہ تھوڑی شام ہو جائے... بلکہ شاہ زیب جب شیر شاہ کے ٹھکانے تک پہنچے تو اندھیرا ہو جائے تاکہ شیر شاہ اس کی شکل نہ دیکھ پائے... اسے پہچان نہ پائے... وہ کسی بھی طرح شاہ زیب کو محفوظ رکھنے کی خواہش مند تھی۔

اس نے برتن دھو کر ٹھکانے پر رکھے اور دبے قدموں آ کر کمرے میں جھانکا۔ ولی قالین پر لیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔ پنکھے کی ہلکی ہلکی ہوا سے اس کے بال اڑ رہے تھے اور وہ کشن پر سر رکھے پاؤں پھیلائے بے خبر سو گیا تھا۔

وہ دوسری طرف سے نکل کر کمرے میں داخل ہو کر کھڑکی کی طرف گئی اور پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ حسبِ توقع اسے دور کھڑا شاہ زیب نظر آیا۔ اس نے ہلا کر اسے کھانے کی تھیلیاں پکڑائیں اور ذرا سا پردہ ہٹا کر اسے اندر سوتے ہوئے ولی کو اشارے سے دکھایا۔ شاہ زیب نے اسے دیکھ کر مطمئن انداز میں سر ہلایا اور اس کے ہاتھ سے کھانے کی تھیلیاں لے کر واپس چلا گیا۔ ماہ نور وہاں سے ہٹ کر اپنے پلنگ پر آ کر لیٹ گئی۔

دن آہستہ آہستہ ڈھل کر شام تک پہنچ رہا تھا۔ ماہ نور کچھ دیر اور گزرنے کا انتظار کرتی رہی... پھر اس نے ولی کو آوازیں دے کر اٹھایا، قہوہ پلایا اور شیر شاہ کے لیے پلاسٹک کی تھیلیوں میں کھانا پیک کر کے دیا۔

''او خدا پناہ! میں کتنی دیر تک سوتا رہا... تم نے مجھے اٹھایا بھی نہیں؟ کتنی دیر ہو گئی... اب خیر نہیں ہے۔ بابا کے جوتے کھانے پڑیں گے... اور ہوٹل سے چھٹی ہو جائے گی۔'' ولی نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اس وقت بھی میں نے ہی آوازیں دے کر تمہیں اٹھایا ہے... تم اتنی گہری نیند سو رہے تھے۔ خیر، اب جاؤ۔'' ماہ نور نے اسے رخصت کیا۔

''پھر آنا۔'' باہر نکلتے نکلتے ولی کے کانوں سے ماہ نور کا یہ جملہ ٹکرایا تو اس نے دانت پیس کر اسے ایک ہلکی پھلکی گالی سے نوازا۔

''پتا نہیں کیا جادو پھیرتی ہے خانہ خراب!'' اسے معلوم تھا کہ ابھی اسے گل چاچا کے ہوٹل پہنچنے میں ایک گھنٹا تو لگے گا اور اتنی دیر میں جب وہ وہاں پہنچے گا تو گل چاچا اس پر برس پڑے گا۔ تصور میں اس نے گل چاچا کے منہ سے گالیوں کا فوارہ ابلتے اور اپنے آپ کو اس میں تھرتھرتے دیکھا۔

اسے یہ بھی معلوم تھا کہ رات جب وہ اپنے گھر پہنچے گا تو اس سے پہلے اس کی شکایت بابا تک پہنچ چکی ہوگی اور گھر کے دروازے پر بابا کا جوتا اس کے استقبال کے لیے موجود ہوگا۔

وہ ہاتھ میں کھانے کی تھیلیاں پکڑے تیز تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا۔

ابھی تو اس خانہ خراب کو کھانا بھی پہنچانا ہے۔ اس نے بولا تھا کہ کھانا پہلے اسے دے کر جانا... پھر ہوٹل... ''کاش! میرے پر لگ جائیں تو میں اڑ کر جلد سے جلد پہنچ جاؤں۔'' وہ تیز تیز قدموں سے چلتا اور سوچتا جا رہا تھا کہ اسے اپنے پیچھے سائیکل کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو سائیکل بالکل سر پر آ پہنچی تھی۔ وہ جلدی سے ایک طرف ہٹا۔ اتفاق سے سائیکل والے نے اسے بچانے کے لیے سائیکل ادھر ہی موڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ٹکرائے اور ولی ایک طرف گرا جبکہ سائیکل سوار اپنی سائیکل سمیت دوسری جانب۔

''اوئے خانہ خراب! دیکھ کے نہیں چلاتا۔'' ولی نے اٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا تو سائیکل سوار مسکرایا۔

''تم سڑک کے بالکل بیچ میں چل رہے تھے۔ میں نے گھنٹی بجائی تاکہ تم ایک طرف ہو جاؤ... لیکن اتفاق سے جدھر سے میں نے نکلنا چاہا، تم بھی ادھر ہی مڑ گئے... اس لیے ٹکرانا تو تھا... خیر، تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں... چوٹ نہیں آئی۔ لیکن گھٹنا تھوڑا اچھل گیا ہے۔ اب میں تیز نہیں چل سکتا۔ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو رہی تھی... اب اور ہو جائے گی۔ بس اب اللہ ہی حافظ ہے میرا۔'' ولی نے اوپر دیکھتے ہوئے فریاد کی تو سائیکل سوار ہنس پڑا۔

''ارے یار! ایسی بھی کیا پریشانی... ادھر آؤ... میری سائیکل پر بیٹھ جاؤ اور بولو کدھر جانا ہے... دو منٹ میں پہنچا دوں گا۔'' سائیکل سوار نے آفر کی تو پہلے تو ولی نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے گھورتے دیکھ کر سائیکل سوار پھر گویا ہوا۔

''ارے یار! اب مجھ سے غلطی ہوئی ہے تو میرا فرض بنتا ہے نا کہ میں ہی اس کی تلافی کروں۔ اس لیے تمہیں تمہارے گھر پہنچانے کی ذمے داری نبھانا چاہتا ہوں۔ چلو، آ جاؤ... تکلف نہ کرو... اور بولو کدھر جانا ہے؟'' سائیکل سوار نے اسے پیچھے کیریئر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو ولی نے اسے غنیمت

www.pkdigest.com

جانا اور بیٹھ گیا۔

''اب بولو... کدھر جانا ہے؟'' اس نے پوچھا تو ولی اسے بتاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بڑی سڑک کے پل پر پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر ولی نے سائیکل سوار کو دور نظر آنے والا گل چاچا کا ہوٹل دکھایا۔

''وہ رہا گل چاچا کا ہوٹل... مجھے ادھر جانا ہے۔ نیچے جانے کا راستہ آگے جا کر ہے۔''

''لیکن یار! کھانا تو تمہارے ہاتھ میں ہے... پھر ہوٹل کیوں جا رہے ہو؟'' سائیکل سوار نے پوچھا تو ولی نے ترنت جواب دیا۔

''میں ادھر کھانا کھانے نہیں جا رہا ہوں... ادھر نوکری کرتا ہوں۔''

''اچھا اچھا... نوکری پر جانا ہے... تو کھانا کیوں لے جا رہے ہو؟'' سائیکل سوار نے پوچھا تو ولی کچھ چڑ سا گیا۔

''ایک تو تم سوال بہت کرتے ہو... کھانا میں کسی اور کے لیے لے جا رہا ہوں۔''

''اچھا یار! لیکن ایک بات ہے... کھانا ہوٹل لے جاؤ گے تو ہو سکتا ہے تمہارا گل چاچا یہ سمجھے کہ تم نے ہوٹل سے چوری کیا ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ پہلے جسے کھانا دینا ہے اسے دو... اور پھر ہوٹل جاؤ۔'' سائیکل سوار کی بات سن کر ولی کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

''کھانا جسے دینا ہے وہ ہوٹل کے قریب ہی ہے... تم مجھے ہوٹل پر چھوڑ دو... اس کو میں دے آؤں گا۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دے کر بات ختم کر دی تو سائیکل سوار بھی کچھ نہیں بولا۔ اس نے جلدی جلدی پیڈل مارے اور تھوڑی ہی دیر میں ہوٹل کے قریب پہنچ کر سائیکل روک دی۔

''ٹھیک ہے یار! تمہاری منزل آ گئی، تم جاؤ... اور مجھے اجازت دو۔ مجھے بھی دیر ہو گئی ہے... گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے۔'' یہ کہہ کر وہ واپس مڑا اور تیز تیز پیڈل مارتا ہوا بڑی سڑک کے پل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ولی کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر ہوٹل کے سامنے سے جانے کے بجائے اس کی پچھلی جانب سے چکر کاٹ کر دور ہی دور سے کیکروں کے جھنڈ کی طرف چل دیا۔

'وہ خانہ خراب دوپہر سے کھانے کے انتظار میں بیٹھا ہو گا... بھوک سے پاگل ہو رہا ہو گا... ایک تو کھانا... اور وہ بھی ماہ نور کے ہاتھ کا... وہ تو بلبلا رہا ہو گا۔' وہ تیزی سے چلتا جا رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا۔ اس کی بھاری پشاوری چپل کے نیچے آنے والے سنگ ریزے شور کرتے ہوئے ادھر اُدھر اچھل رہے تھے لیکن وہ ان کے شور سے بے نیاز تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ کیکروں کے جھنڈ میں اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچ گیا۔ جھاڑیوں کی شاخیں ہٹا کر وہ ایک داخلی راستے میں داخل ہوا اور بائیں جانب مڑ کر کچھ فاصلے طے کرتے ہوئے اچانک دائیں جانب کی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ کچھ فاصلے سے دو آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔

سائیکل سوار کچھ دور تو واپس گیا مگر جیسے ہی ولی نے رخ پھیرا، وہ تیزی سے واپس ہوا۔ ہوٹل کے قریب جھاڑیوں میں اس نے اپنی سائیکل چھپائی اور دور نظر آنے والے ولی کے تعاقب میں چھپتا چھپاتا کیکروں کے جھنڈ تک پہنچ گیا۔

اس وقت بھی وہ جھاڑیوں کے پیچھے سے حیران ہو کر ولی کو اس چھوٹے موٹے جنگل نما جھنڈ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو جھاڑیوں میں پوشیدہ کیے انتظار کرتا رہا اور تھوڑی ہی دیر میں اس نے ولی کو خالی ہاتھ جھنڈ سے باہر آتے اور ہوٹل کی طرف جاتے دیکھا۔

'اوہ... تو یہ ہے شیر کی کچھار... جہاں وہ بدبخت گیدڑ بن کر چھپا ہوا ہے۔ چل بھئی شیر شاہ! تیرا بندوبست کیے دیتے ہیں۔ ماہ نور نے قسم نہ دی ہوتی تو میں ادھر سے تجھے مار کر ہی جاتا... مگر خیر! میں تجھے مارتا نہیں ہوں، پر تیرے مرنے کا پورا بندوبست کیے دیتا ہوں۔ کھالے یہ آخری کھانا بھی۔' سائیکل سوار جھاڑیوں میں سے نکلا اور ادھر جانے کے لیے مڑا جہاں ہوٹل کے پیچھے اس نے اپنی سائیکل چھپائی ہوئی تھی... پھر نہ جانے کس خواہش کے تحت وہ رک کر واپس مڑا اور کیکروں کے جھنڈ کے اس حصے کی طرف بڑھنے لگا جہاں اس نے ولی کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہاں موجود چند شاخیں ہٹا کر وہ جہاں آیا... اس حصے کو جھاڑیاں کاٹ کر صاف کیا گیا تھا۔ وہ اس حصے میں کھڑا ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر بائیں جانب اسے کچھ ایسے آثار نظر آئے جیسے کوئی یہاں آتا جاتا رہا ہو۔ اس نے آگے بڑھ کر کچھ شاخیں ہٹائیں تو اسے کچھ دور تک ایک راستہ سا نظر آیا جو اِدھر اُدھر پھیلی شاخوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک دو ایسے شاپر بھی دیکھے جن میں کھانا پیک کیا جاتا ہے۔

اس کا جی چاہا کہ وہ اس راستے پر تھوڑا آگے جا کر دیکھے... شاید وہ نظر آ ہی جائے۔ کیونکہ وہاں کھانوں کی ہلکی ہلکی خوشبو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی کھانے کی خوشبو جو دوپہر میں اسے ماہ نور نے دیا تھا لیکن پھر وہ رک گیا۔ شام گہری ہو گئی تھی اور اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس جھنڈ میں ویسے ہی اندھیرا زیادہ پھیلا ہوا تھا اس لیے اس نے آگے بڑھنے کا

ارادہ ترک کر کے باہر نکلنا زیادہ بہتر سمجھا اور واپس ہو گیا۔

☆☆☆

وہ بے صبری سے جلدی جلدی کھا رہا تھا۔ چاول منہ میں رکھتے ہوئے گر بھی رہے تھے لیکن اسے پروا نہیں تھی کیونکہ بھوک بہت شدید تھی اور کھانا لذیذ۔ وہ تیزی سے منہ چلاتے چلاتے اچانک رک گیا۔ اس کے حساس کانوں نے کچھ اجنبی آہٹ سی سنی تھی۔ اسے لگا کوئی اس کے بہت نزدیک موجود ہے۔

آہٹ دوبارہ سنائی دی۔ کوئی اس کے بہت نزدیک موجود تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا... اور بہت آہستگی سے جیب میں رکھا پستول نکال لیا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر پستول واپس جیب میں ڈالا اور پنڈلی پر لگا ہوا چاقو نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی ساری سماعتیں آہٹوں پر مرکوز تھیں اور چاقو ہاتھ میں اس طرح تلا ہوا تھا کہ کسی اجنبی کی جھلک پاتے ہی اس کے حلقوم کو کاٹ ڈالنے کے لیے ابھی پرواز کر جائے گا۔

وہ کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ آہٹیں پھر سنائی دیں، پر اب یہ دور جاتی ہوئی آہٹیں تھیں۔ وہ لپک کر اس حصے میں آیا جہاں سے باہر نظر آتا تھا۔ وہاں اس نے شلوار قمیص اور واسکٹ میں ملبوس ایک شخص کو راستے پر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ شلوار کا ازار بند باندھتا ہوا جا رہا تھا۔ شام کی ہلکی روشنی میں اس کا ہلکے رنگ کا لباس اور گہرے رنگ کی واسکٹ کے ساتھ اس کے لمبے سنہرے بال نمایاں نظر آ رہے تھے۔

اس نے اطمینان کی سانس لی۔

''اوہ! کوئی پیشاب کرنے ادھر رک گیا تھا... خدائی خوار! ہمارا کھانے کا مزہ خراب کر گیا۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا واپس اپنے ٹھکانے پر گیا اور دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کھاتا رہا... کھاتا رہا... یہاں تک کہ تمام تھیلیوں میں کھانا ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے پانی پیا اور ایک لمبی ڈکار کے بعد آسودگی کا احساس لیے نیم دراز ہو گیا۔

لیٹے لیٹے وہ ان خطوط کے بارے میں سوچتا رہا جو وہ ولی کے ذریعے سمندر خان کو بھجوا تا رہا تھا اور سمندر خان ان کے جواب لکھ لکھ کر بھیج رہا تھا۔ باہر کے حالات کا اندازہ اسے ہو رہا تھا اور خصوصاً ماہ نور کے حوالے سے جو کچھ اسے معلوم ہو رہا تھا... وہ اس کا خون کھولانے کے لیے کافی تھا... اگرچہ باہر کے دوسرے حالات اس کے لیے اب بھی خطرناک تھے لیکن اب اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کافی حد تک آرام سے چلنے پھرنے لگا تھا، چنانچہ اس کا ذہن کچھ منصوبہ بندی کرنے لگا۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھا۔ گھپ اندھیرے میں ننھی سی لالٹین کی روشنی تھی جس کے گرد اس نے موٹا کاغذ موڑ کر لگا دیا تھا تا کہ باہر کہیں سے بھی روشنی نظر نہ آئے۔ اوپر بھی اس نے اخبار ڈھک دیا تھا جس کے سبب ایک ہلکا سا انعکاس تو راس کے آس پاس پھیلا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں اسے مانوس سی آہٹ سنائی دی اور ولی اس کے سامنے آ گیا۔

''اوئے! تم اتنی جلدی آ گئے... چھٹی جلدی ہو گئی؟'' شیر شاہ نے لیٹے لیٹے پوچھا۔

''چھٹی... چھٹی جلدی نہیں ہوئی... مستقل ہو گئی ہے۔ کل چاچا نے کام سے نکال دیا ہے... بولتا ہے تم چھٹی بہت کرتے ہو۔'' ولی نے بے زاری سے اطلاع دی۔

''گھر نہیں گئے؟'' شیر شاہ نے پوچھا تو ولی جیسے پھٹ پڑا۔

''گھر... گھر جاؤں؟ کون سے گھر؟ جہاں میرا باپ ہاتھ میں تیرہ نمبر کا جوتا لیے... دروازے پر میرا انتظار کر رہا ہے۔ مجھے اپنی ہڈیاں نہیں تڑوانی ہیں... میں نہیں جاؤں گا گھر۔'' اس نے غصے سے بھنا کر جواب دیا۔

''گھر نہیں جائے گا تو کدھر رہے گا خانہ خراب؟'' شیر شاہ نے پوچھا۔

''ادھر... تمہارے پاس رہوں گا... تمہارے ساتھ۔'' ولی نے دلیری سے کہا۔

''میرے پاس ادھر رہے گا؟ پاگل کا بچہ! یہ کوئی رہنے کی جگہ ہے... ادھر جانور رہتے ہیں... انسان کے رہنے کی جگہ نہیں ہے یہ۔'' شیر شاہ نے اٹھتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

''تم بھی تو ادھر ہی رہ رہے ہو... میں بھی رہ سکتا ہوں۔'' ولی نے زور دے کر کہا۔

''میں انسان کدھر رہ گیا ہوں... میں تو جانور بن گیا ہوں... خوں خوار جانور۔ میں ایسی جگہ رہ سکتا ہوں... پر تو تو انسان کا بچہ ہے۔ نیک اور عالم دین کی اولاد ہے۔ تیرے لیے یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔ گھر جا... باپ کی مار کھا لے... مر نہیں جائے گا... زندہ رہے گا اور انسان بن کر جیے گا... جا چلا جا۔'' شیر شاہ نے اسے ڈانٹا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔

''کتنے دن سے تم ادھر چھپے ہو... میں ہی ہوں جو تمہارا خیال رکھتا ہوں۔ تمہارا کھانا پینا... دوا علاج... تمہارا دکھ درد... تمہارے پیغام اور تمہارے خط لے کر دور دور پیدل جاتا ہوں... کیوں؟ کیا اس لیے کہ تم مجھے باپ کی مار کھانے کے لیے گھر بھیج دو؟'' شیر شاہ اس کی بات سن کر حیران ہوا۔

''اوئے خدائی خوار! پھر کس لیے کرتا ہے یہ سب... میں تجھے پیسے نہیں دیتا ان کاموں کے لیے؟'' شیر شاہ نے کہا۔

''پیسا... کتنا پیسا... دس... بیس یا پھر پچاس روپے... اس سے زیادہ تم نے کبھی نہیں دیے۔ میں اگر چاہتا تو پولیس کو یا تمہارے کسی دشمن کو تمہارے ٹھکانے کی اطلاع دے کر ہزاروں روپے لے سکتا تھا۔ ایک ساتھ اتنے پیسے مل جاتے تو میں آرام سے اپنا کاروبار کر لیتا۔ ہوٹل کھول لیتا یا گدھا گاڑی اور پانی کی ٹنکی لے کر بستی میں پانی سپلائی کرنے لگتا۔ زندگی آرام سے گزر جاتی... مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ پوچھو... کیوں نہیں کیا؟'' ولی نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا اور شیر شاہ کے حیرت سے ہونق ہو جانے والے چہرے کو شعلہ بار آنکھوں سے گھورا۔

''کیوں... کیوں نہیں کیا؟'' اس نے روبوٹ کی طرح ولی کے الفاظ دہرائے۔

''اس لیے... اس لیے کہ میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں۔ بہت محبت کرتا ہوں میں تم سے... تمہارے کارنامے میرے لیے جوش و ولولہ پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ جب بھی میں اخبار میں تمہارے کارنامے پڑھتا ہوں یا خبروں میں دیکھتا ہوں تو بس... میرا دل اش اش کرنے لگتا ہے۔ میرا بڑا دل کرتا ہے کہ تمہارے ہر کارنامے میں... تمہارے ساتھ میں رہوں۔ تمہارے جیسا بنوں اور تمہارے جیسے کام کروں۔'' ولی نے بڑے جوش میں کہا تو شیر شاہ کے چہرے پر گمبھیرتا سی چھا گئی۔

''تم... میرے جیسا بننا چاہتے ہو؟'' اس نے گھٹی ہوئی سی آواز میں سوال کیا۔

''ہاں... تمہارے جیسا بہادر... تمہارے جیسا نڈر... تمہارے جیسا دلیر... جو چاقو سے لے کر توپ تک چلانا جانتا ہو... جو پچاس دشمنوں میں بھی گھر جائے تو انہیں مارتا دھاڑتا... صاف بچ کر نکل جائے۔ ایسی دہشت ہو اس کی کہ لوگ اس کے نام سے ڈریں... تھر تھر کانپیں... اور جو امیر لوگوں کو لوٹے اور غریب لوگوں کی مدد کرے۔ جو کلاشنکوف لے کر کسی بھی بینک میں گھس جائے اور ہزاروں، لاکھوں روپے لے کر صاف نکل جائے اور جو... جب چاہے مرغ مسلم، دم پخت اور چپلی کباب دل بھر کے کھا سکے۔ کوئی اسے روکنے والا نہ ہو۔ مجھے بھی اپنے جیسا بنا دو نا شیر شاہ... میں اسی لیے تمہاری خدمت کرتا رہا ہوں کہ میں وہ سب کچھ سیکھ سکوں جو تم جانتے ہو۔ مجھے سب کچھ سکھا دو... اپنے جیسا بنا دو... میں تمہارے جیسا بننا چاہتا ہوں کیونکہ تم میرے ہیرو ہو۔'' ولی جوشیلے جذبات میں بولتا جا رہا تھا اور شیر شاہ آنکھوں میں بے پناہ حیرت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

''یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی میری برائیوں میں سے اچھائیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے گا... اور اس طرح مجھے اپنا ہیرو بنا لے گا... ہیرو... ہیرو! ہا ہا ہا...'' شیر شاہ ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ وہ اس قدر ہنسا کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

جب وہ دل بھر کے ہنس چکا تو خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر ولی کو گھورتا رہا... پھر گویا ہوا۔

''ٹھیک ہے... اب تم نے کھل کر اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے تو میں کوشش کروں گا کہ تمہیں کچھ نہ کچھ سکھا ہی دوں... لیکن یہ میں تمہیں پہلے بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ قدم قدم پر بڑے بڑے امتحان دینا پڑتے ہیں۔ پستول یا کلاشنکوف چلانا سیکھ لینا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے... پر چاقو، پستول یا کلاشنکوف سے بندہ مارنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ اپنے اندر کے آدمی سے لڑنا پڑتا ہے۔ پہلے اسے مارنا پڑتا ہے... تب ہمت آتی ہے... تم کر سکو گے یہ سب؟'' اس نے ولی سے سوال کیا تو اس نے سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں کہنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو... اپنی اور اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کی عزت، ان کے رشتے، خاندان... سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے... کیونکہ کسی بدنام مجرم سے کوئی رشتہ رکھتا ہے... نہ محبت... ہاں نفرت کی فراوانی ہو جاتی ہے... سہہ لو گے سب کچھ؟'' شیر شاہ کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تیر کی طرح ولی کے اندر اترتی گئیں۔

''ہاں بھئی... ابھی وہاں کس کو مجھ سے محبت ہے؟ کون عزت کرتا ہے میری؟ میں ہوں یا نہ ہوں... کس کو پروا ہے؟ نفرت کریں گے تو بھی کیا فرق پڑے گا... کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' یہ کہتے کہتے نہ جانے کیوں ولی کی آنکھیں جھک گئیں۔ وہ یہ سب باتیں شیر شاہ کی آنکھوں میں دیکھ کر نہیں کہہ سکا۔

شیر شاہ اسے گھورتا رہا۔ بڑے غور سے اسے دیکھتا رہا اور وہ نگاہیں کسی اور طرف کیے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ چہرے پر بدمزگی کے آثار لیے... کچھ ناراض سا!

''چلو ٹھیک ہے... گھر نہیں جانا ہے تو پھر میرے ساتھ چلو۔ آج مجھے ایک مہم پر جانا ہے... میں بھی دیکھتا ہوں کتنا دم ہے اور کتنی بہادری ہے تمہارے اندر۔'' شیر شاہ نے یک دم ایسا کہہ دیا کہ اس کے سارے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی اور جوش میں خون اچھل کر کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔

''کیا...؟ کیا سچ مچ تم مجھے اپنے ساتھ کسی مہم پر... لے

www.pkdigest.com

جار ہے ہو؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔
''ہاں... تمہاری یہی خواہش ہے نا؟'' شیر شاہ نے پوچھا تو اس نے جذبات سے چمکتی آنکھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔
''ٹھیک ہے... پھر غور سے سنو کہ تمہیں کیا کرنا ہے... تم...'' وہ دیر تک ولی کو کچھ سمجھاتا رہا اور ولی ایک سنسنی آمیز دلچسپی سے اس کی ہدایات ذہن نشین کرتا رہا۔

☆☆☆

آخری تاریخوں کا چاند ابھی طلوع بھی نہیں ہوا تھا... لیکن گلی کے نکڑ پر لگے بھاری روشنی والے بلب کے سبب یہاں بھی ہلکا سا اجالا تھا۔
وہ بڑی دیر سے کھڑا کھڑکی کے اس پار ماہ نور سے باتیں کر رہا تھا۔ آج دن کی پوری روداد اسے سنانے کے بعد اس نے آگے کا لائحہ عمل بتایا۔
''مجھے یقین ہو گیا ہے... وہ وہیں چھپا ہوا ہے... اور یہ لڑکا ولی اس کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے... تب ہی وہ آرام سے وقت گزار رہا ہے۔ مہینے ہو گئے... میں اس کی تلاش میں پاگلوں کی طرح ادھر ادھر پھر رہا ہوں اور وہ جنگلی جانور... اس جنگل میں آرام سے چھپا بیٹھا ہے۔''
''جنگل میں؟ ادھر کراچی میں کوئی جنگل ہے کیا؟'' ماہ نور نے حیرانی سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔
''جنگل کیا ہے... بس لیاری ندی سے تھوڑے فاصلے پر... بڑی سڑک کے پل سے نیچے اتر کر تھوڑا اندر کی طرف جاؤ... تو کیکر کے بڑے بڑے پرانے اور گھنے پیڑوں کا ایک بڑا سارا جھنڈ سا ہے۔ اس سے آگے شمالی علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کی چند کچی پکی بستیاں ہیں۔ وہی لوگ اسے جنگل کہتے ہیں... اس لیے یہ جنگل ہو گیا ہے۔'' اس نے تفصیل بتائی۔
''تو ادھر جانور بھی تو ہوں گے؟'' ماہ نور نے پوچھا۔
''ہوتے ہوں گے شاید... لیکن شیر شاہ سے بڑا کوئی جانور تو یقیناً ہوگا نہیں... پھر اسے کیا ڈر ہے۔'' اس نے کہا۔
''اب تم کیا کرو گے؟'' ماہ نور بے چین تھی۔
''تم نے منع نہ کیا ہوتا تو اس وقت میں تمہیں یہ خوش خبری سنا رہا ہوتا کہ زمین سے اب اس کے گندے وجود کا بوجھ کم ہو گیا ہے۔ لیکن تم نے مجھے پابند کر دیا اپنی قسم کا... اس لیے اب میرا ارادہ ہے کہ کل کسی وقت میں اپنے اس دوست کے پاس جاؤں گا جو پولیس میں ہے۔ اس کو ساتھ لے کر کسی بڑے افسر کو جا کر بتاتا ہوں... یقیناً وہ فوری ایکشن لیں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔
''لیکن پولیس نے کیا کرنا ہے... اس پر الزام لگتا ہے پھر مقدمہ عدالت میں سالوں تک چلتا رہے گا۔ پھر بھی موقع پا کر وہ جیل سے بھاگ جائے گا... اور ہم یہیں کھڑے رہ جائیں گے... جہاں ہیں۔'' ماہ نور کے لہجے میں یاسیت تھی۔
''مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا دوست بتاتا ہے کہ جب سے شیر شاہ نے پولیس کے پانچ چھ بندے مارے ہیں... تب سے پولیس اس کے خون کی پیاسی ہو رہی ہے... اور ان لوگوں نے آپس میں طے کر رکھا ہے کہ اسے پکڑتے ہی ان کاؤنٹر میں مار دیں گے اور کہہ دیں گے کہ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی اور پولیس پر فائرنگ کی... جوابی فائرنگ کے نتیجے میں مارا گیا۔''
''یہ سب ابھی صرف باتیں ہیں... ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی... تم جو کچھ کہہ رہے ہو، شاید ایسا ہو بھی جائے لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل بہت ڈر رہا ہے۔ اپنے لیے نہیں... تمہارے لیے... کہیں وہ تمہیں...'' ماہ نور کی آواز بھرا سی گئی۔
''دیکھو... اگر تمہیں اتنی ہی پریشانی ہے تو میں ابھی جاتا ہوں اور جا کر اسے گولی مار آتا ہوں۔ بس تم مجھے اپنی قسم سے آزاد کر دو۔'' شاہ زیب نے کھڑکی کی سلاخوں پر رکھے اس کے ہاتھوں کو تھام کر التجائیہ انداز میں کہا تو وہ اور جذباتی ہو گئی۔ ہونٹ کپکپائے اور خاموش آنسو اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔
وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھنا چاہتا تھا کہ یک دم ڈنڈے کے زمین پر زور سے مارنے کی ٹھک ٹھک کی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو پرچون والی دکان کے بلب کی زردی روشنی میں انہوں نے بستی کے چوکیدار کو جاتے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے کو زور سے زمین پر مار مار کر آوازیں پیدا کرتا ہوا گلیوں میں گھومتا رہتا تھا... تاکہ لوگوں کو پتا رہے کہ چوکیدار جاگ رہا ہے... اور وہ چین کی نیند سوئیں۔
''شاید اس نے تمہیں دیکھ لیا ہے شاہ زیب!'' ماہ نور نے گھبرا کر کہا۔
''لیکن وہ تو سیدھا آگے نکل گیا اور گلی پار کر کے ڈنڈا بجایا تھا۔ اگر مجھے دیکھ لیتا تو چور سمجھ کر ہی سہی... کچھ شور مچاتا یا آواز دیتا... یا ادھر اندر گلی میں آ ہی جاتا...'' شاہ زیب نے الجھتے ہوئے کہا۔
''اگر وہ ایسا کرتا تو ہم شاید کوئی بات بنا دیتے... لیکن وہ تمہیں دیکھ کر چپ چاپ آگے نکل گیا ہے۔ یہ بات زیادہ

خطرناک ہے... کہیں یہ بات شیر شاہ تک نہ پہنچ جائے۔'' ماہ نور واقعی گھبرا گئی تھی۔
''نہیں... تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ مجھے اور میں اسے جانتے ہیں۔ میں اکثر اس کے ساتھ چائے پیتا ہوں... اور رشوت میں کبھی چائے کا ڈبا، کبھی دودھ کا پیکٹ اور چینی وغیرہ لے جا کر دیتا رہتا ہوں۔ ابھی بھی ایسی ہی کوئی رشوت لے کر جاتا ہوں اس کے پاس... پوچھتا ہوں کہ اس نے کیا دیکھا... اور کچھ دیکھا بھی کہ نہیں۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں... میں اسے سنبھال لوں گا۔'' شاہ زیب نے اسے تسلی دی۔
''نہیں شاہ زیب! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ تم... تم یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ... اتنی دور کہ کوئی تمہیں ڈھونڈ نہ سکے۔ چھپ جاؤ کہیں۔ تھوڑے دن کے لیے ہی سہی... ہو سکتا ہے کچھ دن میں خود ہی کچھ فیصلہ ہو جائے... قدرت کی طرف سے... تم چلے جاؤ۔'' ماہ نور بہت بے چین اور وحشت زدہ سی دکھائی دے رہی تھی۔
''تم مجھے بزدلی کا سبق پڑھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں یہ کیسے...'' شاہ زیب نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن ماہ نور نے اسے کچھ کہنے نہیں دیا۔
''ہاں... ہاں میں چاہتی ہوں کہ تم یہ بزدلی اختیار کرو۔ جان تو بچ جائے گی تمہاری... جاؤ... چلے جاؤ اور اب اس وقت نظر آنا جب اس منحوس شیر شاہ کے بارے میں کچھ سن نہ لو... جاؤ۔'' ماہ نور نے روتے ہوئے کھڑکی بند کر دی۔
شاہ زیب نے ٹھنڈی سانس بھر کر بند کھڑکی پر نظر ڈالی۔ ٹوپی اتار کر اپنے سنہرے لمبے بالوں کو انگلیوں سے سنوارا اور ٹوپی دوبارہ سر پر رکھ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔
گلیوں سے نکلتا ہوا مرکزی سڑک تک پہنچا تو اسے دور سے میدان کے کونے میں جلنے والی آگ نظر آ گئی۔
چوکیدار ایک راؤنڈ لے کر آ گیا تھا اور اب چائے بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تین بلاک رکھ کر جو چولہا اس نے بنا رکھا تھا، اس میں جگہ جگہ سے چن کر لکڑیاں ڈال کر آگ جلا لیتا تھا اور ایک کالی ٹیڑھی میڑھی سی سلور کی کیتلی میں پانی بھر کر اس پر رکھ دیتا تھا۔
شاہ زیب دور سے یہ سب کچھ دیکھتا آ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے بلند آواز سے سلام کیا۔
''کیا حال ہے سمندر خان؟'' اس نے چوکیدار سے حال پوچھا تو اس نے ٹھنڈے سے لہجے میں جواب دیا۔ ''کیا بات ہے سمندر خان! آج کچھ ناراض ہو... یا اداس ہو... یا پھر کوئی پریشانی ہے... سب خیریت ہے نا؟''
''ہاں... ہمارے واسطے تو سب خیریت ہی ہے۔ تم اپنا خیریت کا فکر کرو۔'' اس نے ناراض لہجے میں جواب دیا۔
''کیوں... کیا ہوا؟'' شاہ زیب نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''او ئے... تم ہم سے پوچھتا ہے کہ کیا ہوا؟ ہم تم سے پوچھتا ہے... تم بتاؤ... تم کو کیا ہوا ہے؟ ہم نے تم کو شیر شاہ کے گھر میں جھانکتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ شیر شاہ کا بیوی بہت خوب صورت ہے... تم اس کو دیکھتا تھا۔'' سمندر خان کے لہجے میں غصہ تھا۔
''نہیں... میں اس کی بیوی کو نہیں، خود اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی بہت مدت سے تلاش ہے... اور میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا تھا۔ اب جا کر معلوم ہوا ہے کہ شیر شاہ اس گھر میں رہتا ہے... لیکن وہ مجھے نظر نہیں آیا۔'' شاہ زیب نے اس پر انکشاف کیا۔
''وہ ہوگا تو نظر آئے گا نا۔ وہ آج کل مفرور ہے... اس کے دشمن اور پولیس اس کو ڈھونڈ رہے ہیں... لیکن تم اسے کیوں ڈھونڈ رہے ہو... کوئی دشمنی؟'' سمندر خان نے پوچھا۔
''ہاں... اس نے مجھے قتل کیا ہے... دشمنی تو ہوئی نا۔'' شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا تو سمندر خان پہلے تو حیران ہوا پھر غصیلے انداز میں بولا۔
''اس نے تم کو قتل کیا ہے... پر خانہ خراب! تم تو ہمارے سامنے زندہ بیٹھا ہے... تم کیا بھوت ہے اس کا؟''
''ہاں... یہی سمجھ لو کہ میں بھوت ہوں... ایک ایسا بھوت جسے اپنے قاتل کی تلاش ہے... اور جب تک وہ اپنے قاتل سے انتقام نہیں لے گا، اس کی روح ادھر ہی بھٹکتی رہے گی... اپنے قاتل کے آس پاس۔'' شاہ زیب نے سنجیدگی سے کہا تو سمندر خان الجھ سا گیا۔
''دیکھو یارا! ہم کو آسان زبان میں سمجھاؤ کہ بات کیا ہے؟ تم نے ابھی جو کچھ بولا... ہم کو خدا قسم بالکل سمجھ نہیں آیا۔'' سمندر خان نے کنپٹی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے... میں تم کو شروع سے بتاتا ہوں... اپنی بدنصیبی کی کہانی۔ یہ افغانستان میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں سے شروع ہوتی ہے... ادھر ہم لوگ...'' شاہ زیب کو نہ جانے کیوں یہ خواہش ہوئی کہ آج وہ اپنے پرانے زخموں کو چھیڑے۔ اس نے سمندر خان کو سب کچھ بتانا شروع کیا۔
رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ لکڑیاں جل جل کر چٹخ رہی تھیں جس کے سبب چھوٹی چھوٹی چنگاریاں لمحہ بھر کو چمک کر بجھ جاتی تھیں۔ آخری تاریخوں کا بیمار سا زرد چاند افق سے طلوع ہو رہا تھا اور آہستہ آہستہ اس کی ہلکی سی چاندنی کا

www.pkdigest.com

انعکاس بڑھ رہا تھا جس سے ماحول کسی حد تک روشن ہوتا جا رہا تھا۔

وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ شاہ زیب بول رہا تھا اور سمندر خان پوری توجہ سے اس کی کہانی سنتے ہوئے... اس کی آواز کے زیر و بم اور حالات و واقعات کی دلچسپی میں کھویا ہوا تھا۔ رات کے سکوت میں اس کی ہلکی آواز میں چھپی جذباتی کیفیت بہت نمایاں طور پر محسوس ہو رہی تھی۔

اچانک کسی چھوٹے سے پتھر کے گرنے کی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ دونوں نے بہ یک وقت سر اٹھا کر اس طرف دیکھا جہاں سے آواز آئی تھی... پھر بہ یک وقت کئی باتیں ظہور پذیر ہو گئیں۔

ایک آدمی چہرے اور منہ پر کپڑا لپیٹے... ہاتھوں میں کلاشنکوف لیے... شور مچاتا ہوا تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر سمندر خان تو وہیں بیٹھا رہ گیا... کیونکہ وہی کلاشنکوف کی زد پر تھا لیکن شاہ زیب نے اٹھ کر دوڑ لگائی اور تیزی سے کچھ دور پڑے بڑے سارے پائپ کے پیچھے چھپ گیا... جہاں سے کلاشنکوف بردار کی آمد ہوئی تھی۔

"ہاتھ اوپر کر کے... ادھر ہی بیٹھے رہو... ورنہ کھوپڑی اڑا دوں گا... ہاتھ اوپر کرو۔" وہ آدمی چوکیدار کی پشت کی طرف گردن سے گن کی نال لگائے اس پر چلا رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر چوکیدار نے اندازہ لگایا کہ وہ شاید ایک نوعمر لڑکا ہے۔

وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے بیٹھا رہا۔ آنے والا بھی خاموشی سے کھڑا ہو گیا تو سکوتِ شب دوبارہ بحال ہو گیا... اور ایسے میں ہی ایک ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی نے پانی کے جوہڑ میں پتھر پھینکا ہو... اس کے ساتھ کسی کی ہلکی سی کراہ بھی سنائی دی۔

پھر "چھپ چھپ" کی دو تین آوازیں اور سنائی دیں جیسے کسی نے جوہڑ میں دو تین پتھر اور پھینکے ہوں۔ رات کے سناٹے میں یہ آوازیں بہت نمایاں طور پر سنائی دیں اور تھوڑی ہی دیر میں ان دونوں نے دیکھا کہ شیر شاہ اس پائپ کے پیچھے سے نکل کر ہاتھ پونچھتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔

قریب آ کر اس نے چوکیدار کو غور سے دیکھا۔

"کیا حال ہے سمندر خاناں؟ پھر وہ اسی بلاک پر بیٹھ گیا جس پر کچھ دیر پہلے شاہ زیب بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کلاشنکوف بردار کو چوکیدار کے سر پر سے ہٹ جانے کو کہا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔

ولی نے کلاشنکوف کاندھے پر لٹکائی اور منہ پر سے کپڑا تھوڑا نیچے کر لیا۔ وہ دونوں باتوں میں مصروف ہو گئے تو اس نے اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر بڑے پائپ کے پیچھے جا کر دیکھنے کا فیصلہ کیا... کہ آخر وہاں ہوا کیا ہے؟

وہاں ایک آدمی کی لاش پڑی تھی جس کے سینے اور پیٹ کے گھاؤ سے خون بہہ بہہ کر اس کے آس پاس تالاب کی شکل میں جمع ہو رہا تھا۔ اس کے لمبے سنہرے بال خون میں چپک گئے تھے اور اس کی تکلیف کی شدت سے پھٹی پھٹی آنکھیں آسمان کو تک رہی تھیں۔ وہ شاید دل پر ہونے والے پہلے وار سے ہی ختم ہو گیا تھا۔

ولی کھڑا ہوا اسے گھورتا رہا۔ عجیب بات ہے کہ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہونے کے بجائے وہ اپنے اندر ایک سنسنی سی محسوس کر رہا تھا... ایک جوش آمیز سنسنی!

"یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ پھر جھانک کر دیکھا تو وہ دونوں ابھی تک آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ "کاش! اس کام کے لیے شیر شاہ نے مجھے کہا ہوتا... تو کتنا مزہ آتا۔" وہ سوچتا ہوا آہستہ آہستہ پائپ کے پیچھے سے نکل آیا۔ اسی اثنا میں شیر شاہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔

سمندر خان پرخیال انداز میں ہلکی سی لنگراہٹ کے ساتھ چلتے ہوئے شیر شاہ کو دیکھتا رہا۔ وہ نوعمر لڑکا جو کلاشنکوف لیے اس کے سر پر کھڑا ہوا تھا قد میں شیر شاہ سے اونچا ہی تھا۔ وہ دونوں کچھ دور اسے نظر آتے رہے پھر نشیب میں اتر کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ آہستہ سے اٹھا۔ بھاری قدموں سے چلتا ہوا بڑے پائپ کے پیچھے تک گیا تو شاہ زیب کی لاش اسی کے خون کے سمندر میں پڑی ہوئی تھی اور اس کی کھلی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس نے افسوس میں سر ہلایا اور واپس ہو گیا۔

وہ دونوں طویل فاصلہ طے کر کے آخرکار اپنی پناہ گاہ پر پہنچ گئے۔ ولی نے محسوس کیا کہ شیر شاہ کا موڈ کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے کے بجائے اپنے آپ میں کھویا ہوا تھا اور کچھ اشتعال کی سی کیفیت میں تھا۔

صبح ہونے میں کچھ ہی گھنٹے تھے۔ ولی کی آنکھوں میں نیند اتر رہی تھی اور وہ سونا چاہتا تھا۔

"میں ادھر لیٹ جاؤں؟" اس نے بچھی ہوئی چادر کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا تو شیر شاہ جیسے پھٹ پڑا۔

"خانہ خراب! اتنی سی جگہ ہم کو پوری نہیں پڑتی... تو ادھر لیٹ جائے گا تو ہم کیا بیٹھا رہے گا؟ ہم کو بھی نیند آتی ہے... ابھی تم جاؤ ادھر سے۔" اس نے غصے سے جیسے چنگھاڑتے ہوئے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

"لیکن... میں... کدھر جاؤں؟" ولی نے پریشانی سے سوال کیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ رات کے اس پہر وہ گھر تو جا نہیں سکتا۔ بابا اور ماں تہجد کے لیے اٹھے ہوئے ہوں گے۔ اور اگر اس وقت وہ گھر میں داخل ہوا تو ایسی جوتا کاری ہوگی کہ ساری بستی جمع ہو جائے گی۔

"جہنم میں جاؤ... پر جاؤ ادھر سے۔" شیر شاہ نے بھنا کر لات چلائی جس کی زد سے بچنے کے لیے ولی نے ایک طرف چھلانگ لگائی اور پھر وہ باہر نکلتا چلا گیا۔

جھنڈ سے باہر نکل کر وہ اندھیری رات میں ادھر ادھر دیکھتا رہا کہ کدھر جائے... پر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک طرف گھر تھا جہاں وہ اس وقت جا نہیں سکتا تھا کیونکہ اس نے رات گھر سے باہر گزارنا ناقابلِ معافی جرم کر دیا تھا۔

دوسری طرف گل چاچا کا ہوٹل تھا جس میں بنچیں اور چارپائیاں تھیں۔ ویسے تو ساری بنچوں اور چارپائیوں کو اوپر تلے رکھ کر... ان میں زنجیر ڈال کر تالا ڈال دیا جاتا تھا تاکہ کوئی رات میں چرا کر نہ لے جا سکے۔

پر ہو سکتا ہے... لیٹنے کے لیے کوئی چیز مل ہی جائے۔

یہ سوچتے ہوئے اس نے ہوٹل کی طرف قدم بڑھا دیے۔ نیند سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور وہ جلد سے جلد سونا چاہتا تھا۔ وہ نیند سے لڑتا ہوا ہوٹل تک پہنچا تو ساری چارپائیاں اور بنچیں تالے کے ساتھ بند تھیں... پر اسے ہوٹل کی پچھلی دیوار سے لگی ایک چارپائی نظر آ گئی۔ اس کا بان جگہ جگہ سے ٹوٹ چکا تھا اور وہ بیٹھنے کے قابل بھی نہیں رہ گئی تھی۔ گل چاچا نے اسے دوبارہ بنوانے کی غرض سے باہر نکال دیا تھا۔ جس دن بھی چارپائی بنانے والا آتا... وہ نئی بن جاتی۔

فی الحال تو اسے وہی بہت بڑی نعمت لگی۔ اس نے اتار کر اسے بچھایا اور اسی جھلنگی چارپائی پر گر گیا۔ موسم اگرچہ ہلکا گرم ہو گیا تھا لیکن رات کے اس پہر ٹھنڈک ہو رہی تھی اور اسے اچھی خاصی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر وہ ٹھنڈک سے لڑتا رہا... پھر آخرکار اس پر نیند غالب آ گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔

رات کا اندھیرا کب چھٹا اور کب صبح نمودار ہوئی، اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ سورج نے افق سے سر نکالا تھا... اس کو اس کا بھی پتا نہ چلتا اگر درد و جلن کی ایک تیز لہر نے اس کے حواسوں کو جھٹکے سے بے دار نہ کر دیا ہوتا۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر چلایا اور پٹ سے آنکھیں پوری کھول دیں... لیکن فوراً ہی دوبارہ بند کر لیں کیونکہ آنکھیں کھولتے ہی جس چہرے پر نظر پڑی، وہ بابا کا غصے میں لال چہرہ تھا۔ ان کے ہاتھ میں ان کی مخصوص چھڑی تھی جس کی ایک ہی ضرب نے اس کے ذہن و جسم کے تمام تاروں کو مضراب بن کر جھنجھنا دیا تھا۔

"اٹھ جاؤ خدائی خوار!" عبدالرحمٰن نے ایک اور چھڑی اسے رسید کرتے ہوئے چلا کر کہا تو وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

"سارا رات تم ادھر آرام سے سوتا رہا... ادھر پورا گھر تمہارا پریشانی میں جاگتا رہا۔ خبیث کا بچہ! گھر کیوں نہیں آیا؟ جواب دو۔" عبدالرحمٰن غصے میں آگ بگولا ہو رہا تھا۔

ولی نے سر اٹھا کر باپ کو دیکھا... پھر دوسری جانب پیر لٹکا کر اترا... اطمینان سے چپل پاؤں میں ڈالی اور مڑ کر باپ کے سامنے آیا۔ "اس لیے نہیں آیا تھا گھر... کیونکہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ گھر کے دروازے پر تیرہ نمبر جوتا... میرا انتظار کر رہا ہے۔" ولی نے اطمینان سے کہا۔

"وہ جوتا تو ابھی بھی تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" عبدالرحمٰن نے ہاتھ میں پکڑا ہوا جوتا اسے دکھایا۔

"تو میں اب بھی نہیں جاؤں گا گھر... بھاگ جاؤں گا ادھر سے۔" ولی نے اسے مطلع کیا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔

"بھاگ جائے گا... چل پھر ابھی سے بھاگ... بھاگ۔ میں بھی دیکھتا ہوں... کتنا بھاگتا ہے... بھاگ..." عبدالرحمٰن نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی دھائیں سے گھما کر ماری تو وہ اچھل کر بھاگا۔ عبدالرحمٰن نے اسے بھاگتا دیکھ کر پاؤں سے اپنی بھاری چپل اتار کر اسے پھینک ماری پھر دوسری چپل اتار کر اس کی جانب پھینکی تو وہ اس کی زد سے باہر ہو چکا تھا۔

اس نے وہیں سے پلٹ کر دیکھا۔ بابا بکتا جھکتا... اسے برا بھلا کہتا... اپنی چپلیں اٹھا اٹھا کر پہن رہا تھا... وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ کیکروں کے جھنڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایک نظر اس چھوٹے سے خلا پر ڈالی جہاں سے شیر شاہ کی پناہ گاہ کا راستہ تھا لیکن وہ اندر گیا نہیں۔ اسے رات کا شیر شاہ کا رویہ اب تک یاد تھا۔ ویسے بھی اس کی طبیعت میں کسل مندی سی ہو رہی تھی اور بدن ٹوٹ رہا تھا۔ وہ اس وقت گھر جا کر لیٹنا اور سونا چاہتا تھا... اس لیے گھر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

گھر پہنچنے تک تیز بخار اس کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ وہ دروازے سے اندر داخل ہوا تو اس کی بہنیں کچھ کہتی ہوئی اس کے آس پاس آ گئیں... لیکن اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ بہ مشکل تمام کمرے تک پہنچا اور زمین پر بچھے بستر پر گر پڑا... پھر اسے معلوم نہیں کہ کیا ہوتا رہا۔

☆☆☆

اس کی راہ دیکھتے دیکھتے صبح سے شام ہو گئی... لیکن وہ نہیں آیا۔

"خدائی خوار ناراض ہو گیا ہے... لیکن کب تک... اب تو اس کو آنا چاہیے تھا... اب تو بھوک خود مجھے کھانے لگی ہے... کیا کروں؟" اس نے بڑبڑاتے ہوئے واسکٹ کی اندرونی جیب کو انگلیوں سے ٹٹولا اور دس روپے کا واحد نوٹ نکال کر آنکھوں کے سامنے لا کر غور سے دیکھنے لگا۔

"دس روپے... دس روپے میں کیا آئے گا... سارا پیسا ختم ہو گیا ہے... اب تو پیداگیری کرنی ہی پڑے گی۔" اس نے برا سامنہ بناتے ہوئے نوٹ واپس جیب میں رکھا... پھر اپنی کلاشنکوف اور پستول میں میگزین ڈالے۔ چاقو کی دھار کو اور صیقل کیا... دائیں ٹانگ پر پستول باندھا اور بائیں ٹانگ پر چاقو اس طرح باندھا کہ ایک لمحے میں نکال سکے... اور اس طرح تیار ہو کر وہ شام ڈھل جانے کا انتظار کرنے لگا۔

اس کا ارادہ تھا کہ وہ بڑی سڑک پر جائے گا۔ رات کو بارہ بجے کے بعد آنے والی آخری بسوں میں سے کسی کو روکے گا... اور اندر گھس کر مسافروں سے پیسے اور زیور وغیرہ لوٹ لے گا۔

'کچھ دنوں کا بندوبست تو ہو جائے گا۔' اس نے سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

کافی دیر کے بعد جب اندھیرا پھیل گیا تو بھوک اس کے اندر چنگھاڑنے لگی۔ وہ اپنی پناہ گاہ سے جھانک کر دیکھنے لگا۔ دور گل چاچا کے ہوٹل پر جلتی ہوئی روشنیاں جیسے اس کا منہ چڑھا رہی تھیں۔

ابھی جیب بھری ہوتی تو ادھر جاتا... دل اور پیٹ بھر کر کھانا کھاتا... گرما گرم چائے پی کر واپس آتا اور لمبی تان کر سو جاتا۔ "کیسا مجبوری ہے... شیر کو گیدڑ کی طرح رہنا پڑ رہا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ اسے اپنے ساتھیوں پر غصہ آ رہا تھا... کبھی ولی پر... کہ وہ کل سے جو غائب ہوا ہے تو شکل ہی نہیں دکھائی۔

رات کچھ اور گزر گئی تو وہ چھپتا چھپاتا اپنی پناہ گاہ سے نکلا۔ لنگڑا لنگڑا کر چلتا ہوا بڑی سڑک کے پل تک پہنچا... اور خاصا چکر کاٹ کر بہ مشکل وہ پل کے قریب پہنچ کر ایک محفوظ گوشے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے سے دوسرے شہروں کو جانے والی بسیں، ٹرک اور ٹرالر وغیرہ گزرتے رہے لیکن وہ اسے مطلوب نہیں تھے۔ اس لیے وہ چپ چاپ دیکھتا رہا۔

پھر آخر کار ان کی آمد میں کمی ہونے لگی۔ بارہ بج گئے تھے۔ اب آخری اکا دکا بسیں نکل رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے نکلا اور جلدی جلدی چند پتھر سڑک پر رکھ کر راستہ بند کرنے کی کوشش کی... ان پر کچھ جھاڑیاں ڈال دیں۔ اب اسے کسی بس کا انتظار تھا۔

بس آئی... سڑک پر رکاوٹ دیکھ کر اس کی رفتار کچھ کم ہوئی تو شیر شاہ لپک کر اس کے سامنے آیا۔ کلاشنکوف سے ایک چھوٹا برسٹ فائر کر کے اس نے ڈرائیور کو خوف زدہ کر کے بس رکوائی... اور دوڑ کر اندر چڑھ گیا۔ ڈرائیور کو اس کی سیٹ سے اٹھا کر پیچھے لایا اور اسے الٹا فرش پر لیٹنے کا حکم دیا... پھر مسافروں کو حکم دیا۔

"میں جس کی طرف اشارہ کروں، اپنی جیب سے بٹوے، پیسے اور عورتیں اپنا زیور نکال کر کھڑکی سے باہر پھینکتے جائیں... میرے ساتھی بس کے چاروں طرف موجود ہیں۔ کسی نے ہوشیاری دکھائی تو ایک برسٹ میں وہ... اور اس کے آس پاس بہت سے... اوپر پہنچ جائیں گے۔ جلدی کرو... پچھلی سیٹ!" اس نے گن کی نال سے پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا تو لوگوں نے اپنی اپنی چیزیں نکالیں لیکن پھینکنے کی نوبت نہیں آئی۔ ہائی وے پولیس پٹرول والوں نے رات کے اس پہر ویرانے میں کھڑی بس کو دیکھ کر اسے چیک کرنے کا ارادہ کیا اور وہ بلند آواز میں سائرن بجاتے ہوئے کونوں سے ادھر آنے لگے۔ پسپے بیٹھتا ہوا شیر شاہ کا ہاتھ رک گیا۔

شیر شاہ نے عافیت اسی میں جانی کہ دوڑ کر بس سے اترے اور فرار ہو جائے۔ وہ سڑک کے کنارے دوڑا اور تیزی سے پل سے اترتے ہوئے آگے کہیں جانے کے بجائے پل کے نیچے اگی ہوئی جھاڑ جھنکار جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ پیروں کے نیچے لیاری ندی کا گندا پانی... جھاڑیوں میں چھپے حشرات اور مچھر... وہ ان سے تنگ تو بہت ہو رہا تھا مگر خاموشی سے چھپے رہنے پر مجبور تھا۔

اسے پل کے اوپر سے بھاری جوتوں کی آہٹ اور باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ شاید پل کی ریلنگ کے ساتھ کھڑے ہوئے نیچے نشیب میں نظر آنے والے علاقے کا جائزہ لے رہے تھے۔

"اگر اتنے سارے ڈاکو تھے تو منٹوں میں غائب کہاں ہو گئے؟ یہاں سے تو دور تک کا علاقہ بالکل صاف نظر آ رہا ہے... اور ہمیں یہاں سے کوئی چلتا پھرتا یا بھاگتا نظر ہی نہیں آیا۔" وہ کوئی پولیس والا ہی تھا جو اوپر پل پر کھڑا علاقے کا جائزہ لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ایک ہی جگہ ہے ڈاکوؤں کے چھپنے کی... پل کے نیچے... ہو سکتا ہے کہ وہ نیچے چھپے ہوئے ہوں۔" ایک ذہین پولیس مین نے تجزیہ کیا۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں، نیچے اترتے ہیں اور ان جھاڑیوں میں دو چار برسٹ مارتے ہیں۔ اگر چھپے ہوں گے تو نکل کر بھاگیں گے۔" ایک اور نے جان لیوا مشورہ دیا۔

"بات تو ٹھیک ہے۔ دیکھ لیتے ہیں۔ ایک برسٹ بھی فائر کیا تو وہ نکل کر بھاگیں گے اور ہم انہیں چھاپ لیں گے۔"

پھر ایسا ہی ہوا۔ جتنی دیر میں وہ پل سے اتر کر نیچے آئے... اتنی دیر میں شیر شاہ نے جلدی سے اپنے آپ کو پل کے موٹے سے پلر کے پیچھے پوشیدہ کر لیا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اپنی ٹانگ کو پیچھے کرنا بھول گیا۔ اس برسٹ سے آنے والی ایک گولی نے اس کی پنڈلی میں قیامت مچا دی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے ہونٹوں سے نکلنے والی چیخ کو قابو میں کیا... اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ سکوتِ شب میں ویران سناٹا کچھ دیر فائرنگ سے گونجتا رہا پھر خاموش ہو گیا۔

'شٹ! کوئی بھی نہیں ہے یہاں... وہ لوگ شاید کسی اور طرف نکل گئے ہیں۔ چلو یارو! کوئی شکار نہیں ملا... آگے تلاش کرتے ہیں۔ وہ کسی اور جگہ سے کسی گاڑی کے ذریعے نکل گئے ہیں شاید... دیکھتے ہیں... کم آن!"

کسی پولیس والے کی آواز آئی اور پھر ان کے واپس جاتے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ لیکن وہ فوراً ہی وہاں سے نہیں نکلا۔ اس نے اپنی پنڈلی کا جائزہ لینے کی کوشش کی اور اندازہ لگایا کہ ہڈی تو بچ گئی ہے لیکن گولی گوشت کو بری طرح پھاڑتی ہوئی نکل گئی ہے۔ زخم سے بری طرح خون بہہ رہا تھا... اور اس کے جسم میں ایک سنسناہٹ کے ساتھ ساتھ... اندر ہی اندر کچھ بیٹھ جانے کا سا احساس نمودار ہو رہا تھا۔

اس نے خطرے کا اوراک کرتے ہوئے اپنی چادر میں سے ایک کافی بڑا ٹکڑا پھاڑ کر اپنی پنڈلی پر کس کر لپیٹا اور اس پر کچھ باندھ دیا۔ اس کے پاس وقت کم تھا اور وہ بے حال ہونے سے پہلے پہلے اپنی پناہ گاہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔

خون کا بہاؤ رک گیا تھا... یا شاید کم ہو گیا تھا۔ وہ تکلیف کے کن کن عذابوں سے گزرتا... نہ جانے کیسے کیسے راستے کاٹتا... آخر کار اپنی پناہ گاہ تک پہنچ کر گر گیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے سامنے رکھی پانی کی بوتل سے بہت سارا پانی پیا اور لیٹ گیا تھا۔

☆☆☆

فائرنگ کی تیز آواز رات کے سناٹے میں گونجی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا؟" اس کی بہن نے فوراً پوچھا۔

"وہ... آواز... فائرنگ؟" اس نے ٹوٹے لفظوں میں کہا۔

"ہاں... کسی نے فائرنگ کی ہے... پر تم کو کیا؟ تم لیٹو، آرام کرو۔" بہن نے اس کے کاندھے پکڑ کر لٹانے کی کوشش کی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ پسینے میں بھیگا ہوا ہے... اور اس کا بخار سے جلتا ہوا بدن ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ بہن نے اس کی پیشانی اور کلائیاں چھو کر دیکھا اور خوش ہو گئی۔

"ولی! تیرا بخار اتر گیا ہے... یا اللہ شکر!" اس نے جلدی جلدی اس کے چہرے اور گردن سے پسینا اپنے دوپٹے سے پونچھا۔

"ولی! ابھی تو بیٹھا رہ... میں تیرے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔" اس نے لا کر ٹھنڈے دودھ کا پیالہ اسے پکڑایا جسے وہ غٹاغٹ پی گیا۔ بہن نے اسے پھر سے لٹا دیا تھا۔

'نہ جانے اس کی کیا حالت ہو گی؟ کہیں پولیس نے تو نہیں گھیر لیا؟ پتا نہیں... مر اکہ ابھی زندہ ہے؟' اس کا ذہن ابھی سوچوں میں غلطاں تھا اور اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ صبح وہ ضرور باہر جائے گا اور اس کی خیریت معلوم کرے گا... اسے فکر ہو گئی تھی اور اسی فکر میں کروٹیں بدل بدل کر اس نے صبح کر دی۔ صبح ہونے تک اس کا بخار بالکل اتر چکا تھا۔ صرف ہلکی سی نقاہت کا احساس تھا جو اس وقت دور ہو گیا جب اس نے ڈٹ کر ناشتا کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب کی نظریں بچا کر باہر نکل گیا۔

وہ آرام آرام سے چلتا ہوا بستی سے باہر نکلا اور گل چاچا کے ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اسی راستے پر پہلے کیکر کا جھنڈ آتا تھا اور اس کو دراصل جانا بھی وہیں تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ بستی کے باہر ہی اسے اپنے دو تین دوست مل گئے۔ وہ اس سے باتیں کرتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ان کا رخ گل چاچا کے ہوٹل کی طرف تھا جس کے پچھلی جانب ایک نامکمل سی دیوار ان کی بیٹھک تھی جہاں ایک گھنا درخت سایہ کیے ہوئے تھا۔ جھنڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے اس جگہ کا جائزہ لیا جہاں سے وہ شیر شاہ کی خفیہ پناہ گاہ میں جاتا تھا۔ حسب توقع وہاں اسے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ وہ دوستوں کی باتیں سنتا آگے بڑھتا چلا گیا۔

دوستوں نے ہی اسے بتایا کہ آج کل اس علاقے میں پولیس بہت گھوم رہی ہے۔

"ابھی دیکھنا، دوپہر ہونے سے بھی پہلے پولیس کی گاڑیاں نظر آنا شروع ہو جائیں گی۔ وہ اکثر دوپہر کا کھانا گل چاچا کے ہوٹل پر کھاتے ہیں۔ کبھی موبائل ہوتی ہے... کبھی کاریں اور کبھی موٹر سائیکلوں پر وہ ادھر ہی کہیں نہ کہیں گھومتے رہتے ہیں۔" بخت بہادر نے بتایا۔

www.pkdigest.com

"لیکن پولیس ادھر کیوں گھوم رہی ہے؟ کسی کو تلاش کر رہی ہے کیا؟" ولی نے اس سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں... سنا ہے کہ پولیس شیر شاہ کو تلاش کر رہی ہے۔ وہ پچھلے دنوں کچھ پولیس والوں کو مار چکا ہے اور ابھی چند دن پہلے اس نے ادھر دوسری بستی میں کسی جوان کا خون کیا ہے۔ چاقو مار مار کر اس کا قیمہ کر دیا۔ پولیس کا خیال ہے کہ وہ آس پاس ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔" بخت بہادر نے اپنی معلومات کا رعب ڈالا۔

"اچھا... یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ ادھر ہی کہیں چھپا ہوا ہے؟" ولی نے پھر پوچھا۔

"ابھی تین چار دن پہلے اس نے بڑی سڑک پر ایک مسافر بس کو لوٹنے کی کوشش کی تھی... پر پولیس پٹرول کار وہاں پہنچ گئی تو وہ وہاں سے بھاگ گیا۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ شیر شاہ تھا۔ پولیس نے فوراً چیک کیا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ انہیں جن جگہوں پر شبہ ہوا کہ شیر شاہ یہاں چھپا ہو سکتا ہے، انہوں نے وہاں خوب فائرنگ کی۔ ہو سکتا ہے، وہ جہاں چھپا ہوا ہو... وہیں گولی لگ کر مر گیا ہو۔" یہ اس کا دوسرا دوست نصیب گل تھا۔

"مر گیا ہو؟ اتنی خاموشی سے... چپ چاپ مر جائے گا وہ... ناممکن ہے۔" ولی نے اپنی بے یقینی ظاہر کی۔

"کیوں... ناممکن کیوں؟ کیا وہ گولی کھا کر مر نہیں سکتا؟" بخت بہادر کچھ حیران ہو کر بولا۔

"نہیں نہیں... میرا مطلب ہے... اتنا بہادر اور شیر دل آدمی جو پچاس پچاس دشمنوں میں گھر کر بھی ہمت نہیں ہارتا... مقابلہ کرتا ہو اور مار دھاڑ کرتا ہوا صاف نکل جاتا ہو... وہ چوہے کی طرح کہیں دبکا ہوا مارا جائے... کچھ دل کو لگتی نہیں ہے بات۔" ولی نے اس خیال کو قطعاً ناقابلِ یقین قرار دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی! تیرے دل کو کیوں لگے گی ایسی بات... وہ ہیرو جو ہوا تیرا۔" نصیب گل نے دور پل کے اوپر رک جانے والی پولیس کار کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے انہیں اس طرف متوجہ کیا۔

دونوں دوستوں کو کہیں جانا تھا۔ وہ ولی سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے تو ولی نے واپسی کا قصد کیا۔ وہ جلد سے جلد شیر شاہ کی خیر خبر معلوم کرنا چاہتا تھا۔ تیزی سے چلتا ہوا وہ کیکروں کے جھنڈ تک پہنچا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے لپک کر اس خلا میں داخل ہو گیا۔ جہاں سے وہ شیر شاہ کی پناہ گاہ پہنچتا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ اس کے ٹھکانے پر موجود تھا۔

وہاں وہ چادر اوڑھے سکڑا سمٹا شاید سو رہا تھا۔ ایک ٹانگ پر چادر کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر باندھا گیا تھا اور وہ بھی خون سے تر...... ہو رہا تھا۔ نہ جانے کہاں سے چند موٹی موٹی آوارہ مکھیاں بھن بھن کی تیز آواز کے ساتھ اس کے زخم سے لہو چاٹنے کے لیے آگئی تھیں۔ گھنی شاخوں میں سے چھن کر آنے والی سورج کی چند کرنوں نے اتنی روشنی کر رکھی تھی کہ اسے بالوں کے جھاڑ جھنکاڑ سے جھانکتے اس کے چہرے پر کھنڈی زردی بھی صاف نظر آرہی تھی... اور پہلی نظر میں وہ اسے زندہ انسان سے زیادہ ایک لاش لگا۔ اس نے گھبرا کر اس کے قریب بیٹھ کر اسے ہلایا جلایا۔

"شیر شاہ! شیر شاہ! آنکھیں کھولو... شیر شاہ! یہ میں ہوں... ولی رحمن... شیر شاہ!" اس نے گھبرا کر نہ صرف اسے آوازیں دیں بلکہ اسے جھنجوڑ بھی ڈالا۔

بہ مشکل شیر شاہ کے ہونٹوں سے ایک کراہ سی نکلی اور کوشش کر کے اس نے تھوڑی سی آنکھیں کھولیں۔ ہونٹ خشک ہو کر جڑ سے گئے تھے اس لیے اس سے کچھ بولا نہیں گیا۔ ولی نے لپک کر پانی کی بوتل اس کے منہ سے لگا دی جسے اس نے بے صبروں کی طرح پینے کی کوشش کی۔ شاید بہت شدید پیاس تھی۔ کچھ اس کے حلق میں گیا... کچھ پانی گرا... بوتل خالی ہو گئی۔ اس نے آخری گھونٹ لے کر سکون کا ایک لمبا سانس لیا اور پوری آنکھیں کھول کر ولی کو گھورا۔

"تم کدھر مر گیا تھا خانہ خراب!" اس نے کمزوری آواز میں کہا۔

"میں بیمار ہو گیا تھا۔ بہت تیز بخار ہو گیا تھا... اٹھ نہیں سکتا تھا... اسی لیے ادھر نہیں آسکا۔ لیکن تم کو کیا ہوا ہے؟ ٹانگ پر یہ زخم کیسا ہے؟" ولی نے پوچھا۔

"ہم بھوک سے بے تاب ہو کر باہر نکلا تھا۔ پیسا بھی ختم ہو گیا تھا۔ ادھر بڑی سڑک پر کوچ کو روکا تھا، پر وہ خدائی خوار پولیس ادھر آگئی۔ ہم بھاگ کر پل کے نیچے چھپ گیا تھا۔ انہوں نے میرے کو ڈھونڈا... ہم نظر نہیں آیا تو انہوں نے اندھا دھند فائرنگ کیا۔ پتا نہیں کیسے ایک خانہ خراب گولی نے ہمارا پاؤں اڑا دیا ہے۔ ہم کدھر جاتا... بہت مشکل سے ادھر آکے پڑ گیا۔ تم کو پتا ہے... ہم چار دن سے بھوکا ہے... اور ٹانگ کا حال خراب ہے۔ سارا گوشت گولی نے اڑا دیا ہے۔ گوشت بھی گیا... خون بھی بہت زیادہ نکل گیا... پتا نہیں ہم زندہ کیسے ہے... تم ادھر آتا ہوتا تو ہم کو یہ مصیبت بھی نہیں پڑتا۔" وہ بولتے بولتے نڈھال ہو گیا تو خاموش ہو گیا۔

آنکھیں بھی موند لیں۔

"اچھا... تمہارے پاس تھوڑا بہت پیسا بھی نہیں ہے کیا؟ میں تمہیں کچھ کھانے پینے کو لا دیتا ہوں، دوائی کی ضرورت ہے تو وہ بھی بتا دو... میں لے آؤں گا۔" ولی نے ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ جواب میں شیر شاہ نے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ واسکٹ کی اندرونی جیب سے نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا اور پھر آنکھیں بند کر کے خاموش لیٹ گیا۔ یہ کچھ پیسے اس نے بس کنڈیکٹر سے چھینے تھے۔

ولی نوٹ لے کر گیا اور تھوڑی ہی دیر میں اس کے لیے دودھ کے ڈبے... پاپے بسکٹ... پانی اور دوائیں لے کر آگیا۔ اسے کھلایا پلایا پھر دوائیں کھلائیں... اور آخر میں ملک پیک کا ایک اور ڈبا پلایا تو شیر شاہ کی جان میں جان آئی اور وہ تھوڑا سا اٹھ کر بیٹھنے اور باتیں کرنے کے قابل ہو گیا۔

"اگر تم آج بھی نہیں آتا... تو کل تم کو ادھر میری لاش ملتی۔" شیر شاہ نے چندھی چندھی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس رات تم نے مجھے یہاں سے بھگا دیا تھا تو میں ہوٹل کے پیچھے ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا تھا۔ اس وقت سردی بہت ہو رہی تھی مگر میں گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے وہیں سردی سے لڑتے لڑتے سو گیا۔ صبح بابا نے ڈنڈا مار کر مجھے جگایا اور گھر لے گیا مگر اس وقت تک سردی نے مجھے بخار میں مبتلا کر دیا تھا۔ اتنا تیز بخار چڑھا کہ مجھے اپنا کچھ ہوش ہی نہیں رہا... کل جب فائرنگ ہوئی تھی تو اس کی آواز سے میں گھبرا کر اٹھا۔ میں پسینے میں شرابور تھا اور میرا بخار اتر چکا تھا... تب ہی میں یہاں آسکا ہوں۔" ولی نے اپنی طرف سے وضاحت پیش کی تو شیر شاہ سر ہلاتے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔

"ویسے ایک خبر ہے جو یہاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے... کہ پولیس کو شبہ ہو گیا ہے کہ تم یہیں... اس علاقے میں کہیں چھپے ہوئے ہو۔ اور آج کل میں ہی تمہیں تلاش کرنے کے لیے پولیس کا ایک گرینڈ آپریشن ہونے والا ہے۔" ولی نے جو اطلاع فراہم کی تھی، اس نے شیر شاہ کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔

"اچھا... اس طرح تو وہ خانہ خراب... مجھے پکڑ لیں گے... یا پھر مار دیں گے۔" اس نے تھوڑے تیز لہجے میں کہا تو ولی اس کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔

"تمہیں کیا پسند ہے؟ پکڑا جانا... یا مارا جانا؟"

ولی نے اس سے پوچھا تو شیر شاہ کی آنکھوں میں چنگاریاں چمکیں۔ "اوئے خدائی خوار! مجھے نہ تو مارا جانا پسند ہے... اور نہ ہی پکڑا جانا... مجھے ادھر سے بھاگ جانا پسند ہے۔" شیر شاہ نے چلاتے ہوئے کہا۔

"اس ٹانگ کے ساتھ؟" ولی نے اس کی زخمی ٹانگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہی تو مصیبت ہے یار! یہ زخمی ٹانگ ہی میرے کو پکڑوائے گی... یا مروائے گی۔ سن ولی! کیا تو میرے کو ادھر سے نکال سکتا ہے؟" شیر شاہ نے ولی کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"جائے گا کدھر؟"

"ادھر منگھوپیر میں... ایک ٹھکانا ہے میرے پاس... اس کا کسی کو پتا نہیں ہے۔ بس تو کسی طرح مجھے سب سے چھپا کر... وہاں تک پہنچا دے... پھر مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔" شیر شاہ نے ولی سے بڑے شیریں لہجے میں کہا تو ولی اس کو گھورتے ہوئے بولا۔

"میں کیوں پہنچاؤں؟ مجھے کیا فائدہ ہے اس میں... بلکہ الٹا نقصان ہی ہے... تیرے ساتھ میں بھی پکڑا جاؤں گا۔" ولی نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

"کسی چیز میں چھپا کر لے چل... نہیں پکڑا جائے گا۔" شیر شاہ نے التجا کی۔

"لیکن میں ایسا کیوں کروں... مجھے اس کا کیا فائدہ ہے؟ میں خوامخواہ کی مصیبت میں کیوں پڑوں؟" اس نے اسی رکھائی سے جواب دیا تو شیر شاہ اسے پُرخیال نظروں سے گھورتا رہا۔

"تم کس قسم کا فائدہ چاہتا ہے؟ اگر تجھے پیسا چاہیے تو میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں، اس مصیبت سے ایک بار نکل جاؤں تو تجھے اتنا پیسا دوں گا جو تو نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا ہو گا۔ ابھی بتا دے... بول کتنا پیسا چاہیے؟" شیر شاہ نے پوچھا تو ولی نے نفی میں سر ہلایا۔

"پیسا نہیں چاہیے۔" اس نے صاف جواب دیا تو شیر شاہ حیران ہو گیا۔

"پیسا نہیں چاہیے... تو پھر کیا چاہتا ہے؟" اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا... مجھے اپنے جیسا بنا دو۔ میں شیر شاہ بننا چاہتا ہوں... جس کے نام سے لوگ دہشت زدہ ہو جائیں۔ وہ بڑے سے بڑے دشمنوں کو چٹکیوں میں مسل دے... اور پچاس دشمن بھی گھیر لیں تو بھی ہار ان کا مقدر ہو۔ میں ایسا ہی بننا چاہتا ہوں... جیسے تم ہو۔" ولی نے مضبوط لہجے میں کہا تو شیر شاہ اسے گھور کر دیکھتا رہا۔

"ایسے لوگ بنائے نہیں جاتے... اوپر سے بن کر دنیا

www.pkdigest.com

میں آتے ہیں۔'' شیر شاہ نے کہا۔

''کیوں... تم نے پیدا ہوتے ہی بندوقیں چلانی شروع کر دی تھیں؟ پیدا ہوتے ہی دشمنوں پر ٹوٹ پڑے تھے؟'' ولی نے مضحکہ اڑانے کی کوشش کی۔

''اچھا ٹھیک ہے... میں نے تجھے ہر طرح کے ہتھیار چلانا اور انہیں سنبھالنا سکھا دیا ہے۔ چاقو سے وار کرنا بھی سکھا دیا ہے۔ اب کوئی دشمن ڈھونڈ لے... اور بن جا شیر شاہ۔ اب تیرے لیے کیا مشکل ہے؟'' شیر شاہ کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں رہ رہ کر چنگاریاں لہرا رہی تھیں۔

''تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تم سے کیا چاہتا ہوں... اور تم مجھے جو کچھ سکھا چکے ہو... اس کے بارے میں تمہیں خود بھی بہت اچھی طرح اندازہ ہے کہ وہ شیر شاہ بننے کے لیے کافی نہیں ہے۔ لفظوں سے کھیل کر تمہارا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ اگر تم سچ مچ چاہتے ہو کہ میں تمہاری مدد کروں... تو تمہیں بھی سچ مچ میری مدد کرنا ہوگی۔ جو کچھ میں چاہتا ہوں... میری اس خواہش کو پورا کرنا ہوگا اور یہ فیصلہ ابھی اور اسی وقت کرنا ہوگا... ہاں یا نہیں... بولو...'' ولی نے اس کے اندر ابھرتے غصے کی ذرہ برابر پروا نہیں کی۔ اب وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ دونوں ہی اپنی اپنی پوزیشن کا جائزہ لے رہے تھے۔ شیر شاہ جو ہمیشہ غالب رہنے والا تھا... آج وقت اور حالات کے جبر کے سبب مغلوب تھا۔

ولی بہت دن سے جس دن اور وقت کا انتظار کر رہا تھا... وہ آج آ گیا تھا۔ آج وہ شیر شاہ سے جو چاہے منوا سکتا تھا۔

آخرکار شیر شاہ نے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے وعدہ کر لیا کہ وہ ولی کو اپنے جیسا بنانے کے لیے بہت اچھی تربیت دے گا۔ اپنے اڈے پر ایک دفعہ پہنچ جانے کے بعد وہ اپنے کئی ساتھیوں کو اس کے ساتھ لگا دے گا جو اسے عملی طور پر وارداتوں میں حصہ دلا کر اسے بے خوف، نڈر اور ماہر فن بنا دیں گے۔

''اب ٹھیک ہے؟ اب بول... مجھے لے کر جا سکتا ہے؟'' شیر شاہ نے وعدہ کیا تو ولی خوشی سے کھل اٹھا۔

''مسئلہ ہی کوئی نہیں... میں ابھی کچھ بندوبست کر کے آتا ہوں۔'' وہ اٹھا اور خوشی خوشی باہر نکل گیا۔

'نہ جانے کیا بندوبست کرنے گیا ہے خانہ خراب!' شیر شاہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے خاموشی سے بیٹھا نہ جانے کن خیالوں میں گم تھا۔ ٹانگ کی بے انتہا تکلیف میں دوا کھانے سے کسی حد تک افاقہ ہوا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگ کو تھوڑا بہت ہلانے کی کوشش کی تو تکلیف کی شدت سے اس کے منہ سے کراہیں نکلنے لگیں... لیکن پھر بھی ہمت کر کے اس نے خون میں بھیگا ہوا چادر کا وہ ٹکڑا ٹانگ کے زخم پر سے اتارا۔ ولی کی لائی ہوئی دواؤں کی تھیلی سے روئی کا بنڈل نکالا اور اس سے زخم صاف کرنے کی کوشش کی۔ پھر مرہم لگا کر اس پر پٹی باندھی۔ اس پورے عمل میں وہ بے انتہا تکلیف جھیلتا رہا... مگر یہ بہت ضروری تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے دو چین کلر گولیاں اور نگل لیں۔ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے، آنکھیں بند کیے وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ گھنٹا بھر گزر چکا تھا ولی کو گئے ہوئے... پھر اچانک ہی وہ سامنے آ گیا۔

''شیر شاہ! یہ دیکھو، تمہارے لیے کیا چیز لے کر آیا ہوں۔'' ولی نے اسے ایک بوری دکھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا ہے؟'' شیر شاہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بوری ہے... میں نے ایک کباڑ والے سے اس کا ٹھیلا کرائے پر لیا ہے... شام تک کے لیے... اس کو یہ بول کر کہ میری نوکری ختم ہو گئی ہے، پیسے بھی ختم ہو گئے ہیں۔ گھر میں آٹا بھی ختم ہو گیا ہے... تھوڑا پیسا کمانا ہے۔ شام کو تمہارا ٹھیلا اور پچاس روپے بھی تم کو دے دوں گا۔ اب تمہیں یہ بوری اوڑھ کر ٹھیلے کے نچلے حصے میں لیٹنا پڑے گا۔ فکر نہ کرو... تکلیف نہیں ہوگی۔ میں نے ٹھیلے کے نیچے ایک پھٹا بچھا دیا ہے۔ اوپر ٹھیلے پر ردی، سوکھی روٹیاں اور ٹوٹی پھوٹی چیزیں پڑی ہیں... میں آواز لگاتا ہوا... ٹھیلا لے کر تمہارے ٹھکانے پر پہنچ جاؤں گا۔ ٹھیک ہے... تم راضی ہو؟'' اس نے شیر شاہ سے پوچھا تو اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر نہ جانے کیا کیا جتن کر کے اس نے شیر شاہ کو زخمی ٹانگ سمیت بوری اوڑھا کر ٹھیلے کے نچلے حصے میں اس طرح لٹایا کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ یہاں کوئی انسان لیٹا ہوا ہے۔

بھری دوپہر میں سورج سر پر تھا۔ وہ ٹھیلا کچے راستوں پر دھکیلنے کی جدوجہد میں پسینے پسینے ہو رہا تھا۔

''شیر شاہ! تم بہت وزنی ہو... تمہیں گھسیٹنا بہت مشکل کام ہے۔'' وہ ٹھیلے کو زور لگاتے لگاتے نیچے جھک کر کہہ رہا تھا۔

''او خانہ خراب! جوان آدمی ہے... اتنا سا کام مشکل لگ رہا ہے؟'' بوری میں سے آواز آئی۔

''اگر تیری ٹانگ زخمی نہ ہوتی... تو میں تجھ سے کہتا کہ اگر یہ کام آسان ہے... تو تو کر لے... پھر تجھے پتا چلتا۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''اچھا اچھا، چل! اب تھوڑی دور رہ گیا ہے... بس یہ سامنے جو پہاڑیاں ہیں، انہی میں ہے میرا ٹھکانا۔'' شیر شاہ کی آواز آئی۔

''تجھے نظر آ رہا ہے؟'' ولی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں... بوری میں سوراخ ہیں جگہ جگہ... انہی میں سے ایک سوراخ سے دیکھ رہا ہوں میں باہر... بس یہ جو پتلی پہاڑی کے قریب تین بڑے بڑے پتھر پڑے ہیں ایک ساتھ... وہیں چل۔'' اس نے ہدایات دیں اور ولی ہانپتا کانپتا ٹھیلا دھکیلتا وہاں پہنچ گیا۔

اس نے ایک لمحہ وہاں رک کر آس پاس نظر ڈالی۔ دور تک یہ ویرانہ... سناٹوں سے گونج رہا تھا۔ دور تک کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ ''پتھروں کے ساتھ ہی ایک پتلی سی دراڑ نظر آ رہی ہوگی... ٹھیلا اسی میں لے چل۔'' شیر شاہ نے کہا تو ولی نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

دراڑ آگے جا کر پہاڑیوں میں اندر کہیں داخل ہو کر بائیں جانب مڑ گئی تھی۔ وہ ٹھیلے کو آہستہ آہستہ دھکیل کر وہاں تک آیا تو دراڑ وہاں سے ایک سرنگ نما حصے میں داخل ہو گئی۔ وہاں باہر کی تیز روشنی کے مقابلے میں کچھ اندھیرا سا تھا۔ ولی ٹھٹک کر رک گیا۔

''چلو چلو... اندر کی طرف چلو... ڈرنے کی کوئی بات نہیں... یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' شیر شاہ نے بوری سے منہ نکال لیا تھا اور وہ سرنگ نما راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ولی نے کچھ جھجکتے ہوئے ٹھیلا آگے بڑھایا۔ سائے والے حصے میں داخل ہوتے ہی ولی کو ایک دل پذیر خنکی کا سا احساس ہوا... اور وہ دھپ سے وہیں پتھریلی زمین پر بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ بوری سے منہ نکالے شیر شاہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ دھوپ کی حدت سے اس کا چہرہ تپ کر لال چقندر ہو گیا تھا اور اس پر پسینہ ریلوں کی صورت بہہ رہا تھا جسے اس نے آستین سے پونچھا۔

''ابھی کتنی دور اور جانا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''بس تھوڑی دور آگے جا کر یہ راستہ سیدھے ہاتھ کو مڑتا ہے... تم مجھے وہیں اتار کر چلے جانا۔'' شیر شاہ نے ہدایت دی اور وہ شیر شاہ کو مطلوبہ جگہ اتار کر جانے لگا تو شیر شاہ نے... کچھ پیسے اسے دیے۔

''اس میں سے کچھ پیسے کباڑی کو دو گے... کچھ خود رکھ لینا اور کچھ پیسوں کا میرے لیے دودھ... کھانا... پانی اور دوائیں لے آنا۔ اور ہاں! دوسرے تیسرے دن چکر لگاتے رہنا... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے... آؤ گے؟'' شیر شاہ نے پوچھا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا واپسی کے لیے مڑا۔

''راستہ یاد رہے گا؟'' شیر شاہ نے پوچھا تو وہ ہاتھ ہلاتا ہوا تیزی سے ٹھیلا دھکیلتا ہوا چلا گیا۔

دوسرے تیسرے روز وہ چکر لگاتا اور کھانا، پانی اور دوائیں وغیرہ اسے دے آتا۔ اس کا یہ معمول تقریباً مہینے بھر تک چلتا رہا... اور شیر شاہ نے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس کا زخم بھر رہا تھا اور وہ ایک لکڑی کے سہارے چلنے پھرنے لگا تھا۔ شیر شاہ نے ولی سے اپنے بہت سے کام کروائے۔ کسی سے پیسے بھی منگوائے... کچھ پیغامات کہیں بھجوائے... اور ایک سیل فون بھی منگوا لیا۔ جس جگہ اس کا ٹھکانا تھا، وہ حصہ ویران سا تھا۔ آس پاس دور دور تک کوئی بستی بھی نہیں تھی۔ ہاں، پہاڑیوں کے دوسری جانب سے ایک سڑک گزرتی تھی جو منگھوپیر کے مزار کے سامنے سے ہوتی ہوئی آگے چلی گئی تھی۔

اسی سڑک پر بھی کبھی کوئی گاڑی... گدھا گاڑی... یا ریڑھے وغیرہ گزرتے تھے۔ دور ایک چھوٹی بستی تھی۔ وہاں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے سبزیاں، پھل اور پانی وغیرہ انہی گدھا گاڑیوں پر لے جایا جاتا تھا۔

شیر شاہ اب اس قابل ہو گیا تھا کہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان ٹیلوں تک آ جاتا تھا جہاں سے سڑک نظر آتی تھی۔ وہ اور ولی اکثر پتھروں پر بیٹھے رہتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے۔ سڑک پر آنے جانے والوں کو دیکھتے رہتے۔ بعض سائیکل سوار یا گاڑی سوار انہیں دور او نچائی پر بیٹھا دیکھتے ہوئے گزر جاتے۔ ان میں سے کوئی منچلا ان کی طرف دیکھتا اور ہاتھ بھی ہلا دیتا... جس کا جواب ولی بڑی خوش دلی سے دیتا۔ یوں کھلی فضا اور تازہ ہوا میں کچھ وقت گزار کر دونوں اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے جاتے۔

''اب تمہاری طبیعت ٹھیک ہے... زخم بھی کافی حد تک بھر گیا ہے... تم نے میرے بارے میں کیا سوچا؟'' آخرکار ولی نے وہ سوال کر ہی دیا جس کا انتظار شیر شاہ کئی دنوں سے کر رہا تھا۔

''ہاں... فارغ وقت بہت ہوتا ہے میرے پاس... اور میں اکثر اس میں سوچتا ہی رہتا ہوں۔ تمہارے بارے میں بھی میں نے کافی سوچا اور مجھے اندازہ ہوا کہ تم میرے اچھے جانشین ثابت ہو سکتے ہو... اور مجھے تمہیں اچھی تربیت دینا چاہیے۔'' شیر شاہ کے یہ الفاظ سن کر ولی کا چہرہ کھل اٹھا۔

''لیکن اس سے پہلے میں ایک مرتبہ پھر تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم جانتے ہو... میرے جیسے لوگوں کو پہلے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے... تمہیں بھی کھونا پڑے گا۔'' شیر شاہ نے

www.pkdigest.com

اسے بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس کھونے کے لیے ہے ہی کیا؟" ولی نے کچھ تلخی سے کہا۔

"تمہارے پاس بہت کچھ... بلکہ سب کچھ ہے۔ سارے رشتے... جیسے ماں باپ، بھائی بہن... کھانے کے لیے روٹی... سونے کے لیے آرام دہ بستر اور تحفظ کے لیے ایک مضبوط چار دیواری اور چھت۔ معاشرے میں ایک عزت دار خاندان کے عزت دار فرد ہونے کی شناخت... بہت کچھ تو ہے تمہارے پاس... اور اس کے علاوہ کیا چاہیے کسی انسان کو؟" شیر شاہ نے ایک مرتبہ پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں... مجھے ان سب سے زیادہ چاہیے... یہ چیزیں میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ میں جو چاہتا ہوں تمہیں بتا چکا ہوں۔ کہیں پھر تمہارا ارادہ بدل تو نہیں رہا ہے؟" اس نے تیز لہجے میں شیر شاہ سے پوچھا۔

"نہیں، میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ تمہیں صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم ایک مرتبہ اور سوچ لو... کیونکہ فی الحال تمہیں ان چیزوں کی کوئی قدر محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ کھو دو گے... تو بہت پچھتاؤ گے میری طرح... لیکن پھر تمہارے لیے واپسی کے راستے بند ہو چکے ہوں گے... اور اگر تم نے میری طرف آنے کا آخری فیصلہ کر لیا تو یہ دروازے میں خود تمہارے لیے بند کر دوں گا تاکہ تم پلٹ کر واپس نہ جا سکو۔" شیر شاہ نے شاید آخری کوشش کی کہ اسے سمجھا سکے... پر ولی اپنے ارادے پر اٹل ہی رہا۔ زچ ہو کر اس نے ولی سے کہا۔

"ٹھیک ہے... اب تم نے میرے راستے پر چلنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو تمہیں ایک امتحان دینا ہوگا۔ جانتے ہو، جرم کی دنیا میں داخل ہونے کا لائسنس کیا ہوتا ہے؟ قتل... پہلا قتل ہی تمہیں خود بہ خود کھینچ کر میری دنیا میں لے آئے گا... راضی ہو؟"

شیر شاہ نے پوچھا تو ولی نے انتہائی جوش و خروش سے سر اثبات میں ہلایا۔ اس کے چہرے پر چھائی خوشی اور اس کی جوشِ جذبات سے چمکتی آنکھیں دیکھ کر شیر شاہ کچھ خاموش سا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے... کل آؤ... اور اپنے پیچھے چھوڑ آنے والی دنیا کو اچھی طرح دیکھتے آنا... ہو سکتا ہے پھر دیکھنے کو نہ ملے۔ کل ہی تمہارا امتحان ہو جائے گا۔" شیر شاہ نے کہا۔ پھر وہ دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔ شیر شاہ لکڑی کے سہارے لنگڑاتا ہوا اپنے ٹھکانے پر چلا گیا اور ولی کی گھر واپسی ہو گئی۔

سارا گھر بے خبر سو رہا تھا لیکن اس کے اندر کی ہیجان انگیز بے چینی نے اسے جگائے رکھا۔ وہ ایک سنسنی آمیز تجربے سے گزرنے جا رہا تھا۔ ایک عجب طرح کی بے کلی اسے کروٹیں بدلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کل کے بارے میں وہ سوچے جا رہا تھا کہ کل وہ کیا کرنے والا ہے؟ پھر آخر کار وہ اٹھ بیٹھا... صبح نمودار ہو چکی تھی۔ بابا بیدار ہو کر نماز کے لیے نکل رہے تھے۔ اس نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ پھر وہ بھی اٹھ بیٹھا۔ سارے بہن بھائی بھی ایک ایک کر کے اٹھ رہے تھے۔

"چل ولی! نماز کا ٹائم ہو گیا ہے۔" بڑے بھائی نے ٹوپی سر پر جماتے ہوئے اسے اشارہ کیا اور دوسرے بھائیوں کے ساتھ مسجد روانہ ہو گیا۔ اماں اور بہنیں بھی نماز کی تیاری کر رہی تھیں۔ اس نے بے زاری سے پورے گھر پر ایک نظر ڈالی اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ آج وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ منگھو پیر کی ان پہاڑیوں کی طرف قدم بڑھا رہا تھا جہاں سے ہو کر وہ ایک نئی دنیا میں داخل ہونے جا رہا تھا۔ وہ تین پتھروں کے پاس سے گھومتا ہوا جب دراڑ میں داخل ہوا تو سورج افق پر طلوع ہو رہا تھا۔

"ارے... آج تو اتنی جلدی آ گیا؟ بڑی جلدی ہے تجھے گڑھے میں گرنے کی خانہ خراب!" شیر شاہ نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔

"تم نے ہی تو بولا تھا... جلدی آنا۔ اب باتیں مت کرو... بولو کیا کرنا ہے آج مجھے؟" ولی نے چڑ کر کہا۔

"قتل کرنا ہے۔" شیر شاہ بولا۔

"کسے... تمہیں...؟" ولی نے چنگاری چھوڑی۔

"مجھے نہیں... تجھے اپنے آپ کو قتل کرنا ہے خانہ خراب! چل... ادھر ٹیلے پر... بڑی سڑک کے قریب۔" شیر شاہ اٹھتے ہوئے بولا۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں وہاں موجود تھے اور اپنی پسند کے ایک نسبتاً ہموار پتھر پر بیٹھے تھے۔

"یہ لے... یہ گن ہاتھ میں پکڑ اور ادھر سڑک کے موڑ سے جو پہلا آدمی آتا ہوا نظر آئے، اسے گولی مار دے۔ تجھے پتا ہے نا... قتل کیے بغیر تو شیر شاہ کی دنیا میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ میری دنیا میں جگر والے بندے ہی داخل ہو سکتے ہیں... اور قتل اس چیز کا ثبوت ہوتا ہے کہ بندہ جگر والا ہے۔ چل شاباش! تیاری پکڑ... گن چیک کر لے۔ جیسے ہی پہلا بندہ ادھر موڑ سے سڑک پر آتا نظر آئے... تو تیار ہو جائے گا۔ وہ وہاں سے ہوتا ہوا ہمارے سامنے سے گزرے گا اور وہ اگلے موڑ پر جا کر غائب ہو جائے گا... کیونکہ سڑک وہاں مڑ جاتی ہے۔ اس پورے عرصے میں وہ جہاں تیرے ٹھیک نشانے پر

آئے... اس پر گولی چلا دینا۔ ٹھیک ہے؟" شیر شاہ نے گن اس کے ہاتھ میں پکڑائی تو وہ ایک نئی سنسنی خیزی سے دوچار ہوا۔ دل زور سے دھڑکا اور پیشانی پر پسینے کی نمی اتر آئی۔

"جو بھی آئے... اسے گولی مار دوں... چاہے وہ کوئی بھی ہو؟" ولی نے کپکپاتے لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں... کوئی بھی ہو... چاہے وہ تیرا باپ یا تیرا سگا بھائی کیوں نہ ہو۔ شیر شاہ کی دنیا میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ جو پہلا بندہ نظر آئے گا، اسے قتل کرنا ہے تجھے... چل تیار ہو جا۔" شیر شاہ نے جھنجلا کر کہا تو وہ گن ہاتھ میں لیے اچھی طرح جم کر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کی نظریں اس موڑ پر تھیں جہاں سے اس سڑک پر آنے والی ہر شے طلوع ہوتی تھی۔ زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دس پندرہ منٹ بعد ہی موڑ سے ایک گدھا گاڑی نمودار ہوئی۔ بڑی سی جستی ٹنکی اس پر رکھی ہوئی تھی جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔

وہ سقہ تھا جو کچی بستیوں کو پانی سپلائی کرتے ہیں۔ وہ بھی ٹنکی پانی سے بھر کر لا رہا تھا۔ شاید کسی بستی کے کچے پکے نلکوں سے محروم گھر... اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ سقہ ٹنکی کے اوپر ہاتھ میں لگام پکڑے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر ولی کا دل اور بھی زور سے دھڑکنے لگا۔

گاڑی بان ایک نوجوان تھا۔ سامنے سے طلوع ہوتے سورج کی چمکیلی کرنیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں اور اس کا چہرہ جوانی کی چھب سے چمکتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کوئی بہت ہی زندہ دل نوجوان تھا۔ راستے کی تنہائی سے گھبرا کر وہ اونچی آواز میں کوئی زندگی سے بھرپور پشتو گیت گا رہا تھا... جس کی لے اس کی گدھا گاڑی کی چرخ چوں کی تال سے مل کر ایک خوب صورت گیت کی شکل میں دور تک پھیل رہی تھی۔

"ہو یا قربان... یا قربان..." اس نے ایک ہاتھ کان پر رکھ کر صدا لگائی تو یوں محسوس ہوا جیسے یہ تان اس کی روح کی گہرائیوں سے نغمہ بن کر پھوٹ رہی ہو۔

ولی نے گن دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر گود میں رکھی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں زندگی سے بھرپور اس نوجوان کی جانب نگراں تھیں جو خوشی خوشی گیت گاتا ہوا... اپنی موت سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔

ولی کی گرفت گن پر اس قدر مضبوط ہوئی کہ اس کے ہاتھوں کی رگیں پھول گئیں۔ چہرے پر ہیجان انگیز سکوت تھا اور پیشانی سے نمودار ہونے والا پسینا بہہ کر اس کی کنپٹیوں سے ہوتا ہوا گردن تک بہنے لگا تھا۔

برابر میں ہی شیر شاہ بیٹھا اس کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک سرد مہر سکوت کے آثار تھے۔

گاڑی کافی آگے بڑھ آئی تھی اور اب تقریباً ان کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ بھری ہوئی ٹنکی سے پانی چھلک کر بہہ رہا تھا اور سڑک پر ایک لکیری بناتا جا رہا تھا۔ اس کا گیت جاری تھا... خوشی کا نغمہ... کانوں کو چھو کر دل میں اتر جانے والا... زندگی سے بھرپور اور خوشیوں سے چھلکتا۔ ولی نے گن کو اٹھانے کی کوشش کی... اسی لمحے گاڑی بان نے تان لگاتے ہوئے ان دونوں کو اوپر بیٹھے دیکھا تو ہنستے مسکراتے انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ وہ ہاتھ ہلاتا رہا... گاڑی آگے بڑھتی رہی۔ ٹنکی سے پانی... اس کے وجود سے زندگی... اور اس کے گیت سے خوشی چھلکتی رہی... اور وہ آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے اگلا موڑ مڑ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ولی نے دھپ سے اس گن کو دوبارہ گود میں ڈال دیا جسے اس نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا تھا۔

اپنی زندگی کا پہلا قتل کرنے کے لیے... شیر شاہ بننے کی راہ میں پہلا قدم رکھنے کے لیے... اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کرنے کے لیے... اس نے جسم و جاں کی پوری قوت صرف کر دی تھی... لیکن افسوس... کہ اس کے سامنے جو شخص آیا، وہ زندگی کی اس قدر سچی تفسیر تھا... اس قدر زندہ دل تھا... کہ وہ ایسی زندگی کو مٹانے کی ہمت نہیں کر پایا... گولی نہ چلا پایا... قتل نہ کر سکا۔

پہلے تو وہ شرمندگی کے بوجھ تلے دبا ہوا گردن جھکائے بیٹھا رہا... پھر نہ جانے کیا سوچ کر سر اٹھایا... شیر شاہ کی طرف دیکھا تو وہ اسے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اس کی نظروں میں ایک سرد اور بے رحم سا تاثر محسوس ہوا۔

ولی نے حیران ہو کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا اور وہ اس نے اس طرح ہاتھ میں تھاما ہوا تھا جیسے لمحے بھر میں کسی کے ٹکڑے اڑا ڈالنے کو تیار ہو۔

"م... میں... میں گولی نہیں... چلا پایا..." ولی نے خشک ہو جانے والے حلق کو تر کرنے کی کوشش کی اور ٹوٹے ہوئے لفظوں میں کچھ کہنے کی کوشش کی تو اس نے شیر شاہ کی آواز سنی۔

"اگر تم نے گولی چلا دی ہوتی اور اسے مار دیا ہوتا... تو میں یہ چاقو فوراً ہی تمہاری پیٹھ میں گھونپ دیتا... سیدھا دل کو نشانہ لے کر۔" شیر شاہ کی آواز میں سانپ کی پھنکار تھی... ولی گھبرا گیا۔

"کیوں... تم... مجھے مار دیتے؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیونکہ میں کسی قیمت پر ایک اور قاتل کو جنم لیتے اور پنپتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔" شیر شاہ نے غصے سے کہا۔

"لیکن... تم ہی نے تو... یہ شرط رکھی تھی... قتل کرنے

www.pkdigest.com

کی۔" ولی نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔
"ہاں، میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تیرے اندر انسانیت ابھی زندہ ہے... یا مر چکی ہے... اسی لیے تیرا یہ امتحان لیا تھا... پر لگتا ہے ابھی..." اس نے کہتے کہتے ولی کے ہاتھ سے گن چھینی... نہایت غصے کے عالم میں اسے لوڈ کیا اور ولی کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے دہاڑا۔
"اٹھ خانہ خراب! دوڑ ادھر سے... سیدھا گھر جا... اب اگر تو مجھے اپنے آس پاس بھی نظر آیا تو کوئی سوال کیے بغیر گولی مار دوں گا۔ اٹھ... دفع ہو جا۔" اس نے چلّاتے ہوئے ایک فائر ولی کے پاؤں کے پاس کیا تو وہ اندھا دھند وہاں سے بھاگا۔
"رک جا...!" پھر چند گولیوں نے اس کے پیروں کے پاس سے دھول اڑائی تو وہ وہیں جم کر رہ گیا۔
"اب میں نے تجھے گھر سے باہر دیکھا تو چھوڑوں گا نہیں۔ میں یہاں سے کتنی بھی دور چلا جاؤں... تیری نگرانی کا بندوبست رہے گا... اور اگر کبھی بھی تو نے برے لوگوں سے تعلق رکھا یا برائیوں کی طرف قدم بڑھائے تو یاد رکھ... ایک اندھی گولی تیری کھوپڑی کا نصیب بن جائے گی۔ جا، شکل گم کر... اور سیدھا گھر جا... دفع ہو خانہ خراب!"
شیر شاہ زور سے چلایا تو ولی نے دوڑ لگا دی۔ راستے میں کہیں دم لیے بغیر وہ سرپٹ دوڑتا ہوا سیدھا گھر پہنچا... اور ہانپتا کانپتا بستر پر گر گیا۔ وہ آنکھیں بند کیے بستر پر پڑا تھا اور شیر شاہ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔
"میں ہمیشہ تم پر نظر رکھوں گا۔ جہاں غلط راستہ اختیار کیا... اڑا دوں گا۔"

☆☆☆

گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول کی جماعت ہشتم ب کے بچے انتہائی محویت سے اپنے استاد کی باتیں سن رہے تھے۔ کلاس میں مکمل خاموشی تھی اور اس سکوت میں صرف ان کی نرم آواز گونج رہی تھی۔
"اس دن کے بعد سے میں نے برے راستوں پر چلنے کی آرزو کو دل سے نکال دیا۔ پہلے میں نے خوف زدہ ہو کر گھر سے باہر نکلنا اور آوارہ گرد دوستوں کا ساتھ چھوڑا۔ پھر گھر میں فارغ بیٹھے بیٹھے کیا کرتا... پڑھنا شروع کر دیا۔ آج ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہوں۔ سرکاری اسکول میں بہ حیثیت استاد... بچوں کو تعلیم دیتا ہوں۔ معاشرے میں استاد کی ایک قابلِ احترام شناخت رکھتا ہوں۔ بچوں کو حتی الامکان سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ جرم اور بدی کی دنیا میں داخل ہونے کے تو بہت راستے ہیں... لیکن باہر نکلنے کا کوئی نہیں۔ دعا کرتا ہوں... شاید میرے اس عمل سے کسی کے دل میں پلنے والی برائی... اچھائی میں بدل جائے۔ کسی انسان کے اندر انسانیت مرنے نہ پائے... ہمیشہ زندہ رہے... اور یہ میں نے شیر شاہ سے سیکھا ہے جس کے لیے میں ہمیشہ اس کا احسان مند رہوں گا۔" سر ولی بولتے بولتے خاموش ہو گئے۔ یوں لگا جیسے ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے ہوں۔
"سر! کیا شیر شاہ اب بھی آپ کی نگرانی کرواتا ہے... کہ کہیں آپ برائی میں نہ پڑ جائیں؟" کسی بچے نے پوچھا۔
"نہیں... وہ تو چند سال بعد ہی پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا... اور اس سے بھی پہلے میری کوئی نگرانی نہیں ہوتی تھی۔ مجھے معلوم تھا... لیکن شیر شاہ نے جو سبق مجھے پڑھایا تھا، وہ مجھے زندگی بھر کے لیے یاد ہو گیا تھا۔" سر ولی نے جواب دیا۔
"سر! کیا شیر شاہ اب بھی آپ کا ہیرو ہے؟" ایک اور لڑکے نے سوال کیا تو سر ولی نے اثبات میں سر ہلایا۔
"ہاں! وہ اب بھی میرا ہیرو ہے۔ برا آدمی ہونے کے باوجود اس نے ایک اور آدمی کو برا بننے سے روک لیا۔ ایک خاندان کو تباہی سے بچا لیا... اس سے بڑی ہیروشپ اور کیا ہو گی۔"
"اس دن کے بعد پھر بھی آپ کی اس سے ملاقات ہوئی؟" ایک لڑکے نے پوچھا۔
"ہاں... میری صرف ایک دفعہ اور ملاقات ہوئی اس سے... وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ اس کی لاش ایدھی کے مردہ خانے میں پڑی تھی اور کوئی اسے وصول کرنے نہیں آیا تھا۔ تین دن ہو چکے تھے... میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو میں نے اپنی اور شیر شاہ کی کہانی پوری تفصیل کے ساتھ بابا اور سب گھر والوں کو سنائی۔ بابا سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی کہ وہ مجھے اجازت دے دیں۔ میں شیر شاہ کی تجہیز و تکفین خود اپنے ہاتھ سے کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میرا محسن تھا... میرا ہیرو تھا۔ میں اسے بہ صد احترام اس کی آخری منزل تک پہنچانا چاہتا تھا۔
"پھر بابا اور میرے سب بھائی اس کی لاش ایدھی کے مردہ خانے سے لائے۔ غسل اور کفن دیا جا چکا تھا۔ بابا نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور میں نے اور میرے بھائیوں نے کاندھوں پر اس کی میت اٹھا کر قبرستان... اور پھر قبر میں پہنچائی۔ میں آج بھی ہر جمعرات کو اپنے اس ہیرو کی قبر پر اسے سیلوٹ کرنے جاتا ہوں۔ اس کی مغفرت کی دعا کرتا ہوں... اور ایک پھول اس کے سرہانے رکھ کر آ جاتا ہوں۔"
سر ولی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ٹیبل پر پڑی کتابیں سمیٹیں اور کلاس سے باہر نکل گئے۔

شکستِ خواب

شکیل ادریس

خوابوں کی مسافت زندگی کے ہر موسم میں جاری رہتی ہے ...... شاید کبھی پڑاؤ آجائے ...... مگر بارش اور محبت کے برسنے میں بعض اوقات دیر ہو جاتی ہے ...... اس خشک سالی میں بہت سے خواب مرجاتے ہیں ......ایسی ہی ایک محبت گزیدہ کا قصہ جو محبت کی تلاش میں در در کی خاک چھان رہی تھی۔

خوابوں بھری زندگی اور بارشوں کی چاہ رکھنے والی لڑکی کا دل گداز فسانہ

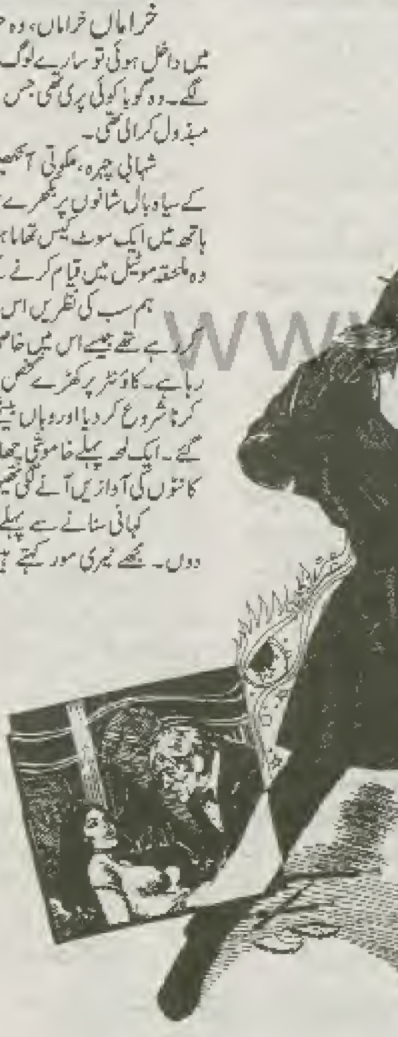

خراماں خراماں، وہ حسینہ بچی کے شبینہ ریستوران میں داخل ہوئی تو سارے لوگ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ گویا کوئی پری تھی جس نے ہم سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی۔
شہابی چہرہ، ملکوتی آنکھیں اور سرخی مائل رنگت۔ اس کے سیاہ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور اس نے دائیں ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھاما ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ملحقہ موٹیل میں قیام کرنے کے ارادے سے آئی ہے۔
ہم سب کی نظریں اس پر گڑی ہوئی تھیں، مگر ظاہر یہ کر رہے تھے جیسے اس میں خاص طور سے کوئی دلچسپی نہیں لے رہا ہے۔ کاؤنٹر پر کھڑے شخص نے ڈسٹر اٹھا کر کاؤنٹر کو صاف کرنا شروع کر دیا اور وہاں بیٹھے لوگ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ ایک لمحہ پہلے خاموشی چھائی ہوئی تھی لیکن اب چمچوں اور کانٹوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔
کہانی سنانے سے پہلے بہتر ہو گا کہ میں اپنا تعارف کرا دوں۔ مجھے نیری مور کہتے ہیں۔ چند ہفتوں پہلے تک میں

www.pkdigest.com

لیفٹین مور ہوا کرتا تھا مگر اب مجھے ترقی دے کر ریکٹ اسکواڈ کا سربراہ بنا دیا گیا ہے اور میری ماتحتی میں دو سراغ رساں پوویک اور بریگان کام کرتے ہیں۔

دراصل یہ سب کیپٹن چارلس گریکو کی موت کے بعد ہوا ہے۔ اس کی کیڈی لاک مارکیٹ میں کسی ٹائم بم کے دھماکے سے پھٹ گئی اور اس میں آگ لگ گئی۔ اس کے ٹکڑے اڑ کر دور جا پڑے تھے لیکن اس کے باوجود محکمے کا کوئی شخص چارلس گریکو کی موت پر افسردہ نہیں ہوا۔ اس لیے کہ سب کا خیال تھا کہ وہ قصبے کے سب سے بڑے گروہ کے سربراہ بگ ہرمین سے ملا ہوا ہے اور چیف طرف کے بجائے اس کے احکامات پر عمل کرتا ہے۔ بگ ہرمین کا گروہ تمام ناجائز دھندے کرتا تھا۔

بہرحال، اس کی موت کے بعد مجھے ترقی دے کر اس عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ پولیس ریکٹ کا مطلب یہ تھا کہ میں مجرموں کی ایسی ساری تنظیموں پر نگاہ رکھوں اور ان کا قلع قمع کرتا رہوں جو قانون کے خلاف کام کرتی ہیں۔

ریستوران میں بیٹھے ہوئے لڑکے جو چست پتلونیں اور پھول دار قمیصیں پہنے تھے، انہوں نے سیٹیاں بجا کر اس لڑکی کا التفات حاصل کرنا چاہا تھا مگر ناکام رہے۔ وہ کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔

”لڑکی تو حور معلوم ہوتی ہے۔“ پوویک نے سرگوشی میں کہا۔ میں سر ہلا کر رہ گیا۔

لڑکی کاؤنٹر پر کھڑے جارج سڈمین سے کہہ رہی تھی۔

”میں تھوڑی دیر پہلے بس سے اتری ہوں اور یہاں قیام کا ارادہ ہے۔ اس لیے ملازمت بھی کرنا چاہتی ہوں لیکن اس سے پہلے قیام کا بندوبست ہونا چاہیے۔ مجھے کسی سستے لیکن اچھے سے ہوٹل کا پتا بتا دو۔“

سڈمین تذبذب میں تھا اس لیے کوئی جواب نہیں دے سکا۔ میں بہ خوبی واقف تھا کہ ان اطراف میں جو سستے ہوٹل ہیں، وہ رہائش کے لیے مناسب نہیں ہیں اور جنہیں اچھا کہا جا سکتا ہے، وہ سستے نہیں ہیں۔

بگ ہیری اپنی میز پر بیٹھا اورنج جوس پی رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کاؤنٹر کے قریب گیا اور بولا۔ ”ہیلو مس! میرا خیال ہے کہ میں تمہارا مسئلہ حل کر سکتا ہوں۔ تمہارے لیے مابراؤن بورڈنگ ہاؤس مناسب رہے گا۔ اس کی مالکن ایک نفیس عورت ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو میرے ساتھ کھانے کے بعد چلو۔ میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گا۔“

لڑکی کے چہرے سے احسان مندی جھلکنے لگی۔

”شکریہ!“ اس نے کہا۔ ”میں یہاں کچھ کھانے نہیں آئی ہوں۔ میں یہاں صرف کسی قیام گاہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آئی ہوں۔“

اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ لڑکی یقیناً سارا دن بس میں سفر کرتی رہی تھی مگر حیرت کی بات تھی کہ کچھ کھانے پر آمادہ نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ اسے یقیناً بھوک لگ رہی ہوگی۔

”مگر میں فوراً ہی کہیں نہیں جا سکتا۔“ ہیری نے صاف گوئی سے کہا۔ ”اس لیے کہ میں بھوکا ہوں۔ پہلے میں برگر کھاؤں گا اور سوپ پیوں گا۔ اگر تم میری میزبانی قبول کر لو تو مناسب رہے گا۔ سڈمین! منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ جلدی سے ساری چیزیں تیار کر کے میز پر رکھو۔“

”اچھا جناب!“ سڈمین نے مستعدی سے کہا اور چولہوں کی طرف مڑ گیا۔

اس طرح اس لڑکی ایمی جین کو ہم نے پہلی مرتبہ وہاں دیکھا۔ میں نے قیاس لگایا تھا کہ وہ یہاں نہیں ٹکے گی۔ یہاں کے ماحول سے اسے وحشت ہونے لگے گی۔ وہ اپنے گھر لوٹ جائے گی یا پھر قصبے کے کسی اچھے علاقے میں جا کر سکونت اختیار کر لے گی۔ مگر اس وقت مجھے ازحد حیرت ہوئی جب لڑکی نے مابراؤن کے بورڈنگ ہاؤس میں ایک کمرا کرائے پر لے کر وہیں رہنا شروع کر دیا۔ اسے ایک اسٹور میں کام مل گیا جو ٹینڈرلوائن میں واقع تھا۔

وہ گاہے گاہے کھانا کھانے بگی کے ریستوران پر آ جاتی تھی۔ چونکہ اسے بار بار ہمارے چہرے دیکھنے کو ملتے تھے چنانچہ وہ ہم سے مانوس ہو گئی تھی۔ وہ عموماً رات کو کافی پینے اور حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کرنے آتی تھی۔ وہ چونکہ تنہا تھی اس لیے اسے کسی ایسے شخص کی تلاش رہتی تھی جو اس کی باتوں پر کان دھر سکے۔ اس معاملے میں سڈمین اور ہیری پیش پیش تھے۔

اس نے آئندہ ایک ہفتے میں دوسروں کی تو کم ہی سنی، اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ہمیں معلوم ہو گیا کہ وہ ایمی جین رابرٹ شا ہے۔ ایک قریبی قصبے سے آئی ہے اور اس کے خاندان کے سارے لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور کسان ہیں۔ اس کی ماں کا بھائی یعنی اس کا ماموں پادری ہے۔ ویسے اس کی ماں کے پانچ بھائی اور پانچ بہنیں ہیں جو انہی کے ساتھ فارم پر رہتے ہیں۔ فارم پر لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی اس لیے وہ سب کو چھوڑ چھاڑ کر یہاں آ گئی۔ اس کی اسکول کی تعلیم نامکمل ہے اور عمر اٹھارہ سال ہے۔

ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ قانونی طور پر بالغ ہو

چکی ہے۔

اس کے کئی خیرخواہوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ رات کی کلاسوں میں داخلہ لے کر اپنی ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کر سکتی ہے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ان دو ہفتوں کے دوران، جب سے وہ وہاں رہائش پذیر تھی، قصبے کے سارے لوگ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ سب کے معمولات میں فرق آ گیا تھا۔ سڈمین تو کھلم کھلا اس کی پوجا کرنے لگا تھا اور ہر لمحے اس کی تعریفوں کے پل باندھتا رہتا تھا۔ میرے لیے یہ بات قابلِ اطمینان تھی کہ اس ریستوران کے سب لوگ مسکرانا سیکھ گئے تھے۔ اس لیے کہ ایمی ہر بات پر مسکراتی اور قہقہے لگاتی تھی۔

میں سوچتا تھا کہ اگر میں نے وقت پر شادی کر لی ہوتی تو یقیناً میری بچی کی عمر اتنی ہوتی اور وہ اتنی ہی کھلنڈری ہوتی۔ اسے اپنی بیٹی سمجھنے کا احساس ہی تھا جو ہر لمحے مجھے چوکنا رکھتا تھا۔ میں اس کی فلاح کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ رہتا تھا کہ اسے کوئی میلی آنکھ سے نہ دیکھے اور نقصان نہ پہنچا دے۔

فادر پاول جو گزشتہ بیس سال سے وہاں رہ رہے تھے، ٹینڈرلوائن کے ایک چرچ میں تعلیم دیتے تھے۔ کبھی کبھار وہ اسٹیک کھانے میری میز پر آ جاتے تھے۔ ایک رات جب انہوں نے ایمی کو دیکھا تو چونک گئے اور اس کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگے۔

”تم بے فکر رہو فادر۔“ میں نے انہیں یقین دلایا۔ ”وہ اپنے گھر کی طرح یہاں محفوظ ہے۔ اگر کسی نے اس کی طرف ترچھی آنکھ سے بھی دیکھا تو میں اس کی آنکھ نکال لوں گا۔“

”ٹیری مور! میں جانتا ہوں کہ تم جیسے دیانت دار اور مخلص پولیس مین کے ہوتے ہوئے اس لڑکی پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی۔“ انہوں نے سر ہلا کر کہا۔ ”مگر...“ وہ خاموش ہو کر اپنی ڈاڑھی کھجانے لگے۔

ان کی خاموشی پر مجھے تشویش ہونے لگی تو میں نے کہا۔ ”کیا آپ کوئی خاص بات کہنا چاہتے ہیں؟ اچانک خاموش کیوں ہو گئے؟“

”بس اندیشہ ہی اندیشہ ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”میرے ذہن میں کوئی خاص بات نہیں ہے اس لیے میں اس معاملے پر مزید لب کشائی نہیں کروں گا۔“

میں نے ان کے دماغ کی بات اگلوانے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ بات یہاں پر ختم ہو گئی اور فادر پاول ایک پیالی کافی پینے کے بعد چلے گئے۔

حالات معمول کے مطابق چل رہے تھے کہ قصبے میں

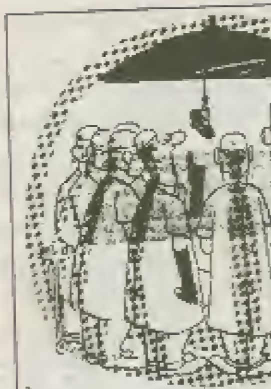

”ناظرین اوئی کا یہ آپریشن آپ ٹی وی پر لائیو دیکھ رہے ہیں۔ آپریشن اب ایک نہایت نازک مرحلے میں داخل ہو چکا ہے ...لیکن پہلے ایک وقفہ... چند اشتہارات ملاحظہ فرمائیے...!“

بل فریڈ دوبارہ وارد ہو گیا۔

فریڈ کی عمر چوبیس سال تھی۔ وہ تندرست توانا اور جسیم تھا مگر اس کی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے اتنا تعارف ناکافی ہے، اس لیے میں آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں کہ وہ اس قصبے کی گندی اور غلیظ گلیوں کا رہنے والا ہے اور اس کی فطرت میں بچھو والی خصوصیت شامل ہے۔ یعنی وہ لوگوں سے خواہ مخواہ دشمنی نکال لیتا ہے اور نقصان پہنچانے کے درپے رہتا ہے۔ قصبے کے سارے آوارہ گرد اس کے قریب موجود رہتے ہیں بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ اس کی جنبشِ ابرو کے منتظر رہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے اپنے دودھ کے دانت خود چاقو سے کاٹ کر پھینک دیے تھے۔

اس کے کارناموں کی تفصیل لمبی ہے اور یہ صفحات اس کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لیے میں آپ کو ایک واقعہ سنائے دیتا ہوں کہ جب اس نے پاؤں پاؤں چلنا پھرنا سیکھ لیا تو اپنے پڑوسی کے ہاں چوری کر لی۔ پڑوسی نے دیکھ لیا اور اسے زدوکوب کیا۔ فریڈ نے اس کے مکان کو آگ لگا دی۔ جیسے روم کے شہنشاہ نیرو نے کیا تھا۔ نیرو کا کارنامہ کتابوں میں محفوظ ہے اور تاریخ کا حصہ بن چکا ہے، لیکن فریڈ کا کارنامہ سب محسوس کر سکتے ہیں۔ کسی کے پاس اس کا ثبوت نہیں ہے۔ ثبوت مل جاتا تو پھر بات ہی کیا تھی۔ اسے یقیناً جیل میں کچھ عرصہ گزارنا پڑتا۔

وہ بے حد چست جینز، جیکٹ پہنتا تھا اور ہیٹ سر پر رکھتا تھا۔ اس کے سینے پر ایک بے لباس رقاصہ کی تصویر گدی

ہوئی تھی اور وہ جیکٹ کھول کر اس کی نمائش کرتا رہتا تھا۔

ہاں، یہ تو میں بتانا بھولے جا رہا تھا کہ چودہ سال کی عمر میں اسے سزا ہو چکی ہے۔ اس پر ایک لڑکی سے زیادتی کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ ایک سال اسے جیل میں اس لیے رہنا پڑا کہ اس نے ایک شراب خانے میں ٹوٹی بوتل سے ایک شرابی کا پیٹ پھاڑ کر آنتیں باہر نکال دی تھیں۔ اس شرابی کا بروقت آپریشن ہو گیا اور اس کی جان بچ گئی ورنہ فریڈ کو قتل کے الزام میں پھانسی ہو جاتی۔

فریڈ نے گزر بسر کے لیے کوئی معقول پیشہ نہیں اپنایا تھا اسی لیے وہ چوری چکاری کرتا تھا یا ویران اور تاریک گلیوں میں دھونس دھڑلے سے لوگوں کی جیبیں خالی کرا لیتا تھا۔ وہ کمزوروں کا گریبان تھام لیتا تھا اور طاقتوروں کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔

ریکٹ چیف ہونے کی حیثیت سے میں قصبے کے سارے لڑکوں کا مشاہدہ کرتا رہتا تھا۔ بارہ سال کی عمر کے بعد ان کے طور طریق کیا ہیں؟ وہ پڑھائی کی طرف توجہ دے رہے ہیں یا آوارہ گردی کی طرف مائل ہیں؟ اس لیے میرے مشاہدات میں فریڈ بھی شامل تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ میں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا ہوں اس لیے وہ قصبے سے باہر چلا گیا تھا مگر اب اس کے دماغ میں جانے کیا سمایا تھا کہ وہ دوبارہ آن موجود ہوا تھا۔

میں نے سوچ رکھا تھا کہ یہ روز روز کا مذاق ختم ہونا چاہیے۔ بہتر ہو گا کہ اسے کسی لمبے معاملے میں سزا دلوا کر دس سال کے لیے جیل بھجوا دیا جائے یا پھر کسی پولیس مقابلے میں اس پر فائرنگ کر کے اسے کاروبارِ حیات سے نجات دلا دی جائے۔ اگر میں قانون کا محافظ ہو کر یہ باتیں سوچ رہا تھا تو محض اس لیے کہ مجھے قصبے کے لوگوں کا سکون اور قانون کی سربلندی عزیز تھی۔

وہ اسی قابل تھا کہ اسے تنگ و تاریک گلی میں ہلاک کر دیا جاتا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی موت پر کوئی آنسو نہیں بہائے گا۔

وہ چلا گیا تھا تو سب نے سکون کا سانس لیا تھا مگر وہ دوبارہ آ گیا تھا تو سب مضطرب تھے۔ وہ قصبے سے کیوں گیا تھا، اس کی بھی ایک کہانی تھی۔ یہاں بگ ہرمین کی شہنشاہی تھی۔ ایک سال پہلے کسی بڑی ڈکیتی کے بعد فریڈ اور بگ ہرمین میں رقم کی تقسیم پر تنازعہ ہوا تھا تو بگ ہرمین کے گروہ نے فریڈ کو ٹھکانے لگانا چاہا۔ وہ اپنی جان بچا کر فرار ہو گیا... مگر جب بگ ہرمین مر گیا تو فریڈ واپس آ گیا۔

ایک اتوار کی شب دو بجے وہ یمی کے شیڈ ریستوران میں داخل ہوا۔ اس کے جسم پر چست ریشمی پتلون اور قمیص تھی۔ سر پر سفید ہیٹ تھا۔ پاؤں میں قیمتی جوتے تھے۔

ایمی وہاں تھوڑی دیر پیشتر کسی فلم کا آخری شو دیکھ کر آئی تھی۔ اس نے کاؤنٹر کے قریب ایک اسٹول سنبھالا ہوا تھا۔ اس کے سامنے مٹن پائی اور کافی رکھی تھی۔

ہیری اپنی آنکھوں میں محبت کی جوت جگائے یہ کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس کی دعوت پر ایک اور مٹن پائی منگوا لے۔

فریڈ جب ریستوران میں داخل ہوا تو اس نے تیزی سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ میں نے اپنی کرسی پیچھے کھسکائی اور مستعد ہو گیا۔ اگر وہ کوئی واردات کرنے آیا تھا تو مجھے دفاع کرنا تھا۔

میں اپنے اندیشوں اور واہموں میں گھرا ہوا نہ جانے کیا کچھ بیٹھا تھا کہ چوکنا ہو گیا۔ فریڈ نے میری توقعات کے برعکس شرافت کا ثبوت دیا اور متانت سے چلتا ہوا آگے آیا۔ پھر کالج کے کسی شریف طالب علم کی طرح اس نے اپنا ہیٹ اتار کر اسٹینڈ پر لٹکایا اور اس کے بعد ایمی کی دوسری جانب ایک اسٹول کا فاصلہ رکھ کر بیٹھ گیا۔ ایمی کے ایک جانب ہیری پہلے سے بیٹھا تھا۔ فریڈ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اس نے اپنے اور ایمی کے درمیان جو اسٹول چھوڑا ہے اس پر کوئی نہیں بیٹھے گا۔

اس نے ایمی کی طرف نہیں دیکھا بلکہ مینیو اٹھا کر کھانوں کی تفصیل دیکھنے لگا۔ اپنے لیے اس نے اسٹیک کا آرڈر دیا پھر مینیو ہاتھ سے رکھ کر گردن گھمائی اور ہیری کی طرف دیکھ کر ”ہیلو“ کہا۔

ہیری کے چہرے پر اس وقت جو تاثرات ابھر رہے تھے انہیں دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے وہ فریڈ سے کہہ رہا ہو ”جہنم میں جاؤ۔“ گروہ تو ہیری کا بھی خاصا بڑا تھا مگر فریڈ ان سب کا بادشاہ تھا، لہٰذا ہیری نے اپنے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سجائی اور جواباً ”ہیلو“ کہا۔

ایمی ان کے درمیان تھی اور جس وقت فریڈ ریستوران میں داخل ہوا تھا، اسی وقت وہ اس کی موجودگی سے واقف ہو گئی تھی لیکن وہ ان جان بنی رہی اور مٹن پائی کھانے میں مصروف رہی۔

پھر اس نے ہیری کی طرف دیکھا اور متانت سے کہا۔ ”اوہ! کیا تم دونوں دوست ہو؟ مجھے اس سے متعارف نہیں کراؤ گے؟“

فریڈ نے خود اپنا تعارف نہیں کرایا بلکہ ایک خاص انداز سے ایمی کو دیکھتا رہا۔ میں تیار بیٹھا تھا کہ اگر وہ کوئی بے ہودہ بات کرے تو میں اچھل کر اس کی گردن دبوچ لوں اور اسے دھکے دے کر ریستوران سے نکال دوں لیکن ابھی تک اس نے ایسا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔

ہیری نے فریڈ کا تعارف کرا دیا اور فریڈ نے رسمی سی گفتگو کی۔ پھر ویٹر نے اس کے سامنے اسٹیک رکھ دی۔ وہ اسے تحمل مزاجی سے کھانے لگا۔ اس کے بعد وہ اٹھا، اس نے قیمت ادا کی اور اپنا ہیٹ اٹھا کر وہاں سے نکل گیا۔ حالانکہ ایمی چاہتی تھی کہ وہ کچھ دیر اور بیٹھ کر باتیں کرے۔

ابھی ایمی ریستوران میں تھی کہ وہ پھر آ گیا۔ اس بار وہ ایک سفید کار میں آیا تھا۔ کار اس نے باہر ایک درخت کے قریب پارک کر دی اور خود اندر آ گیا۔ اس بار وہ ایمی کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور اس سے مہذبانہ انداز میں گفتگو کرنے لگا۔

اگلی رات وہ پھر آیا اور ایمی کے ساتھ ریستوران کے مغربی گوشے میں جا کر بیٹھ گیا۔ گزشتہ رات کی طرح اس نے مسکرا مسکرا کر باتیں کیں۔ ایسی دل موہ لینے والی باتیں جن سے لڑکیاں مبہوت ہو کر مردوں کی طرف دیکھتی رہ جاتی ہیں۔

وہ دو گھنٹے بعد چلا گیا اور پھر تین راتوں تک لوٹ کر نہیں آیا۔ ایمی کی بے تابی اور بے قراری اپنے عروج پر تھی۔ جب وہ چوتھی رات آیا تو ایمی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کبھی جانے ہی نہ دے۔

اس رات وہ زیادہ دیر تک ریستوران میں نہیں بیٹھے اس لیے کہ ایمی اسے اپنی قیام گاہ مابراؤن کے بورڈنگ ہاؤس لے گئی۔

اگلی رات وہ دونوں آخری شو دیکھنے ایک سینما گھر گئے۔ واپسی پر ایک اسٹور پر انہوں نے بال گیم کھیلا۔ ان کی رفاقت کو سب نے محسوس کر لیا۔ ہیری کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ ایمی کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر مایوس ہو کر قصبے سے چلا گیا... کہاں چلا گیا، یہ کسی کو پتا نہیں چلا۔ اس لیے کہ وہ پھر کبھی نظر نہیں آیا۔

ریستوران کا باورچی سڈمین بھی ایمی میں دلچسپی لے رہا تھا، مگر جب ایمی کی نگاہِ التفات کا مرکز فریڈ بن گیا تو اس کے چہرے پر پیشی برسنے لگی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ جس چھری سے گوشت کے پارچے بنایا کرتا تھا، شاید اسی سے فریڈ کے ٹکڑے کر دیتا۔

میں نے اور پوڈیک نے مختلف جگہوں پر فریڈ کو اچانک روکا اور اس کی تلاشی لی۔ اس توقع پر کہ اس کی جیب سے ریوالور یا کوئی بھی ایسی چیز نکل آئے کہ ہم اس کی گردن دبا سکیں، مگر ہمیں ہر بار مایوسی ہوئی۔ فریڈ نے ہر بار ہم پر ایک استہزائیہ قہقہہ بلند کیا تھا۔ ”تم لوگوں نے جب بھی میری تلاشی لی، تمہیں کچھ نہیں ملا پھر تم میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ محکمۂ پولیس میں اتنے احمقوں کو بھرتی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

اس کے طنزیہ جملوں پر جی چاہتا تھا کہ ہم اپنی بوٹیاں نوچ لیں۔ وہ جب سے قصبے میں آیا تھا، دو چار پیٹرول پمپ لٹ چکے تھے اور ایک آدھ اسٹور پر بھی ڈاکا مارا گیا تھا۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ ان وارداتوں میں فریڈ کا ہاتھ ہے لیکن عدم ثبوت کی بنا پر ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکے۔

وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ہم اس کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتے تھے مگر یہ بھی نہ کر سکے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے سرچ وارنٹ بنوانا پڑتا اور اس کے لیے متعدد محکمہ جاتی مرحلوں سے گزرنا پڑتا۔ وجہ بتانی پڑتی کہ ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں کچھ انتظار کرنا چاہیے۔ کیپٹن! یہ لوگ کسی نہ کسی مرحلے پر غلطی ضرور کرتے ہیں۔ فریڈ جب کوئی غلطی کرے گا تو ہم اس کی گردن دبوچ لیں گے۔“ پوڈیک نے کہا۔

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”مگر میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ میں اس پر ابھی ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں... میں بھی چاہتا ہوں اور قصبے کے زیادہ تر لوگ بھی یہی چاہتے ہیں لیکن ہم نے اس پر غلط طریقے سے... یعنی بغیر کسی ثبوت کے ہاتھ ڈالا تو وہ چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر نکل جائے گا۔“ اس نے سمجھانے والے انداز سے کہا۔

”اب وہ میرے ہاتھ سے نکل نہیں سکتا۔“ میں نے درشتی سے کہا۔ ”میں اسے کسی مچھر کی طرح مسل دوں گا۔“

اس رات میں نے فادر پاول سے بات کی تو انہوں نے کہا۔ ”تم جو کچھ کہہ رہے ہو یہ تو میرے دل پر لکھا ہوا ہے کیپٹن! مگر ہم اس معاملے میں ایمی جین کو اعتماد میں نہیں لے سکتے۔ میرا خیال ہے کہ وہ عقل سے کوری ہے۔“

”عورتیں عموماً ایسی ہی ہوتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ چرچ میں وعظ کرتے ہیں اور آپ کی کہی ہوئی بات لوگوں کے دلوں میں اتر جاتی ہے۔ ممکن ہے آپ اسے سمجھائیں تو وہ مان جائے۔“

فادر پاول نے اپنی سی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ تیسرے روز انہوں نے کہا۔ ”کیپٹن! اس لڑکی کے دل و دماغ پر فریڈ کا بھوت سوار ہو چکا ہے۔ اس نے میری نصیحتوں کو ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا۔ اس لیے کہ اس کی سماعت میں فریڈ کی میٹھی سرگوشیاں بسی ہوئی ہیں۔ میرے سمجھانے پر، جانتے ہو اس نے کیا کہا؟“

”کیا کہا؟“

www.pkdigest.com

"یہ کہ فریڈ چند ہفتوں تک اس کے ساتھ رہے گا تو سدھر جائے گا اور اپنی عادتیں چھوڑ دے گا۔"

☆☆☆

فادر پاول نے ایمی کی ذات پر جو تبصرہ کیا تھا، وہ بڑی حد تک درست تھا۔ اس لیے کہ دو روز بعد ایمی اور فریڈ شی ہال گئے اور انہوں نے آپس میں شادی کر لی۔ جب وہ رات کو بچی کے ریستوران پر آئے تو انہوں نے وہاں پر موجود لوگوں کو شادی کا سرٹیفکیٹ دکھایا۔ میں اتفاق سے اس رات ریستوران نہیں جا سکا، میری ڈیوٹی دوسری جگہ لگ گئی تھی۔ بے چارہ سڈ مین بھی اس صدمے کی تاب نہ لا سکا اور ریستوران سے رخصت ہو گیا۔ البتہ ہیری وہاں موجود تھا۔ اس نے مجھ سے بعد میں کہا۔ "ایمی کی آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے۔ اس کے چہرے پر خوشیاں رقصاں تھیں۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا۔"

"اور دولہا کا کیا حال تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔" ہیری نے جواب دیا۔ "اس نے کہا کہ وہ تم سے اور فادر پاول سے مبارک باد حاصل کرے گا۔"

وہ دونوں ایک ہفتے کے لیے ہنی مون منانے میامی گئے۔ واپس آنے کے بعد ہوٹل ایمی میں ایک کمرا کرائے پر لے کر رہنے لگے جس کی ایک کھڑکی گندی گلی میں کھلتی تھی۔

جب زندگی معمول پر آ گئی تو ایمی نے پھر سے اسٹور پر جانا شروع کر دیا۔ ان دنوں اس کی خوشی دو چند ہو چکی تھی اور وہ پھولی نہیں سما رہی تھی۔ وہ دو باتیں کرنے کے بعد کہتی۔ "ہمارا نیا گھر..."

فریڈ حسب معمول جوئے کی مشینوں پر جانے لگا۔ ابتدائی ہفتوں میں وہ تقریباً ہر رات ایمی کو ساتھ لے کر کسی شراب خانے یا کلب میں جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہ اس لیے کر رہا تھا کہ ایمی کو اپنے دوستوں سے ملوا سکے۔ ان پر جتا سکے کہ اس نے ایک کارنامہ انجام دیا ہے اور ایک ٹرافی جیت لی ہے۔ ایمی اس کے لیے اسی طرح باعث افتخار تھی جیسے لوگ گلے میں ہیروں کا ہار ڈال کر دوسروں کو دکھاتے پھرتے ہیں۔ میں اور فادر پاول اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تھوڑے دنوں کے بعد فریڈ کی آنکھوں پر چھایا ہوا خمار دم توڑ دے گا اور اس کے پاس دنیا والوں کو دکھانے کے لیے کچھ نہیں رہے گا تو ایمی کے لیے اس کی عزت و توقیر میں کمی آ جائے گی۔

ہماری توقعات سے پہلے ہی گڑبڑ شروع ہو گئی۔

فریڈ نے گرمیاں شروع ہونے سے پہلے ہی راتوں کو تنہا گھومنا شروع کر دیا۔ بعض اوقات ایمی اس کے ساتھ ہوتی تھی اور بعض اوقات نہیں۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ جب ایمی اکیلی ہوتی تھی تو بچی کے شبینہ ریستوران میں کھانا کھانے نہیں آتی تھی۔

سڈ مین کے دل میں اب بھی اس کے لیے چاہ تھی۔ اس لیے کہ جب ایمی ریستوران میں آتی تھی تو وہ کوئی نہ کوئی کام غلط کر بیٹھتا تھا۔ کبھی وہ اسٹیکس جلا دیتا اور بعض اوقات اس سے سینڈوچز صحیح نہیں بنتے تھے۔

کچھ عرصے بعد ایمی نے پابندی سے ریستوران میں آنا شروع کر دیا۔ اس کے یاقوتی ہونٹوں پر اب بھی دل موہ لینے والی مسکراہٹ پھیلی رہتی تھی لیکن ہم سب جانتے تھے کہ اب وہ پہلے والی ایمی نہیں رہی ہے۔ وہ ایک مختلف عورت ہے۔ ایک ایسی عورت جس نے خود پر ایک خول چڑھا لیا ہے۔

فریڈ کے بارے میں اچانک تشویش ناک خبریں آنے لگیں۔ مجھے پتا چلا کہ فریڈ نے ہیروئن کا کاروبار کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس قصبے پر ایک سینڈیکیٹ کی حکمرانی تھی اور سارا کاروبار چوری چھپے اس کے توسط سے ہوتا تھا۔ اگر فریڈ تن تنہا یہ کام کر رہا تھا تو پھر اس پر ہاتھ ڈالنا آسان تھا۔

اس اثنا میں ایمی ایک ہفتے تک ریستوران پر نہیں آئی۔ ایک لڑکی نے اسٹور پر اسے دیکھا تھا۔ اس کی ایک آنکھ اور بازو پر بینڈیج بندھی تھی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے فریڈ نے اس کی پٹائی کی ہے۔" وہ بولی۔

ایمی سے اس بارے میں پوچھا گیا مگر اس نے انکار کیا اور چوٹ لگنے کا عذر پیش کیا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، فریڈ کی کھوکھلی محبت میں کمی آتی جا رہی تھی اور ایمی کی چوٹوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک رات اس کے رخسار پر انگلیوں کے نشانات بھی دکھائی دیے۔

سڈ مین سے برداشت نہیں ہوا۔ اس نے مجھ سے کانپتی آواز میں کہا۔ "میں اسے ہلاک کر دوں گا۔ گوشت کاٹنے والی چھری سے اس کی گردن کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

"اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" میں نے اس کا شانہ تھپک کر کہا۔ "اس سے کسی نہ کسی مرحلے پر غلطی ہونے والی ہے۔ میں موقع کا منتظر ہوں۔ پھر میں قانونی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے ایسی سزا دوں گا کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو ساری زندگی کے لیے عبرت حاصل ہوگی۔ اپنی چھری کو میز کی دراز میں رکھ لو اور وقت کا انتظار کرو۔ وقت اب زیادہ دور نہیں ہے۔"

میں اسے دلاسا دے رہا تھا مگر خود میری حالت غیر

تھی۔ ایک روز جب میں نے ایمی کا سوجا ہوا چہرہ دیکھا تو کانپ کر رہ گیا۔ میں نے فادر پاول سے کہا۔ "اب ان دونوں میں علیحدگی ہو جانا چاہیے ورنہ میں اس خنزیر کے بچے کو قتل کر دوں گا۔"

"تم قانون کے رکھوالے ہو کیپٹن!" فادر نے کافی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "جب تم فریڈ کو ختم کرو گے تو یہ قتل نہیں کہلائے گا۔ اس لیے کہ تم کوئی قانونی جواز تلاش کر کے ہی اس کا قصہ پاک کرو گے۔"

"ہاں، میں ایک دیانت دار پولیس کیپٹن ہوں۔ اگر وہ میرے ہاتھوں ختم ہوگا تو سب یہی کہیں گے کہ میں نے اسے اپنے دفاع میں ختم کیا ہے۔"

☆☆☆

ایمی کے لیے فریڈ کی محبت عارضی ثابت ہوئی۔ اس کے شب و روز پہلے کی طرح گزرنے لگے اور اس نے دوسری عورتوں کی بانہوں کا سہارا لے لیا۔ وہ ایمی کو اذیتیں دینے لگا تاکہ وہ اس سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ اسے اذیت دینے کے پس پردہ یہ جذبہ بھی کارفرما تھا کہ وہ ہمیں ذہنی ہیجان اور کرب میں مبتلا کر سکے۔ اس لیے کہ ہم سب ہی ایمی سے محبت کرتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم سب کا زاویۂ نگاہ جدا تھا۔

☆☆☆

اتوار کو نصف شب کے قریب جب میں ریستوران میں تنہا تھا اور میرے دونوں نائب کسی اور جگہ ڈیوٹی دے رہے تھے، فریڈ ایک شخص کے ساتھ وہاں داخل ہوا اور کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ وہ شخص نشے میں تھا اور اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ دونوں وہاں کافی پینے اور سرگوشیوں میں گفتگو کرنے لگے۔

پھر شرابی نے اپنی جیب سے پرس نکالا اور چند بڑے نوٹ نکال کر فریڈ کو تھما دیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور ریستوران سے باہر چلے گئے۔ جاتے ہوئے فریڈ نے خاص طور پر میری طرف مڑ کر ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا تھا۔ اس کے استہزا میں نفرت بھی جھلک رہی تھی۔

باہر نکل کر وہ دائیں جانب مڑ گئے جہاں ایک ہوٹل کی انیکسی میں فریڈ کی رہائش تھی۔

سڈ مین غالباً معاملے کو سمجھ گیا تھا۔ وہ کچن سے نکلا، اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ ہیری نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے پکڑنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ میں بہر حال مستعد تھا اس لیے میں نے بڑھ کر اس کی کنپٹی پر مکا مارا، وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ ہیری نے اس کے ہاتھ سے چھری چھین لی۔

"اس پر نظر رکھو ہیری! اسے باہر نہ جانے دینا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

ریستوران میں اس وقت فریڈ کے پانچ یا چھ ساتھی موجود تھے۔ میں نے ان کی طرف مڑ کر کہا۔ "اگر میرے واپس آنے تک تم میں سے کوئی یہاں سے اٹھا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔"

"کیپٹن! فکر نہ کرو۔ ہم میں سے کوئی باہر نہیں جائے گا۔" ان میں سے ایک نے مجھے اطمینان دلایا۔ "ہم اس معاملے میں تمہارے ساتھ ہیں۔" میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بھی فریڈ کی حرکتوں سے نالاں ہیں۔

باہر نکل کر میں نے جیکٹ کی زپ کھول دی تاکہ ہولسٹر سے ریوالور نکالنے میں دقت نہ ہو۔ مجھے خوشی تھی کہ فادر پاول اس روز ریستوران میں نہیں آئے تھے۔

ہوٹل ایمی میں لفٹ تھی مگر اس کی انیکسی میں نہیں تھی۔ گلی میں ایک دروازہ کھلتا تھا جس کے فوراً ہی بعد لکڑی کے زینے تھے جو گھومتے ہوئے اوپر گئے تھے۔

میں زینے چڑھنے لگا لیکن ابھی میں تیسری منزل پر پہنچا تھا کہ اوپر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر دوڑتے قدموں کی بھاری آوازیں سنائی دیں... کوئی اوپر سے نیچے آ رہا تھا۔ اس کے بعد دو فائر ہوئے۔

وہ شرابی ایک دروازے سے نکلا اور دھپ دھپ کرتا ہوا میرے قریب سے گزرتا ہوا چلا گیا۔ اس کے قدم صحیح طور پر نہیں اٹھ رہے تھے۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ میں نے اس کے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

میں نے اپنا ریوالور ہولسٹر سے نکال لیا اور آخری لینڈنگ کو طے کر کے اس دروازے تک پہنچ گیا جو کھلا ہوا تھا۔ فریڈ کے اپارٹمنٹ پر موت کا سناٹا تھا۔ نیچے بہت سے کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور لوگ حقیقت حال دریافت کرنے کے لیے مضطرب تھے۔ مگر جب انہوں نے مجھے ریوالور نکالے دیکھا تو دوبارہ اپنے کمروں میں دبک گئے۔

میں نے سن گن لی اور پھر چھلانگ لگا کر کھلے دروازے سے اندر چلا گیا۔ میں نے اپنا ریوالور دائیں سے بائیں ایک قوس میں لہرایا تاکہ وہاں اگر کوئی ہو تو میں اسے کور کر سکوں۔

ملحقہ کمرے میں فریڈ فرش پر چت پڑا تھا اور اس کے سینے سے خون نکل رہا تھا۔ ایک گولی اس کے بائیں جبڑے کے نیچے لگی تھی اس لیے وہاں سے بھی خون بہہ رہا تھا اور وہ نیم جاں ہو گیا تھا۔ وہ ایک خوبرو شخص تھا مگر اس وقت کریہہ

www.pkdigest.com

صورت ہو گیا تھا۔

نزدیکی دیوار سے ایمی چپکی کھڑی تھی۔ اس کے جسم میں کھنچاؤ تھا اور وہ فوج کے سپاہیوں کی طرح بالکل سیدھی تھی۔ اس کے قدموں میں ایک ریوالور پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا ہو۔ اس کے چہرے پر خوف و دہشت کی ساری علامتیں تھیں۔

میں نے بڑھ کر وہ ریوالور اٹھالیا اور پھر چاروں طرف دیکھا۔ واقعہ بالکل سیدھا سادہ تھا اور اس میں ایسی کوئی پیچیدگی نہیں تھی کہ سمجھ میں نہ آسکے۔ فریڈ نے اس شرابی سے رقم لے کر ایمی کی عزت کا سودا کرلیا تھا مگر ایمی نے انکار کیا۔ اس نے ایمی کے رخسار پر تھپڑ مارا، اس لیے کہ وہاں اس کی انگلیوں کی سرخی موجود تھی۔ فریڈ میز کی اوپری دراز میں ریوالور رکھا کرتا تھا۔ ایمی نے وہ ریوالور نکال کر اس پر دو فائر کردیے۔

بیڈ روم کے ڈریسر کی اوپری شیلف میں سات آٹھ سرنجیں اور دس بارہ پڑیاں تھیں۔ وہ یقیناً ہیروئن تھی جو فریڈ سپلائی کیا کرتا تھا۔

''میں نے اسے قتل کردیا۔'' وہ جیسے ہوش میں آکر بولی۔

''نہیں ایمی! میں نے اسے قتل کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم اس واقعے کو اس طرح یاد کرلو کہ میں تمہارے اپارٹمنٹ پر آیا تو وہ تمہیں زدوکوب کررہا تھا۔ میں درمیان میں آیا اور میں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی تو اس نے ریوالور نکال لیا۔ میں نے ریوالور چھین کر اس پر فائر کردیا۔ یہ سب کچھ میں نے اپنے دفاع میں کیا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟''

وہ تیزی سے پلکیں جھپکانے لگی، جیسے میری بات سمجھنے کی کوشش کررہی ہو۔

''میرا خیال ہے کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اس قصبے کو چھوڑ دو۔ پھر کبھی واپس نہ آنا۔ یہاں جو ہیروئن پڑی ہوئی ہے، وہ فریڈ کو مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ ویسے بھی سب اس سے بےزار تھے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں جارہی ہوں کیپٹن! تمہارا شکریہ۔'' اس نے کہا اور دوسرے کمرے میں جاکر اپنا سوٹ کیس تیار کرنے لگی۔

میں نے جھک کر فریڈ کی ہپ پاکٹ سے اس کا پرس نکال لیا اور اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں دو سو ڈالرز تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ رقم اتنی تھی کہ وہ آسانی سے واپس اپنے قصبے پہنچ سکتی تھی۔

فریڈ کے جسم کو میں نے ایک چادر سے ڈھانپ دیا۔

تھوڑی دیر بعد ایمی کمرے سے نکل آئی۔ اس کے جسم پر ایک لمبا کوٹ تھا اور ہاتھ میں وہی سوٹ کیس جسے لے کر وہ اس قصبے میں آئی تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ میں دو سو ڈالرز تھما دیے۔

''قصبے سے جانے والی جو سب سے پہلی بس ملے تو اس میں بیٹھ کر یہاں سے چلی جانا۔'' میں نے اسے تلقین کی۔ ''تمہارے پیچھے کوئی نہیں آئے گا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو مجھے اس کارنامے پر سونے کا تمغہ ملے گا۔ یہ خبر تم جلد اخبارات میں پڑھ لوگی۔ مگر میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اب تم اس قصبے میں لوٹ کر نہ آنا۔''

''میں واپس نہیں آؤں گی۔ اپنے گھر سے نکلنے کا تجربہ میرے لیے بہت بھیانک رہا۔ گھر میں نے اس لیے چھوڑا تھا کہ وہاں میری طرف کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ میری طرف آنکھ اٹھا کر کوئی نہیں دیکھتا تھا... مگر یہاں...'' اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ''اگر کسی نے دیکھا بھی، یا کوئی میری طرف ملتفت ہوا تو اس انداز سے کہ میں پامال ہوگئی۔ اب مجھے اپنے گھناؤنے وجود کی طرف دیکھ کر شرم آتی ہے۔ میں یہاں سے جارہی ہوں اور کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گی۔ اس قصبے نے میرا سب کچھ مجھ سے چھین لیا ہے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے اپنی نم آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور سوٹ کیس اٹھا کر وہاں سے چلی گئی۔

میں تھوڑی دیر بعد دوسرے کمرے میں گیا تو میں نے وہاں سے تین سرنجیں اور چار ہیروئن کی پڑیاں غائب پائیں!

یہ انکشاف میرے لیے حیرت انگیز ہی نہیں، عذاب ناک بھی تھا کہ ایمی نشے کی عادی تھی۔ وہ کھلنڈری اور درد ان پرور لڑکی پہلے سے ہیروئن کی عادی تھی یا فریڈ نے اسے نشے کا عادی بنایا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جب فریڈ نے اس کی زندگی تلخ کردی اور اس میں زہر بھر دیا تو اس نے سب کچھ فراموش کرنے کے لیے نشہ کرنا شروع کردیا ہو؟ جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ دردناک تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ لوٹ کر اس قصبے میں نہیں آئے گی لیکن اپنے گھر جانے کا بھی اس کے پاس کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ وہ ایڈونچر پسند تھی اور روشنی کی تلاش میں آئی تھی لیکن اسے تاریکیوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ اس کی مثال شہاب ثاقب جیسی تھی جو آسمان کی وسعتوں میں تھوڑی دیر کے لیے تیز روشنی دیتا ہے مگر پھر تاریکیوں میں معدوم ہوجاتا ہے اور اس کا وجود ختم ہوجاتا ہے!

کرم چند ذرا دیر تک ہاتھ میں پکڑی ہوئی گاجر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گاجر کو دانت میں دبا کر اس کا ایک ٹکڑا کاٹ لیا۔ ''کیٹی!'' اچانک وہ چلایا۔ ''دس از بیڈ۔''

''سر! یو آر اے جینئس۔'' فوراً ہی کیٹی نے اپنا تکیہ کلام کھینچ مارا۔

''اس میں جینئس کی کیا بات ہے؟'' کرم چند غرایا۔ ''کیٹی! تمہارا دماغ روز بہ روز خراب ہوتا جارہا ہے۔''

''کیوں سر... جینئس نہیں کہنا چاہیے؟'' کیٹی نے کہا۔

''آپ نے گاجر کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھتے ہی کہہ دیا، یہ گاجر خراب ہے۔''

''شٹ اپ کیٹی۔''

''یس سر!''

''یہ گاجر خراب نہیں ہے۔''

''اوہ... ٹھیک یو سر!''

''ہماری حالت خراب ہے۔'' کرم چند نے کہا۔

''اوہ سوری سر!''

''ول یو شٹ اپ کیٹی۔''

''یس سر!''

گجراتی زبان کے لبادے میں ملبوس سراغرسی کی جرم پرور تحریر

یعقوب جمیل

دو روپے کا نوٹ

سراغرسی ذہانت کا کھیل ہونے کے ساتھ دلچسپی کا سامان بھی رکھتا ہے ..... اس کام میں وقت اتنی سرعت سے گزرتا ہے کہ اندازہ نہیں ہوتا ..... ایک سراغرساں اور اس کی خوبصورت سیکریٹری کو درپیش کیس کا احوال ..... جوں جوں بات آگے بڑھ رہی تھی ..... اسرار و تجسس کا عنصر نمایاں تر ہورہا تھا۔

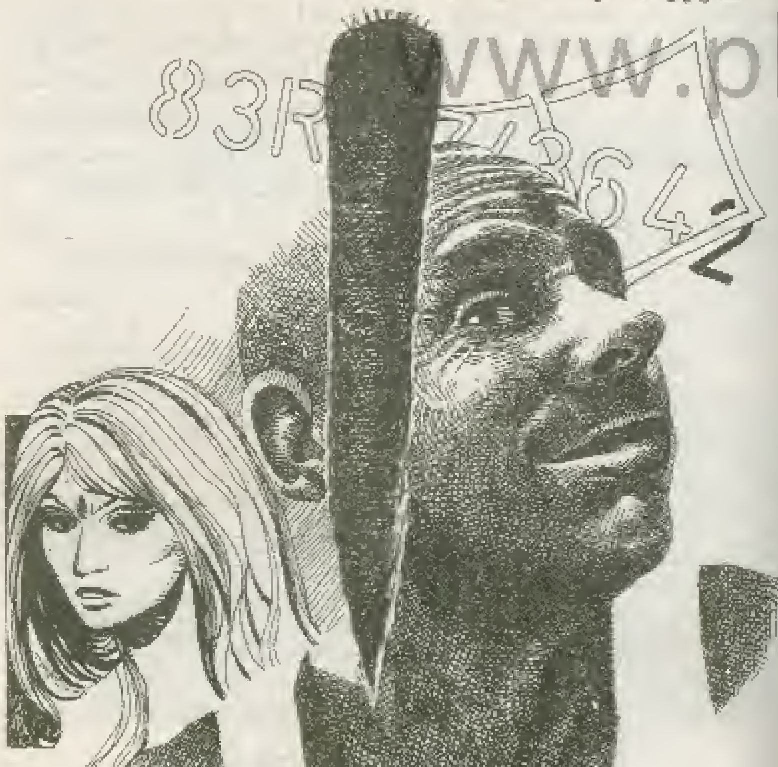

www.pkdigest.com

کرم چند نے گاجر کا ایک اور ٹکڑا دانتوں سے کاٹا اور اسے چبانے لگا اور پھر گاجر چباتے چباتے ہی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنی بھی ریزگاری تھی، نکال کر میز پر رکھ دی اور پھر اس کو گھورتے ہوئے اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ "کیٹی!"

"یس سر!"

"تم مجھ سے پوچھتی کیوں نہیں؟" کرم چند نے کہا۔

"کیا پوچھوں سر؟"

"یہی کہ ہماری حالت کیوں خراب ہے؟"

"میں کیوں پوچھوں سر؟ یو آر اے جینئس۔ آپ کو تو سب کچھ ہی معلوم ہوتا ہے۔" کیٹی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"شٹ اپ کیٹی۔" کرم چند ذرا غصے سے بولا۔

"سوری سر!"

"اُف کیٹی۔" ذرا دیر بعد کرم چند بولا۔ "ہماری حالت کیوں خراب ہے؟"

"کیوں خراب ہے سر؟" کیٹی نے پوچھا۔

"اس لیے کہ... اس لیے کہ اس گاجر کی قیمت دو روپے ہے، جس میں سے آدھی گاجر میں کھا چکا ہوں۔ اب میرے پاس یہ اتنی ہی ریزگاری بچی ہے جس سے آدھی یا پون گاجر ہی خریدی جا سکے اور ہمارے پاس جو ایک واحد کیس ہے، وہ صرف دو روپے کا کیس ہے۔"

"اوہ آئی سی... مطلب یہ کہ ایک پوری گاجر... آپ..."

"شٹ اپ کیٹی۔" کرم چند نے اسے آگے بولنے سے روک دیا۔

"سوری سر!"

"کیٹی!"

"یس سر!"

"ہمیں یہ کیس ہر حال میں حل کرنا پڑے گا۔" کرم چند نے کہا۔ "ہم لوگ دوردرشن کے چینل ون پر نہیں ہیں۔ چینل نو پر بھی نہیں ہیں۔ سونی پر بھی نہیں ہیں اور زی ٹی وی پر بھی نہیں ہیں مگر ہمیں کسی صورت واپس آنا ہے، مارکیٹ میں رہنا ہے۔"

"یس سر!" کیٹی نے کہا۔

"ہمیں کسی ایک چینل کی فوراً ہی ضرورت ہے۔" کرم چند بولا۔

"سر! کھمبا چینل چلے گا؟" کیٹی نے پوچھا۔

"کھمبا چینل؟" کرم چند نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "یہ بھلا کون سا نیا چینل آ گیا ہے؟"

"نیا نہیں ہے سر!" کیٹی بولی۔ "ہمارے علاقے میں ایک الیکٹریشن رہتا ہے، وہی یہ کھمبا چینل چلاتا ہے۔"

"شٹ اپ کیٹی..."

"سوری سر!"

☆☆☆

بات اصل میں یہ تھی کہ کرم چند کے ہاتھ ایک کیس آیا تھا اور یہ کیس دو روپے کی رشوت کا کیس تھا۔ نارکوٹکس کنٹرول اتھارٹی کے ایک انسپکٹر نے دو روپے کی رشوت لی تھی اور دو روپے کی رشوت لیتے وقت وہ پکڑا گیا تھا۔ خفیہ پولیس کے محکمے نے اس انسپکٹر کے گرد جال بچھا کر اسے گرفتار کر لیا تھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ انسپکٹر نے صرف دو روپے کی رشوت کس لیے لی تھی؟" کرم چند نے ہاتھ میں دبی ہوئی گاجر کے ٹکڑے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"یو آر رائٹ سر!" کیٹی بول پڑی۔ "رشوت ہی لینی تھی تو دو ہزار یا دو لاکھ کی لی ہوتی مگر یہ تو صرف دو روپے۔ لگتا ہے ہمارا بھارت سچ مچ بہت غریب ہو گیا ہے۔"

"شٹ اپ کیٹی!"

"یس سر!"

"میرا خیال ہے اب ہمیں اپنے کلائنٹ سے ملنا چاہیے۔"

"او... واؤ۔" کیٹی اچھل پڑی۔ "سر یو ہیو اے پوائنٹ۔"

"کیٹی..."

"سوری سر!"

☆☆☆

آدھی بچی ہوئی گاجر کو ہاتھ میں تھامے کرم چند انسپکٹر شرما کے گھر میں داخل ہوا۔ انسپکٹر شرما نے اٹھ کر دروازے پر ہی اس کا استقبال کیا۔ "آیئے... آیئے۔ ویلکم کرم چند جی..."

انسپکٹر شرما سے ہاتھ ملاتے وقت کرم چند نے ایک ہلکی سی سسکاری لی اور بولا۔ "اُف! آپ کی یہ سونے کی انگوٹھی تو بہت بھاری اور بڑے سائز کی ہے۔"

"اوہ، یہ..." انسپکٹر شرما نے اپنا ہاتھ اٹھا کر انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آئی ایم سوری... اصل میں یہ میرے سسر نے مجھے تحفے میں دی ہے۔ مگر آپ کھڑے کیوں ہیں؟ بیٹھیے نا۔" انسپکٹر نے انتہائی کیتی اور نرم نرم صوفہ سیٹ کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

کرم چند نے صوفے پر بیٹھتے بیٹھتے کمرے کا جائزہ لے لیا پھر اس سے پہلے کہ کچھ پوچھتا، انسپکٹر شرما نے کہا۔ "جناب! خفیہ پولیس والوں کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں اور ایک ایمان دار افسر ہوں۔ مجھ پر یہ ایک جھوٹا الزام ہے... آپ سگریٹ پئیں گے؟" یہ کہہ کر اس نے قیمتی سگریٹ پانچ سو پچپن کا پیکٹ کرم چند کی جانب بڑھا دیا۔

"نو تھینکس!" کرم چند نے کہا۔

"یوئی..." انسپکٹر شرما نے گولڈن لائٹر سے اپنا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "مجھے میری بہترین کارکردگی پر دو بار ایوارڈ مل چکے ہیں۔"

"آئی سی۔" کرم چند نے اس کی طرف دیکھ کر گردن ہلائی۔

"آج ذرا گرمی ہے۔ میں اے سی تیز کر دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر شرما نے ریموٹ کنٹرول سے ایئرکنڈیشنر تیز کر دیا اور پوچھا۔ "آپ کیا لیں گے؟ اسکاچ، وھسکی، رم، بیئر؟"

"نہیں شکریہ۔" کرم چند نے کہا۔ "مجھے یہ گاجر ہی سوٹ کرتی ہے۔"

"گاجر کا جوس بھی آپ کو مل جائے گا۔" انسپکٹر شرما بولا۔ "کہیے تو منگوا دوں؟ ابھی ابھی میرا ملازم ٹیکسی میں جا کر لے آئے گا۔"

"نہیں نہیں... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل ہم لوگ تو صرف آپ کا گھر ہی دیکھنے آئے تھے۔" کرم چند نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ... تو کیسا لگا آپ کو... اصل میں یہ میرے سالے کا مکان ہے۔"

"اچھا ہے... بلکہ بہت اچھا ہے۔" یہ کہہ کر کرم چند اٹھ گیا اور آگے بولا۔ "چلتے ہیں، اب ہم لوگ پولیس اسٹیشن جائیں گے تفتیش کے لیے۔"

"آپ کو وہاں تک چھوڑنے کے لیے گاڑی بھیجوں؟ مرسیڈیز ہے۔ یہ گاڑی بھی میرے سالے کی ہے۔" انسپکٹر شرما نے کہا۔

"نو تھینکس۔" کرم چند نے گاجر کا ٹکڑا کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ سائیکل رکشے پر جائیں گے۔ ویسے مسٹر شرما! آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"یہ جاسوسی ناول مصنف نے واقعی نئے انداز میں لکھا ہے۔ اس میں قاتل آخر میں وہی نکلتا ہے، جس پر آپ کو شروع سے شک ہوتا ہے"

"ویل... مجھے تو معطل کر دیا گیا ہے اس لیے وقت گزارنے کے لیے کچھ سماج سیوا، میرا مطلب ہے فلاحی کام کر رہا ہوں۔" شرما نے کہا۔

"سماج سیوا... ویری گڈ! کیسی سماج سیوا؟" کرم چند نے گاجر چباتے ہوئے پوچھا۔

"پرندوں کو دانے ڈالتا ہوں۔ چیونٹیوں کو آٹا، چینی ڈالتا ہوں۔"

"اچھا اچھا سمجھ گیا۔" کرم چند جلدی سے بولا۔ "یعنی چڑیوں کو دانا ڈالتے ہیں۔"

"جی۔"

"گڈ... ویری گڈ! اچھا اب ہم چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر کرم چند نے ہاتھ بڑھایا لیکن سونے کی موٹی انگوٹھی سے ڈر کر اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا اور "کم آن کیٹی" کہہ کر کیٹی کی طرف مڑ گیا۔

"یس باس، چلیے۔" کیٹی نے کہا اور اس کے پیچھے چل پڑی۔ باہر آ کر کیٹی سے رہا نہیں گیا اور وہ پوچھ بیٹھی۔ "سر! یہ شرما آپ کو کیسا آدمی لگ رہا ہے؟"

"بہت ایمان دار۔" کرم چند نے گاجر کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "سونے کی موٹی انگوٹھی اسے اس کے سسر نے دی ہے۔ جس بنگلے میں وہ رہ رہا ہے، وہ بنگلا اس کے سالے کا ہے اور مرسیڈیز کار بھی اس کے سالے کی ہے۔"

www.pkdigest.com

بے چارے کے پاس اپنا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سسپنڈ کر دیے جانے کے بعد وقت گزارنے کے لیے سماج سیوا کر رہا ہے۔"

"سر! ایک دوسرا سوال۔" کیٹی بولی۔

"پوچھو۔"

"ہمیں سائیکل رکشہ کہاں سے ملے گا؟" کیٹی نے پوچھا۔

"نہیں ملے گا اور اگر مل بھی گیا تو ہمارے پاس کرائے کے پیسے نہیں ہیں۔" کرم چند نے کوٹ کی جیب میں سے بچی ہوئی آخری چونی نکالی اور اسے ہتھیلی پر رکھ کر دیکھنے لگا۔

"تو سر! ہم لوگ پولیس اسٹیشن کیسے جائیں گے؟"

جواب میں کرم چند نے ٹاس کرنے کے لیے چونی کو ہوا میں اچھال دیا۔ پھر اسے اپنی ہتھیلی پر روک کر دیکھنے کے بعد بولا۔ "پھول آیا ہے اور اس کا مطلب ہے کہ ہم پیدل چلتے ہوئے وہاں جائیں گے۔"

یہ سن کر کیٹی نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر پوچھا۔ "لیکن ٹاس کرنے میں پھول کے بجائے اگر چاند آجاتا تو؟"

"تو ہم دوڑتے ہوئے جاتے۔" کرم چند نے جواب دیا۔

☆☆☆

جائے وقوعہ... یعنی پولیس اسٹیشن!

جس شخص نے نارکوٹکس آفیسر انسپکٹر شرما کو دو روپے کی رشوت دی تھی، اس کا نام کیتلی تھا۔ اس معاملے میں اس کا دیا ہوا بیان بڑا دلچسپ تھا۔ کرم چند نے اس سے چند سوالات کیے اور کیتلی نے ان سوالات کے جواب بھی بڑے دلچسپ انداز میں دیے تھے۔ ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا۔

"میرا نام کیتلی ہے صاحب۔ مجھے اپنا اصلی نام تو اب یاد بھی نہیں ہے۔ سب لوگ مجھے اسی نام سے جانتے ہیں۔ میں بچپن ہی سے اس پورے علاقے میں صبح سے شام تک چائے کی کیتلی اٹھا کر گھومتا رہتا ہوں۔ دکانداروں اور دفتروں میں کام کرنے والوں کو چائے پلانا ہی میری روٹی روزی کا ذریعہ ہے۔ یہاں کے سارے لوگ مجھے 'اوئے کیتلی... ابے کیتلی' کہہ کر بلاتے ہیں۔ بس اسی طرح میرا یہ نام پڑ گیا ہے۔ اب تو میں چالیس سال کا ہو گیا ہوں لیکن نام کیتلی ہی ہے۔ میرا ایک بیٹا ہے جس کا نام میں نے داؤد رکھا تھا لیکن ان پولیس والوں نے اس کا نام چالد رکھ دیا ہے۔ ایک دن شام کو میں مٹی کا تیل لانے گیا تھا تو اس وقت نارکوٹکس پولیس کے بڑے افسر نے میرے بیٹے کو پکڑوا کر اندر کر دیا۔"

"کیا کیا تھا اس نے؟"

"بہت معمولی سی بات تھی صاحب... جانے دیجیے۔" کیتلی ہچکچایا۔

"مگر بات کیا تھی وہ؟ جب تک پوری بات نہیں بتاؤ گے تو ہم اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔"

"صاحب! وہ میرا بیٹا اُدھر نارکوٹکس پولیس والوں کے دفتر کے پیچھے والی دیوار کے پاس 'شوں شوں' کرتے بیٹھ گیا تھا۔ بس یہی اس کا جرم بن گیا۔ شرما صاحب نے اسے پکڑوا کر پہلے تو اپنے ہی حوالات میں بند کر دیا پھر اسے پولیس تھانے بھیج دیا۔ میں نے تھانے دار سے درخواست کی کہ وہ مہربانی کر کے میرے بیٹے کو چھوڑ دیں۔ مگر تھانے دار نے مجھے یہ کہہ کر بھگا دیا کہ جب تک شرما صاحب حکم نہیں دیں گے، اس وقت تک ہم تمہارے بیٹے کو نہیں چھوڑیں گے۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"صاحب! میں شرما صاحب کے پاس گیا۔" کیتلی نے بتایا۔ "ان کے آگے ہاتھ جوڑے... رویا... گڑگڑایا اور کہا کہ داؤد میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ آپ اسے چھوڑ دیں۔ اس کی ماں بھی نہیں ہے صاحب!"

"پھر؟"

"پھر بھی نہیں چھوڑا اور مجھے دھکے مار کر نکال دیا۔" کیتلی نے آگے کہا۔ "میں جب سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر رو رہا تھا کہ تب اچانک ہی ایک سفید چمکتی ہوئی کار میرے پاس آ کر رکی اور اس میں سے دو آدمی قیمتی کپڑے پہنے اور آنکھوں پر کالے چشمے چڑھائے نیچے اترے اور مجھ سے بولے۔ ابے روتا کیوں ہے؟ شرما صاحب تیرے لڑکے کو ایسے ہی نہیں چھوڑ دیں گے۔ انہیں کچھ دینا پڑے گا۔ یہ کہہ کر ان میں سے ایک نے اپنی جیب سے دو روپے کا ایک نوٹ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ یہ نوٹ جا کر شرما صاحب کو دے دے، وہ تیرے لڑکے کو چھوڑ دیں گے۔"

"نہیں صاحب۔" میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "دو روپے کی کیا ویلیو ہے۔ وہ مجھے ماریں گے اور مجھے بھی حوالات میں بند کر دیں گے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "یہ شرما صاحب کا فکس ریٹ ہے۔ جاؤ جا کر انہیں دے دو تمہارا کام ہو جائے گا۔"

"اس کے بعد وہ لوگ تو اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ پھر میں دو نوٹ لے کر شرما صاحب کے دفتر کی طرف

جانے لگا تو بیچ میں مجھے دوسرے دو اور صاحب لوگوں نے روک لیا اور ایک نے کہا۔ وہ نوٹ لاؤ۔ میں نے ڈرتے ڈرتے نوٹ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔"

"پھر؟"

"پھر انہوں نے اس نوٹ پر سفید پاؤڈر جیسی کوئی چیز لگائی اور پھر نوٹ میرے ہاتھ میں دے کر بولے۔ 'لو اب یہ نوٹ خوشبودار ہو گیا ہے۔ شرما صاحب خوش ہو جائیں گے۔ جاؤ جا کر انہیں دے دو۔'"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"میں نے جا کر وہ نوٹ شرما صاحب کو دیا تو وہ خوش ہو گئے اور پھر انہوں نے اسے اپنی جیب میں رکھ لیا... پھر میں ان سے اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے کہنے والا تھا کہ... اتنے..."

"کیا ہوا اتنے میں؟"

"اتنے میں وہی دونوں صاحب لوگ جنہوں نے میرے ہاتھ سے نوٹ لے کر اس پر پاؤڈر لگایا تھا، وہ بھاگتے ہوئے اندر آگئے۔ پہلے تو انہوں نے شرما صاحب کو اپنا کارڈ دکھایا اور پھر انہیں پکڑ لیا۔"

"اوہ..."

☆☆☆

"ہوں..."

"ہوں..."

"ٹریپ..."

"ٹریپ..."

"کیٹی! میں جو بولوں، وہ تمہارا ریپیٹ کرنا ضروری ہے؟"

"نو سر!"

"دین شٹ اپ۔" یہ کہہ کر کرم چند نے جیب میں سے گاجر نکالی۔

کیٹی نے اپنی جیب میں سے پلاسٹک کا ایک اسکیل نکالا اور بولی۔ "سر! اب یہ آخری گاجر ہی ہے۔"

"تو؟" کرم چند نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

"ایک سینٹی میٹر سے بڑا ٹکڑا آپ کاٹ لے گا۔" کیٹی نے اسکیل کرم چند کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس گاجر کو آپ کو اس کیس کے ختم ہونے تک چلانا ہے۔"

"شٹ اپ۔" یہ کہہ کر کرم چند نے تین سینٹی میٹر سے بڑا ٹکڑا دانتوں سے کاٹ لیا۔

"سر!" کیٹی کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔

"اس طرح تو آپ ہماری تمام جمع پونجی عیاشی میں اڑا دیں گے اور اس کے بعد ہمارا یہ دفتر کیسے چلے گا؟"

"مولیوں پر۔" کرم چند گاجر چباتے ہوئے بولا۔

کیٹی کچھ نہیں بولی۔ کرم چند تین سینٹی میٹر گاجر کے ٹکڑے کو تین منٹ تک چباتا رہا پھر اچانک ہی وہ اچھل پڑا۔ "کیٹی..."

"یس سر!"

"تم جانتی ہو... دو روپے کا وہ نوٹ خفیہ پولیس والوں کا نہیں تھا۔ وہ نوٹ چائے والے کیتلی کا بھی نہیں تھا۔" کرم چند نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"تو پھر کس کا تھا سر؟" کیٹی نے پوچھا۔

"سفید چمکتی ہوئی کار میں جو لوگ کالا چشمہ لگا کر آئے تھے، وہ نوٹ ان کا تھا... رائٹ؟"

"رائٹ سر! یو آر اے جینئس۔"

"مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اتنی قیمتی کار کے مالک نے اس نارکوٹکس انسپکٹر کو دو روپے کیوں بھجوائے ہوں گے؟" یہ کہہ کر کرم چند اپنا سر کھجانے لگا۔

"سر! ہو سکتا ہے کہ اس سفید کار کے مالک کا بیٹا بھی انسپکٹر شرما کے دفتر کے باہر 'شوں شوں' کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔" کیٹی نے کرم چند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شٹ اپ کیٹی... کیا بکواس کر رہی ہو؟"

کرم چند نے گھور کر اس کی طرف دیکھا تو کیٹی چپ ہو گئی لیکن چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ پھر بول پڑی۔ "سر! ایک بہت اہم بات آپ بھول گئے۔"

"کیا؟"

"ان کار والوں نے چائے والے کو دو روپے کا نوٹ دیتے وقت اس سے یہ بھی کہا تھا کہ انسپکٹر شرما کا یہ فکس ریٹ ہے۔"

"شٹ اپ کیٹی... جانتی ہو، ان لوگوں نے دو روپے کا نوٹ انسپکٹر شرما کو کیوں بھجوایا تھا؟" کرم چند نے پوچھا۔

"نو سر!"

"وہ اس لیے کہ دو روپے کا وہ معمولی نوٹ ایک بہت ہی خاص نوٹ تھا۔" کرم چند نے رک رک کر کہا۔ "کوئی خاص پیغام تھا اس نوٹ میں، کوئی خاص کوڈ ورڈ..."

"اوہ... یو آر اے جینئس سر۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"سر!"

"یس۔"

www.pkdigest.com

”آپ مزید تین سینٹی میٹر گاجر اور کھا جائیں۔“ کیٹی نے کہا۔

”نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ کرم چند تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ ”کم آن... ہمیں چلنا ہے۔“

”کہاں سر؟“

”کورٹ کے ریکارڈ روم میں جہاں دو روپے کا وہ نوٹ ہوگا۔ اس کیس کی فائل میں ہی ہوگا۔“ کرم چند نے جلدی سے کہا۔

”اوہ واؤ سر۔“ کیٹی خوش ہو کر بولی۔ ”میرے منہ میں تو پانی آرہا ہے۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ وہ دو روپے کا نوٹ ہمارے ہاتھ میں آجائے گا تو ہم اس سے ایک بڑی گاجر خرید سکیں گے۔“

”شٹ اپ کیٹی۔“

”یس سر!“

☆☆☆

کرم چند سوچ رہا تھا کہ کورٹ میں رکھے ہوئے ریکارڈز پر ہاتھ مارنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام بالکل بھی آسان نہیں ہے اور خاص کر اس کیس کی فائل پر ہاتھ ڈالنا جس میں نارکوٹکس کنٹرول آفیسر جیسا ایمان دار اور شریف آدمی ملوث ہو۔

”کیٹی! ہم دو روپے کے اس نوٹ کو کورٹ کے ریکارڈ سے باہر کیسے نکال پائیں گے؟“ کرم چند نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔ ”تمہاری سمجھ میں کچھ آرہا ہے؟“

”یس سر... میرے پاس ایک بہترین آئیڈیا ہے۔“ کیٹی نے کہا۔

”کیسا آئیڈیا ہے؟“

”سر! ریکارڈ روم کا جو خاص چپراسی ہے، اسے ہم سو روپے کی رشوت دیں گے۔“ کیٹی نے کہا۔ ”اس سے وہ خوش ہو جائے گا کیونکہ اسے اٹھانوے روپے کا فائدہ ہوگا۔ وہ آرام سے فائل میں سے وہ نوٹ نکال لے گا اور اس کی جگہ دو روپے کا دوسرا نوٹ رکھ دے گا۔“

”شٹ اپ کیٹی۔“

”کیوں سر؟“ کیٹی نے حیرت سے پوچھا۔

”اگر رشوت سے یہ کام ہو جاتا تو انسپکٹر شرما کب کا یہ کام کر چکا ہوتا۔“ کرم چند بولا۔

”تو اب...؟“

”میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔“ کرم چند بولا۔

”کیا؟“

”میں ریکارڈ روم کے خاص چپراسی کو ہپناٹائز کروں گا پھر ہمیں رشوت کا رسک بھی نہیں لینا پڑے گا۔ وہ ہپناٹائز ہو کر خود ہی وہ نوٹ نکال کر ہمیں دے دے گا۔“

”اوہ واقعی؟“ کیٹی بولی۔ ”کیا آپ کو ہپناٹائز کرنا آتا ہے؟“

”تمہیں کیا لگتا ہے؟ پچھلے سات سال سے تم میرے پاس بغیر تنخواہ، بغیر بونس اور میری کھائی ہوئی گاجروں کے چھوٹے ٹکڑے کھا کھا کر جس طرح کام کر رہی ہو، وہ بغیر ہپناٹائز کیے ممکن ہے؟“

کرم چند کی بات سن کر کیٹی بالکل چپ ہوگئی۔ کرم چند ذرا دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”کیٹی! چپ کیوں ہوگئیں؟ تم کچھ بولتی کیوں نہیں؟“

”کیا بولوں؟“ کیٹی نے اداس لہجے میں کہا۔

”تمہارا تکیہ کلام... سر یو آر اے جینئس۔“ کرم چند مسکرا کر بولا۔

”سر! یو آر اے چیٹر... آپ دھوکے باز ہیں۔“ کیٹی نے غصے میں منہ پھلا کر کہا۔

”شٹ اپ کیٹی... مجھے معلوم ہے۔“

☆☆☆

کرم چند کے ایک ہاتھ میں دو روپے کا وہی نوٹ تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں گاجر تھی بلکہ گاجر کا ٹکڑا تھا۔ نوٹ کو گھور گھور کر دیکھنے کے بعد اس نے اپنا منہ کھولا تو گاجر کا ٹکڑا اس کے منہ کے اندر سرک گیا۔

”سر!“ اچانک کیٹی چیخ پڑی۔

”کیا ہوا؟“

”ہماری مانگ پوری کرو۔“ کیٹی نے ہاتھ اٹھا کر نعرہ لگایا۔

”شٹ اپ کیٹی... یونین بازی بند کرو۔“ کرم چند دھیرے سے بولا۔

”سوری سر!“

میز پر رکھے ہوئے دو روپے کے نوٹ کو گھور گھور کر دیکھنے کے بعد کرم چند نے پھر اپنا منہ کھولا اور گاجر کا ٹکڑا منہ کے اندر جانے لگا۔

کیٹی پھر چیخ پڑی۔ ”سر!“

”کیا ہے؟“

”ہماری مانگ پوری کرو۔“ کیٹی نے پھر نعرہ لگایا۔

”پھر یونین بازی؟ کیٹی... تمہیں گاجر کے ٹکڑے میں سے حصہ چاہیے نا؟“ کرم چند نے کہا۔

”نہیں... ہماری مانگ اس سے بڑی ہے۔“ کیٹی نے کہا۔ ”ہمیں بھوک لگی ہے۔ ہم چائنیز ریسٹوران میں کھانا چاہتے ہیں۔“

”چائنیز ریسٹوران میں؟“

”یس سر...“

”اوکے...“ کرم چند نے درد میں ڈوبا ہوا بہت گہرا سانس لیا اور پھر بھاری سی آواز میں بولا۔ ”انتظامیہ اس کے بارے میں سوچ کر کل جواب دے گی۔“ اتنا کہہ کر اس نے تین سینٹی میٹر کا ایک ٹکڑا اور کاٹ لیا اور جلدی جلدی منہ چلانے لگا۔

☆☆☆

کرم چند کے ایک ہاتھ میں دو روپے کا وہی نوٹ تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹارچ لائٹ تھی۔ یہ ٹارچ الٹراوائلٹ ٹارچ تھی۔ کرم چند نے بٹن دبا کر اسے آن کیا تو الٹراوائلٹ کرنیں دو روپے کے اس نوٹ پر تھرکنے لگیں۔

”دیکھو کیٹی... اس نوٹ پر ایک خاص قسم کا پاؤڈر لگایا گیا ہے۔“ کرم چند نے نوٹ کیٹی کی آنکھوں کے آگے کر دیا اور بولا۔ ”پاؤڈر کے یہ ذرے عام روشنی میں بالکل نظر نہیں آتے۔ لیکن الٹراوائلٹ کرنوں سے یہ صاف نظر آتے ہیں۔“

”یس باس!“

”اب یہ نوٹ جہاں جہاں اور جس جس کے پاس جائے گا، وہاں وہاں پاؤڈر کے ذرات بھی جائیں گے۔“ کرم چند نے دھیرے دھیرے کہا۔ ”انسپکٹر شرما نے اپنی انگلیوں سے جب یہ نوٹ تھاما تھا تو اس کی انگلیوں پر اس کے ذرات جم گئے تھے جس کی وجہ سے وہ پکڑا گیا تھا۔ ویسے اس کی قمیص کی جیب پر سے بھی پاؤڈر کی موجودگی کا ثبوت مل گیا تھا۔ چائے والے سے نوٹ لے کر ان خفیہ پولیس کے افسران نے ہی اس پر یہ پاؤڈر لگایا تھا۔“

”یس سر... بات اب سمجھ میں آگئی۔“ کیٹی نے کہا۔

”کیا؟“

”یہی کہ خفیہ پولیس والے ہر چیز پر پاؤڈر لگانے کا ہی کام کرتے ہیں۔“

”شٹ اپ کیٹی۔“

”سوری سر!“

”اب ایک بار پھر ذرا غور سے دیکھو۔“ کرم چند نے ایک بار پھر نوٹ کیٹی کے آگے کرتے ہوئے کہا۔ ”اس نوٹ میں تمہیں کوئی خاص بات نظر آرہی ہے... کوئی غیر معمولی بات؟“

”ہاں... یہ نوٹ ذرا کچھ مختلف سا لگ رہا ہے۔“ کیٹی نے کہا۔

”مثال کے طور پر کیا بات مختلف ہے اس میں؟“ کرم چند نے پوچھا۔

”مثال کے طور پر سر... یہ نوٹ میلا نہیں ہے، مسلا ہوا بھی نہیں ہے۔ اس میں سے کڑوے تیل یا باسی دودھ کی بو بھی نہیں آرہی ہے۔ یہ کہیں سے پھٹا ہوا بھی نہیں ہے، نہ اس پر جگہ جگہ پبلک کے آٹوگراف ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ عام طور پر استعمال ہونے والا دو کا نوٹ نہیں ہے۔“

اتنا کہہ کر کیٹی سانس لینے کے لیے رکی ہی تھی کہ کرم چند پوچھ بیٹھا۔ ”آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو کیٹی؟“

”یہی کہ یہ نوٹ عام طور پر استعمال ہونے والا نوٹ نہیں ہے۔“ کیٹی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو بالکل نیا نقلی نوٹ ہے۔“

”شٹ اپ کیٹی۔“ کرم چند ذرا اونچی آواز میں بولا۔ ”اصل میں تم نے کافی عرصے کے بعد دو روپے کا ایسا نیا نوٹ دیکھا ہے اس لیے تمہیں ایسا لگ رہا ہے۔ یہ سو فیصد اصلی نوٹ ہے۔ یہ دیکھو، اس کے نمبر بھی صاف طور پر پڑھے جا سکتے ہیں۔“ کرم چند نے نوٹ کو ذرا اونچا کیا اور نمبر پڑھنے لگا۔ ”83R-574354... لو تم بھی پڑھ لو۔“

”نو سر!“ کیٹی نے کہا۔ ”83R-574364 نوٹ کی دوسری طرف تو یہ نمبر لکھا ہوا ہے۔“

”وہاٹ؟“ کرم چند چونک پڑا۔ ”لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ نوٹ پر تو دونوں طرف ایک ہی نمبر ہوتے ہیں اور وہ ہیں...“ یہ کہہ کر کرم چند نے دوسری جانب کے نمبر کو دھیان سے دیکھا۔ ”اوہ... یس کیٹی! یہ تو دونوں جانب کے نمبر الگ الگ ہیں... ایک نوٹ پر دو دو نمبر...“

”نو گاڈ سر... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”بہت آسانی سے ایسا ہو سکتا ہے۔“ کرم چند نے دھیرے دھیرے اپنا سر کھجایا۔ ”یہ دو نوٹوں کے الگ الگ ٹکڑے ہیں جنہیں سولوٹیپ کیمیکل سے بڑی مہارت سے چپکایا گیا ہے۔“

”دو نوٹوں کے دو الگ الگ ٹکڑے!“ کیٹی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”مگر سر! اس میں تو کوئی ٹیپ نظر نہیں آرہا ہے۔ یہ کہیں سے جڑا ہوا بھی دکھائی نہیں دیتا۔“

”یہی تو کمال کی بات ہے کہ سرسری طور پر دیکھنے

www.pkdigest.com

والے کو کچھ نظر ہی نہ آئے۔" کرم چند نے کہا اور پھر نوٹ کے بیچوں بیچ میں اپنے انگوٹھے کا ناخن رکھ کر اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اب اس کے دونوں ہاتھ میں نوٹ کے دو ٹکڑے تھے۔

"اوہ... سر! یہ آپ نے کیا کر دیا؟" کیٹی چیخ پڑی۔

"کیوں... کیا ہوا؟"

"اب اگر ہم اس نوٹ کو دوبارہ پہلے کی طرح جوڑ نہیں پائے تو سبزی والا ہمیں آدھی گاجر بھی نہیں دے گا۔" کیٹی ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولی۔ "ہائے... ہائے، اب کیا ہوگا؟"

"شٹ اپ کیٹی... اب ہم سبزی والے کے پاس نہیں جائیں گے۔"

"تو کہاں جائیں گے سر؟"

"حوالہ کمپنی میں۔"

"حوالہ کمپنی... کیا مطلب سر؟"

"مطلب ہنڈی... وہ کمپنی جو ایک ملک سے دوسرے ملک لوگوں کے پیسے غیر قانونی طور پر بھجوا دیتی ہے۔" کرم چند نے سمجھایا۔

"تو ہم وہاں جا کر کیا نوٹوں کے ان ٹکڑوں کو کہیں اور بھجوائیں گے؟" کیٹی نے حیرت سے کرم چند کی طرف دیکھا۔ "مگر مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ ہنڈی والے دو روپے کے نوٹ کے دو ٹکڑوں کو لے لیں گے۔"

"شٹ اپ کیٹی۔"

"سوری سر!"

"چلو ہمیں ابھی چلنا ہے۔"

"سر! یو... آر... اے..."

"جینئس، مجھے معلوم ہے۔" یہ کہہ کر کرم چند کمرے سے نکل گیا اور کیٹی اس کے پیچھے لپکی۔

☆☆☆

حوالہ ایجنٹ کے دفتر میں ایک خاص سسٹم سے ہر کام ہوتا تھا۔ پہلے کرم چند اندر گیا۔ اس وقت کیٹی سڑک کی دوسری جانب کھڑی ایک دکان کے شوکیس میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے وہیں سے کرم چند کو حوالہ ایجنٹ کے دفتر میں جاتے دیکھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس نے کرم چند کو واپس آتے ہوئے دیکھا۔ کرم چند کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا پھولا ہوا سفری بیگ تھا۔

کرم چند نے دفتر کے اندر جا کر شیشے کے ایک بند کیبن میں بیٹھے ہوئے شخص سے ہاتھ ملایا اور پھر اپنی جیب سے اس دو روپے کے نوٹ کا ایک ٹکڑا نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ کیبن میں بیٹھے ہوئے شخص نے نوٹ کے اس ٹکڑے کو دھیان سے دیکھا پھر میز کی دراز میں سے ایک ڈائری نکال کر اس کے اندر سے دو روپے کے نوٹ کا ویسا ہی ادھورا ٹکڑا نکال کر دونوں کے نمبر ملانے لگا۔ نوٹ کے دونوں ٹکڑوں میں ایک ہی نمبر تھے۔ اپنا اطمینان کر لینے کے بعد اس نے کرم چند کو وہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنے پیچھے والے شیشے کے دروازے سے اندر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ سیاہ رنگ کا ایک پھولا ہوا سفری بیگ لے کر آ گیا اور اسے کرم چند کے سامنے میز پر رکھ کر بولا۔

"دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیجیے... کیش ہیں... ایک کروڑ!"

کرم چند نے بیگ کی زپ کھول کر اندر دیکھا۔ بیگ نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کرم چند نے زپ بند کی اور بیگ اٹھا کر 'تھینک یو' کہہ کر باہر نکل آیا۔

کرم چند نے سڑک پار کی اور بیگ اٹھائے اس فٹ پاتھ پر آ گیا جہاں کیٹی کھڑی تھی۔ لیکن دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی مگر کیٹی نے کرم چند کی آنکھوں کا اشارہ سمجھ لیا تھا اور اب وہ حوالہ ایجنٹ کے دفتر کی طرف جا رہی تھی۔ دو روپے کے اس نوٹ کا دوسرا حصہ اس کے پاس تھا۔

ذرا دیر بعد جب وہ ایجنٹ کے دفتر سے نکل کر سڑک پر آئی تو اس کے ہاتھ میں بھی ویسا ہی سیاہ رنگ کا پھولا ہوا سفری بیگ تھا۔ مگر جیسے ہی وہ سڑک پار کر کے کرم چند کے قریب پہنچی تو کرم چند نے خود ہی آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے بیگ لے لیا۔

"واؤ... بیگ کا کپڑا بہت مضبوط اور بہت اچھا ہے۔ البتہ بیگ ذرا بھاری ہے۔" کیٹی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"یہ بیگ بھاری نہیں ہے بلکہ اس کے اندر جو مال ہے وہ بہت بھاری ہے۔" کرم چند نے کہا۔

"کیا بھرا ہوا ہے اس بیگ میں؟" کیٹی نے معصومیت سے پوچھا۔

"کیوں، تم نے ایجنٹ کے سامنے اسے کھول کر نہیں دیکھا تھا؟"

"نہیں... مجھے کیا ضرورت تھی؟" کیٹی نے اسی لہجے میں کہا۔ "اس نے تو کہا تھا آپ دیکھ کر اپنی تسلی کر لیں۔ لیکن مجھے تو ڈر لگ رہا تھا اس لیے 'ٹھیک ہے' کہہ کر جلدی سے اٹھ گئی۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ کیا تم نے ایسا بیگ پہلے کبھی دیکھا نہیں ہے؟" کرم چند نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"ٹی وی پر بھی نہیں؟"

"اوہ، ہاں یاد آ گیا۔" کیٹی نے اچھل کر کہا۔ "ایک بار ٹی وی کے ایک اشتہار میں ایسا ہی بیگ دیکھا تھا۔"

"ٹھیک ہے اب تم پوچھو کہ ان دونوں بیگ میں کیا ہے؟" کرم چند نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یس سر... بتا دیجیے کیا ہے ان دونوں میں؟"

"ایک کروڑ روپے ایک بیگ میں اور ایک کروڑ روپے دوسرے بیگ میں۔" کرم چند بولا۔ "اور اسی لیے یہ اتنے بھاری ہیں۔"

"واقعی سر؟" کیٹی حیرت سے بولی۔ "ایک کروڑ اس میں اور ایک کروڑ اس میں؟"

"یس کیٹی..."

"یعنی دونوں میں دو کروڑ... سر! یو آر اے جینئس۔" کیٹی خوشی سے تالیاں بجانے لگی۔ "سر! یو آر اے جینئس۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"بس تو جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر آخر وہ بچی ہوئی چونی نکال کر بات کر لیں۔" کیٹی نے کہا۔ "اگر چاند آ جائے تو میں روزے توڑ کر گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"شٹ اپ کیٹی... اب ہمارے پاس بہت روپے ہیں۔ اب ہم ٹیکسی پر بیٹھ کر بھی گھر جا سکتے ہیں۔"

"اوہ... یس... ٹیکسی... ٹیکسی!" کیٹی سڑک کی طرف ہاتھ ہلانے لگی۔

تب ہی ایک ٹیکسی تیزی سے آ کر فٹ پاتھ کے کنارے رک گئی۔ مگر اس سے پہلے کہ کیٹی آگے بڑھ کر ٹیکسی کا دروازہ کھولتی، اس کا پچھلا دروازہ کھل گیا اور اس میں سے سادہ لباس میں ملبوس خفیہ پولیس کے دو افسر اتر کر کرم چند کے پاس آ گئے۔ کرم چند نے پہلے تو باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور پھر اچانک ہی ہنستے ہوئے بولا۔ "اوہ، مسٹر پٹیل! آپ لوگ یہاں کیسے؟"

"ہم تو صبح سے ہی آپ کے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں مسٹر کرم چند۔" انسپکٹر پٹیل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ جیسے بڑے پرائیویٹ جاسوس سے جاسوسی بھی تو سیکھنی ہے۔"

"اوہ، ویری گڈ۔" کرم چند ہنس کر بولا۔ "میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاتا ہوں۔ میں نے اس دو روپے کے نوٹ کا معما حل کر لیا ہے جو ہارو کس انسپکٹر شرما کو نامعلوم افراد کی طرف سے بھجوایا گیا تھا۔"

"اچھا..." پٹیل نے پھر طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اصل میں وہ دو کا نوٹ حوالہ ایجنٹ کی پرچی تھی۔ یعنی جو شخص وہ نوٹ لے کر حوالہ ایجنٹ کے پاس جائے گا، اسے وہاں سے دو کروڑ روپے مل جائیں گے۔" کرم چند نے کہا۔ "اس طرح انسپکٹر شرما کو انہوں نے دو روپے کے نوٹ کے ذریعے دو کروڑ کی رشوت دی تھی۔"

"تو اب دو روپے کا نوٹ کہاں ہے؟" انسپکٹر پٹیل نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"وہ تو میں نے کیش کرا لیا۔" کرم چند بولا۔ "اس نوٹ کے دونوں ٹکڑے اب حوالہ ایجنٹ کے پاس ہوں گے۔"

"لیکن آپ کے پاس وہ نوٹ کہاں سے آیا؟" پٹیل نے کرم چند کو گھورتے ہوئے پوچھا، پھر بولا۔ "وہ نوٹ تو کورٹ کے ریکارڈ میں محفوظ تھا۔"

"اوہ... وہ..." کرم چند ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے؟

"مسٹر کرم چند! آپ نے کورٹ کے ریکارڈ روم سے ایک اہم کیس کا سب سے بڑا ثبوت غائب کیا ہے۔ اس لیے میں آپ کو اس جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "امریش! پولیس موبائل کو فون کرو اور ان دونوں کو گرفتار کر لو... چلو جلدی کرو... میں تھک گیا ہوں، مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"ذرا ٹھہرو مسٹر امریش۔" کرم چند نے ہاتھ اٹھا کر اس دوسرے افسر کو روکا اور پھر پٹیل سے بولا۔ "میں یہی تو ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس حوالہ ایجنٹ کو پکڑیں کیونکہ وہ نوٹ اسی کے پاس ہے۔"

"لیکن ایجنٹ اسے چبا گیا ہوگا۔" پٹیل نے کہا۔

"تو اس کے پیٹ میں سے نکالیے۔"

"اور اگر اس نے اسے جلا دیا ہو تو؟" انسپکٹر پٹیل بولا۔ "اب آپ بتائیے، یہ دو کروڑ روپے کے دو بیگ آپ کے پاس کہاں سے آ گئے؟"

لیکن کرم چند جب کوئی جواب نہیں دے سکا تو پٹیل نے پھر امریش سے کہا۔ "پولیس موبائل کو بلاؤ اور انہیں ہتھکڑیاں لگا کر تھانے لے چلو۔" یہ کہہ کر انسپکٹر پٹیل نے کھڑے ہی کھڑے منہ کھول کر جمائی لی۔

"سر! اب ہم کس طرح بچیں گے؟" کیٹی نے دھیرے سے پوچھا اور مزید کہا۔ "سر! ہم نے تو واقعی کورٹ

www.pkdigest.com

کے ریکارڈ سے اصل نوٹ غائب کر کے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ اب ہمارا بچنا بہت مشکل ہے سر!"

"اب ایک ہی راستہ ہے۔" کرم چند نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "یہ دو کروڑ اب دو کروڑ نہیں ہیں۔"

"کیا؟" کیٹی نے آنکھیں پھاڑ کر کرم چند کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" کرم چند اچانک ہی اونچی آواز میں بولا۔ "مسٹر چٹیل! آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

"کیا؟" انسپکٹر چٹیل نے پوچھا۔

"یہی کہ یہ دو کروڑ دو کروڑ نہیں ہیں بلکہ ایک کروڑ ہیں... صرف ایک کروڑ!" کرم چند نے انگلیوں کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

"ایک کروڑ...؟" چٹیل نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے منہ کھول کر زوردار جماہی لی۔ "مجھے تو نیند آرہی ہے۔"

"تو چلیے ایسا کرتے ہیں کہ ڈیڑھ کروڑ ادھر اور پچاس لاکھ اُدھر۔" کرم چند نے کہا۔ "بس پچاس لاکھ فائل کر لیجیے۔ اخباروں میں شائع ہونے والی خبروں میں اتنی رقم تو دکھانی ہی پڑے گی۔ ویسے حکومت کے خزانے میں جمع کرانے کے لیے یہ کم رقم نہیں ہے۔ کیا کہتے ہیں آپ؟"

خفیہ پولیس انسپکٹر چٹیل کو کرم چند کی یہ بات اچھی لگی۔ اسی لیے وہ ذرا آگے آکر دھیرے سے کرم چند کے کان میں بولا۔ "اب ڈیڑھ کروڑ کا کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں ہوگا۔" کرم چند نے بھی اس کے کان میں ہی کہا۔ "پورے ہی آپ کے گھر جائیں گے۔"

"کیا؟" انسپکٹر چونک کر اچانک ہی زور سے بولا۔ "نہیں... یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ میں ایک ایمان دار آفیسر ہوں۔ اتنی بڑی بے ایمانی میں نہیں کر سکتا کہ ڈیڑھ کروڑ اپنے گھر لے جاؤں۔"

"تو؟"

"تو انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ پچاس تمہارے، پچیس امریش کے اور پچھتر لاکھ میرے۔" انسپکٹر چٹیل نے کہا۔ "بولیے اب کیا کہتے ہیں آپ؟"

"نہیں... یہ ہرگز نہیں ہوگا۔" کرم چند بولا۔ "میں تو ایک پائی بھی نہیں لوں گا۔ سارا کریڈٹ آپ کا ہے۔ یہ کیس آپ نے حل کیا ہے۔ کورٹ کے ریکارڈ سے دو روپے کا نوٹ بھی آپ نے ہی غائب کیا ہے۔ اس کے دو حصوں کا راز بھی آپ ہی نے کھولا ہے اور آپ ہی نے حوالہ ایجنٹ سے کیش وصول کیا ہے۔ اس لیے میں کون ہوتا ہوں اپنا کمیشن لینے والا؟"

"مگر کرم چند جی... یہ رقم تو میں آپ کو دے رہا ہوں۔" انسپکٹر چٹیل کرم چند کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اس کیس کا سارا کریڈٹ آپ نے مجھے دیا ہے۔ اس لیے حکومت کی طرف سے مجھے جو انعام ملے گا اس میں سے آدھا میں آپ کو دوں گا۔"

"ٹھیک ہے تو پھر پچاس لاکھ آپ کیٹی کو دے دیجیے۔ میں تو اس میں سے ایک پائی بھی نہیں لوں گا۔" کرم چند بولا۔

"مگر کرم چند جی، بات تو ایک ہی ہے۔" انسپکٹر چٹیل نے ہنس کر کہا۔ "کیٹی آپ کی بیوی ہی تو ہے۔"

"نہیں۔ کیٹی جب گھر کے اندر ہوتی ہے، تب ہی وہ میری بیوی ہوتی ہے اور دفتر کے کام میں وہ صرف میری سیکریٹری ہوتی ہے۔" کرم چند نے کہا۔ "اس لیے پچاس لاکھ اسی کو دیجیے۔"

"اچھی بات ہے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر چٹیل اپنے ساتھی امریش کی جانب مڑ کر بولا۔ "جاؤ جلدی اور اس سالے حوالہ ایجنٹ کو پکڑ لو۔ اگر وہ نوٹ چبا گیا ہو تو اس کے منہ میں انگلی ڈال کر نکالو... پیٹ پر ڈنڈے مارو، کچھ بھی کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" امریش حوالہ ایجنٹ کے دفتر کی جانب دوڑ گیا۔

☆☆☆

"سر! یو آر اے جینئس۔"

"شٹ اپ کیٹی۔"

"سر! پچاس لاکھ کا کیس پکڑنے پر حکومت نے خفیہ پولیس انسپکٹر چٹیل کو پچاس ہزار روپے کا نقد انعام دیا ہے۔" کیٹی نے کہا۔ "اور انسپکٹر چٹیل نے وعدے کے مطابق پچیس ہزار آپ کو بھجوائے ہیں۔"

"ہاں، وہ بہت ایمان دار افسر ہے۔" کرم چند نے کہا۔

"سر! آپ سچ مچ جینئس ہیں۔" کیٹی نے کہا۔ "سارا کریڈٹ آپ نے اس کے سر پر ڈال دیا۔ نہیں تو کورٹ کے ریکارڈ کی چوری کے جرم میں تو ہم اندر ہی ہوتے۔"

"بس یہی تو ایک راستہ تھا بچنے کا۔" کرم چند نے کہا۔ "اب انعام کے وہ پچیس ہزار روپے میری گاجروں کے لیے رکھ دو کیونکہ دوسرا کیس نہ جانے کتنے سال بعد ملے۔"

"سر! یو آر اے جینئس۔"

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔"

وقت کا قیدی

ثمر عباس

زندگی کے کچھ لمحات جو کیف آگیں ...... پُر لطف اور دلچسپ ہونے کے باعث یادگار بن جاتے ہیں ...... انسان چاہتا ہے کہ گزرے وہ ایّام پلٹ کر واپس آجائیں ...... مگر وہ وقت ہی کیا جو لوٹ کر واپس آسکے ...... یہ تو ریت کے مانند پھسلنا جانتا ہے ...... ایسے ہی ایک شخص کا ماجرا جو وقت کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا تھا.

اس شخص کی کہانی جسے سرِ راہ ایک قیمتی شے مل گئی تھی

کارل ہلٹن بہت خوش تھا۔ جس وقت وہ طیارے میں سوار ہو رہا تھا اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ اس نے اس پرواز کا ٹکٹ بہت مشکل سے حاصل کیا تھا۔ اس پرواز کا ٹکٹ ہر ایرے غیرے کو نہیں مل سکتا تھا۔ بہت منتخب لوگوں کو اس پرواز کے لیے ٹکٹ دیا گیا تھا۔ یہ دنیا کی پہلی ہائپر سونک کمرشل پرواز تھی جس میں طیارہ آواز سے سات گنا تیز ...... پرواز کرتے ہوئے واشنگٹن سے پیرس تک کا فاصلہ صرف ایک گھنٹے میں طے کر لیتا۔ فلم انڈسٹری کے نامور اداکار، نامور سیاست دان، کھلاڑی اور شوبزنس سے تعلق رکھنے والے دوسرے افراد اس پرواز میں جا رہے تھے۔ ان کے علاوہ بعض افراد نے محض اپنی دولت کے بل بوتے پر اس پرواز میں نشست حاصل کر لی تھی۔

ساری دنیا میں اس پرواز کا شہرہ تھا اور بے شمار چینلز اس کی لائیو کوریج کر رہے تھے۔ لوگ ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے ذوق و شوق سے اس پرواز کی روانگی کا انتظار کر رہے تھے۔ واشنگٹن میں اس پرواز کی روانگی کے وقت خصوصی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں امریکی نائب صدر شریک ہوا تھا۔ اس سے بھی اس پرواز کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

کارل ایک عام سا آدمی تھا۔ اس کی صورت بھی خاص نہیں تھی۔ وہ ٹھگنا تھا۔ اس کا باپ سفید فام مگر ماں نیگرو تھی اور اس کی مزید بدقسمتی کہ اس کے نقوش اور رنگ میں کسی قدر ماں

کی جھلک تھی۔ چھوٹا قد اور بھدا سا جسم... اس کی تعلیم بھی معمولی سی تھی۔ اسکول کے بعد اس نے کسی تعلیمی ادارے کا منہ نہیں دیکھا تھا اور معمولی نوکریاں کر کے گزارہ کر رہا تھا۔

کارل کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ وہ مشہور ہو، دنیا میں سب اسے جان لیں۔ مگر اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس کے پاس کوئی ایسی صلاحیت یا قابلیت نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ دنیا میں مشہور ہوتا۔ لیکن نہیں... اس کے پاس ایک ایسی چیز تھی جس کا اگر انکشاف ہو جاتا تو وہ دنیا کا مشہور ترین آدمی بن سکتا تھا لیکن اس صورت میں یہ چیز اس سے چھن جاتی اور یہ امر اسے کسی طرح بھی گوارا نہیں تھا۔ اسے یہ چیز اتنی عزیز تھی کہ وہ اپنی شدید ترین خواہش پر بھی اسے قربان کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

جب اسے اس پرواز کا پتا چلا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کا ٹکٹ ہر قیمت پر حاصل کرے گا کیونکہ اس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بہرحال، قیمت بعد کا مسئلہ تھا سب سے پہلے اسے یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ ٹکٹ کس ایسے شخص کے پاس تھا کہ وہ اس سے حاصل کر سکتا۔ اس نے جستجو شروع کی اور بڑی مشکل سے اسے معلوم ہوا کہ ایک ارب پتی لیکن گمنام شخص نے بھی اس پرواز کا ٹکٹ حاصل کیا ہے۔ کارل اس سے ملا اور اس سے یہ ٹکٹ حاصل کر لیا۔ مزے کی بات تھی کہ اس نے کوئی ادائیگی نہیں کی تھی۔ بس ایک شرط لگا کر اس ارب پتی سے یہ ٹکٹ حاصل کر لیا تھا۔ امیر شخص جوئے کا شوقین تھا۔ جس وقت کارل اس سے ٹکٹ لینے گیا تو وہ ٹی وی پر ڈربی ریس دیکھ رہا تھا۔ کارل نے اسے جیتنے والے گھوڑے پر شرط لگانے کو کہا اور وہ اس کے بدلے ٹکٹ جیت گیا اور اب وہ اس پرواز پر جانے کے لیے تیار تھا۔

ہائپرسونک پرواز کے لیے مسافر ایک خاص گیٹ سے گزر کر لاؤنج میں داخل ہوئے تھے جہاں ان کے لیے کسٹم اور امیگریشن کے خاص انتظامات کیے گئے تھے۔ وہ بے فکری سے ان مراحل سے گزرتے ہوئے ایک ایک کر کے طیارے میں سوار ہونے لگے۔ کارل بہت خوش تھا۔ اگرچہ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ طیارے میں سوار ہونے والے سب نامور لوگ تھے اور اسے کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ ان کے درمیان وہ غیر نمایاں تھا جیسے کوئی کرسی یا میز ہو، اس کے باوجود وہ بہت خوش تھا۔

اپنی باری پر اس نے طیارے کے دروازے پر کھڑی ائر ہوسٹس کو بورڈنگ پاس دکھایا اور اس نے مسکراتے ہوئے اسے طیارے میں خوش آمدید کہا۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں ایک طنز تھا جیسے کارل سے پوچھ رہی ہو۔ ”تمہیں اس پرواز میں ٹکٹ کیسے مل گیا؟“

اتنی دیر میں کارل کو پہلی بار غصہ آیا تھا اور اس کا دل چاہا کہ ابھی اس چینی نقوش والی دل کش ائر ہوسٹس کو قتل کر دے۔ اگر اس کے پاس کوئی پستول یا چاقو ہوتا تو وہ ایسا کر گزرتا۔ مگر افسوس کہ اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ ایسی کوئی چیز لے کر طیارے پر سوار نہیں ہو سکتا تھا۔ چینی نقوش والی ائر ہوسٹس نے منی اسکرٹ اور بے حد تنگ شرٹ پہن رکھی تھی جس میں اس کے ہوش ربا وجود کا ایک ایک نقش واضح تھا۔ مگر اس وقت وہ کارل کو بالکل اچھی نہیں لگی۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ اسے مزہ چکھا کر رہے گا۔

وہ طیارے کے اندر آیا۔ اس کے پاس اکانومی کلاس کا ٹکٹ تھا مگر اس پرواز میں اکانومی کلاس بھی ایسی تھی کہ اس کے سامنے عام پرواز کی لگژری کلاس بھی ہیچ تھی۔ کارل کے لیے ایک کشادہ اور آرام دہ سیٹ منتظر تھی۔ اس نے اپنا چھوٹا سا بیگ اوپر خانے میں رکھا اور پھیل کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی مشہور شخصیت اس کے آس پاس ہو گی مگر اس کے آس پاس سارے اجنبی چہرے تھے۔ پھر اسے خیال آیا کہ اکانومی کلاس ہے اور مشہور لوگ تو ایگزیکٹو کلاس میں ہوں گے۔ بہرحال، ان کی اس پرواز پر موجودگی ہی کارل کے لیے کم نہیں تھی۔

ذرا دیر بعد سیٹ بیلٹ باندھنے کا سائن روشن ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی طیارے نے رن وے پر ٹیکسی کرنا شروع کر دیا۔ طیارے کا کیبن اتنا ساؤنڈ پروف تھا کہ کارل کو طیارے کے انجن کا شور ذرا بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک منٹ بعد طیارہ فضا میں تھا اور پانچ منٹ بعد وہ ایک لاکھ فٹ کی بلندی کے فلائٹ لیول پر آ کر سیدھی پرواز کرنے لگا تھا۔ کیونکہ یہ ہائپرسونک طیارہ تھا، اس لیے اسے بہت بلندی پر ہی اڑایا جا سکتا تھا تاکہ ہوا کی رگڑ کا مسئلہ نہ ہو۔ یہاں آسمان تاریک تھا اور دن میں بھی ستارے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

کارل کو سیٹ بیلٹ سے بہت الجھن ہوتی تھی اس لیے جب سیٹ بیلٹ کا سائن بجھ گیا تو اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے جلدی سے اپنی سیٹ بیلٹ کھول دی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ائر ہوسٹس یاد آئی جس نے اسے کتنی حقارت سے دیکھا تھا۔ کارل نے فیصلہ کیا کہ اسے کچھ سبق سکھانا چاہیے۔ اس نے ائر ہوسٹس کو بلانے کے لیے بٹن دبایا۔ کچھ دیر بعد وہی ائر ہوسٹس مست چال چلتی ہوئی کیبن میں داخل ہوئی۔ کارل پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ایک لمحے کے لیے نظر آیا پھر فوراً ہی وہ اپنے پیشے کے مدنظر اخلاقاً مسکرانے لگی۔ وہ اس کے پاس آ کر ذرا جھکی۔ اس کی شرٹ کے کھلے گریبان سے جھانکتا بدن دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

”خدمت تو میں تمہاری کروں گا۔“ کارل نے مسکراتے ہوئے کہا اور اچانک ہاتھ بڑھا کر ائر ہوسٹس کا گلا دبوچ لیا۔ اس کے طاقت ور ہاتھ میں ائر ہوسٹس کا نازک گلا یوں آ گیا جیسے کوئی باز کسی چڑیا کو دبوچ لیتا ہے۔ تکلیف سے اس کی آنکھیں باہر ابل آئی تھیں۔ دوسرے لمحے کارل نے اس کی شرٹ سامنے سے پھاڑ دی۔ پھر اندر کا لباس بھی پھاڑ کر اسے عریاں کر دیا۔ اب وہ سانس لینے کے لیے پھڑپھڑا رہی تھی اور کارل کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا بوڑھا دم بخود سا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اپنا کام کر کے کارل کا ہاتھ نیچے آیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ائر ہوسٹس کا اسکرٹ اوپر کیا اور اس کا زیر جامہ نیچے کھینچ لیا۔ اس سارے عمل کے دوران کارل کا ذہن گنتی گننے میں مصروف تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ائر ہوسٹس کا گلا دبا رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اسے بے لباس کرنے میں مصروف تھا۔ ائر ہوسٹس کا چہرہ اب سرخ ہو رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بس دم توڑنے والی ہے۔ کارل کی گنتی جیسے ہی اٹھاون تک پہنچی، اس نے ائر ہوسٹس کا گلا چھوڑ کر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کا ڈائل دبایا اور اگلے ہی لمحے سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا۔ ائر ہوسٹس اس کے سامنے صحیح سلامت اور اپنے مکمل لباس میں کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

کارل ہلٹن واشنگٹن کے مضافات میں ایک غریب سی بستی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی کم عمر ماں اسے پیٹ میں لے کر ماں باپ کے گھر آ گئی تھی کیونکہ اس کے باپ نے اس کی ماں سے شادی بھی نہیں کی تھی۔ وہ آوارہ گرد آدمی تھا اور جیسے ہی اسے علم ہوا کہ اس کی محبوبہ حمل سے ہے، وہ اسے چھوڑ کر ایسا بھاگا کہ پھر اس کی صورت بھی دکھائی نہیں دی۔ کارل کی ماں اس حالت میں کہاں کام کرتی اس لیے اس نے اپنے گھر واپس آنے میں عافیت سمجھی تھی۔ وہ صرف پندرہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگ گئی تھی۔ اس کے بعد وہ ٹھوکر کھا کر کچھ عرصے کے لیے گھر لوٹ آتی تھی اور جب اس کی حالت سنبھل جاتی تو وہ پھر بھاگ نکلتی تھی۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ وہ پیٹ میں کسی کا بچہ لے کر آئی تھی۔ اس کے باپ نے بہت

قارئین متوجہ ہوں
قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

طوفان اٹھایا تھا مگر اس کی ماں نے شوہر کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ کارل کے نانا کو اعتراض اس پر نہیں تھا کہ اس کی بیٹی ایک ناجائز بچے کی ماں بننے والی تھی بلکہ اعتراض اس پر تھا کہ اسے بیٹی کے ساتھ اس کے بچے کا بوجھ بھی اٹھانا پڑے گا۔ پہلے کارل کی ماں چند مہینے بعد بھاگ جاتی تھی، اب وہ پورا سال اس کے سر پر رہتی۔ کارل کے نانا کے لیے سب سے زیادہ صدمے کی بات یہ تھی کہ اب اسے ایک سفید فام کے بچے کو پالنا پڑے گا۔ وہ سفید فاموں سے شدید نفرت کرتا تھا اور انہیں سفید شیطان کے نام سے پکارتا تھا۔ اب ایک سفید شیطان اس کے گھر میں بھی آنے والا تھا لیکن جب تقریباً سیاہ فام کارل نے جنم لیا جس کے نقوش بھی سیاہ فاموں جیسے تھے تو کارل کے نانا نے سکون کا سانس لیا کہ اس کی عزت بچ گئی تھی۔ پھر اسے اپنے ناجائز نواسے سے پیار ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کی بیٹی بچے کی پیدائش کے تین مہینے بعد اسے چھوڑ کر پھر گھر سے فرار ہوئی تو نانا نے کارل کو کسی یتیم خانے میں داخل نہیں کرایا اور خود اس کی پرورش کی۔ تین سال کی عمر میں کارل نے اپنی ماں کو پہلی بار دیکھا۔ وہ گھر واپس آ گئی تھی مگر اس کی محبت میں نہیں بلکہ جب نشے کی زیادتی کی وجہ سے وہ مرنے کے قریب ہو گئی تھی اور دو وقت کی روٹی کا سہارا بھی نہیں رہا تھا تو وہ پھر اپنے باپ کے گھر آ گئی تھی۔ کارل کی نانی مر چکی تھی اور اس بار نانا نے کارل کی وجہ سے اپنی بیٹی کو پناہ دے دی تھی۔ ایک مہینے بعد حالت سنبھلتے ہی وہ پھر غائب ہو گئی۔ کارل اس کے جانے پر تڑپ تڑپ کے رویا تھا مگر نانا نے اسے سنبھال لیا۔

جوانی تک کارل نے کوئی چار بار ماں کو دیکھا اور ہر بار پہلے سے زیادہ تباہ حال دیکھا تھا۔ آخری بار جب وہ آئی تو مرنے کے قریب تھی۔ منشیات اور جنسی بے راہ روی نے اسے متعدد امراض میں مبتلا کر دیا تھا اور ڈاکٹرز نے اسے جواب دے دیا تھا۔ اس لیے وہ سکون سے مرنے کے لیے باپ کے گھر آ گئی تھی۔ دو مہینے بعد وہ پھر چلی گئی مگر اس بار وہ غائب نہیں ہوئی تھی بلکہ چار کندھوں پر قبرستان گئی تھی۔ اس کے چند

www.pkdigest.com

مہینے بعد کارل کے نانا نے بھی قبرستان کی راہ لی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اب تک اپنی بھاگی ہوئی بیٹی کو پناہ دینے کے لیے ہی زندہ تھا۔

اب دنیا میں کارل کا کوئی نہیں تھا۔ انیس برس کی عمر میں اس نے رو پیٹ کر اسکول پاس کر ہی لیا مگر اس کا آگے پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے اس نے ایک کلب میں بیل بوائے کی نوکری کر لی۔ تیس سال کی عمر تک وہ ایسی ہی چھوٹی موٹی نوکریاں کرتا رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے بہتر کمائی کے لیے برگر کا ٹھیلا لگا لیا تھا۔ وہ درحقیقت بزدل شخص تھا اور اس میں جرأت کی کمی تھی ورنہ وہ جرائم پیشہ بن جاتا۔ لیکن دولت کے لیے اس نے بھی جائز اور ناجائز کی پروا نہیں کی تھی۔ اسے جب بھی موقع ملا، اس نے ہاتھ مارا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی صورت کی طرح اس کی قسمت بھی کھوٹی تھی۔ وہ دولت کے لیے ترستا رہا تھا۔

وہ کچھ اس قسم کے خواب دیکھا کرتا تھا کہ اسے کہیں سے بے تحاشا دولت مل گئی ہے اور وہ زندگی سے سارے لطف اٹھا رہا ہے... یا اسے الہ دین کا چراغ مل گیا ہے جس کا جن اس کی ساری خواہشیں پلک جھپکتے میں پوری کر رہا ہے۔ مگر جب اس کی آنکھ کھلتی تو وہ خود کو اپنی پرانی حالت میں پاتا... یعنی کہ مالی طور پر کنگال! اس کی زندگی میں دولت کی طرح عورت کا خانہ بھی خالی ہی تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے کسی عورت کی قربت ہی نہیں ملی تھی مگر جن عورتوں سے اس کا تعلق رہا تھا وہ سب معمولی درجے کی تھیں اور ان میں سے کوئی بھی سفید فام نہیں تھی... جبکہ وہ سفید فام عورتوں پر مرتا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ اسے کسی حسین سفید فام عورت کی قربت نصیب ہو۔ اسے معلوم تھا کہ وہ معمولی صورت کا انسان ہے اور صرف دولت ہی اس کے یہ عیب چھپا سکتی تھی۔ دولت حاصل کرنے کے لیے اس نے بارہا کسی جرم کے بارے میں سوچا مگر ہمت نہیں ہوئی۔ اس لیے وہ اپنے ارمان دبا کر بیٹھا تھا۔ برگر بیچنے سے اس کے مالی حالات کسی قدر بہتر ہوئے تھے مگر کوئی بہت بڑا تغیر نہیں آیا تھا۔

شروع میں اس نے شہر میں برگر کا ٹھیلا لگایا تھا مگر جلد اس نے دریا کے کنارے ایک پکنک پوائنٹ تلاش کر لیا۔ وہاں اس کی اچھی سیل ہو جاتی تھی۔ اس کے پاس سائیکل نما ٹھیلا تھا، وہ اسی پر آتا جاتا تھا۔ خاص طور سے گرمیوں میں یہاں بہت رش رہتا تھا۔ اگرچہ بہت ساری دولت کی اس کی یہ خواہش پوری تو نہیں ہوئی تھی لیکن اسے پہلے سے زیادہ آمدنی ہونے لگی تھی... اور سب سے بڑھ کر وہ دریا میں تیراکی کے لیے آنے والی خوب صورت سفید فام عورتوں کے ہوش رُبا نظاروں سے اپنی آنکھیں سینک سکتا تھا۔

پھر اسے وہ چیز ملی جس نے اس کی زندگی بدل کر رکھ دی۔

کارل کو پڑھنے کا شوق نہیں تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ اخبار دیکھ لیتا تھا مگر وہ فلمیں شوق سے دیکھتا تھا اور خاص طور سے سائنس فکشن پر مبنی فلمیں اسے بہت پسند تھیں۔ لیکن وہ حقیقی زندگی میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ ایلین وغیرہ سب انسانوں کے ذہن کی اختراع تھے اور حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ ایسی فلم دیکھ کر بہت ہنستا تھا جس میں عجیب و غریب شکلوں والے ایلینز دکھائے جاتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی ایلین سچ مچ اس کے سامنے آ جائے، تب بھی وہ اس کے وجود پر یقین نہیں کرے گا۔

اس روز موسم بہت خوش گوار تھا اور دریا کے کنارے بہت رش تھا۔ وہ خوش تھا کہ آج اس کی اچھی سیل ہوگی اور وہ سوچ رہا تھا کہ ایک چکر ریڈ لائٹ ایریا کا لگا لے۔ ممکن ہے اسے کوئی معقول قسم کی سفید فام کال گرل مل جائے۔ دوپہر کے قریب وہ پھرتی سے برگر بنا کر اپنے گاہکوں کو دے رہا تھا۔ لوگ چاروں طرف سے اس پر یلغار کر رہے تھے۔ دو گھنٹے بعد کہیں جا کر اسے سکھ کا سانس لینے کا موقع ملا تھا۔

سفید بالوں والا ایک معمر آدمی خاصی دیر سے سامنے ایک بینچ پر بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب کارل اس کی طرف متوجہ ہوتا تو وہ جلدی سے نظریں پھیر لیتا۔ شروع میں کارل نے اس پر توجہ نہیں دی تھی، اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا لیکن جب وہ فارغ ہوا اور اس نے بوڑھے کو اسی جگہ پایا تو اسے تجسس ہونے لگا۔ آخر یہ بوڑھا کئی گھنٹے سے یہاں کیا کر رہا تھا؟ تین بجے وہ فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے غور سے بوڑھے کو دیکھا، وہ معمر مگر صحت مند اور طویل قامت شخص تھا۔ خاص طور سے اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ یقیناً اس سے آنکھیں ملا کر بات کرنا آسان نہیں تھا۔ جب اس کے آس پاس کوئی نہیں رہا تو بوڑھا اچانک اپنی بینچ سے اٹھا اور اس کی طرف آیا۔

”ہیلو مسٹر کارل بلنن!“

کارل بری طرح چونک اٹھا۔ ”تم مجھے جانتے ہو... کون ہو تم؟“ اس کے لہجے میں شک آ گیا۔

”یہ چھوڑو کہ میں کون ہوں لیکن میں تمہارے کام آ سکتا ہوں... بشرطیکہ تم میرا ساتھ دو۔“

کارل بدک گیا۔ ”معاف کرنا، مجھے کسی چکر میں ملوث نہیں ہونا۔ تم جا سکتے ہو۔“

”کوئی چکر نہیں ہے۔“ بوڑھے نے اسے یقین دلایا۔

”تم مجھ سے کسی قسم کا جرم کروانا نہیں چاہتے؟“ کارل نے شک سے کہا۔

”نہیں، بالکل بھی نہیں۔“ بوڑھے نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ”یہ بہت معمولی سا کام ہے۔“

”اگر یہ کوئی معمولی سا کام ہے تو تم خود کیوں نہیں کر لیتے؟“

بوڑھے نے سرد آہ بھری۔ ”کیونکہ میں مجبور ہوں۔ اگر میں خود سے یہ کام کر سکتا تو تم سے کیوں کہتا؟“

”اس لیے کہ اس کام میں کوئی خطرہ ہے۔ تم مجھے آگے رکھ کر خود اس خطرے سے بچنا چاہتے ہو۔“

”خطرہ ہے لیکن میرے لیے... تمہارے لیے نہیں ہے۔“

”وہ کیسے؟“ کارل نے بحث کرنے والے انداز میں کہا۔ ”جو چیز تمہارے لیے خطرناک ہے وہ میرے لیے کیوں نہیں ہے؟“

”کیونکہ میرے دشمن مجھے پہچانتے ہیں، تمہیں نہیں۔“

کارل سوچنے لگا کہ بوڑھے کے دشمن بھی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کام میں خطرہ تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ بوڑھے نے اس کے کام آنے کو کہا تھا۔ ”تم میرے کیا کام آ سکتے ہو؟“

”میں تمہیں ایک ایسی چیز دے سکتا ہوں جو تمہاری دنیا کے کسی آدمی کے پاس نہیں ہوگی۔“

کارل اس بار شدت سے چونکا۔ ”تمہاری دنیا سے کیا مراد ہے... کیا تم اس دنیا سے تعلق نہیں رکھتے؟“

بوڑھا آدمی کچھ دیر چپ رہا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں، یہ حقیقت ہے کہ میں تمہاری دنیا سے تعلق نہیں رکھتا۔“

”کیا؟“ کارل چلا اٹھا۔ ”کیا تم انسان نہیں ہو؟“

بوڑھے نے بُرا سا منہ بنایا۔ ”انسان نہ ہونا کوئی جرم یا برائی ہے جو ہر شخص اس طرح کا ردعمل ظاہر کرتا ہے؟“

کارل نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ”تم سچ مچ کوئی ایلین ہو؟“

اس بار بوڑھے نے زیادہ بُرا منایا تھا۔ ”کیا ایلین ہونا بہت بڑی برائی ہے؟“

کارل نے سر ہلایا۔ ”ہماری فلموں میں زیادہ تر ایلین کو بُرا دکھایا جاتا ہے۔ وہ ہمیں مارنے اور ہماری دنیا پر قبضہ کرنے کے لیے آتے ہیں اور جو ایسا کرے گا ہم انسان اس سے محبت تو نہیں کر سکتے۔“

”یہ سب پروپیگنڈا ہے۔ ورنہ ہم ایلین کسی انسان جتنے بے ضرر ہوتے ہیں۔“

سیلز مین

خاتون: میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے ڈکشنری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس پہلے ہی ایک ڈکشنری موجود ہے۔

سیلز مین: لیکن آپ کے شیلف میں تو مجھے کوئی ڈکشنری نظر نہیں آئی۔

خاتون: وہ ادھر ٹیبل پر رکھی ہے۔

سیلز مین: ارے نہیں، مادام آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں، وہ تو بائبل ہے۔

خاتون: اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بائبل ہے لیکن کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اتنی دور سے تم نے بائبل کو کیسے پہچانا؟

سیلز مین: اس پر جمی ہوئی گرد کی وجہ سے۔

”انسان جتنے۔“ کارل نے تشویش سے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم بہت خطرناک ہو۔“

”ہاں انسانوں کو دیکھا جائے تو وہ بہت خطرناک ہوتے ہیں جو اپنے ہم جنس کو نہ بخشیں، وہ کسی اور کے لیے کہاں اچھے ہو سکتے ہیں۔“

”خیر، اب ایسا بھی نہیں ہے۔“ کارل نے انسانوں کا دفاع کیا۔ اسے ایک ایلین کی زبان سے انسانوں کی برائی اچھی نہیں لگی تھی۔

”میں بھی تم سے بحث کرنے نہیں آیا۔ یہ بتاؤ تم میرا کام کرنے کے لیے تیار ہو؟“

اچانک کارل کو احساس ہوا کہ وہ اب تک اپنے جیسے آدمی کے ہاتھوں بے وقوف بن رہا تھا اور آدمی بھی سفید فام تھا جس کی دانست میں ہر سیاہ فام کے پاس کسی جانور سے زیادہ عقل نہیں ہوتی۔ اس نے غصے سے کہا۔ ”مجھے احمق مت سمجھو۔ تم انسان ہی ہو۔“

”میں انسان نہیں ہوں۔“ بوڑھے نے آرام سے کہا۔

”اگر تم انسان نہیں ہو تو انسان جیسے کیوں لگتے ہو؟“

”ایسا کرنا ضروری ہے۔ یہ میرا گیٹ اپ ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تم خود سوچو کہ اگر میں اپنی اصل شکل میں سامنے آ جاؤں تو ایک منٹ میں یہاں ہزاروں افراد کا مجمع نہیں لگ جائے۔“

”یہ تو ہے... مگر مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔“ کارل نے صاف گوئی سے کہا۔ ”تم بالکل بھی ایلین نہیں لگ رہے ہو۔“

www.pkdigest.com

"اگر میں تمہیں یقین دلا دوں کہ میں ایلین ہی ہوں تو کیا تم میرا کام کرو گے؟"

"ہاں، تب میں سوچوں گا۔"

بوڑھے نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ذرا آگے جھک کر کارل سے کہا۔ "میری آنکھوں میں دیکھو۔"

کارل نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اچانک ہی اس کی نیلگوں آنکھوں کا رنگ آتشیں ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی بوڑھے کے چہرے کے نقوش بدل گئے۔ اب اس کے سامنے ایک چپٹی سی ناک اور تکونی آنکھوں والا ایلین کھڑا تھا جس کا رنگ پیلا تھا اور آنکھوں کا رنگ نارنجی تھا۔ کارل بری طرح بھڑک کر پیچھے ہٹا اور اس سے پہلے کہ وہ مارے خوف کے چلّانے لگتا بوڑھے نے پھر انسان کا روپ دھار لیا۔ مگر کارل بدستور خوف زدہ تھا۔ اس نے چلّا کر کہا۔

"تم سچ مچ ایلین ہو... اوہ میرے خدا!"

"ہاں تو اس میں اتنا چلّانے کی کیا بات ہے؟" بوڑھے نے خفگی سے کہا۔

"تم تو سچ مچ ایلین ہو۔" کارل نے پھر کہا اور اپنا تھیلا چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر بوڑھے نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ کارل اپنی جگہ سے ایک انچ بھی کھسکنے سے قاصر تھا۔ اس نے کراہ کر کہا۔

"میرا بازو ٹوٹ جائے گا۔"

"سوری!" اس نے گرفت نرم کر دی مگر اسے چھوڑا نہیں۔ "تم بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

"اچھا، میں نہیں بھاگوں گا۔" کارل نے مان لیا تو بوڑھے نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"یہ صرف حماقت ہوتی کیونکہ تمہارے شور مچانے اور کسی کو بتانے سے پہلے میں یہاں سے غائب ہو چکا ہوتا اور تم بلاوجہ کی مصیبت میں پڑ جاتے۔ عین ممکن ہے کہ تمہیں پاگل قرار دے کر کسی اسپتال بھیج دیا جاتا۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ ہم سیاہ فاموں کے ساتھ یہاں اچھا سلوک نہیں ہوتا۔" کارل نے شکوہ کیا۔

"ہم میں سب برابر ہوتے ہیں۔" بوڑھے نے کہا۔

"ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تمہارے دشمن ہیں؟"

"دشمن ہونا الگ بات ہے لیکن ایک جیسی مخلوق میں اونچ نیچ ہونا الگ بات ہے۔" بوڑھے نے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔"

"کیا اب تم میرا کام کرنے کے لیے تیار ہو؟"

"نہیں، پہلے تم بتاؤ کہ اس کے عوض مجھے کیا ملے گا۔"

"اس دنیا کی دولت کے علاوہ جو تم چاہو۔"

کارل کا منہ لٹک گیا۔ "اگر تم دولت نہیں دے سکتے تو پھر کیا فائدہ؟"

"ہماری دنیا میں ایسی ایسی چیزیں ہیں کہ تم نے کبھی اس بارے میں سوچا بھی نہیں ہوگا۔"

"تم کہاں سے آئے ہو اور ہماری زمین پر کیا کر رہے ہو؟" کارل نے اسے شک سے دیکھا۔

"ہم یہاں سیاحت کے لیے آتے ہیں اور ہمارا مقصد ہرگز وہ نہیں ہے جو تمہاری فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔"

"پھر یہ دشمنی کا کیا چکر ہے؟"

"یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ ہم لوگ یہاں کی حکومتوں کو متوجہ کرنے والی کوئی حرکت نہیں کرتے۔"

"چلو، تم مجھے دولت نہیں دے سکتے، تب کیا دو گے؟" کارل نے مطالبہ کیا۔

بوڑھے نے اپنی جیب سے ایک گھڑی نکالی۔ "اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

کارل نے خفگی سے اسے دیکھا۔ "تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ یہ معمولی سی گھڑی دے کر ٹرخانا چاہتے ہو۔"

"میں نے کہا نا کہ ہماری دنیا میں ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جن کا تم نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔"

کارل نے غور سے گھڑی دیکھی۔ اس کا سیاہ پٹا خالص چمڑے کا لگ رہا تھا اور ڈائل بہت عجیب سا تھا۔ یہ بس سفید سا سادہ ڈائل تھا۔ اس کا سفید رنگ چمک دار تھا۔ اس پر کوئی ہندسہ یا سوئی نظر نہیں آ رہی تھی۔ "کیوں، اس میں کیا خاص بات ہے اور اس میں وقت کیسے دیکھتے ہیں؟"

"یہ کوئی گھڑی نہیں ہے۔" بوڑھے نے وضاحت کی۔

"گھڑی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟"

"ہم اسے ٹائم پریزنر کہتے ہیں۔"

"وقت کا قیدی!" کارل نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔ "اس کا مطلب کیا ہے، یہ کس کام آتی ہے؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" بوڑھے نے کہا۔ "میں تمہیں اس کا عملی تجربہ کر کے دکھاتا ہوں۔ وہ لڑکی دیکھ رہے ہو؟" بوڑھے نے پانی سے نکل کر آنے والی ایک حسین سی لڑکی کی طرف اشارہ کیا جس نے نہ ہونے کے برابر لباس پہن رکھا تھا۔ کارل نے لڑکی کو دیکھا۔

"ہاں، نظر تو آ رہی ہے مگر تمہاری عمر اب اس قسم کی لڑکیوں کو دیکھنے کی نہیں رہی ہے۔"

"میں اسے دیکھ نہیں رہا۔" بوڑھے نے خفگی سے کہا۔ "ویسے بھی تم بھول رہے ہو کہ میں ایلین ہوں اور مجھے تمہاری دنیا کی عورتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہماری عورتیں تو جانوروں تک کو رام کر لیتی ہیں۔" کارل نے اعتراض کیا۔

"بس مجھے ان میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔ میں تمہیں یہ بات سمجھا بھی نہیں سکتا۔"

"چلو، میں نے مان لیا۔ اب آگے کہو، اس عورت میں کیا بات ہے؟" کارل نے بحث ختم کرنے کے لیے کہا۔

"اسے غور سے دیکھتے رہو۔" بوڑھے نے کہا۔ اس سے پہلے ہی کارل اپنی نظریں اس پر جما چکا تھا۔ وہ لڑکی تھی بھی اتنی حسین کہ اسے خوب غور سے اور نظر جما کر دیکھا جائے۔ وہ ساحل پر آ کر تولیے سے اپنا جسم خشک کر رہی تھی۔ اچانک ہی کارل نے دیکھا کہ اس نے پھر تولیا اٹھا لیا اور اپنا جسم خشک کرنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ری پلے ہو رہا ہو۔ اس نے الجھے ہوئے انداز میں بوڑھے کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔

"پھر دیکھو۔" اس نے کہا۔

لڑکی نے تولیا باندھ کر اپنا سوئمنگ سوٹ اتار دیا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس کا تولیا سلپ ہو گیا۔ اگرچہ اس نے بڑی پھرتی سے دوبارہ اپنا جسم ڈھانپ لیا تھا مگر اتنی دیر میں کارل بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ اس کی پلکیں بھی جھپکنا بھول گئی تھیں۔ اچانک ہی لڑکی پھر سے تولیا باندھ کر سوئمنگ سوٹ اتار رہی تھی اور جیسے ہی وہ سیدھی ہوئی تولیا پھر پھسل گیا۔

"یہ... یہ کیا تھا؟" کارل کے منہ سے اضطراری انداز میں نکلا۔

"یہ اس کا کمال ہے۔" بوڑھے نے کہا۔ اس نے گھڑی نما چیز آگے کی۔ "اس کی مدد سے کچھ دیر کے لیے وقت کو پیچھے لوٹایا جا سکتا ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"تم خود تجربہ کر کے دیکھ لو۔" بوڑھے نے گھڑی نما چیز اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس کا ڈائل دبانے سے یہ کام ہوتا ہے۔"

کارل نے گھڑی نما چیز لی اور اسے شوق سے دیکھا پھر اس نے اردگرد دیکھا۔ ذرا دور دو بچے اسکوٹی چلا رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے الجھ کر مضحکہ خیز انداز میں گرے۔ کارل ہنس دیا۔ اس نے بے ساختہ گھڑی نما چیز کا ڈائل دبایا۔ بچے پھر سے اپنی اسکوٹی پر تھے اور کچھ دیر بعد وہ الجھ کر گر پڑے تھے۔ کارل نے دو تین بار یہ تجربہ کر کے دیکھا اور ہر بار لڑکے پہلے کی طرح اسکوٹی چلاتے ہوئے آتے اور گر جاتے تھے۔

"کمال کی چیز ہے۔" کارل نے سر ہلایا۔ "یہ واقعی وقت کو پیچھے لے جاتی ہے۔"

"تب تم اس کے بدلے میرا کام کرنے کے لیے تیار ہو؟"

"ہاں۔" کارل بے ساختہ مان گیا۔ یہ اتنی انوکھی چیز تھی کہ اس کے لیے وہ کوئی بھی کام کرنے کے لیے تیار تھا۔ "مجھے کیا کرنا ہے؟"

"میرے ساتھ چلو۔" بوڑھے نے اس سے کہا۔ اتنی سی دیر میں وہ اس پر اتنا حاوی ہو چکا تھا کہ کارل بلا چون و چرا اس کی بات مان رہا تھا۔ اس نے اپنا تھیلا بھی وہیں چھوڑ دیا تھا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ بوڑھا اسے ایک ہوٹل تک لایا۔ "اس ہوٹل کے کمرا نمبر سترہ میں ایک پیپر ویٹ ہے، مجھے وہ لا دو۔"

"پیپر ویٹ... کس قسم کا؟"

"عام سا شیشے کا بنا ہے، اس میں ہرا بھرا جنگل دکھایا گیا ہے۔ اس کمرے میں وہ ایک ہی چیز ہے۔"

"اس کمرے میں کوئی ہے؟"

"نہیں، میری معلومات کے مطابق وہ کمرا خالی ہے لیکن کوئی ہوا بھی تو تمہیں بہر صورت یہ کام کرنا ہے۔"

"یہ قابلِ دست اندازیِ پولیس ہو سکتا ہے۔"

"نہیں، ایک معمولی سا پیپر ویٹ کسی طرح بھی قیمتی نہیں ہو سکتا۔"

"تمہیں معلوم نہیں ہے، معاملہ ایک نگر وکا ہو تو معمولی پیپر ویٹ بھی بہت قیمتی بن جاتا ہے۔" کارل نے تلخی سے کہا۔

"اس کے باوجود تمہیں یہ کام کرنا ہے۔" بوڑھا بولا۔ "اب تم اندر جاؤ، میں باہر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

کارل بادلِ ناخواستہ اندر داخل ہو گیا۔ اچانک اسے ایک خیال آیا، وہ سیدھا استقبالیہ پر گیا اور کمرا نمبر سترہ کے بارے میں پوچھا۔

"وہ خالی ہے لیکن آپ کو کمرا درکار ہے تو ہمارے پاس اور بھی کمرے ہیں۔" ڈیسک کلرک نے کہا۔

"نہیں، مجھے سترہ نمبر ہی چاہیے کیونکہ یہ میرا پسندیدہ نمبر ہے۔"

"ٹھیک ہے، کتنے دن کے لیے چاہیے؟"

"ایک دن کے لیے۔"

ڈیسک کلرک نے فارم فل کر کے اس کے دستخط لیے اور اس سے ستر ڈالرز کا مطالبہ کیا۔ کارل نے دل پر پتھر

www.pkdigest.com

رکھ کر یہ رقم اسے دی تو اس نے کارل کو چابی تھما دی۔

"آپ کا سامان نہیں ہے؟" ڈیسک کلرک نے پوچھا۔

"نہیں، مجھے بس ایک دن ٹھہرنا ہے۔ میں اسی شہر سے تعلق رکھتا ہوں۔" کارل نے جواب دیا اور اوپر کمرے میں آیا۔ ویٹر نے اسے کمرا دکھایا۔ اس کے جاتے ہی کارل نے پیپر ویٹ تلاش کیا اور وہ اسے ڈرائنگ ٹیبل پر مل گیا۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ اس بوڑھے نے بتایا تھا۔ اس نے پیپر ویٹ جیب میں ڈالا اور باہر آ گیا۔ اس نے چابی ڈیسک کلرک کے حوالے کی۔ "میں باہر جا رہا ہوں اور ممکن ہے کہ میری واپسی نہ ہو لیکن یہ کمرا پورے ایک دن میرے نام پر رہنا چاہیے۔"

"آپ بے فکر رہیں جناب۔" ڈیسک کلرک نے کہا۔

وہ باہر آیا، اس نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر اسے بوڑھا کہیں نظر نہیں آیا۔ اچانک اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ کہیں بوڑھا اس کا تھیلا لے کر تو نہیں بھاگ گیا ہے۔ وہ بے ساختہ اس طرف بھاگا جہاں اس نے تھیلا چھوڑا تھا۔ وہاں اپنا تھیلا پا کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ مگر بوڑھا کہاں تھا؟ اسے تو یہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر اچانک ہی اسے اپنے پاس کھڑے پایا۔ کارل چونکا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"میں یہیں تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "تم وہ چیز لے آئے؟"

"ہاں، میں لے آیا ہوں لیکن پہلے تم مجھے وہ گھڑی دو۔" کارل نے مطالبہ کیا۔

بوڑھے نے گھڑی اس کے حوالے کر دی۔ "تم اسے کلائی پر بھی پہن سکتے ہو۔"

کارل نے ایسا ہی کیا اور پھر اس نے اسے چیک بھی کیا۔ وہ پہلے کی طرح کام کر رہی تھی۔ مطمئن ہو کر اس نے پیپر ویٹ بوڑھے کے حوالے کر دیا اور بولا۔ "یہ کب تک کام کرے...." اس کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا کیونکہ بوڑھا یک دم اپنی جگہ کھڑے کھڑے غائب ہو گیا تھا۔ کارل ڈر گیا اس نے جلدی سے اپنا تھیلا سنبھالا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے ذہن سے کام بھی نکل گیا تھا۔ اسے یہ خطرہ تھا کہ وہ مافوق الفطرت بوڑھا کہیں اپنی یہ چیز بھی اس سے واپس نہ لے لے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو کارل کسی طرح بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

گھر آ کر اس نے ذرا سکون کا سانس لیا تھا۔ پھر اس نے اس چیز کو چیک کیا۔ اس نے سوچا کہ یہ صرف اس کے آس پاس کے ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے یا ساری دنیا پر اس کا اثر ہوتا ہے؟ اس نے ٹی وی چلا کر اسے آزمایا اور اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ٹی وی پر بھی وقت پیچھے چلا گیا تھا۔ پھر اس نے ایک چینل لگایا جس پر لائیو پروگرام آ رہا تھا۔ اس نے اس پر بھی تجربہ کیا جو پہلے کی طرح کامیاب رہا۔ کارل پُرجوش ہو گیا۔ اس کے پاس دنیا کی انوکھی ترین چیز آ گئی تھی۔ وہ اس کی مدد سے وقت کو پیچھے کر سکتا تھا اور کسی کو اس کا پتا بھی نہیں چلتا۔

کئی دن تک وہ اس میں مگن رہا اور اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے پتا چلا کہ ایک تو یہ چیز صرف ایک منٹ کے لیے وقت کو پیچھے لے جاتی تھی، دوسرے وہ ایک بار اسے استعمال کرتا تھا تو دوسری بار پورے ایک منٹ کے لیے اسے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ یعنی یہ وقت کو صرف ایک منٹ کے لیے ہی پیچھے لے جاتی تھی۔ ایسا ممکن نہیں تھا کہ اسے بار بار استعمال کرنے سے وقت کو مستقل پیچھے لے جایا جا سکے۔ یعنی اس کا استعمال محدود تھا لیکن یہ بھی بہت تھا۔ دنیا میں کوئی اور ایسا آلہ نہیں تھا جو وقت کو ایک سیکنڈ کے لیے بھی پیچھے لے جا سکتا ہو۔

اس نے یہ بھی جانا کہ وہ اپنے ذاتی فعل میں تبدیلی کر سکتا تھا۔ مثلاً اس نے ایک کپ چائے پی اور ایک منٹ میں پلٹ کر وقت کو پیچھے کر دیا۔ اب اس کی مرضی تھی کہ وہ چائے پیے یا نہ پیے۔ اسی طرح وہ کسی کے کام میں مداخلت کر کے اس کو بھی اپنا فعل تبدیل کرنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ جیسے ایک کار سڑک سے اس کے سامنے سے گزر گئی۔ وہ وقت کو پیچھے لا کر کسی طریقے سے اسے گزرنے سے روک سکتا تھا۔ لیکن قدرتی واقعات اور دوسروں کے افعال تبدیل نہیں ہوتے تھے۔ بار ہا تجربے سے ثابت ہوا کہ جو ایک بار ہو گیا، دوبارہ بھی ویسا ہی ہوتا تھا۔ جیسے کسی ریس میں ایک ایتھلیٹ جیت گیا تو دس بار وقت پیچھے کرنے سے وہی فاتح رہا.... بلکہ ریس میں حصہ لینے والے تمام افراد کی پوزیشن وہی رہی تھی۔

اب کارل نے اس چیز کی مدد سے دولت کمانے کا سوچا اور یہ کوئی اتنا مشکل کام بھی نہیں تھا۔ وہ سب سے پہلے ایک کیسینو میں گیا اور اس نے رولٹ کی میز پر داؤ کھیلے۔ اس میں چند سیکنڈ پہلے بھی شرط لگائی جا سکتی ہے۔ اس لیے وہ بہت آسانی سے جیتتا چلا گیا۔ وہ نتیجہ دیکھتے ہی وقت کو پیچھے کر کے اس نمبر پر شرط لگا دیتا تھا جس پر چھلا آ کر رکتا تھا بلکہ وہ پچھلے میں آنے والا نمبر بھی بتا دیتا تھا۔ اس طرح چند ڈالرز کے عوض اسے اچھی خاصی رقم مل گئی تھی۔ دو تین بار اس نے ایسا ہی کیا تو کیسینو کے لوگ اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے اور اس سے پہلے کہ وہ اس کے خلاف حرکت میں آتے، اس نے

وہاں سے نکل جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

بہر حال، دو تین جوئے خانوں کا چکر لگا کر اس نے ایک رات میں دس ہزار ڈالرز کما لیے تھے۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی جو وہ چار پانچ مہینے میں کماتا تھا اور اس نے یہ رقم محض چند گھنٹوں میں کمائی تھی۔ اگرچہ یہ دیرپا طریقہ نہیں تھا کیونکہ وہ جس طرح جیت رہا تھا، ایک دو دن میں اس کی شہرت تمام جوئے خانوں میں پھیل جاتی اور اسے داخلے سے روک دیا جاتا۔ اور اس سے بھی زیادہ خطرہ یہ تھا کہ جوئے خانوں کے لیے کام کرنے والے غنڈے اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتے۔ اس لیے اس نے دوسرے دن باقی جوئے خانوں میں کمائی کر کے فوری طور پر شہر کو خیر باد کہہ دیا۔ اس کے بعد وہ امریکا کے مختلف شہروں میں گھومتا رہا۔ جوئے خانوں کے علاوہ وہ ریس بھی کھیلتا تھا۔ مختلف مختصر دورانیے کے کھیلوں پر بھی شرط لگاتا اور ظاہر ہے کہ ہمیشہ جیتتا تھا۔ مگر ساتھ ہی اس نے خود کو بڑی ہوشیاری سے پوشیدہ بھی رکھا تھا۔ وہ اس حد تک نہیں جاتا تھا کہ دوسرے اس سے چونک جائیں اور نہ ہی ایک شہر میں زیادہ دیر رکتا تھا۔

چند سالوں میں وہ لاکھوں ڈالرز کما چکا تھا۔ اس نے اسٹاک ایکسچینج میں قسمت آزمائی کی کوشش کی مگر ایک تو اسے یہ کام آتا نہیں تھا دوسرے اس میں وقت زیادہ لگ جاتا تھا اور اسے متعدد بار نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس کے بعد اس نے اس کام سے توبہ کر لی تھی۔ اس نے کمانے کے جو طریقے نکالے تھے، ان کی مدد سے وہ اتنا کما لیتا تھا کہ کھل کر عیاشی کی زندگی بسر کر سکتا تھا۔ اس کے دل میں جو حسرتیں تھیں وہ انہیں پورا کر رہا تھا۔ دنیا کی بہترین شرابیں اور حسین ترین عورتیں اب اس کی دسترس میں تھیں کیونکہ اس کے پاس دولت تھی۔ اس کی مدد سے وہ دنیا کی ہر چیز حاصل کر سکتا تھا۔

اس کا بیشتر وقت دنیا کی بہترین تفریح گاہوں میں گزرتا تھا۔ اس نے میامی کے ساحل پر ایک شاندار ولا خرید لیا تھا اور جب وہ تفریح سے تھک جاتا تھا تو یہاں آ کر کچھ دن آرام کر لیا کرتا جب دولت کم ہو جاتی تو مزید کمانے لگ جاتا تھا۔ اتنے عیش و آرام میں صرف ایک بات اسے ڈراتی تھی کہ کہیں یہ چیز کام کرنا بند نہ کر دے۔ اسے بالکل نہیں معلوم تھا کہ یہ کس طرح سے کام کرتی تھی اور نہ اسے کھولنے کا کوئی طریقہ یا خانہ نظر آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ڈسپوزیبل قسم کی چیز تھی، جب ناکارہ ہو جائے تو اسے پھینک دیا جائے۔

اس چیز کے کام نہ کرنے کے خطرے کے پیش نظر کارل نے مستقبل کے لیے پہلے سے بندوبست کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ حاصل کی جانے والی دولت کا ایک حصہ محفوظ کرنے لگا۔ اسے امید تھی کہ اسے چار پانچ سال موقع مل گیا تو وہ اتنا جمع کر لے گا کہ پھر ساری عمر بیٹھ کر کھا سکتا تھا۔ وہ محفوظ کی جانے والی رقم سے سونا اور پیٹرول بانڈ خرید لیتا تھا۔ اس طرح اس کی رقم بڑھتی بھی رہتی۔ آنے والے پانچ سالوں میں اس نے کئی ملین ڈالرز محفوظ کر لیے تھے اور اب اسے مستقبل کے حوالے سے کوئی فکر نہیں تھی۔

اس نے شادی کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس طرح اس کا راز... راز نہیں رہے گا اور وہ اس چیز کے راز میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر شادی کے بغیر ہی اس کی زندگی رنگینیوں سے بھرپور تھی۔ اسے شادی کی ضرورت نہیں تھی اور نہ اس نے کبھی اس بارے میں سوچا تھا۔

کارل ایک بار ایک ایشیائی ملک کی تفریح گاہ میں زندگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ ایک جزیرہ تھا جہاں دنیا کی حسین ترین عورتیں پائی جاتی تھیں اور سیاح یہاں آنے کے لیے بے تاب رہا کرتے تھے۔ مگر یہاں وہی آ سکتے تھے جن کی جیب بھاری ہوتی تھی۔ یہاں کارل کو ایک حسین یوریشین لڑکی جینی ملی۔ جینی کا باپ فرانسیسی اور ماں مقامی تھی۔ اس میں دونوں نسلوں کا حسن جمع ہو گیا تھا۔ پہلی بار کارل کو کوئی لڑکی اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ اسے مستقل طور پر اپنے تصرف میں رکھنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ پھر جینی بھی اس پر اتنے دل و جان سے فدا ہوئی تھی جیسے اس کے سوا دنیا میں کوئی اور مرد ہی نہیں ہے۔

لیکن جب کارل نے اسے اپنے ساتھ رہنے کی پیش کش کی تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔ "تمہارا دماغ درست ہے... میں تمہارے ساتھ کیوں رہوں گی؟"

"میں تمہیں دنیا کی ہر آسائش دوں گا۔" کارل نے کہا۔

"دنیا کی ہر آسائش مجھے ویسے بھی میسر ہے اور جہاں تک مستقل رہنے کی بات ہے تو میں صرف اپنے منگیتر کے ساتھ ہی رہوں گی۔"

کارل اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ "تمہارا کوئی منگیتر بھی ہے؟"

"بالکل ہے اور میں اس سے محبت کرتی ہوں۔" جینی نے سینہ تان کر کہا۔ "تم نے یہ بات سوچی بھی کیسے کہ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

"اگر تمہارا منگیتر ہے اور تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو تو یہ کام کیوں کرتی ہو؟"

www.pkdigest.com

کمانے کے لیے۔'' اس نے شانے اچکائے۔ ''جب ہمارے پاس ایک خاص رقم جمع ہو جائے گی تو ہم شادی کرلیں گے۔''

کارل کا غصے سے بُرا حال ہو گیا۔ اپنی دانست میں وہ جینی پر اپنا حق سمجھ بیٹھا تھا اور وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اسے انکار کرتے ہوئے جینی کا لہجہ اتنا حقارت آمیز ہو گیا تھا جیسے وہ اسے صرف دولت کی وجہ سے برداشت کرتی تھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ وہ اسے معاف نہیں کرے گا۔ وہ ایک مہینے سے اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی تھی اور اب بری جھنڈی دکھادی تھی۔ اس نے اچانک جینی کا گلا دبوچ لیا اور اسے دبانے لگا۔ پھر جیسے ہی ایک منٹ ہونے لگا، اس نے وقت کو پیچھے کر دیا۔ اس کے بعد اس نے کئی بار جینی کو چھری مار کر اور گردن کی ہڈی توڑ کر ہلاک کیا اور پھر وقت کو پیچھے لے گیا۔ جینی پھر سے زندہ ہو جاتی تھی۔

کارل بنیادی طور پر ایک گھٹیا فطرت شخص تھا اس لیے جب اس کے ہاتھ ایک نیا حربہ آیا جس میں وہ کسی کو کوئی بھی تکلیف دے کر خود محفوظ رہ سکتا تھا تو اس کے اندر کا گھٹیا پن ابھر کر سامنے آ گیا اور اس نے ہر اس شخص کو مارنا اور اذیت دینا شروع کر دی جس سے اسے ذرا سی بھی پرخاش ہوتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس شخص کا کوئی نقصان نہیں ہوتا تھا۔ کارل ایک منٹ پورا ہونے سے پہلے بٹن دبا کر وقت کو پیچھے کر دیتا تھا۔ بے شمار بار ایسا ہوا کہ جن عورتوں نے اسے حقارت کی نظر سے دیکھا، اس نے سرعام ان کو بے عزت کیا۔ ان کے کپڑے پھاڑ دیے اور ان کو قتل تک کر دیا۔ وہ بچوں اور بوڑھوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتا تھا۔ کسی کو راہ چلتے اچانک ہی آتے ٹرک کے سامنے دھکا دے دیتا۔ کسی کو بلندی سے نیچے دھکیل دیتا اور کسی کو اپنے ہاتھ سے ختم کر ڈالتا... بہت معزز نظر آنے والے شخص کو تھپڑ مار دیتا۔

اب اس کے اندر کی حسرت باقی نہیں رہتی تھی۔ جیسا اس کے دل میں آتا، وہ کر گزرتا تھا۔ اس پر کوئی الزام نہیں آتا تھا کیونکہ ایک منٹ سے بھی پہلے اس کے کیے کسی بھی کام یا حرکت کا نام و نشان نہیں رہتا تھا۔ اسے ایک انوکھی چیز مل گئی تھی جس کی مدد سے وہ ہر کام کر کے بھی آزاد ہی رہتا۔

☆☆☆

''پچپن، چھپن، ستاون، اٹھاون...'' وہ دل ہی دل میں گن رہا تھا اور جیسے ہی وہ اٹھاون پر پہنچا اس نے گھڑی تھما آلے کا ڈائل دبا دیا۔ اگلے ہی لمحے ایئر ہوسٹس صحیح سلامت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے الجھن کے آثار نظر آئے پھر اس نے پیشہ ورانہ انداز میں مسکرا کر کارل کی طرف دیکھا۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں سر؟''

کارل کو کسی خدمت کی ضرورت نہیں تھی مگر اس نے کافی کا کہہ دیا۔ ''بہت سیاہ اور گرم... تمہاری طرح مس۔''

ایئر ہوسٹس کا چہرہ ایک لمحے کے لیے بدلا مگر پھر وہ مسکرانے لگی۔ یہ اس کے پیشے کا تقاضا تھا کہ وہ مسافروں کے اس قسم کے جملے بھی برداشت کرے۔ وہ دل ہی دل میں کارل کو گالیاں دیتی ہوئی چلی گئی۔ اس کی کیفیت کا کارل کو اچھی طرح اندازہ تھا اور اسے اس کھیل میں لطف آ رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دوسرا راؤنڈ بھی کھیلے گا۔ وہ ایئر ہوسٹس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ تقریباً دس منٹ بعد آئی تھی۔ اس نے ٹرے میں گرم کافی کا مگ اٹھا رکھا تھا۔ اس نے جیسے ہی ٹرے اس کے سامنے کی، کارل نے مگ اٹھا کر کافی ایئر ہوسٹس کے چہرے پر پھینک دی۔ اس نے چیخ ماری۔ کافی نے اس کا چہرہ جلا دیا تھا۔ مگر کارل اس کی تکلیف کی طرف دھیان دیے بغیر اپنے شیطانی کاموں میں مصروف تھا۔ اس بار کچھ مسافر بھی اپنی نشستوں سے اٹھ گئے تھے۔ وہ اس کی طرف آنے لگے۔ کارل نے بُرا سا منہ بنایا۔ لگ رہا تھا کہ ان کی وجہ سے وہ پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکے گا۔ ابھی تو صرف بیس سیکنڈ ہوئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر ایئر ہوسٹس کے کپڑے پھاڑ کر اسے عریاں کر دیا تھا۔ ابھی تیس سیکنڈ باقی تھے مگر دوسرے مسافر جارحانہ انداز میں اس کے پاس آ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے جیسے ہی کارل کی گرفت سے ایئر ہوسٹس کو چھڑانے کی کوشش کی، کارل نے بٹن دبا دیا اور سب پہلے کی طرح ہو گیا۔ ایئر ہوسٹس کیبن کا پردہ ہٹا کر اندر آ رہی تھی۔ اس نے کافی کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ کارل نے فیصلہ کیا کہ اس بار اس پر کافی نہیں پھینکے گا۔ اس طرح شور مچ جاتا اور وہ اپنی تفریح وقت سے پہلے ختم کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ مگر ابھی ایئر ہوسٹس اس سے ذرا دور تھی کہ اسے طیارے کی کھڑکی کے باہر روشنی سی محسوس ہوئی اور جیسے ہی اس نے باہر دیکھا، ایک چھوٹا سا آتشیں شہابیہ طیارے کے دائیں پر کو توڑتا ہوا گزر گیا۔ اس کے ساتھ ہی طیارے میں زلزلہ سا آ گیا۔ ایک میکانکی سے انداز میں اس نے بٹن دبا دیا اور وقت پیچھے چلا گیا۔

طیارہ تقریباً خلا میں سفر کر رہا تھا اور یہاں شہابیوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ کارل کا خوف سے بُرا حال تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک شہابیہ طیارے کی طرف آ رہا ہے اور ایک منٹ میں اس سے ٹکرانے والا ہے۔ وہ جھپٹ کر اپنی سیٹ سے اٹھا۔

ایئر ہوسٹس راستے میں تھی کہ اس نے اسے روک لیا۔

''فوراً پائلٹ کو اطلاع دو کہ طیارے کے راستے میں ایک شہابیہ آ رہا ہے، طیارے کا راستہ تبدیل کرے۔'' اس نے جلدی جلدی کہا۔ مگر ایئر ہوسٹس اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو۔ اسی لمحے طیارہ پھر سے زلزلے کی زد میں آ گیا۔ شہابیہ آ کر اس سے ٹکرا گیا تھا۔ کارل نے ڈگمگاتے ہوئے بٹن دبا دیا۔ وہ اپنی سیٹ پر تھا۔ اس بار وہ خود بھاگا اور کاک پٹ کی طرف جانے کی کوشش کی مگر اس سے دو تین گارڈ چمٹ گئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ کارل نہ جانے کیا کرنے کاک پٹ کی طرف جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ چیخ رہا تھا کہ اسے پائلٹ کے پاس جانے دیا جائے۔ طیارے سے ایک شہابیہ ٹکرانے والا تھا مگر وہ اس کی ایک نہیں سن رہے تھے۔ اسی کشمکش میں شہابیہ آ کر طیارے سے پھر ٹکرا گیا۔ وہ سب الٹ پلٹ گئے۔ بڑی مشکل سے کارل نے بٹن دبایا۔ اس نے خود کو گیلری میں پایا۔ اس بار اس نے اندھادھند بھاگنے سے گریز کیا مگر اس کی بدقسمتی کہ وہ کاک پٹ سے بہت دور تھا۔ اس لیے شہابیہ راستے میں ہی ٹکرا گیا۔ اسے پھر بٹن دبانا پڑا اور وہ ایک بار پھر گیلری میں کھڑا تھا۔ وہ پھر جھجکا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ وہ سعی رائیگاں کر رہا ہے۔ اس طرح وہ کبھی کاک پٹ تک نہیں پہنچ سکے گا۔ مگر مرنے کا خوف اسے حرکت میں رکھے ہوئے تھا۔ چوتھی بار اس نے بٹن دبایا تو وہ ایئر ہوسٹس والے حصے کی طرف جھپٹا۔ اسے معلوم تھا کہ وہاں ایک فون ہوتا ہے جس سے براہ راست کاک پٹ میں رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

اس نے اندر گھستے ہی ایئر ہوسٹس کی پروا کیے بغیر فون اٹھایا اور چیخ کر بولا۔ ''طیارے کا راستہ تبدیل کرو، ایک شہابیہ اس سے ٹکرانے والا ہے۔''

''کیا... یہ کون بول رہا ہے؟'' کاک پٹ سے کسی نے بدمزگی سے کہا۔ اسی لمحے کسی نے اسے عقب سے جکڑ لیا تھا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر نہیں چھڑا سکا اور شہابیہ آ کر طیارے سے ٹکرا گیا۔ اسے پکڑنے والے نے پھر بھی اسے نہیں چھوڑا اور اسے بٹن دبانے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وقت کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے خود کو فون کے پاس پایا۔ اس نے جلدی سے کاک پٹ سے رابطہ کیا اور پائلٹ کو بتانے لگا کہ طیارے کی راہ میں ایک شہاب ثاقب آنے والا ہے جو اس سے ٹکرا جائے گا۔ مگر پائلٹ اس کی بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔

''یہ کون ہے، اسے روکو۔''

اس بار کارل عقب کی طرف سے ہوشیار تھا اس لیے اس نے گارڈ کو آتے دیکھ لیا جس نے اسے پہلے بھی جکڑ لیا تھا۔ اس نے گارڈ سے بچنے کی کوشش کی اور فون پھینک کر اسے مارا۔ ''احمقو!... طیارہ تباہ ہونے والا ہے، اس کا راستہ تبدیل کرو۔''

مگر گارڈ اس کی فکر میں تھا۔ اس نے کارل کو جھکائی دے کر دبوچ لیا اور اسے کھینچ کر باہر لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایئر ہوسٹس چیخ رہی تھیں اور مسافر تجسس سے اس کشمکش کو دیکھ رہے تھے۔ کارل کا ایک ہاتھ اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ وہ اس سے دوسرے ہاتھ کی کلائی پر بندھے آلے کا بٹن نہیں دبا سکتا تھا۔ اسی اثنا میں شہابیہ طیارے سے ٹکرا گیا۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس دوران میں کارل بے تحاشا گالیاں دیتے ہوئے بٹن دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہ مشکل اس نے بٹن دبایا تو اس پر انکشاف ہوا کہ وقت گزر گیا تھا اور شہابیہ طیارے سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کر ڈولنے لگا۔ طیارہ قلابازیاں کھاتا ہوا تیزی سے زمین کی طرف جا رہا تھا۔ لوگ الٹ پلٹ ہو رہے تھے۔ چیزوں سے ٹکرا رہے تھے۔ کارل نے بٹن دبایا۔ اس بار بھی وہ زلزلہ زدہ طیارے میں تھا۔ اچانک ہی طیارہ درمیان سے دو ٹکڑے ہو گیا اور مسافر اس سے باہر نکلنے لگے۔ ہواؤں کے پاگل جھکڑ اندر گھس آئے تھے اور ہر چیز کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے بے تاب تھے۔ ان میں مسافر بھی تھے۔ کارل ایک سیٹ سے چمٹا بار بار بٹن دبا رہا تھا اور ہر بار خود کو قلابازیاں کھاتے طیارے میں پاتا تھا۔ پھر ہوا اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لے گئی اور وہ ہزاروں فٹ کی بلندی سے زمین کی طرف جانے لگا۔ اس نے بٹن دبایا اور طیارے میں واپس آ گیا حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ طیارہ تباہ ہونے والا تھا مگر وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے کوئی دسویں بار بٹن دبایا تو خود کو طیارے کے باہر ہی پایا۔ بار بار بٹن دبانے پر بھی وہ واپس طیارے میں نہیں جا سکا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ اب بھی بہت زیادہ بلندی پر تھا۔ یہاں سردی بے پناہ تھی۔ اس کا خون رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ اس لیے اس نے کچھ دیر تک خود کو نیچے جانے دیا۔ جیسے جیسے وہ نیچے جا رہا تھا، سردی کا احساس کم ہو رہا تھا۔ آخر اسے سمندر دکھائی دینے لگا اور اب ہوا اتنی سرد نہیں تھی۔ اس نے پھر آلے کا بٹن دبانا شروع کر دیا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا اور اس کے لیے وہ بار بار وقت کو ایک منٹ پیچھے کر رہا تھا۔ وہ اس وقت تک ایسا کرتا رہتا جب تک اس میں زندہ رہنے کی خواہش برقرار رہتی اور اسے معلوم تھا کہ یہ خواہش زیادہ دیر برقرار نہیں رہتی اور وہ وقت ...... زیادہ دور نہیں تھا...!

اسما قادری

گرداب

چوتھی قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب بااثر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے۔ جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کرکے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے ... سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ..... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ۔

www.pkdigest.com

ماہ بانو پورا زور لگا رہی تھی کہ کسی طرح خود کو جکڑنے والے کی گرفت سے آزاد کروا سکے لیکن گرفت بہت مضبوط تھی۔

''شش ... شور مت مچانا۔ آرام سے رہو، میں تمہارا دشمن نہیں دوست ہوں۔'' پیچھے سے اسے گرفت میں لینے والے شخص نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور اپنا ہاتھ اس کے منہ پر سے ہٹا لیا۔ اس نے پلٹ کر خود کو جکڑنے والے کو دیکھا۔ تاریکی کے باوجود وہ اسے شناخت کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ وہ موتی والا کا ڈرائیور تھا لیکن رات کے اس پہر اس کی یہاں کوٹھی میں موجودگی کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ماہ بانو نے دھیمی آواز میں اس سے دریافت کیا۔

''یہ وقت سوال جواب کا نہیں۔ ہمیں پہلے یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' اس نے ماہ بانو کا ہاتھ تھاما اور احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ اس کا رخ بیرونی گیٹ کی جانب تھا۔ ماہ بانو کے حواس موتی والا کے بیڈ روم کا منظر دیکھنے کے بعد ابھی تک مختل تھے اس لیے وہ بنا کسی مزاحمت کے اس کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ اتنی بڑی کوٹھی پر اس وقت ہُو کا عالم طاری تھا۔ وہ جو اس وقت کوٹھی میں گھسے ہوئے لوٹ مار کر رہے تھے، وہ بھی اندرونی حصے میں مصروف تھے۔ گیٹ پر چوکیدار موجود نہیں تھا۔ وہ دونوں ذیلی گیٹ سے گزر کر آرام سے باہر نکل گئے۔

باہر نکلنے کے بعد ڈرائیور نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر لی۔ اسے بھی ڈرائیور کی پیروی کرنی پڑی تھی۔

''اس علاقے میں رہنے والے تمام افراد کے پاس اپنی ذاتی گاڑیاں موجود ہیں اس لیے یہاں دن کے وقت بھی پبلک ٹرانسپورٹ مشکل سے ہی ملتی ہے۔ رات کے اس پہر تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہمیں کوئی سواری مل جائے۔ سواری کے لیے ہمیں مین روڈ تک جانا ہوگا۔ ممکن ہے کوئی رکشا یا ٹیکسی مل جائے۔'' چلتے چلتے اس نے ماہ بانو کو اطلاع دی۔ وہ کیا کہہ سکتی تھی۔ جب اس کے ساتھ کوٹھی سے نکل ہی پڑی تھی تو اس کی پیروی بھی کرنی تھی۔ اس کی رات کے اس پہر کوٹھی میں موجودگی کی وجہ سمجھ نہ آنے کے باوجود اسے اس بات کا یقین تھا کہ وہ کوٹھی میں موجود افراد کے مقابلے میں اسے کم از کم کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ وہاں جو لوگ موجود تھے، وہ یقیناً عادی جرائم پیشہ لوگ تھے اور اسے یقین تھا کہ انہوں نے موتی والا اور اس کی بیوی کو قتل کر دیا ہے۔ موتی والا کے بیڈ روم میں موجود شخص جس طرح اس کی تجوری سے مال سمیٹ رہا تھا اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ڈاکوؤں کا کوئی گروہ کوٹھی میں گھس آیا ہے۔ اسے ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں وہ چودھری کے بندے نہ ہوں۔ جس طرح چودھری نے اس کی دارالامان میں موجودگی کا پتا چلا لیا تھا اسی طرح یہاں موجودگی کا پتا بھی چلا سکتا تھا لیکن اس خیال کو کوٹھی میں موجود افراد کا طرزِ عمل کمزور بنا رہا تھا۔ اگر وہ چودھری کے بندے تھے اور اس کی تلاش میں آئے تھے تو انہیں لوٹ مار میں ملوث ہونے کے بجائے پوری کوٹھی میں پھیل کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ حقیقت جو بھی تھی، فی الحال اس کے ساتھ تو یہ معاملہ تھا کہ وہ ایک بار پھر پناہ گاہ سے محروم ہو گئی تھی اور ایک ایسے شخص پر بھروسا کر کے جا رہی تھی جو اس کے لیے فقط صورت آشنا تھا، اس کے ساتھ جانے پر مجبور تھی۔ وہ دونوں تیز تیز قدموں سے ساتھ ساتھ چلتے مین روڈ پر آئے تو وہاں بھی کافی سناٹا تھا۔ سڑک سے گزرنے والی اکا دکا ٹیکسیوں میں پہلے ہی سے کوئی نہ کوئی مسافر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں کسی خالی ٹیکسی کے انتظار میں رکنے کے بجائے چلتے رہے۔ تقریباً دس منٹ چلنے کے بعد انہیں ایک چوک پر خالی ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور اگلی نشست پر اسٹیئرنگ پر سر ٹکائے سواری کے انتظار میں اونگھ رہا تھا۔

''خان! بھائی گیٹ تک جانا ہے... چلو گے؟'' ڈرائیور نے ٹیکسی ڈرائیور کو پکار کر پوچھا۔

''چلنے کا نہیں تو اور کیا کرے گا۔ ام یہاں اس وقت سواری کے انتظار میں ہی تو خوار ہو رہا ہے۔'' وہ جھٹ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ چادر سے آدھے چہرے کو چھپائے کھڑی ماہ بانو کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک معنی خیز سا شک اتر آیا تا ہم زبان سے کچھ بھی کہے بغیر اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی جھک کر ٹیکسی کے دونوں عقبی دروازوں کے لاک کھول دیے۔

وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی نے اپنا سفر شروع کر دیا۔ دورانِ سفر انہوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی حالانکہ ماہ بانو کے ذہن میں کئی سوالات کلبلا رہے تھے مگر احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ فی الحال خاموش رہا جائے۔

''آپ کس طرف لینا ہے؟'' اس دبیز خاموشی کو ایک طویل وقفے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے ہی توڑا۔ وہ ان کے مطلوبہ علاقے میں پہنچ گیا تھا اور اب حتمی منزل کی نشان دہی چاہتا تھا۔

''بس یہیں اتار دو۔'' اسے جواب دیا گیا۔ ٹیکسی رکنے پر ٹیکسی والے کو منہ مانگا کرایہ دینے کے بعد وہ لوگ ایک بار پھر پیدل چل پڑے۔ ذرا سی دیر میں وہ کشادہ علاقے کو چھوڑ کر تنگ اور پُرپیچ گلیوں والے ایک علاقے میں چل رہے تھے۔ ان پُرپیچ گلیوں سے گزرتا ہوا وہ ماہ بانو کو لے کر ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رک گیا۔ لکڑی کے دروازے پر دستک بجا کر رکی جانے والی دستک کئی بار دہرائی گئی تھی پھر بھی اندر سے تیسری دستک کے بعد ہی کچھ ظاہر ہوا۔

''اس وقت کون ہے بھائی؟'' نیند میں ڈوبی مردانہ آواز نے بے زاری سے پوچھا۔

''دروازہ کھول عامر! میں سرمد ہوں۔'' اس جواب پر فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔

''تو اس وقت کیسے؟ سب خیر تو ہے؟'' دروازہ کھولتے ہی عامر نام کے اس شخص نے اپنی تشویش کا اظہار شروع کر دیا لیکن پھر پیچھے کھڑی ماہ بانو کو دیکھ کر اسے حیرت کا اتنا شدید جھٹکا لگا کہ وہ مزید کوئی سوال نہ کر سکا۔

''پہلے اندر آنے دے۔ بعد میں تیرے سوالوں کا جواب دوں گا۔'' سرمد نے اسے ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے اپنے اور ماہ بانو کے اندر جانے کا راستہ بنایا۔ وہ بے چارہ حیران پریشان سا دروازہ بند کرنے لگا۔ اتنی دیر میں سرمد ماہ بانو کو لے کر ایک بیٹھک نما کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ عامر بھی وہیں آ گیا۔

''کیا چکر ہے یار! تو آج اپنی نیلم پری کے بجائے کس کو ساتھ لے کر گھوم رہا ہے؟ کیا پٹری بدل لی ہے؟'' سرگوشی میں کیا گیا یہ سوال اس چھوٹے سے کمرے میں موجود ماہ بانو کے کانوں میں بھی پہنچا۔ اندر ہی اندر خفت محسوس کرنے کے بجائے وہ ایسی بن گئی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پٹری میری ابھی تک وہی ہے۔ تُو یوں سمجھ لے کہ اس پٹری پر دوڑتے رہنے کی خواہش نے میرا بیڑا کر دیا ہے۔ اپنی نیلم پری کو پانے کے لیے ہی ایک کوشش کرنے نکلا تھا لیکن حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ اسے اپنے ساتھ لے کر جان بچانے کے لیے بھاگنا پڑا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اسے کہاں رکھوں؟ میرے گھر کا تو تجھے معلوم ہے کہ وہاں کی آبادی کتنی زیادہ اور ... خطرناک ہے۔ میری ماں بھی سوال کر کر کے میرا ستیاناس کر دیں گی اس لیے میں تیرے پاس آ گیا کہ تو اسے اپنے گھر پر رکھ لے۔''

''میں... میں کیسے رکھ لوں؟'' اس مطالبے پر عامر اچھلا۔

''کیسے کیا؟ بس میری خاطر رکھ لے۔ آس پڑوس والوں سے بول دینا کہ رشتے کی بہن ہے جسے تو نے اپنی اماں کی خدمت کے لیے بلوایا ہے۔ خالہ جی اتنی بیمار ہیں، کسی کو تیری بات پر شک نہیں ہوگا۔''

''اور اماں سے کیا بہانہ کروں گا؟ وہ تو اسے میری رشتے کی بہن نہیں مانے گی نا؟'' خود کو ملنے والے مشورے پر مرے مرے لہجے سے سوال کیا۔

''خالہ جی کو جو تیرا من کرے، وہ بہانہ گھڑ کر سنا دینا۔ مجھے معلوم ہے کہ تیرے لیے انہیں بے وقوف بنانا کوئی مشکل نہیں۔ چاہے تو میرا نام لے لینا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ تفصیلات کل کسی وقت موقع ملا تو آ کر بتاؤں گا۔ تو اس کے سونے وونے کا انتظام کر دے۔'' وہ عجلت میں بولتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ عامر نے اسے روک کر کچھ پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ رکنے پر تیار نہیں ہوا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ عامر کے ساتھ ساتھ ماہ بانو بھی ہکا بکا سی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

''لاہور سے ایک بُری خبر ہے سر!'' شہریار کی دفتر میں آمد کے تھوڑی دیر بعد ہی عبدالمنان نے اسے مطلع کیا۔

''کیا خبر ہے؟'' اس نے عبدالمنان کی سنجیدہ شکل کی طرف دیکھتے ہوئے حتی الامکان خود کو پُرسکون رکھتے ہوئے پوچھا، ورنہ عبدالمنان کے الفاظ نے اسے بے حد تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے ذہن میں سب سے پہلا اندیشہ ماہ بانو کے حوالے سے ہی سر سرایا تھا۔ وہ لاہور میں موتی والا کے گھر پناہ گزین تھی۔ ابھی پچھلے ہی دنوں اسے لاہور کے اس دارالامان سے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی جہاں عبدالمنان نے اسے اس وثوق کے ساتھ بھجوایا تھا کہ وہاں وہ بالکل محفوظ رہے گی۔ ماہ بانو کی اپنی ہی غلطی کی وجہ سے سہی لیکن اس محفوظ دارالامان میں اس کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اگر مشابرم خان کا دوست اپنی جان کی بازی لگا کر اس کے اغوا کی کوشش ناکام نہ بنا دیتا تو وہ چودھری اختیار تک پہنچ چکی ہوتی۔ اب ایک بار پھر عبدالمنان اسے اطلاع دے رہا تھا کہ لاہور سے کوئی بری خبر تھی۔ اس بری خبر کا تعلق ماہ بانو سے ہونے کے خدشے نے اسے بے چین کر دیا تھا۔

''موتی والا کے گھر ڈاکا زنی کی واردات میں اسے اور اس کی بیوی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ واقعہ کل آدھی رات کے بعد پیش آیا ہے۔ زیادہ تفصیلات کا فی الحال مجھے علم نہیں ہو سکا۔''

''اور ماہ بانو...؟ اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟ وہ بھی تو موتی والا کے گھر پر تھی؟'' عبدالمنان کی اطلاع نے اس کے خدشات کو درست ثابت کر دیا تھا۔ موتی والا کے گھر ہونے والی واردات میں ماہ بانو کے متاثر ہونے کا بہت زیادہ امکان تھا۔

''نہیں... ابھی ماہ بانو کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا۔ ماہ بانو کی وہاں موجودگی کیونکہ آف دی ریکارڈ ہے اور ہم اس سے اپنا کوئی تعلق شو بھی نہیں کر سکتے، اس لیے میں نے اس سلسلے میں کسی بھی قسم کے سوال جواب کرنا مناسب نہیں

www.pkdigest.com

سمجھا۔ ہم وہاں پہنچ کر صورت حال دیکھنے کے بعد ہی اس کے سلسلے میں کوئی اقدام کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے ماہ بانو موتی والا کے گھر پر موجود ہو اور اس نے پولیس کو وہاں اپنی موجودگی کے سلسلے میں کوئی وجہ بھی بتائی ہو۔ بہر حال، لاہور پہنچنے سے پہلے کوئی بھی لائحہ عمل طے کرنا ممکن نہیں۔'' عبدالمنان کا جواب دوٹوک تھا۔

''او کے، تم لاہور چلنے کی تیاری کرو۔ ہم نے ماہ بانو کو موتی والا کے گھر نہ بھی ٹھہرایا ہوتا تو بہر حال اس سے میرے ٹرم ایسے تھے کہ اس موقع پر میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔'' اس نے عبدالمنان کو حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوگ لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ طویل راستہ بالکل خاموشی کے ساتھ کٹا۔ جس وقت وہ لوگ موتی والا کی رہائش گاہ پر پہنچے، وہاں جنازوں کو روانہ کرنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ انتظامات موتی والا کے ایک کزن نے سنبھال رکھے تھے۔ موتی والا کا شمار بڑے کاروباری افراد میں ہونے کی وجہ سے اس کی رہائش گاہ پر شہر کے تقریباً ہر قابل ذکر طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد موجود تھے۔ بزنس کمیونٹی کے افراد کے علاوہ کئی محکموں کے اعلیٰ افسران اور سیاست دان بھی وہاں نظر آ رہے تھے۔ موتی والا کے کزن سے تعزیت کرنے کے بعد شہریار مختلف لوگوں سے ملتا رہا۔ اپنے ماموں لیاقت رانا اور کزن سجاد رانا سے بھی اس کی ملاقات ہوئی۔ چودھری افتخار بھی وہاں پر موجود تھا اور سب سے زیادہ سرگرم نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جنازے کے انتظامات کرنے والا موتی والا کا کزن سارے کام اسی کے مشورے پر کر رہا ہو۔ وہ بے چارہ ایسا یقیناً چودھری افتخار کے دبدبے اور اس کے موتی والا کے کاروباری شریک ہونے کی وجہ سے کر رہا تھا۔ شہریار بہ ظاہر دوسرے لوگوں کے ساتھ مصروف تھا لیکن اس کی نظریں چودھری افتخار کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے اس کے چہرے پر چھائے افسردہ تاثرات بالکل مصنوعی لگ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ چودھری افسردہ ہونے کی اداکاری کر رہا ہو۔ جنازہ روانہ ہوا تو بھی چودھری ہی سب سے آگے آگے تھا۔ گھر کی قریبی مسجد سے ملحقہ عیدگاہ میں نماز جنازہ کی ادائیگی کے بعد زیادہ تر افراد رخصت ہونے لگے۔ وہ سب مصروف ترین لوگ تھے جنہوں نے نماز جنازہ میں شرکت کا وقت بھی یقیناً بڑی مشکل سے نکالا تھا۔ مرنے والوں کی تدفین کے لیے قبرستان روانہ ہونے والوں میں موتی والا کے قریبی عزیز، دوست اور چند ملازمین شامل تھے۔

''میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے ملنا چاہتا ہوں سجاد بھائی!'' سجاد، شہریار سے ہاتھ ملا کر وہاں سے روانہ ہو رہا تھا، تب اس نے دھیمی آواز میں اس سے فرمائش کی۔

''کیوں؟'' سجاد چونکا۔

''ابھی کچھ دن قبل میں نے آپ کے ذریعے جس لڑکی کو تھانے سے چھڑوایا تھا، وہ لڑکی موتی والا کے گھر پر ہی رہ رہی تھی۔ مجھے اس لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں۔'' شہریار نے آواز مزید دھیمی کرتے ہوئے بتایا۔ وہاں ارد گرد اور بھی لوگ موجود تھے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی اور کے کان میں بھنک پڑے۔

''تم نے اس رات بھی مجھے اس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ آخر کون ہے وہ لڑکی جس کے لیے تم اتنے پریشان ہو؟'' سجاد رانا نے پوچھا۔

''میں بعد میں آپ کو ساری تفصیلات بتا دوں گا۔ فی الحال یہ سمجھ لیں کہ وہ ایک مظلوم لڑکی ہے جسے میری مدد کی ضرورت ہے۔ اس وقت بھی میں انکوائری آفیسر سے مل کر اس کے تحفظ کے بارے میں ہی یقین دہانی کرنا چاہتا ہوں۔ فی الحال تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ وہ موتی والا کے گھر پر موجود بھی ہے یا نہیں۔''

''او کے! میں انکوائری آفیسر کو آرڈر کر دیتا ہوں کہ وہ تم سے ملاقات کر لے۔ تم ایسا کرو کہ رانا ہاؤس پہنچ جاؤ۔ آفیسر وہیں آ کر تم سے ملاقات کر لے گا۔'' سجاد کو شروع سے اس کی فرمائشیں پوری کرنے کی عادت تھی۔ اس وقت بھی اس نے زیادہ بحث نہیں کی اور اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔

''تھینک یو سجاد بھائی۔'' شہریار اس سے ایک گرم جوش مصافحہ کرتے ہوئے بولا اور اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھنے کے بعد مشاہدم خان کو رانا ہاؤس چلنے کا حکم دیا۔ عبدالمنان اس کے ساتھ تھا۔ رانا ہاؤس میں حسب معمول صرف اس کی ممانی آفرین ہی موجود تھیں۔ لیاقت رانا کی بیرونی سرگرمیاں اتنی زیادہ تھیں کہ وہ دن کی روشنی میں کم ہی گھر پر دکھائی دیتے تھے۔ سجاد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتا تھا اس لیے آفرین رانا کا بیشتر وقت گھر پر تنہائی گزرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ لیاقت رانا کے ساتھ کسی فنکشن میں شرکت کرنے چلی جاتی تھیں لیکن مزاجاً محفل پسند نہ ہونے کے باعث وہ عموماً گھر پر رہنے کو ہی ترجیح دیتی تھیں۔

''بڑی ٹریجڈی ہوئی موتی والا کی فیملی کے ساتھ۔ پہلے جوان بیٹا حادثے کا شکار ہو کر مر گیا اور اب دونوں میاں بیوی بھی قتل ہو گئے۔ ذرا سے عرصے میں سارا خاندان ختم ہو گیا۔'' وہ شہریار سے حالیہ واقعے کو ڈسکس کرنے لگیں۔

''ہاں، واقعی بات تو بڑی افسوسناک ہے۔'' اس نے غائب دماغی سے آفرین رانا کی بات کی تائید کی۔ اصل میں تو اس کا ذہن ماہ بانو میں اٹکا ہوا تھا۔ ابھی تک اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تھی کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ موتی والا کے گھر میں جو ہجوم لگا ہوا تھا، اس ہجوم میں وہ کسی سے ماہ بانو کی بابت دریافت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں چودھری افتخار کے ساتھ اس کے کئی کارندے بھی موجود ہوں گے۔ اگر وہ لوگ اس کی یا عبدالمنان کی کوئی غیر معمولی سرگرمی دیکھ لیتے تو ضرور چونک پڑتے۔

''تمہارا کیا خیال ہے، قتل کی اس واردات کے پیچھے کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ویسے تو کہا جا رہا ہے کہ وہاں ڈاکا پڑا ہے اور ڈاکو بہت سارا روپیا اور زیور لوٹنے کے ساتھ موتی والا اور اس کی بیوی کو قتل کر گئے ہیں لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ معاملہ کوئی اور ہے۔ پہلے بیٹے کی حادثاتی موت اور اب دونوں میاں بیوی کے قتل کی واردات سے تو ایسا ظاہر ہو رہا ہے کہ کسی کی موتی والا سے دشمنی تھی۔ ہو سکتا ہے خاندان کا کوئی فرد ملوث ہو۔ اکثر لوگ دولت حاصل کرنے کے لیے اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔'' آفرین رانا کو مشکل سے کوئی سامع میسر آتا ہوتا تھا۔ اب شہریار ہاتھ لگا تھا تو دل کھول کر قیاس آرائیاں کر رہی تھیں۔

''فی الحال تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے سجاد بھائی سے کہا تھا کہ اس کیس کے انکوائری آفیسر سے میری ملاقات کروا دیں۔ تھوڑی دیر میں وہ آفیسر یہاں آتا ہو گا۔'' شہریار نے انہیں جواب دیا۔ اس کی پرورش کی زیادہ تر ذمے داری انہوں نے ہی نبھائی تھی اس لیے وہ ان کا بہت ادب و لحاظ کرتا تھا۔ اس وقت بھی گفتگو کا موڈ نہ ہونے کے باوجود وہ ان کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔

''یعنی تم اس آفیسر سے ملاقات کے لیے یہاں رکے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ ملاقات کے فوراً بعد ہم لوگ فوراً روانہ ہو جائیں گے۔ اصل میں یہ تو میرا بالکل اتفاقی وزٹ ہے ورنہ مجھے وہاں اتنے معاملات دیکھنے ہیں کہ فی الحال کہیں آنے جانے کی فرصت نہیں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں، میں کسی دن بلوچستان سے صرف آپ سے ملنے کے لیے لاہور آؤں گا۔'' شہریار نے انہیں تسلی دی۔

''مجھے اس قسم کے وعدوں کی حقیقت بڑی اچھی طرح معلوم ہے۔ تمہارے ماموں کے ساتھ برسوں گزارے ہیں میں نے۔ سجاد کی مصروفیت کا عالم بھی دیکھتی رہتی ہوں۔ مجھے

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاءاللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپ کے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0547-521787

فون اوقات
صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

علم ہے کہ ہمارے خاندان کے کسی مرد کے پاس گھر اور گھر والوں کے لیے وقت نہیں ہوتا۔" ان کے لہجے میں شکوہ تھا مگر اس سے قبل کہ شہریار انہیں کوئی تسلی دیتا، وہ خود ہی بات بدلتے ہوئے بولیں۔ "ذرا کچن کا چکر لگا کر آتی ہوں۔ صابر سے کہا تو تھا کہ کھانا لگا دے۔ پتا نہیں وہ اب تک کیا کر رہا ہے؟" وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد صابر کھانا لگنے کی اطلاع کے ساتھ وہاں آ گیا۔ گیسٹ روم میں موجود عبدالمنان کو بھی ڈائننگ روم میں بلوا لیا گیا۔ مشتا بیرم خان کے کھانے کا انتظام صابر اور دیگر ملازمین کے ساتھ تھا۔ ان لوگوں کے کھانے سے فارغ ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی انکوائری آفیسر پہنچ گیا۔

"میں رفیق کھوکھر ہوں سر! موتی والا کیس کا انکوائری آفیسر۔ ڈی آئی جی صاحب کا حکم ملا تھا کہ آپ اس کیس کے سلسلے میں مجھ سے ذاتی طور پر ملاقات کرنا چاہتے ہیں، اس لیے میں پہلی فرصت میں رانا ہاؤس پہنچ جاؤں۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ اب آپ فرمایئے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" پولیس والوں کے عمومی تاثر کے برخلاف اس کی شخصیت میں نرمی اور تہذیب کی جھلک تھی۔ وہ دراز قد، اسمارٹ اور جوان العمر آدمی تھا جس کے صرف اٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے کے انداز سے ہی شہریار نے اس کے مستعد اور چست ہونے کا اندازہ لگا لیا تھا۔

"سب سے پہلے تو مجھے موتی والا کے کیس پر اب تک کی گئی تحقیقات کے بارے میں بتاؤ۔" شہریار نے اس سے کہا۔ اسے یقین تھا کہ ابتدائی تحقیقات میں ہی انکوائری آفیسر کو ماہ بانو کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ معلوم ہوا ہوگا۔

"قتل تقریباً آدھی رات کے وقت کیا گیا۔ موتی والا کے بیڈروم میں موجود کھلی ہوئی خالی تجوری کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ڈاکازنی کی واردات تھی۔ شاید موتی والا صاحب اور ان کی مسز نے ڈاکوؤں کے خلاف مزاحمت کرنے کی کوشش کی ہو، اس لیے انہیں قتل کر دیا گیا۔ مگر مجھے اس تھیوری پر بہت زیادہ یقین نہیں ہے۔ دونوں لاشیں بیڈ پر اس طرح پائی گئی ہیں جیسے کسی نے سوتے میں ان پر وار کیا ہو۔ دونوں کے جسم پر چاقو کے کئی وار کرنے کے بعد ان کے گلے کاٹ دیے گئے ہیں۔" انکوائری آفیسر کی اس بات پر شہریار کے علاوہ ملاقات میں شریک عبدالمنان بھی چونک پڑا۔ قتل کا یہ انداز کچھ عرصے پہلے کیے جانے والے صفدر اور حوراں کے قتل سے مماثلت رکھتا تھا۔ ان دونوں کے چونکنے کو محسوس کیے بغیر رفیق کھوکھر نے اپنی بات جاری رکھی۔

"میرا خیال ہے کہ اگر قتل کسی مزاحمت کی وجہ سے کیا گیا ہوتا تو لاشوں کو بستر کے بجائے نیچے فرش پر یا تجوری کے قریب پایا جانا چاہیے تھا۔ اگر قتل بلاجواز تھا تو اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ڈاکو خطرناک، تشدد پسند اور جارح تھے جنہوں نے صرف تفریحاً قتل کیے۔ موتی والا کا چوکیدار بھی اپنے کیبن میں مردہ پایا گیا ہے۔ اسے گردن کی ہڈی توڑ کر قتل کیا گیا۔ گھر پر مامور کتے گوشت میں شامل سریع الاثر زہر کی وجہ سے مارے گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ واردات بہت سوچ سمجھ کر اور منظم طریقے سے کی گئی ہے۔ آنے والے مجرم اچھی طرح جانتے تھے کہ گھر کی حفاظت کے لیے کیا انتظامات ہیں اسی لیے انہوں نے سب سے پہلے کتوں کو ہلاک کرنے کا بندوبست کیا۔ آتشیں ہتھیار استعمال نہ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کا شور شرابا بھی نہیں ہوا۔ میں نے کوٹھی میں سے مختلف مقامات پر سے... خصوصاً موتی والا کے بیڈروم سے فنگر پرنٹس اٹھوائے ہیں۔ ممکن ہے اس سے ہمیں کچھ مدد مل جائے۔ ویسے مجھے اس سلسلے میں زیادہ امید نہیں ہے۔ یہ لوگ تو بہت منظم معلوم ہوتے ہیں اور اب عام سے عام مجرم کو بھی اس بات کا شعور آ چکا ہے کہ جائے واردات پر اپنے فنگر پرنٹس نہ چھوڑے۔"

"پولیس کو واردات کی اطلاع کس نے دی؟" رفیق کھوکھر نے اب تک جو کچھ بتایا تھا اس میں ماہ بانو کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ شہریار نے اسے مزید کریدنے کے لیے یہ سوال کیا۔

"اطلاع وہاں کام کرنے والے مالی نے دی تھی۔ وہ صبح سات بجے سب سے پہلے ڈیوٹی پر آتا ہے۔ وہ آیا تو اس نے دیکھا کہ کوٹھی کا ذیلی گیٹ کھلا ہوا ہے۔ اسے کچھ تشویش ہوئی اور اس نے چوکیدار کے کیبن میں جھانکا۔ وہاں اسے چوکیدار کی لاش نظر آئی تو وہ الٹے قدموں باہر نکل گیا اور قریبی کوٹھی کے چوکیدار کو صورتِ حال بتائی۔ اس چوکیدار نے اپنے مالک کو بتایا اور انہوں نے پولیس اسٹیشن فون کر دیا۔ باقی دو لاشیں پولیس نے خود دریافت کی تھیں۔"

"کیا کوٹھی میں چوکیدار کے علاوہ کوئی دوسرا مستقل ملازم نہیں تھا؟"

"نہیں۔ ڈرائیور اور مالی سمیت تمام ملازمین کو رات گیارہ بجے چھٹی دے دی جاتی تھی۔ صرف دو میاں بیوی مستقل کوٹھی میں رہتے تھے لیکن وہ چھٹی پر گئے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کے پیچھے بندہ بھیجا ہے، وہ انہیں ان کے گاؤں سے لے آئے گا۔ پہلے مرحلے پر ہم نے تمام ملازمین کو تفتیش میں شامل کر لیا ہے۔ عموماً ایسی وارداتوں میں ملازمین کی شمولیت کا امکان ہوتا ہے۔ رشتے داروں میں سے کسی پر اس

بھی شک نہیں کیا جا سکتا کہ موتی والا کے قتل سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں ہی بیٹے کے مرنے کے فوراً بعد اس بات کا اعلان کر چکے تھے کہ انہوں نے اپنی کل جائیداد اپنے بیٹے کے نام سے ٹرسٹ قائم کرنے کے لیے وقف کر دی ہے۔ واردات کرنے والے کو موتی والا کے گھر سے زیور اور کیش کے سوا کچھ نہیں ملا ہوگا اور ظاہر ہے موتی والا جیسے عقل مند آدمی نے تمام زیور اور کیش تو گھر پر رکھنے کی غلطی نہیں کی ہوگی۔ ان دونوں چیزوں کا بڑا حصہ تو بینک میں ہی محفوظ ہوگا۔"

"یعنی آپ کو شک ہے کہ یہ اصل میں ڈاکازنی کی واردات نہیں تھی بلکہ موتی والا اور ان کی مسز کے قتل کی واردات کو ڈاکازنی کی واردات کا روپ دینے کی کوشش کی گئی ہے؟" شہریار نے آفیسر کی بات پکڑی۔

"جی ہاں۔" آفیسر نے ہچکچاتے ہوئے اعتراف کیا۔

"اس شک کی کوئی خاص وجہ؟ کیا آپ کے علم میں کوئی غیر معمولی بات آئی ہے؟" شہریار نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"جی ہاں۔ ملازمین سے ہمیں علم ہوا کہ موتی والا کی کوٹھی کی انیکسی میں ایک مہمان لڑکی ٹھہری ہوئی تھی لیکن اب اس لڑکی کا کچھ اتا پتا نہیں۔ وہ کوٹھی سے غائب ہے۔ ملازمین اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ انہیں صرف اتنا علم ہے کہ موتی والا صاحب خود اس لڑکی کو لے کر آئے تھے۔ ملازمین کے متفقہ بیان کے مطابق لڑکی رات کو ان کے روانہ ہونے کے وقت تک انیکسی میں موجود تھی لیکن صبح وہ کسی کو نہیں ملی۔ اب یہ نہیں معلوم کہ وہ لڑکی واردات میں ملوث تھی یا خوف زدہ ہو کر کوٹھی سے بھاگ گئی۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ ملازمین کی مدد سے لڑکی کا اسکیچ بنوا کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔"

"لیکن آپ اس اسکیچ کو کسی اخبار وغیرہ میں شائع مت کروایئے گا۔" شہریار نے بے ساختہ ہی اسے ٹوکا اور پھر اس کی آنکھوں میں الجھن تیرتی دیکھ کر وضاحت کے لیے بولا۔ "میں آپ کو اسکیچ چھپوانے سے اس لیے منع کر رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے وہ لڑکی کہیں چھپ جائے یا اگر وہ مجرم نہیں تو خواہ مخواہ مجرموں کی نظر میں آ کر کسی مشکل میں پڑ جائے۔ جیسا کہ آپ نے بتایا ہے کہ موتی والا صاحب اسے خود اپنے ساتھ لے کر آئے تھے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اسے جانتے تھے اور وہ ان کے لیے قابلِ اعتماد تھی، تب ہی انہوں نے اسے اپنی کوٹھی میں رکھا ہوا تھا۔"

"میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں سر! میں لڑکی کا اسکیچ چھپوانے سے گریز کروں گا۔" رفیق کھوکھر نے یقین دلایا۔

"تھینک یو آفیسر! میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اس کیس کی انکوائری سے باخبر رکھیں۔ اصل میں موتی والا صاحب سے میرے نجی نوعیت کے تعلقات تھے اور وہ ایک اہم کیس کے سلسلے میں میری مدد بھی کر رہے تھے اس لیے میں اس معاملے میں ذاتی طور پر دلچسپی لے رہا ہوں۔" شہریار نے اپنی بات کہہ کر یک دم ہی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ یہ رفیق کھوکھر کے لیے ملاقات ختم ہونے کا اشارہ تھا۔ وہ بے چارہ اگر کچھ پوچھنے کی خواہش بھی رکھتا ہو تو بھی نہ پوچھ سکا اور ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

سرمد کا دوسرے دن کی شام ہو جانے کے باوجود کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ عامر نے اپنی ماں سے ماہ بانو کا تعارف سرمد کی کزن کی حیثیت سے کرواتے ہوئے یہ کہانی سنائی تھی کہ یہ سرمد کے مرحوم چچا چچی کی بے آسرا بیٹی ہے جو ساہیوال سے کسی اپنے کے سہارے کی خاطر یہاں آئی تھی لیکن سرمد کی والدہ نے اس مظلوم لڑکی کو رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ مجبوراً سرمد اسے یہاں چھوڑ گیا کہ تم اسے رکھ لو۔ یہ گھر کے کام اور اماں کی خدمت کر دیا کرے گی، ساتھ اسے رہنے کا ٹھکانا بھی مل جائے گا۔ سرمد کی والدہ چونکہ اپنی تیزی طراری اور تند خوئی کی وجہ سے اچھی خاصی مشہور تھیں اس لیے عامر کا یہ بہانہ چل گیا۔ عامر کی والدہ نے نہ صرف ماہ بانو کو گلے لگا لیا بلکہ ساتھ ہی عامر کی یہ تجویز بھی قبول کر لی کہ وہ اسے محلے داروں کے سامنے اپنی عزیزہ ظاہر کریں گی۔ ان کی طویل بیماری کے باعث لوگوں کے لیے یہ بہانہ قابلِ قبول بھی ہوتا۔ ماہ بانو نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سچ مچ فوری طور پر گھر کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ عورت کی توجہ سے محروم گھر کافی ابتر حالت میں تھا۔ ظاہر ہے، عامر اپنی ملازمت کی ذمے داریوں کے ساتھ گھر کی دیکھ بھال کا کام مناسب طریقے سے نہیں کر پاتا ہوگا۔ اماں اتنی بیمار تھیں کہ بس حوائج ضروریہ کے لیے ہی اپنے بستر سے اترتی تھیں۔ ماہ بانو نے گھر کی صفائی ستھرائی کر کے کھانا تیار کرنے کے بعد انہیں کھلایا تو وہ بہت دیر تک اسے دعائیں دیتی رہیں۔ اُن کی ان محبت بھری دعاؤں کو سن کر اسے بے بے یاد آ گئی۔ وہ بھی اس کی چھوٹی چھوٹی خدمات پر اسی طرح خوش ہو کر دعائیں دیتی تھی۔ بہت دنوں بعد ایک چھوٹے سے گھر میں، عام گھریلو لڑکی کی طرح کام کاج نمٹاتے اور کسی بزرگ کی دعائیں سمیٹے

ہوئے اس کو اپنا فیصل آباد والا گھر بری طرح یاد آتا رہا۔ وہ اچھی بھلی ایک سیدھی سادی زندگی گزار رہی تھی۔ اس زندگی میں چودھری افتخار کیا آیا، وہ ایک گرداب میں پھنستی چلی گئی۔ اسے لگتا تھا کہ اُسے اس گرداب سے نکل کر دوبارہ اپنے گھر جا کر رہنا کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ کبھی گھر نہ لوٹنے کا یہ خیال بہت وحشت ناک اور افسردہ کر دینے والا تھا۔ اس افسردگی اور وحشت میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب عامر شام کا اخبار لے کر گھر آیا۔ اخبار میں موتی والا اور اس کی بیگم کے قتل کی خبر چھپی تھی۔ اس خبر کو پڑھ کر وہ بہت دیر تک روتی رہی۔ ان لوگوں نے اسے پناہ دی تھی، خصوصاً موتی والا کی بیوی کا رویہ اس کے ساتھ بہت مہربان تھا مگر اب وہ دونوں قتل کر دیے گئے تھے۔ اخباری اطلاع کے مطابق قتل کی یہ واردات دراصل ڈاکازنی کی واردات کے ساتھ جڑی ہوئی تھی لیکن جانے کیوں اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ چھپ چھپ کر روتے اور گھر کے چھوٹے موٹے کام نمٹاتے ہوئے شام کا وقت گزر گیا۔ رات کے تقریباً دس بجے سرمد وہاں پہنچا۔ وہ بہت تھکا ہوا اور پریشان لگ رہا تھا۔

”اب جلدی سے مجھے بتا دے کہ یہ سارا چکر کیا ہے؟ میں پورا دن پریشان رہا ہوں۔ لڑکی سے کوئی سوال کرنا اس لیے مناسب نہیں سمجھا کہ تیرے مجبور کرنے پر ہی سہی لیکن میں اسے یہاں پناہ دے چکا ہوں اور کسی پناہ گزین کو دباؤ میں لینا مجھے گوارا نہیں تھا۔“ عامر نے فوراً ہی اسے گھیر لیا۔ وہ جو کچن میں تھی، خود بھی بیٹھک میں آگئی تاکہ اپنے ذہن میں موجود بہت سے سوالوں کے جواب حاصل کر سکے۔

”مجھے تیری پریشانی کا خیال تھا یار... اسی لیے شدید تھکن کے باوجود گھر جانے کے بجائے تیرے پاس آیا ہوں۔ سارا دن گاڑی دوڑا دوڑا کر کام نمٹانے کے ساتھ ساتھ پولیس والوں کو بھی بھگتایا ہے۔ ان کا سارا زور غریبوں پر ہی چلتا ہے اس لیے ہم سارے ملازمین کو گھیر کر بیٹھے رہے کہ کسی طرح کچھ اگلوا لیں۔ شاکر اور اس کی بیوی کو تو شادی والے گھر سے واپس بلوا لیا کہ کہیں وہ لوگ ڈاکوؤں کو ساری مخبری کرنے کے بعد شادی میں شرکت کے بہانے سے تو منظر سے نہیں ہٹ گئے۔ ایک فکر انہیں مہمان لڑکی کی طرف سے بھی تھی کہ وہ کیسے اور کہاں غائب ہو گئی؟ میرا اندر سے گھبراہٹ کے مارے کیا حال تھا، میں بتا نہیں سکتا۔ بس ہمت کر کے سب کے ساتھ یہی بولتا رہا کہ مجھے نہیں معلوم۔ اگر پولیس والوں کو یہ بتا دیتا کہ لڑکی کو میں نے وہاں سے نکالا ہے تو وہ ڈاکے اور قتل کا شک بھی مجھ پر ہی کرتے۔“

”شک تو انہیں کرنا ہی چاہیے تھا۔ میں خود پریشان ہوں کہ تو ڈاکے کے وقت وہاں کوٹھی میں کیا کر رہا تھا جبکہ تیری ڈیوٹی تو ٹھیک گیارہ بجے ختم ہو جاتی ہے۔“ سرمد کی پریشانی کے جواب میں عامر نے اس سے پوچھا۔

”تو تو جانتا ہے یار میرے اور نیلم کے معاملے کے بارے میں... میں کتنی بار اس کے گھر رشتہ بھجوا چکا ہوں۔ ہر بار اُدھر سے انکار ہو جاتا ہے۔ میری نیلم سے بات ہوئی تو اس نے کہا تم یہ ڈرائیوری کا کام چھوڑ کر کوئی دوسرا عزت والا کام کر لو تو میں اپنے گھر والوں کو منانے کی کوشش کروں گی۔ اب عزت والے کام کے لیے آدمی کے پاس یا تو تعلیم ہو یا پیسا۔ وقت پر تعلیم حاصل کی ہوتی تو یہ ڈرائیوری کا کام ہی کیوں کرنا پڑتا اور پیسا ہماری سات نسلوں میں سے بھی کسی کے پاس نہیں رہا تو میرے پاس کہاں سے آتا؟ لیکن میں نیلم کو بھی نہیں کھو سکتا تھا۔ میرے ذہن نے مجھے راستہ دکھایا کہ کہیں سے اتنا پیسا حاصل کر لوں کہ اپنا کوئی ذاتی کاروبار کر سکوں۔ موتی والا صاحب کے ہاں ملازمت کرتے ہوئے مجھے چار پانچ سال ہو چکے ہیں۔ مجھے ان کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم ہے۔ گھر میں حفاظت کا کیا انتظام ہے اور روپیا، زیور وغیرہ کہاں رکھا جاتا ہے۔ سب کچھ علم تھا بس پھر میں نے منصوبہ بنایا کہ ان کی تجوری میں نقب لگائی جائے۔ شاکر اور اس کی بیوی کے چھٹی پر جانے سے مجھے اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں اور بھی سہولت ہو گئی۔ اپنے طے کردہ منصوبے کے مطابق اس روز میں ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد کوٹھی سے روانہ ہونے کے بجائے شاکر کے کوارٹر میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں نے ایک زمانے میں اپنے ایک بدمعاش ٹائپ کے دوست سے تار کی مدد سے تالا وغیرہ کھولنا سیکھ لیا تھا۔ اس فن نے میری مدد کی۔ میں شاکر کے کوارٹر کا تالا کھول کر آرام سے اندر چلا گیا۔ مجھے امید تھی کہ اسی فن کے سہارے میں کوٹھی کے اندرونی حصے میں بھی گھس جاؤں گا اور تجوری بھی کھول لوں گا۔ تجوری سے نکالا ہوا مال میں شاکر کے کوارٹر میں کہیں چھپا دیتا اور بعد میں مناسب وقت پر نکال لیتا۔ سیٹھ صاحب اور ان کی بیگم کو واردات سے پہلے بے ہوش کرنے کے لیے میں نے بے ہوشی کی دوا ایک اسپرے گن میں بھر لی تھی۔ چوری کے بعد میں رات کا باقی حصہ آرام سے شاکر کے کوارٹر میں چھپ کر گزارتا اور صبح معمول کے مطابق ڈیوٹی پر حاضر ہو جاتا۔ گیٹ پر ڈیوٹی دینے والا چوکیدار زیادہ مستعد نہیں تھا اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ میرے رات کو کوٹھی سے نہ جانے اور

صبح اندر ہی نظر آنے پر کوئی نوٹس نہیں لے گا بلکہ اسے یہی خیال گزرے گا کہ میری آمد ورفت ان اوقات میں ہوئی ہے جب وہ گیٹ سے غائب تھا۔ میں اپنی طرف سے اپنے اس منصوبے کو بالکل مکمل سمجھ رہا تھا۔ پہلے مرحلے کی کامیابی نے میرے اس یقین کو اور مضبوط کر دیا تھا لیکن پھر سب کچھ الٹ ہوتا چلا گیا۔ میں آدھی رات کے بعد جب شاکر کے کوارٹر سے نکلا تو عین اسی وقت کسی نے باہر سے گوشت کے ٹکڑے کوٹھی کے لان میں اچھال دیے۔ کتے جو آہٹ پر چونک گئے تھے، وہ گوشت کے ٹکڑوں کی طرف لپکے اور بے تابی سے اسے اپنے دانتوں سے نوچنے لگے۔ میرے لیے یہ منظر حیرت انگیز تھا کیونکہ میری معلومات کے مطابق کتے تربیت یافتہ تھے اور مخصوص خوراک کے علاوہ کچھ بھی نہیں کھاتے تھے مگر باہر سے پھینکے جانے والے گوشت کے لیے ان کی بے تابی دیدنی تھی۔ شاید اس گوشت میں کوئی ایسی خوشبو شامل کی گئی تھی جو کتوں کو مرغوب تھی۔ بے چارے کتے اس گوشت کا ذرا سا حصہ کھا کر ہی گر پڑے۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ باہر سے کوئی کوٹھی میں نقب لگانے کی کوشش کر رہا ہے اور اس نے سب سے پہلے نگرانی پر مامور کتوں کا بندوبست کیا ہے۔ نقب تو میں بھی لگانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن کتے مجھ سے مانوس تھے اس لیے مجھے ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کتوں کے مرتے ہی میں کوٹھی کے گیٹ کی طرف بھاگا۔ چوکیدار حسب معمول گیٹ سے غائب تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک نقاب پوش گیٹ پھلانگ کر اندر آیا اور اس نے ذیلی گیٹ کھول دیا۔ مزید تین اور نقاب پوش اندر گھس آئے۔ ان میں سے دو چوکیدار کے کیبن کی طرف چلے گئے اور ایک نے کوٹھی کی مرکزی عمارت کے دروازے پر قسمت آزمائی شروع کر دی۔ وہ یقیناً میرے والے فن میں ماہر تھا۔ جب تک اس نے لاک کھولا، چوکیدار کے کیبن میں جانے والے باہر نکل آئے۔ انہوں نے کتوں کی طرح اس کے بھی خاموش رہنے کا بندوبست کر دیا تھا۔ اب چونکہ انہیں اطمینان تھا کہ وہاں انہیں دیکھنے والا یا ان کے کام میں رکاوٹ ڈالنے والا کوئی شخص باقی نہیں بچا ہے، اس لیے وہ چاروں کے چاروں اندر چلے گئے۔ مجھے جانے کیا ہوا کہ اس وقت ہی کوٹھی سے بھاگ جانے کے بجائے عقبی حصے کی طرف چلا گیا۔ صاحب کے بیڈروم کی کھڑکی عقبی لان میں کھلتی ہے، اس بات کا مجھے علم تھا۔ میں نے کھڑکی سے ان کے بیڈروم میں جھانکا۔ کوٹھی میں گھسنے والے بھی اس وقت وہاں پہنچ چکے تھے۔ میری نظروں کے سامنے دو افراد اپنے چاقو کھول کر بیڈ کی طرف لپکے۔ میں جس رخ سے دیکھ رہا تھا وہاں سے بیڈ پر سوئے ہوئے لوگ مجھے نظر نہیں آرہے تھے لیکن چاقو کے وار سے اچھل کر نکلنے والا خون میں نے صاف دیکھا۔ ساتھ ہی مجھے اندر سے چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ قتل کی اس واردات کو دیکھ کر میں گھبرا گیا اور خود پر قابو پانے کے لیے کھڑکی سے ہٹ کر ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت میں نے کسی کو وہاں آتے دیکھا۔ پہلے میں ڈرا کہ شاید یہ کوٹھی میں گھسنے والوں کا کوئی ساتھی ہے لیکن پھر مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ سیاہ شال میں لپٹی وہ ایک لڑکی ہے۔ لڑکی نے بھی میری طرح ہی کھڑکی کے شیشے سے جھانک کر اندر کا جائزہ لیا۔ اس دوران میں پہچان چکا تھا کہ یہ موتی والا صاحب کی مہمان لڑکی ہے۔ یہ جب کھڑکی سے ہٹی تو اس کے چہرے پر اتنا خوف تھا کہ مجھے لگا کہ یہ خوف سے چیخیں مارنے لگے گی اور ظاہر ہے چیخوں کی یہ آواز اندر بھی جاتی اسی لیے میں نے اس کی حفاظت کے خیال سے پیچھے سے جا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے بعد ہم دونوں کوٹھی سے نکل بھاگے۔ میں جب اسے اپنے ساتھ کوٹھی سے لا رہا تھا، تب بھی مجھے احساس تھا کہ میں اپنے آپ کو مشکل میں ڈال رہا ہوں لیکن ایک لڑکی کو اتنے بڑے خطرے میں گھرا چھوڑ کر فرار ہو جانا میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا۔ شاید تم دونوں سوچو کہ اپنے مالک کے گھر میں نقب لگانے کا ارادہ رکھنے والا شخص بھلا کہاں کا باضمیر ہے۔ لیکن سچ یہی ہے کہ میری اس نمک حرامی کے ارادے کے پیچھے میری بے ضمیری سے زیادہ میری مجبوری تھی۔ میں نیلم کے لیے دیوانہ ہوں اور اسے پانے کی جو راہ مجھے سجھائی دی، میں اس پر چل پڑا۔“ سرمد نے ایک ہی سانس میں سارا قصہ سنانے کے ساتھ ساتھ اپنی بے بسی کا بھی اعتراف کیا۔

”حماقتیں تو تم نے بہت کی ہیں لیکن یہ وقت ان حماقتوں پر تمہیں برا بھلا کہنے کا نہیں ہے۔ اب اصل بات جو ہمیں سوچنی ہے وہ یہ کہ ہم ان محترمہ کے سلسلے میں کیا کریں۔ ظاہر ہے پولیس کے لیے ان کا غائب ہونا ایک معما ہوگا اور اس معمے کے حل کے لیے وہ اِدھر اُدھر ہاتھ پیر ماریں گے۔ ایسی صورت میں تیرے ساتھ ساتھ میرے پھنسنے کا بھی امکان ہے۔“ عامر نے سرمد کو احساس دلایا۔

”میں سمجھتا ہوں یار لیکن اب جو کچھ ہوگا، اس لڑکی کے مشورے کے بعد ہی ہوگا کیونکہ مجھے تو نہیں معلوم کہ یہ کون ہے اور صاحب نے کیوں اسے اپنی کوٹھی میں رکھا ہوا تھا؟“

”آپ نے سرمد کی بات سن لی محترمہ! اب آپ ہمیں اپنے بارے میں بتائیے تاکہ ہم کوئی فیصلہ کر سکیں۔“ عامر نے

www.pkdigest.com

ماہ بانو کی طرف رخ کیا۔ وہ اس ساری گفتگو کے دوران خاموش بیٹھی اپنی انگلیاں مروڑتی رہی تھی۔ خود کو مخاطب کیے جانے پر اس نے بہ مشکل اپنے لب کھولے اور کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

"موتی والا صاحب سے میری کوئی رشتے داری یا ذاتی جان پہچان نہیں تھی۔ وہ صرف کسی کے کہنے پر میری مدد کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی کوٹھی میں پناہ دے رکھی تھی۔ مجھے پوری طرح یقین نہیں لیکن تھوڑا سا شک ضرور ہے کہ موتی والا صاحب کی کوٹھی میں گھسنے والے لوگ میری ہی تلاش میں آئے تھے لیکن وقتی طور پر لالچ کا شکار ہو کر لوٹ مار میں الجھ گئے اور مجھے سرمد کی مدد سے وہاں سے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اگر یہ مجھے یہاں نہ لاتے تو کوٹھی سے نکل جانے کے باوجود میں بڑی مشکل میں پڑ جاتی۔ اکیلی لڑکی کے لیے یوں بھی خود کو محفوظ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے اور میرے ساتھ تو یہ بھی مسئلہ ہے کہ میرے دشمن مسلسل میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ آپ لوگوں سے میری یہ گزارش ہے کہ آپ اس وقت تک مجھے پناہ دے دیں جب تک میں اپنے ہمدردوں سے رابطہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتی۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ مجھے مشکل میں دیکھیں گے تو ضرور میری مدد کریں گے۔ ان کے اثر رسوخ کی وجہ سے پولیس بھی آپ لوگوں پر کوئی الزام عائد کرنے سے گریز کرے گی۔ بس میرا ایک بار ان سے رابطہ ہو جائے۔"

"اگر تمہارے وہ ہمدرد اتنے ہی اثر رسوخ والے ہیں تو چلو ابھی پولیس اسٹیشن چلتے ہیں۔ پولیس خود ہی تمہارا ان سے رابطہ کروا دے گی۔" عامر چٹکی بجاتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"نہیں... میں پولیس اسٹیشن نہیں جاؤں گی۔ مجھے پولیس والوں پر اعتبار نہیں ہے۔" وہ فوراً ہی بدکی۔

"تو تم ہمیں اپنے اس ہمدرد کا نام اور فون نمبر وغیرہ بتا دو تاکہ ہم ان سے رابطہ کر کے تم سے اپنی جان چھڑا لیں۔" سرمد کچھ چڑا ہوا تھا۔ ایک تو اسے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تھی، دوسرے وہ ایک مصیبت بھی خود ہی اپنے گلے سے باندھ کر لے آیا تھا۔

"ان کا نام شہر یار ہے۔ اسسٹنٹ کمشنر شہر یار... لیکن میرے پاس ان کا فون نمبر نہیں ہے۔ فون نمبر کے لیے آپ ایک دارالامان کی منتظمہ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو دارالامان کا پتا سمجھا دیتی ہوں۔" وہ ان دونوں کو پتا سمجھانے لگی۔ اگر وہ دونوں پڑھے لکھے ہوتے تو دارالامان کی منتظمہ سے فون نمبر حاصل کرنے کے مشورے پر عمل کرنے کے بجائے سیدھے سیدھے شہر یار کے انڈر میں موجود ضلعے کا نام پوچھ کر ڈائریکٹری سے اس کے دفتر کا فون نمبر حاصل کر سکتے تھے۔ خود ماہ بانو کا دماغ بھی ان حالات میں درست سمت میں سوچنے سے معذور تھا۔

☆☆☆

ماسٹر آفتاب بڑے اشتیاق سے مزدوروں کو دیوار کھڑی کرتا دیکھ رہا تھا۔ دیوار میں چنی جانے والی ایک ایک اینٹ اسے خوشی فراہم کر رہی تھی کیونکہ ہر چنی جانے والی اینٹ کے ساتھ وہ اپنے خواب کو تعبیر کے مرحلے سے گزرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ شہر یار نے اس کے اسکول کی توسیع کا جو وعدہ کیا تھا، اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا تھا۔ خلاف توقع ابھی تک چودھری افتخار کی طرف سے اس کام میں کوئی روڑا نہیں اٹکایا گیا تھا اور اسکول کے لیے کمروں کی تعمیر کا کام سکون سے جاری تھا۔ دوسری طرف موبائل کمپنی والے بھی اپنا کام شروع کر چکے تھے۔ اسے موبائل کمپنی کے ٹاور کی تعمیر پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس علاقے میں موبائل سروس شروع ہو جاتی تو اسے کافی سہولت ہو جاتی۔ ابھی تو لاہور رابطے کے لیے ڈاک خانے تک جانا پڑتا تھا۔ موبائل کام کرنے لگتا تو یہ مسئلہ حل ہو جاتا۔

"سلام ماسٹر صاحب!" وہ اپنے خیالوں میں گم تعمیر کے کام پر نظر جمائے کھڑا تھا کہ عقب سے سنائی دینے والی نسوانی آواز نے چونک کر پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو رانی؟" سلام کا جواب دینے کے ساتھ اس نے رانی کا حال بھی پوچھا۔ رانی کا چھوٹا بھائی اسکول میں زیر تعلیم تھا اور وہ اس کی شکایتیں کرنے اکثر اسکول آتی رہتی تھی اس لیے وہ اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔

"رب کا شکر ہے۔ آپ اپنا حال بتائیں؟ آج کل تو بڑے خوش ہوں گے۔ آپ کا اسکول جو ترقی کر رہا ہے۔"

"ہاں بھائی، میں تو سچ مچ بڑا خوش ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"اللہ سائیں آپ کو سدا خوش رکھے۔ ہمارے پنڈ کے بچے پڑھ لکھ کر ترقی کر گئے تو اس میں سارا ہاتھ آپ کا ہو گا۔ کاش! میرے ویلے میں بھی کوئی آپ جیسا استاد ہوتا۔ مجھے بڑا شوق تھا جی پڑھنے کا لیکن دو چار جماعتوں سے آگے پڑھ ہی نہیں سکی۔" رانی نے کچھ اداسی سے بتایا۔

"تو کیا ہوا، اب پڑھ لینا۔ میں تمہاری مدد کر دوں گا۔" اس نے پیشکش کی۔

"سچ ماسٹر صاحب!" وہ خوش ہوئی لیکن پھر اداسی سے بولی۔ "مجھے بھلا کون اسکول آ کر آپ سے پڑھنے دے گا؟"

"آدمی ہمت کرے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ میں بھی تو کتنے عرصے سے کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح اسکول کی عمارت میں توسیع ہو جائے لیکن کہیں میری شنوائی ہی نہیں ہوتی تھی... پر اب دیکھو! میں نے ہمت نہیں ہاری اور کوشش جاری رکھی تو کام شروع ہو ہی گیا نا! میرا دوسرا منصوبہ یہ ہے کہ دوپہر کو اسکول کی چھٹی کے بعد یہاں پر دستکاری کا کام شروع کر دیا جائے۔ پنڈ کی عورتیں اتنی ہنرمند ہیں ہم ان سے کپڑوں پر کڑھائیاں وغیرہ کروا کر لاہور اور دوسرے بڑے شہروں میں لے جا کر بیچیں گے تو اچھی خاصی آمدنی ہو جائے گی۔ تم تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب کرنا تو جانتی ہی ہو۔ میں ایسا کروں گا کہ اس کام کے لیے تمہیں انچارج بنا دوں گا۔ تم کام کرنے والی عورتوں کی نگرانی بھی کرتی رہنا اور ساتھ میں اپنی پڑھائی بھی شروع کر دینا۔ میں تو رہتا ہی یہیں ہوں، تم جب چاہو گی آسانی سے میری مدد لے سکو گی۔"

"تہاڈی وڈی مہربانی ماسٹر صاحب! میرا پڑھنے لکھنے کا خواب پورا ہو گیا تو میں آپ کو بڑی دعائیں دوں گی بلکہ آپ کی غلام بن جاؤں گی۔" اس کی تجویز سن کر وہ بے حد جذباتی ہو گئی تھی۔

"غلام ولام بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس جب تم پڑھ لکھ جانا تو گاؤں کی دوسری لڑکیوں کو بھی پڑھانا۔"

"بالکل جی! میں تو بڑے شوق سے یہ کام کروں گی۔" اس نے فوراً وعدہ کیا پھر اچانک کچھ یاد آ جانے پر ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ "میں بھی بس ایویں ہوں جی! جس کام سے آئی تھی، وہ تو بھول ہی گئی اور دوسری باتیں لے کر بیٹھ گئی۔"

"کس کام سے آئی تھیں؟ کیا تمہارے بھائی نے پھر تمہیں ستانا شروع کر دیا ہے اور گھر پر پڑھنے نہیں بیٹھتا۔ لیکن ایک بات میں تمہیں بتا دوں، تمہارا بھائی بڑا ذہین بچہ ہے اور اسکول میں خوب دل لگا کر پڑھتا ہے۔" اپنے سابقہ تجربے کی روشنی میں رانی کی آمد کے مقصد کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

"مجھے معلوم ہے جی کہ میرا بھرا بڑا چنگا اور بیبا بچہ ہے۔ وہ تو بس میں اس پر رعب شوب رکھنے کے لیے آپ کے پاس اس کی شکایتیں لے کر آ جاتی ہوں، پر اس وقت میں اپنے کام سے نہیں آئی، مجھے کشور بی بی نے بھیجا ہے۔" یہ بات بتاتے ہوئے رانی کی آواز بہت مدھم ہو گئی تھی۔

"کیوں؟" وہ بری طرح چونکا۔

"انہوں نے آپ کے لیے یہ بھجوایا ہے؟" رانی نے اوڑھنی میں چھپا اپنا ہاتھ باہر نکال کر ایک ہلکے نیلے رنگ کا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ وہ لفافہ تھام کر کچھ دیر گم صم سی کیفیت میں کھڑا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

"اپنی بی بی کو سمجھاؤ رانی کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح تو وہ اپنے لیے بھی مصیبت مول لیں گی اور میرا بھی راستہ کھوٹا ہو گا۔ میری زندگی کا مقصد کچھ اور ہے اور میں ان سارے جھمیلوں میں نہیں پھنسنا چاہتا۔"

"میں بی بی کو سمجھانے کی کوشش کروں گی تو یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہو گی ماسٹر صاحب! ویسے بھی ان معاملات میں کوئی کسی کے سمجھانے سے نہیں سمجھتا اور بی بی کو تو میں نے اتنے عرصے میں پہلی بار کسی میں دلچسپی لیتے دیکھا ہے۔ وہ بہت اچھی ہیں، ان کا دل دکھے گا تو مجھے بڑا دکھ ہو گا۔" رانی دبے لفظوں میں کشور کی وکالت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اچھے لوگوں کو تو دوسروں کی اور بھی فکر ہونی چاہیے۔ اگر چودھری صاحب کو اس معاملے کی ذرا بھی بھنک مل گئی تو وہ مجھ پر یہاں کی زمین تنگ کر دیں گے۔ میں یہاں رہ کر لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں، ان کے کام آنا چاہتا ہوں۔ تم اپنی بی بی سے کہو کہ وہ میرے اس کام میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔" اس نے ہاتھ میں تھاما لفافہ جوں کا توں رانی کو لوٹا دیا اور رخ موڑ کر دوبارہ مزدوروں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سب اپنے کام میں منہمک تھے اور ان دونوں کی طرف ان کی توجہ نہیں تھی۔ رانی اس کا انداز دیکھ کر واپس پلٹ گئی، پر کچھ فاصلے پر سے آتی شادو اور نسرین کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹکی۔

"خیر تو ہے رانی! اس وقت یہاں کیا کر رہی تھی تو؟" نسرین عرف نچھی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"ماسٹر صاحب سے منے کی شکایت کرنے آئی تھی۔" اس نے بہانہ بنایا۔

"اچھا... ہمیں ایسا لگا کہ ماسٹر صاحب تمہیں کچھ دے رہے ہیں۔" شادو مکاری سے بولی۔

"تو اپنی آنکھوں کا علاج کروا۔ ہر وقت غلط سلط دیکھتی رہتی ہے۔" رانی اندر سے گھبرائی لیکن اس گھبراہٹ کو ظاہر کیے بغیر تڑاخ سے جواب دے کر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ نچھی اور شادو جیسی لگائی لتری اور بڑکا کو اپنانے والی لڑکیوں سے تو وہ یوں بھی ہمیشہ فاصلے پر ہی رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس وقت تو پھر معاملہ بھی کشور بی بی کا تھا جس کی اگر کسی کو کانوں کان بھی خبر ہو جاتی تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔

☆☆☆

کوریئر آفس سے باہر نکلنے کے بعد اس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ ماہ بانو کا دارالامان میں رہ جانے والا بیگ اس کے لیے ایک بوجھ بن گیا تھا۔ وہ ایک ایمان دار عورت تھی اس لیے اپنے ہر فرض کو پوری ایمان داری اور دیانت سے انجام دینے کی کوشش کرتی تھی۔ ماہ بانو کا بیگ اس کے لیے ایک امانت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس امانت کے بوجھ کو اپنے سر سے اتارنے کے لیے اس نے بیگ عبدالمنان کے نام سے کوریئر کر دیا تھا۔ ویسے بھی اس رات دارالامان میں پیش آنے والے واقعے کے بعد وہ کچھ خوف زدہ سی ہو گئی تھی۔ ماہ بانو کے دارالامان سے چلے جانے کے بعد بھی اس کے لیے فون آتے رہے تھے۔ اسے فون پر دھمکیاں بھی دی گئی تھیں کہ اگر وہ ماہ بانو کے بارے میں کچھ جانتی ہے تو شرافت سے بتا دے ورنہ اس کا بہت برا انجام ہو گا۔ ان دھمکیوں سے ڈر کر اس نے کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ آج ہی اس کی ڈیڑھ ماہ کی رخصت منظور ہوئی تھی اور وہ یہ ڈیڑھ ماہ راولپنڈی میں اپنی بہن کے گھر گزارنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ روانگی سے قبل اس نے ماہ بانو کی امانت کو مناسب جگہ بھجوا دینا ضروری سمجھا تھا۔ بیگ کو کوریئر کرنے کا بندوبست کر کے وہ خاصی مطمئن ہو گئی تھی اور اب اطمینان سے چلتی قریبی مارکیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ پنڈی جانے سے قبل وہ بہن اور اس کے بچوں کے لیے کچھ خریداری کرنا چاہتی تھی۔ خود اس کی اپنی شادی تو ہوئی نہیں تھی اور اس نے اپنی زندگی کے اتنے سال دارالامان کی منتظمہ کے فرائض انجام دیتے ہوئے گزار دیے تھے۔ ان فرائض کو انجام دیتے ہوئے آج وہ اس مقام پر پہنچ گئی تھی کہ اس کی اپنی ذات کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے اس نے اپنے طور پر ایک منصوبہ بندی کر لی تھی اور اب کچھ مطمئن سی خراماں خراماں بازار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کوریئر آفس سے کافی آگے نکلنے کے بعد وہ ایک موڑ پر پہنچی تو ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ اس نے خود بھی اس آدمی کا ٹھٹکنا محسوس کر لیا اور کچھ خوف زدہ سی ہو کر تیز تیز چلنے لگی۔ خوف زدہ ہونے کی وجہ صرف اس آدمی کا ٹھٹکنا نہیں تھا بلکہ وہ اس آدمی کی چھوٹی چھوٹی سرد اور چمکیلی آنکھیں دیکھ کر بھی ڈر گئی تھی۔ یہ آنکھیں اس کے لیے آشنا تھیں اور پچھلے کئی دن سے اس کے دماغ میں چپکی ہوئی تھیں۔ ماہ بانو کو اغوا کرنے کے لیے آنے والے ڈھاٹا پوشوں کے لیڈر کی آنکھیں بھی ایسی ہی تھیں۔ اب جانے یہ وہی شخص تھا یا نہیں لیکن وہ خوف زدہ ہو چکی تھی اور تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔

"اے رکو۔" اسے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی یہ پکار بھی۔ وہ رکنے کے بجائے تیز تیز دوڑنے لگی۔

"رک جا سالی! ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔" وہ پیچھے سے دہاڑا لیکن وہ رکے بغیر دوڑتی چلی گئی۔ وہ کوئی نوعمر لڑکی نہیں تھی، اچھی خاصی ادھیڑ عمر کی عورت تھی لیکن ساری زندگی ملازمت کرنے اور خود کو مصروف رکھنے کی وجہ سے کافی ایکٹو تھی اس لیے اپنی عمر کی دیگر عورتوں کے برخلاف کافی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ کچھ خود کو خطرے سے محفوظ رکھنے کی جبلی خواہش نے بھی اسے مہمیز کر دیا تھا۔ بغیر ہیل کے سپاٹ تلوے والے جوتے بھی اس وقت اس کے لیے کافی معاون ثابت ہو رہے تھے۔ وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی ایک گلی پار کر کے دوسری گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کے تعاقب میں آنے والا شخص بھی مسلسل پیچھے تھا۔ دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے گلیوں میں سناٹا تھا اور کوئی چوہے بلی کی اس دوڑ کو دیکھنے والا نہیں تھا۔ وہ پھولتی سانسوں کے ساتھ دوڑتی اس کوشش میں تھی کہ جلد از جلد یہ گلی پار کر لے۔ اسے علم تھا کہ اس گلی کے اختتام پر مین روڈ موجود ہے۔ وہ ایک بار مین روڈ پر پہنچ جاتی تو وہاں سے کوئی سواری حاصل کر سکتی تھی۔ دوسری امید اسے یہ بھی تھی کہ رش والی جگہ پر پہنچ کر یہ شخص کھلے عام اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکے گا مگر تعاقب کرنے والا بھی شاید یہ سب باتیں جانتا تھا۔ ابھی وہ گلی کے سرے پر پہنچی ہی تھی کہ پیچھے سے کوئی سنسناتی ہوئی چیز آئی اور اس کی بائیں ٹانگ میں کھب گئی۔ تکلیف کی شدت سے اس کے حلق سے ایک بے اختیاری چیخ نکلی اور اسے لگا کہ وہ ابھی گر جائے گی لیکن گر جانے میں موت تھی۔ اس نے ایک نظر اپنی ٹانگ کی طرف دیکھا۔ اس میں ایک لمبے پھل والا چاقو گڑا ہوا تھا اور زخم سے خون نکلنے لگا تھا۔ اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے اس نے رکے بغیر گلی کا اختتام کر دینے والا چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کا فیصلہ کیا اور زخم کی کھولتی ہوئی تکلیف کے ساتھ بھاگتی ہوئی گلی سے باہر نکل گئی۔ تعاقب میں آنے والا جو اس دوران بے حد قریب پہنچ گیا تھا، اس کی اس جرأت مندی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ دوسرے وہ جانتا تھا کہ اس گلی سے باہر نکلنے کے بعد سڑک کے کنارے کئی موٹر مکینکس کی دکانیں ہیں۔ اگر وہ لوگ اسے ایک زخمی عورت کے پیچھے آتا دیکھتے تو شاید اسے پکڑنے کی کوشش کرتے اور اس وقت اس کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے کوئی ہتھیار بھی موجود نہیں تھا۔ وہ آگے

جانے یا نہ جانے کی کشمکش میں وہیں ٹھٹک کر رکا رہا لیکن وہ اس کے رکنے کو محسوس نہیں کر سکی اور اندھا دھند بھاگتی چلی گئی۔ خوف اور وحشت نے اس کے حواس کو اتنا مختل کر دیا تھا کہ اسے یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ وہ گلی پار کرنے کے بعد مین روڈ پر آ چکی ہے اور اب اسے اپنے قدم روک دینے چاہئیں۔ وہ اسی طرح دوڑتی رہی لیکن یہ دوڑ چند قدم سے زیادہ نہیں تھی۔ سڑک پر دائیں جانب سے آنے والی ٹیکسی کے ڈرائیور کی تمام تر کوشش کے باوجود وہ اس کی ٹیکسی کی زد میں آ کر بری طرح اچھلی اور پھر سڑک پر لڑھکتی چلی گئی۔ ٹیکسی کے ساتھ ہی ایک دیوقامت ٹرک بھی پوری رفتار سے چلا آ رہا تھا جو سڑک پر لڑھکتے اس کے جسم کو کچلتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں نے بریکیں لگانا شروع کر دیں اور دکانوں سے ملنگس بھی نکل کر سڑک کی طرف دوڑنے لگے۔ وہ جو ابھی تک گلی کے سرے پر کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا، کسی کے اپنی طرف متوجہ ہونے سے پہلے پلٹا اور تیزی سے بھاگتا ہوا اس جگہ سے دور ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

"ہاں بھئی بالے! کیا خبر ہے؟ اتنے دنوں سے تو یہاں پڑا اینڈ رہا ہے، ایک موتی والا کو ٹھکانے لگانے کے سوا تو نے کوئی بھی ڈھنگ کا کام نہیں کیا اور اس کام میں بھی تو نے لاکھوں کمائے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس لوٹ مار میں ہی تجھے اس بات کی خبر نہیں ہو سکی کہ کوٹھی میں کوئی مہمان لڑکی بھی ٹھہری ہوئی ہے۔ تو نے بس ان دونوں میاں بیوی کا گلا کاٹا اور مال سمیٹ کر واپس ہو لیا۔" چودھری افتخار آج کل اپنی لاہور والی کوٹھی میں ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ موتی والا سے اپنی دوستی کا ثبوت دینے کے لیے وہ ہر روز اس کی کوٹھی پر جا کر کچھ وقت اس کے عزیزوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ پولیس افسران سے بھی اس نے موتی والا کے قاتلوں کو پکڑنے کا پُرزور مطالبہ کیا تھا۔ اپنے اس آنے جانے اور مسلسل ملاقاتوں میں اسے کوٹھی میں مقیم مہمان لڑکی اور اس کے پُراسرار غیاب کی خبر ہو گئی تھی۔ ملازموں سے پوچھ تاچھ کے نتیجے میں لڑکی کا حلیہ بھی معلوم ہو گیا تھا اور یہ حلیہ ماہ بانو سے بہت مشابہ تھا۔ خصوصاً نچلے ہونٹ کے قریب پائے جانے والے تل کی نشان دہی نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ مہمان لڑکی ماہ بانو ہی تھی۔ اسے موتی والا پر اور بھی شدت سے غصہ آیا تھا۔ وہ شخص اس سے پوری طرح دشمنی نبھاتا رہا تھا مگر اس مزید غصے کے اظہار کے لیے اسے موتی والا دستیاب نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بار پھر بالے کی جان کھانا شروع کر دی تھی کہ وہ ماہ بانو کی تلاش کے سلسلے میں سرگرمی دکھائے اور اب بالا اس حکم کی تعمیل میں کی گئی اپنی کارروائی کی رپورٹ پیش کرنے کے لیے اس کی خدمت میں حاضر تھا۔

لیکن پہلے خود پر عائد کردہ الزامات کی تردید کرنا ضروری تھا اس لیے وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "قسم لے لیں سرکار! میں نے یا میرے آدمیوں نے کوئی بے پروائی نہیں کی۔ پیسا ہمیں آپ سے بھی بہت ملتا ہے۔ پیسے کے چکر میں ہم اپنے فرض کو بھول جاتے، ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہم نے موتی والا کی تجوری خالی کرنے سے پہلے پوری کوٹھی کا چکر لگایا تھا۔ اگر وہاں کوئی لڑکی ہوتی تو ہمیں ضرور ملتی۔ میرے خیال میں تو وہ کڑی رات ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی کہیں چلی گئی تھی۔ اگر وہ بعد میں بھاگتی تو اس کا کوئی سامان وغیرہ تو پولیس کو ملتا لیکن ایجنسی میں سے پولیس والوں کو جو ایک دو جوڑے کپڑے ملے، وہ بھی موتی والا کی بیوی کے تھے۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا نہ کہ کڑی پہلے ہی اپنے سامان سمیت وہاں سے جا چکی تھی۔" وہ جانتا تھا کہ چودھری کے پاس اس کا جھوٹ پکڑنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اس لیے آرام سے دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا، ورنہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے تو کوٹھی کی قیمتی چیزیں سمیٹنے کے سوا وہاں کوئی اور کام نہیں کیا تھا۔

"چل میں نے مان لیا کہ تو سچ کہہ رہا ہے پر یہ بتا کہ تو نے اب کیا کارنامہ انجام دیا۔ کون کون سے ٹھکانے لڑکی کی تلاش میں؟" چودھری اس پر بگڑا۔

"وہی بتانے کے لیے آیا تھا سرکار! اتنے دنوں لاہور میں رہ کر میں نے ٹیم ضائع نہیں کیا ہے۔ میں مسلسل کڑی کو تلاش کرتا رہا ہوں۔ آخری بار اس کے تھانے میں رہنے کی خبر ملی تھی اس لیے میں تھانے کے عملے کے پیچھے لگا رہا کہ کسی طرح معلوم ہو جائے کہ اسے تھانے سے کس نے چھڑوا لیا پر نیچے والوں کو کوئی صحیح بات معلوم ہی نہیں تھی۔ بس یہی کہتے تھے کہ اوپر سے کہیں سے فون آیا تھا۔ میں نے سوچا ایس ایچ او ہی کھنگالا جائے۔ اس کی تھوڑی چھپنی ٹپنی لگائی اور کچھ مال پانی کا لالچ دیا تو اس نے اگلا کہ کڑی کو ڈی آئی جی سجاد رانا کے فون پر چھوڑا گیا تھا۔ اب ان کے بندوں نے کڑی کو کہاں پہنچایا، کوئی خبر نہیں۔ میں کوشش میں لگا رہا کہ کسی طرح ان بندوں کی کوئی خبر مل جائے تو آپ کو خوش خبری سناؤں لیکن کچھ معلوم ہی نہ چلا۔ پھر میں نے دارالامان کی منتظمہ سے پوچھ تاچھ کرنے کا سوچا۔ پہلے اسے فون پر ڈراتا رہا کہ اگر اسے کوئی خبر ہے تو بتا دے۔ ڈائریکٹ اس تک پہنچ کر کچھ معلوم کرنا اس لیے مشکل تھا کہ اغوا کی کوشش کے بعد

دارالامان کی نگرانی سخت کر دی گئی ہے۔ پولیس والے ابھی چکر لگا کر دیکھتے رہتے ہیں۔ آج اتفاق سے وہ عورت مجھے باہر نظر آ گئی۔ میں نے چاہا کہ اسے پکڑ لوں لیکن وہ بھاگ کھڑی ہوئی اور بھاگتے بھاگتے ایک گاڑی کے سامنے آ کر جان سے چلی گئی۔ مجھے لگتا ہے اسے ضرور کچھ نہ کچھ معلوم تھا اسی لیے وہ اتنا گھبرا گئی تھی۔"

"معاملہ کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ ہو نہ ہو، ماہ بانو کو گاؤں سے نکالنے میں اس اے سی کے بچے کا ہاتھ ہے۔ اپنے ماموں کی شہ پر بڑا اسمارٹ بنتا ہے وہ۔ سامنے سے مجھ سے دوستی جتا کر پیچھے سے سارے ایسے کام کرتا ہے جس سے مجھے پریشانی ہو۔ ماہ بانو کو اسی نے دارالامان بھجوایا ہوگا اور پھر تھانے سے چھڑوا کر موتی والا کے گھر رکھوانے میں بھی اس کا ہی ہاتھ ہوگا۔ آج کل بڑی گھٹ گئی تھی اس کی اور موتی والا کی۔ اسی کی مخبریوں پر تو وہ ہمارے مال کو پکڑنے کے چکر میں تھا۔ لیکن اب اسے معلوم ہو جائے گا کہ چودھری افتخار کو اس جیسا کل کا لونڈا چکر نہیں دے سکتا۔" سجاد رانا کا نام سامنے آتے ہی اس نے سارے حالات کا تجزیہ کر لیا تھا۔

"آپ کہیں تو ہم اس اے سی کو اٹھا لیں سرکار! آپ کے قدموں میں اس کا سر رکھ کر اس کی ایسی چھینٹی لگائیں گے کہ خود کڑی کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی ہامی بھر لے گا۔"

"بند کر اوئے اپنی یہ بھڑکیں۔ تیرے جیسے بے عقل آدمی کے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ شکل دیکھی ہے تو نے اپنی جو اسے اٹھا کر لانے کی باتیں کر رہا ہے۔ اس کے خاندان والوں کو جانتا ہوتا تو ایسی گل منہ سے نہ نکالتا۔ تو اسے اٹھائے گا اور وہ سارے قیامت اٹھا دیں گے۔ اس اے سی پر ہاتھ ڈالنے کے لیے تیرے جیسے اٹھائی گیرے کی نہیں، عقل کی ضرورت ہے۔ اب میں اپنی عقل سے ایسی ترکیب لڑاؤں گا کہ اس بلونگڑے کو ایک سبق تو مل ہی جائے گا۔" بالے کی بات پر اسے ڈپٹتے ہوئے چودھری نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ شہریار پہلے ہی اسکول کی تعمیر شروع کروانے اور سپلائی کو پکڑنے کی کوشش کرنے کی وجہ سے اس کی نظروں میں کھٹک رہا تھا۔ اب جو ماہ بانو والے معاملے کے ڈانڈے بھی اس سے ملتے نظر آئے تو وہ مزید بھڑک اٹھا لیکن اسے بھڑکنے میں بھی اس نے عقل کا دامن نہیں چھوڑا تھا اور براہ راست تصادم کے بجائے حکمت عملی سے کام لینے کی ٹھانی تھی۔

☆☆☆

"آج کا شیڈول کیا ہے عبدالمنان! آج ہمیں کس گاؤں کا وزٹ کرنا ہے؟"

"آج نور پور جانا ہے سر! وہاں کے زمیندار کی طرف سے درخواست ملی تھی کہ اس کے گاؤں میں بجلی کی فراہمی کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھایا جائے۔" شہریار کے سوال پر عبدالمنان نے اسے بتایا تو اسے یاد آ گیا کہ اس نے خود ہی یہ درخواست پڑھنے کے بعد نور پور کے دورے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس گاؤں جا کر وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ زمیندار سے مل کر اس کے مزاج کا بھی اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ تقرری کے ابتدائی دنوں میں اردگرد کے بہت سے دیہاتوں کے زمینداروں نے اس کے دفتر آ کر ملاقات کی تھی لیکن نور پور کا زمیندار ملاقات کے لیے نہیں آیا تھا۔

"اوکے! تم وہاں جانے کا انتظام کرواؤ۔ ویسے اندازاً ہمیں وہاں جا کر واپس آنے میں کتنا وقت لگ جائے گا؟"

"نور پور یہاں سے کافی فاصلے پر ہے اس لیے ٹائم تو اچھا خاصا لگے گا۔ ہم ابھی نکلیں گے تو سہ پہر کے بعد ہی کہیں جا کر واپسی ہوگی۔"

"نو پرابلم... جب جانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر چاہے کتنا ہی وقت صرف ہو، جانا ضرور ہے۔" اپنے سامنے رکھی فائل پر کوئی نوٹ لکھتے ہوئے اس نے فیصلہ سنایا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں موتی والا کے وکیل کو آج سہ پہر کے بعد ملاقات کا ٹائم دے دوں؟ صبح صبح اس کا فون آیا تھا کہ وہ موتی والا صاحب کی ول کے سلسلے میں آپ سے ملاقات کے لیے آنا چاہتا ہے۔" عبدالمنان نے پوچھا تو وہ چونک گیا۔ موتی والا کی ول کے سلسلے میں اس کے وکیل کا اس کے پاس آنا معنی خیز تھا۔

"بالکل ٹائم دے دو بلکہ ایسا کرنا کہ یہ ملاقات میرے بنگلے پر رکھنا۔ وہ وکیل اتنی دور سے یہاں تک آئے گا تو اس کی خاطر مدارات بھی تو ڈھنگ سے ہونی چاہیے۔" اجازت دینے کے ساتھ ساتھ اس نے ہدایت بھی جاری کی پھر لہجے کو سرسری سا بناتا ہوا پوچھنے لگا۔

"ماہ بانو کی کوئی خبر ملی؟"

"نو سر! انکوائری آفیسر رفیق کھوکھر سے میں مسلسل رابطے میں ہوں لیکن اس کے پاس ماہ بانو کے سلسلے میں کوئی خبر نہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر موتی والا کے قتل کے کیس میں چودھری افتخار انوالو ہے تو پھر اس بات کا بھی امکان ہے کہ ماہ بانو کو وہاں سے اس کے بندے اغوا کر کے لے گئے ہوں۔" شہریار کے سوال کا جواب دیتے ہوئے عبدالمنان نے خیال آرائی کی۔

"تو پھر کسی ذریعے سے چودھری کی طرف کی سن گن

www.pkdigest.com

لو۔ ہم اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر ایک مظلوم لڑکی کو برباد ہونے کے لیے اس کے رحم و کرم پر تو نہیں چھوڑ سکتے۔'' اس نے تیز لہجے میں حکم دیتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا قلم فائل پر پٹخا۔

''لیس سر! میں کچھ کرتا ہوں۔'' اس کا مزاج بگڑتا دیکھ کر عبدالمنان نے مستعدی سے یقین دلایا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ابھری اور ایک چپراسی اجازت لے کر اندر آیا۔

''یہ کوریئر والا دے کر گیا ہے جناب۔'' اس نے ایک بیگ اور لفافہ عبدالمنان کی طرف بڑھایا۔ بیگ کچھ شناسا سا تھا لیکن عبدالمنان اور شہریار دونوں ہی فوری طور پر اسے شناخت نہیں کر پائے۔ لفافے پر چونکہ عبدالمنان کا نام تھا اس لیے اس نے لفافہ کھول کر اس میں موجود کاغذ نکال لیا۔ یہ دارالامان کی منتظمہ کی طرف سے لکھا جانے والا ایک مختصر خط تھا جس میں اس نے اپنے دھمکیوں سے گھبرا کر چھٹی پر جانے کی اطلاع دینے کے ساتھ ماہ بانو کے بیگ کی بابت بھی لکھا تھا۔ خط پڑھنے کے بعد اس نے شہریار کی طرف بڑھا دیا۔ چپراسی اس دوران اس کے اشارے پر واپس جا چکا تھا۔

''تم دارالامان فون کرو، ممکن ہے ابھی منتظمہ چھٹی پر نہ گئی ہو۔ بیگ بھیجنے پر اس کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ دھمکی آمیز ٹیلی فون کالز کے بارے میں بھی تفصیلات معلوم کر لینا۔'' خط پڑھنے کے بعد اس نے حکم دیا تو عبدالمنان وہیں اس کی میز پر موجود فون سیٹ پر دارالامان کا نمبر ملانے لگا۔

تھوڑی دیر میں اس کا وہاں رابطہ ہو گیا۔ رابطے کے بعد اس نے مختصری گفتگو کی اور ریسیور واپس کریڈل پر ڈالتے ہوئے اداسی سے بولا۔ ''منتظمہ تو نہیں ملی۔ اس بے چاری کا کل دوپہر ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔''

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ وہ سارے لوگ جو ماہ نور کے ہمدرد ہیں، کسی نہ کسی طرح مارے جا رہے ہیں۔ پہلے حوراں اور صفدر، پھر مشابرم خان کا دوست، مولی والا اور ان کی مسز اور اب یہ دارالامان کی منتظمہ۔ اتنے سارے لوگوں کی ایک کے بعد ایک ہلاکت کو اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ تم تفصیلات معلوم کرواؤ کہ منتظمہ کا ایکسیڈنٹ کب اور کن حالات میں ہوا۔ مجھے لگتا ہے کہ ایکسیڈنٹ کے پیچھے بھی یقیناً کوئی نہ کوئی سازش ہو گی۔'' عبدالمنان کی دی اطلاع سن کر اس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اسے حکم دیا۔ عبدالمنان کو اس حکم پر ایک بار پھر فرماں برداری سے ''لیس سر'' ہی کہنا تھا، سو اس نے کہا۔ کچھ دیر بعد جب وہ لوگ حسب پروگرام نور پور کے لیے روانہ ہوئے تو ان کے ذہن میں نور پور کے دورے سے زیادہ ماہ بانو سے جڑے واقعات چکرا رہے تھے۔

☆☆☆

''شش شش۔'' ماہ بانو باورچی خانے سے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ عقب سے سنائی دینے والی اس آواز پر چونک کر پلٹی۔ اس کے پلٹتے ہی کاغذ کی ایک گولی اس کے شانے سے ٹکرائی اور فرش پر گر گئی۔ اس نے نیچے جھک کر کاغذ کی اس گولی کو اٹھایا اور آواز کی سمت دیکھا۔ پچھلی جانب واقع مکان کی چھت پر ایک لمبے بالوں والا لڑکا ہاتھ میں کبوتر لیے کھڑا تھا۔ اسے متوجہ ہوتا دیکھ کر اس نے لوفرانہ انداز میں اپنی بائیں آنکھ کو دبایا۔ وہ لڑکے کی اس حرکت پر جھینپ کر تیزی سے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ اندر عامر کی بیمار ماں چارپائی پر لیٹی سو رہی تھی۔ اس نے اپنی مٹھی میں دبی کاغذ کی گولی کو کھول کر اس پر ناپختہ لکھائی میں تحریر کردہ مضمون پڑھا۔ وہ عامیانہ الفاظ پر مشتمل ایک ایسا خط تھا جس کی پچھلی چھت پر موجود کبوتر باز سے امید کی جا سکتی تھی۔ اس نے خط کا مکمل مضمون پڑھے بغیر کاغذ کے کئی پرزے کیے اور کمرے کی کھڑکی کھول کر ان پرزوں کو باہر گلی میں پھینک دیا۔ گلی میں پہلے سے موجود ڈھیروں کوڑا کرکٹ میں کاغذ کے وہ چند پرزے فوراً ہی مدغم ہو گئے۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور اپنے حالات کے بارے میں سوچنے لگی۔ سرمد دارالامان گیا تھا لیکن وہاں سے منتظمہ کے مرنے کی خبر لے کر مایوس لوٹ آیا تھا۔ اس کے بعد یہی طے ہوا تھا کہ سرمد یا عامر میں سے کوئی ایک جا کر براہ راست شہریار سے ملاقات کر کے اسے ماہ بانو کے بارے میں اطلاع دے گا لیکن فوری طور پر دونوں میں سے کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ سرمد کو خدشہ تھا کہ پولیس والوں کی نظریں اس پر ہوں گی جبکہ عامر جس دفتر میں چپراسی کے فرائض انجام دیتا تھا، وہاں سے اسے آسانی سے چھٹی ملنا مشکل تھا۔ اس صورت حال میں وہ فی الحال یہاں رہنے پر مجبور تھی۔ عامر کی والدہ کی خدمت کر کے اسے دلی سکون ملتا تھا لیکن بے بے اور ابا کی یاد بھی بے طرح آتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح معاملات ایسا رخ اختیار کر لیں کہ وہ پہلے کی طرح پرسکون زندگی کا آغاز کر سکے لیکن حالات نے جس طرح اسے جکڑ لیا تھا، ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ فکر مستقبل میں غلطاں و پیچاں بیٹھے ابھی اسے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر زوردار دستک ابھری۔ دوپہر کے ان اوقات میں عموماً کوئی ہمسائی اماں کی خیر خیریت معلوم کرنے آ جاتی تھی۔ اس نے کمرے سے نکل کر بے دھڑک بیرونی دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک لڑکی تیزی سے اندر آئی اور خود ہی پلٹ کر دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''کیا ہوا بھئی... کون ہو تم اور اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟'' اس نے لڑکی سے دریافت کیا۔

''میں جمیلہ ہوں جی! اس پیچھے والے گھر میں رہتی ہوں۔ خالہ جی کی طبیعت پوچھنے آئی تھی۔'' لڑکی نے اس گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جہاں سے اس کبوتر باز لڑکے نے کچھ دیر قبل رقعہ پھینکا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کروایا اور اپنی اوڑھنی سے چہرے پر آیا پسینا پوچھنے لگی۔ اس کے چہرے پر موجود گھبراہٹ ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی۔ ماہ بانو نے بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ وہ تقریباً اسی جیسے قد و قامت کی اس کی ہم عمر لڑکی تھی لیکن اس میں نسوانی کشش برائے نام ہی تھی۔ چوڑے چوڑے ہاتھ کسی عورت کے بجائے مرد کے معلوم ہوتے تھے۔ بالائی ہونٹ سے اوپر اور ٹھوڑی اور رخساروں کی جلد پر کھردرے پن کا احساس ہوتا تھا۔ یہ کھردراپن چہرے پر جمائی گئی پاؤڈر کی تہ کے باوجود نمایاں تھا۔

''لے جائیں گے، لے جائیں گے دل والے دلہنیا لے جائیں گے۔ رہ جائیں رہ جائیں گے گھر والے دیکھتے رہ جائیں گے۔'' ابھی اس کا جائزہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ باہر سے تالیوں اور ڈھول کی تھاپ کے ساتھ بھونڈی آوازوں میں گانا گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس انداز میں گانا گانے والے کون لوگ ہوتے ہیں، وہ بہ خوبی جانتی تھی لیکن اسے حیرت تھی کہ وہ لوگ اس دروازے پر رک کر کیوں گا رہے ہیں۔ یہ کوئی خوشی کا گھر تو نہیں تھا جہاں پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے بدلے میں انہیں روپے پیسے سے نوازا جاتا۔

''اللہ کے نام پر دے دے۔'' گانے کی آواز کے درمیان ہی کسی نے دروازے پر دستک دے کر صدا لگائی۔

''دروازہ مت کھولنا۔'' جمیلہ نامی لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام کر خوف زدہ انداز میں اسے روکا۔

''تم اندر چل کر خالہ کے پاس بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اس سے کہا اور خود باورچی خانے میں چلی گئی۔ آٹے کے کنستر سے ایک پیالہ آٹا لے کر وہ واپس دروازے پر آئی تو دستک اور صداؤں کا سلسلہ جاری تھا، البتہ جمیلہ اندر کمرے میں جا چکی تھی۔ اس نے ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ زرق برق کپڑوں میں چہروں پر میک اپ کی موٹی موٹی تہ جمائے وہ تین ہیجڑے تھے جن کے اردگرد محلے کے بچے جمع ہو گئے تھے۔ کچھ عورتیں بھی دروازوں کی آڑ اور کھڑکیوں سے باہر جھانکتی تماشا دیکھ رہی تھیں۔

''یہ لے لو۔'' اس نے آٹے سے بھرا پیالہ آگے بڑھایا تو دستک دینے والا ہیجڑا ایدک کر پیچھے ہٹا۔

''مجھے نہیں چاہیے یہ پیالہ بھر آٹا۔''

''تو پھر کیا چاہیے؟ میرے پاس تو اس وقت دینے کے لیے بس یہی ہے۔'' اسے عجیب سی بے بسی کا احساس ہوا۔ خود اس کا سارا سامان تو دارالامان میں رہ گیا تھا۔ وہ کسی دوسرے کے گھر میں بیٹھ کر اس سے بڑھ کر کسی کی کیا مدد کر سکتی تھی۔

''تیرے پاس تو بڑا قیمتی ہیرا ہے، پر جانے دے... آج نہیں دیتی تو کوئی بات نہیں میں پھر آ کر لے جاؤں گی۔'' ہیجڑے نے جواب دیا اور پھر وہ تینوں گاتے بجاتے واپس پلٹ گئے۔ وہ ان کی بات کا مفہوم سمجھے بغیر الجھی ہوئی واپس اندر پلٹ گئی۔ کمرے میں جمیلہ اور عامر کی اماں باتیں کر رہی تھیں۔ شاید شور کی آواز سے ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔

''اچھا ہوا خالہ جی آپ اٹھ گئیں۔ میں کھانا لے کر آتی ہوں۔'' انہیں جاگتے دیکھ کر اس نے کہا اور پھرتی سے جا کر ایک ٹرے میں کھانے کے برتن اور دیگر چیزیں رکھ کر کمرے میں لے آئی۔ جمیلہ کو بھی ان لوگوں نے اصرار کر کے کھانے میں شامل کر لیا۔

''یہ جمیلہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ہر تیسرے چوتھے دن چکر لگا کر میرے کئی کام کر جاتی ہے۔'' کھانے کے دوران خالہ جی اس سے جمیلہ کی تعریفیں کرتی رہیں۔ کھانا کھا کر ان پر دوبارہ غنودگی طاری ہونے لگی تو وہ جمیلہ کو ساتھ لے کر بیٹھک میں آ گئی۔ جمیلہ کے سوالات کے جواب میں اس نے اپنے بارے میں وہی کچھ بتایا جو وہ لوگ پہلے سے طے کر چکے تھے۔ جمیلہ ہمدردی سے اس کی مظلومیت بھری داستان سنتی رہی۔ موقع دیکھ کر اس نے جمیلہ سے اس کبوتر باز لڑکے کی بھی شکایت کر دی جس پر اس نے یقین دلایا کہ وہ ابا سے شکایت کر کے اپنے بھائی کو سیدھا کروا دے گی۔ کھردری جلد اور مردانہ سی ساخت رکھنے والے ہاتھ پیروں کی مالکہ جمیلہ طبیعتاً بڑی ہمدرد اور معصوم لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

''ارے جمیلہ! یہ تو بتاؤ کہ تم جب آئی تھیں تو اتنی ڈری ہوئی کیوں تھیں؟ کیا باہر کوئی تمہیں تنگ کر رہا تھا؟'' باتیں کرتے کرتے اسے جمیلہ کی آمد کے وقت کی گھبراہٹ یاد آئی تو اس نے اس سے پوچھ لیا۔

''نہیں۔ میں گھبرائی ہوئی تو نہیں تھی۔ بس پچھلی گلی سے یہاں تک تیز تیز چل کر آئی تھی اس لیے سانس پھول گیا تھا۔'' وہ صاف مکر گئی اور پھر فوراً ہی کھڑے ہوتے ہوئے

www.pkdigest.com

بولی۔ ''اچھا اب میں چلتی ہوں، بڑی دیر ہو گئی ہے۔ تم میرے بھائی کی طرف سے فکر مت کرنا۔ اس کے میں ابا سے اچھی طرح کان کھنچواؤں گی۔'' اپنی بات کہنے کے بعد وہ رکی نہیں اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ ماہ پاتو حیران سی اس کا یہ ردِعمل دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

نور پور کی حدود میں داخل ہوتے ہی انہیں خوش گوار سا احساس ہوا۔ چھوٹے سے اس گاؤں کے مکانات دیکھ کر بے شک مکینوں کی خستہ حالی کا احساس ہوتا تھا لیکن اس احساس کے ساتھ ہی گلیوں کی ترتیب اور صفائی ستھرائی بھی فوراً نظر میں آجاتی تھی۔ ان ترتیب وار گلیوں سے گزر کر زمیندار کے پختہ مکان تک پہنچنے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مکان کے دروازے پر ایک نوکر نے ان کا استقبال کیا اور پھر انہیں ایک بیٹھک میں لے گیا۔ تھوڑی دیر میں نوکر نے لسی اور دیگر لوازمات ان کے سامنے رکھ دیے۔ دونوں بغلوں کے نیچے بے ساکھی دبائے زمیندار بھی وہیں آ گیا۔ ان بیساکھیوں کو دیکھ کر یہ بات سمجھ آ گئی کہ دیگر زمینداروں کی طرح وہ خود شہریار سے ملنے اس کے دفتر کیوں نہیں آیا تھا۔

''وڈی مہربانی جی اے سی صاحب کہ آپ ادھر آ گئے۔ میں تو بڑے دنوں سے آپ کی راہ دیکھ رہا تھا۔ آپ کے دوسروں گاؤں میں جانے کی خبریں تو ملتی رہتی تھیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ دیکھیں، میرے گاؤں کا مقدر کب جاگتا ہے۔ رب کا شکر ہے آج آپ کو ادھر آنے کا خیال بھی آ گیا۔'' رسمی سلام دعا کے بعد اس نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''میری کوشش تو یہی ہے کہ اپنے علاقے میں موجود ہر گاؤں کا کم از کم ایک دورہ تو کر ہی لوں لیکن کوئی نہ کوئی ایسی مصروفیت آڑے آجاتی ہے کہ میں اپنے اس ارادے پر مکمل طور پر عمل نہیں کر پا رہا۔ آپ کے گاؤں کا دورہ بھی شروع سے ہی ہماری فہرست میں شامل تھا لیکن آج بڑی مشکل سے ہم اس میں کامیاب ہو پائے۔ آپ نے گاؤں میں بجلی کی سپلائی کے سلسلے میں جو درخواست دی تھی، وہ میں نے دیکھ لی تھی۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد اس سلسلے میں کوئی پیش رفت ہو سکے۔ آپ بتائیں کہ اس مسئلے کے علاوہ اور کون سے مسائل ہیں جن کے حل میں، میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟''

نور پور کا زمیندار وہ واحد شخص تھا جس نے اپنے کسی ذاتی کام کے بجائے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے درخواست دائر کی تھی، اس لیے شہریار کا رویہ اس سے بہت مختلف تھا اور وہ بجائے گاؤں کے لوگوں کے پاس جانے کے براہِ راست اسی سے گاؤں کے مسائل پوچھ رہا تھا۔

''یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ تو غربت ہی ہے۔ زیادہ تر لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ کچھ کمہار اور جولاہے ہیں۔ آبادی کے حساب سے روزگار کے ذرائع بہت کم ہیں۔ میں چاہ رہا تھا کہ گاؤں میں بجلی آجائے تو کسی چھوٹی موٹی گھریلو صنعت کی بنیاد ڈال دوں۔ لوگوں کو روزگار ملے گا تو گاؤں خود ہی ترقی کرنے لگے گا۔'' زمیندار نے جواب دیا۔

''آپ کے خیالات سن کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ مجھ سے ملنے والے افراد میں آپ واحد شخص ہیں جنہیں اپنے ذاتی مفادات کے بجائے اپنے گاؤں کی ترقی عزیز ہے۔'' اس نے زمیندار کو سراہا۔

''ذاتی مفادات میں پڑنے کی میرے پاس گنجائش ہی نہیں۔ میری بیوی برسوں پہلے ایک حادثے میں مر گئی تھی۔ میں نے اپنی ٹانگیں اسی حادثے میں گنوائی تھیں۔ اولاد ہماری کوئی تھی ہی نہیں۔ اب مجھ جیسا معذور اور ادھیڑ عمر کا آدمی دولت جمع کرے گا بھی تو اس کے کس کام آئے گی؟ بس ایک چھوٹی بہن ہے، اسے عزت سے اس کے گھر کا کر دوں تو میری ساری فکریں ختم ہو جائیں گی۔ مجھے جو کچھ سوچنا ہے اپنے گاؤں کے بارے میں ہی سوچنا ہے۔'' زمیندار نے سادگی سے اپنے رویے کی وضاحت کرتے ہوئے نوکر کو مزید لسی لانے کے لیے آواز لگائی۔

''مزید تکلف کی ضرورت نہیں زمیندار صاحب! بس آپ یہ بتائیں کہ آپ کے گاؤں میں تعلیم اور صحت کی کیا صورت حال ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے میں دلچسپی رکھتے ہیں یا نہیں؟'' شہریار نے اسے روکتے ہوئے سوال کیا۔

''صرف دلچسپی سے کیا ہوتا ہے جناب! ان بے چاروں کے پاس تو دو وقت پیٹ بھر کر روٹی کھانے کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ حکومت نے بھی کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ یہی حال صحت کا بھی ہے۔ لوگ بیمار ہوتے ہیں تو خود ہی کچھ ٹونے ٹوٹکے کر کے علاج کر لیتے ہیں۔ کسی کی حالت بہت بگڑ جائے تو اسے منجی پر ڈال کر نور کوٹ تک لے جاتے ہیں۔ اب بندے کی قسمت کہ اگر زندگی ہو تو وہاں جانے تک بچ جاتا ہے ورنہ اسے واپس لا کر یہاں دفنا دیتے ہیں۔'' دیگر دیہاتوں کی طرح وہاں بھی صورتِ حال بہت خراب تھی۔ بس واحد حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ گاؤں کا سب سے زیادہ بااثر شخص ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا۔

''آپ کے تعاون کے لیے شکریہ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے گاؤں کے مسائل کے حل کے لیے میں

ترجیحی بنیادوں پر کام کرنے کی کوشش کروں گا۔ تعلیم، صحت اور روزگار ان تینوں ایشوز پر میری نظر رہے گی۔'' زمیندار کو یقین دہانی کروا کر وہ لوگ واپسی کے لیے اٹھ گئے۔ گھر کے بڑے سے صحن سے گزرتے ہوئے انہوں نے کیاری میں موجود پھول دار پودوں پر ایک لڑکی کو جھکے ہوئے دیکھا۔ وہ یقیناً زمیندار کی چھوٹی بہن تھی جو ان لوگوں کو دیکھ کر فوراً بھاگ کر ایک کمرے میں چلی گئی تھی۔ زمیندار کے گھر سے نکلنے کے بعد انہوں نے گاؤں کا چکر لگا کر حالات کا ایک طائرانہ سا جائزہ لیا اور پھر واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ آج شہریار کی موتی والا کے وکیل سے بھی ملاقات طے تھی۔ گھر پہنچ کر اسے بس اتنی ہی مہلت مل سکی کہ وہ غسل کر کے اپنے وجود پر سے دن بھر کی گرد و غبار کو اتار سکے۔ غسل کے بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑا اپنے بالوں کو سنوار رہا تھا کہ بٹلر نے اسے عبدالستار کی موتی والا کے وکیل کے ساتھ آمد کی اطلاع دی۔

''او کے! تم انہیں بٹھاؤ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' بٹلر کو جواب دے کر وہ تیار ہونے لگا۔ سات سے آٹھ منٹ میں اس کی تیاری مکمل ہو گئی۔ سیڑھیاں اتر کر وہ نچلی منزل پر موجود ڈرائنگ روم میں پہنچا تو اس دوران تربیت یافتہ ملازمین لوازمات کے ساتھ چائے سرو کر چکے تھے۔

''حفیظ شیرازی... مسٹر موتی والا کے قانونی مشیر۔'' اس کے ڈرائنگ روم میں پہنچنے پر عبدالستار نے تعارف کی رسم نبھائی۔ اس نے حفیظ شیرازی سے ہاتھ ملا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

''لاہور سے یہاں تک پہنچنے میں آپ کو زیادہ تکلیف تو نہیں اٹھانی پڑی؟'' حفیظ شیرازی کی آمد کا اصل مقصد پوچھنے سے پہلے اس نے ایک رسمی سا سوال کیا۔

''تکلیف کیسی؟ میں تو اپنی ایک ذمے داری پوری کرنے آیا تھا۔ اگر آپ موتی والا صاحب کی تدفین کے بعد لاہور میں ایک دو دن قیام کرتے تو میں آپ سے وہیں ملاقات کر لیتا لیکن اب بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے تو بہرحال اپنا فرض پورا کرنا ہی تھا اس لیے میں یہاں تک چلا آیا۔'' شہریار کے سوال کا جواب دے کر وہ اپنا بریف کیس کھولنے لگا۔ بریف کیس میں سے اس نے ایک خاکی لفافہ نکال کر شہریار کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ''اپنے بیٹے کی وفات کے کچھ دن بعد ہی موتی والا صاحب نے اپنی نئی ول (وصیت نامہ) تیار کروائی تھی۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے آپ کا ذکر بھی کیا تھا۔ وہ بڑے جہاندیدہ آدمی تھے۔ راؤ صاحب کے حوالے سے شاید آپ کو پہلے سے جانتے تھے پھر یہاں کے اسسٹنٹ کمشنر بننے کے بعد بھی انہوں نے آپ کو دیکھا۔ آپ کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ آپ ایک اولوالعزم اور ایمان دار آدمی ہیں جو کم از کم اپنے کیریئر کے ابتدائی حصے میں تو ہرگز بھی کسی کرپشن میں ملوث نہیں ہو سکتے۔'' شہریار نے خاموشی سے حفیظ شیرازی کے یہ الفاظ سنے اور خاکی لفافہ کھول کر اس میں موجود کاغذات نکال کر ان کا جائزہ لینے لگا۔ ان کاغذات کے مندرجات حفیظ شیرازی کے الفاظ کی تصدیق کر رہے تھے۔ موتی والا نے اپنے اس وصیت نامے میں اسے اپنی جائیداد کا ٹرسٹی قرار دیتے ہوئے اپنے بیٹے کے نام سے فلاحی اسپتال کے قیام کی خواہش کے ساتھ یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ شہریار یہ اسپتال اپنے علاقے میں تعمیر کروائے۔ شاید وہ اپنے اس جرم کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا جو اس نے چودھری افتخار کے ساتھ مل کر جنگل سے لکڑی کی اسمگلنگ کی شکل میں کیا تھا۔ جنگل کے درختوں سے حاصل ہونے والی یہ دولت جس پر یقیناً اس علاقے کے لوگوں کا سب سے زیادہ حق تھا، اسی صورت میں واپس لوٹائی جا سکتی تھی۔ موتی والا نے ایک عقل مندی یہ بھی کی تھی کہ شہریار کو مختارِ کل نہیں بنایا تھا بلکہ حفیظ شیرازی سمیت وکلا کا ایک سہ رکنی بورڈ بھی مقرر کیا تھا جو اس کی کارکردگی کا جائزہ لیتا رہتا اور کسی طرح کی کرپشن کی صورت میں اس کی روک تھام کا بندوبست کرتا۔

''یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ موتی والا صاحب نے مجھے اس لائق سمجھا۔ ان کی اس ول نے میرے ہاتھ بہت مضبوط کر دیے ہیں۔ اپنے علاقے کی ترقی کے لیے میرے ذہن میں بہت سے منصوبے ہیں لیکن ظاہر ہے، میں فوری طور پر حکومت سے ان تمام منصوبوں کے لیے مراعات حاصل نہیں کر سکتا۔ موتی والا صاحب کی اس ول کے بعد میں کم از کم اس لائق ہو جاؤں گا کہ علاقے کے مسائل کے حل کے لیے کچھ کر سکوں۔ مگر اس سلسلے میں میرے ذہن میں جو منصوبہ ہے، وہ موتی والا صاحب کی خواہش سے تھوڑا سا مختلف ہے۔ میں ایک بڑے اسپتال کے قیام کے بجائے صحت کے چھوٹے چھوٹے مگر جدید مراکز کے قیام میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ اگر ہم بڑا اسپتال بنائیں گے تو وہ یقیناً کسی ایک قصبے میں قائم کیا جائے گا اور لوگوں کے لیے اس اسپتال تک بروقت پہنچنے کا مسئلہ اپنی جگہ رہے گا۔ اس کے برخلاف اگر ہم مختلف دیہاتوں میں چھوٹے چھوٹے یونٹس قائم کر دیتے ہیں تو لوگوں کو زیادہ آسانی رہے گی۔ ایک آپریشن تھیٹر، ادویات اور چھوٹی موٹی مشینوں کے ساتھ ایک لیڈی ڈاکٹر، جنرل فزیشن اور پیرامیڈیکل اسٹاف پر مشتمل ان یونٹس سے لوگوں

کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ خدا نخواستہ کوئی بہت بڑا حادثہ ہو گیا تو ان یونٹس میں مریض کو فرسٹ ایڈ دے کر کسی بڑے شہر تک پہنچانے کی مہلت مل جائے گی۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ کہیں کہیں ہی حکومت کی قائم کردہ ڈسپنسریاں نظر آتی ہیں اور وہاں بھی ڈاکٹرز اور دوائیں دونوں ناپید ہیں۔" لفافے میں کاغذات واپس رکھنے کے بعد اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اس وقت وہ بہت پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ وہ مختلف منصوبے جو مسلسل اس کے ذہن میں پلتے رہتے تھے، اس وقت ان میں سے ایک کی تکمیل کے لیے راہ نکل آئی تھی۔

"تجویز تو آپ کی بہت اچھی ہے۔ مجھے اس تجویز پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں بورڈ کے باقی دو ممبران سے بھی اس تجویز کو ڈسکس کر کے آپ کو حتمی جواب دے دوں گا۔ میرے خیال میں تو وہ لوگ بھی اس تجویز کو پسند کریں گے۔"

حفیظ شیرازی کا جواب بڑا حوصلہ افزا تھا۔ اسے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن سی چمکتی نظر آنے لگی، ورنہ ماہ بانو کے غیاب کے بعد جو اندھیرا سا چھا گیا تھا اس سے وہ اپنے اندر بڑی گھٹن محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

بیرونی دروازے پر دی جانے والی زوردار دستک پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ موجودہ حالات میں اسے بہت گہری نیند نہیں آ پاتی تھی اور وہ ذرا سی آہٹ پر ہی چونک کر اٹھ جاتی تھی۔ دروازے پر دی جانے والی یہ دستک تو بہت زوردار تھی اور مسلسل یوں دی جا رہی تھی کہ جیسے دروازہ نہ کھولنے کی صورت میں توڑ دیا جائے گا۔ خوف اور اندیشوں سے گھرا اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اس نے ساتھ سوئی ہوئی خالہ جی کو ایک نظر دیکھا۔ دستک کی اس آواز پر ڈسٹرب ہو کر وہ بھی کسمسا رہی تھیں لیکن دواؤں کے زیرِ اثر ان کا ذہن فوری طور پر بے دار ہونے سے قاصر تھا۔ وہ بستر سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس دوران عامر بھی جاگ چکا تھا اور بیٹھک سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

"آ رہا ہوں بھائی، کون ہے؟ ذرا صبر سے تو کام لو۔" اس کے بالائی جسم پر کپڑے موجود نہیں تھے۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ہر موسم میں ایک جیسے حلیے میں سونا پسند کرتے ہیں۔

"کیا بھنگ پی کر سو رہا تھا جو اتنی دیر بعد آنکھ کھلی ہے اور اب بھی دروازہ کھولنے کا نام نہیں لے رہا۔" باہر سے کسی کی بلند اور غصیلی آواز سنائی دی۔

"اچھا اچھا، یہ تو ہے۔ لے کھول دیا میں نے دروازہ۔" باہر سے بولنے والا یقیناً اس کے لیے شناسا تھا جو اس نے اطمینان سے بولتے ہوئے جھٹ دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی چار پانچ لڑکے دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔

"کیا بات ہے یار! تم لوگ اس وقت اس طرح کیوں آئے ہو؟" وہ سب اس کے لیے آشنا تھے لیکن ان کا انداز اور چہرے کا تاثر قطعی اجنبی تھا۔

"دیکھو تو ذرا کیسا معصوم بن رہا ہے۔ حالانکہ اس کا حلیہ دیکھ کر ہی سب سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کون سے گل چھرے اڑا رہا تھا۔" کٹیلے لہجے میں یہ جملہ بولنے والے کو ماہ بانو نے شناخت کر لیا۔ وہ پچھلے گھر میں رہنے والا جمیلہ کا وہی کبوتر باز بھائی تھا جس نے اس کے لیے رقعہ پھینکا تھا۔

"کون سے گل چھروں کی بات کر رہے ہو تم؟ میں سارا دن کا تھکا ہارا گہری نیند سو رہا تھا کہ تم لوگوں کی وجہ سے جاگنا پڑا اور اب تم الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو۔ جاؤ یہاں سے میں کوئی تم لوگوں کی طرح باپ بھائی کی کمائی پر نہیں پل رہا کہ راتوں کو جاگ کر تمہارے ساتھ مغز ماری کروں۔ سویرے مجھے اپنی ڈیوٹی پر بھی جانا ہے۔" عامر بگڑا۔

"دیکھ رہے ہو یارو، کیسے بگڑ رہا ہے۔ ہاں بھئی، آدمی کے عیش میں خلل پڑے تو اسے برا ہی لگتا ہے۔" پرویز نے ایک اور طنز کا تیر چلایا۔ عامر کی طرح گھر کے دروازے کی آڑ میں کھڑی ماہ بانو بھی حیران تھی کہ وہ ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ اس کے انداز سے تو صاف لگتا تھا کہ وہ جھگڑا کرنے کی نیت سے ہی یہاں آیا ہے۔

"زبان سنبھال کر بات کر پرویز! تجھ جیسا آئے روز لڑکیوں کو چھیڑ کر ان کے باپ بھائیوں سے پٹنے والا آخر کس برتے پر مجھ پر الزام تراشی کر رہا ہے؟" عامر نے تند لہجے میں اسے ٹوکا۔

"میں تو صرف لڑکیوں کو چھیڑتا ہی ہوں، پر تو نے تو دیدہ دلیری کی حد ہی کر دی۔ جوان جہان لونڈیا گھر میں لا ڈالی ہے اور اب مزے سے عیاشی کرتا ہے۔"

"تیری تو میں..." پرویز کے اس الزام پر وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ پرویز کے ساتھ آنے والے لڑکے فوراً اس کی مدد کو لپکے۔ عامر جان دار لڑکا تھا۔ اس نے پرویز کے ساتھیوں میں سے ایک کے پہلو میں کہنی ماری اور دوسرے کی طرف دیکھے بغیر یوں ہی اپنی ٹانگ پیچھے کی جانب چلا دی۔ ٹانگ مقابل کے جسم کے نازک حصے پر پڑی اور وہ بری طرح بلبلایا۔ اس ساری

کارروائی کے دوران پرویز کا گریبان اس کے ہاتھ میں ہی رہا تھا۔ موقع پاتے ہی اس نے گریبان کو جھٹکا دے کر پرویز کو پچھلی طرف دھکیل دیا۔ اس کا سر پیچھے موجود دیوار کے ساتھ جا کر لگا اور حلق سے زوردار چیخ نکلی۔ اس دوران عامر خود بھی زد میں آ گیا تھا۔ ایک لڑکے نے اسے پیچھے سے جکڑ لیا تھا اور دوسرا اس کے پیٹ میں مکے برسا رہا تھا۔ مکوں کی یہ ضرب یقیناً بے حد تکلیف دہ تھی۔ عامر کراہتا ہوا دہرا ہو گیا اور یوں لگا کہ نیچے فرش پر بیٹھ جائے گا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنے سامنے کھڑے ہو کر مکے برسانے والے کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر دائیں جانب سے حملہ آور ہوتے ہوئے لڑکے پر دے مارا۔ پیچھے سے اسے جکڑنے والا اسے دہرا ہوتا دیکھ کر غیر ارادی طور پر اسے چھوڑ چکا تھا اس لیے اب وہ کسی کی گرفت میں نہیں تھا۔ اس نے لپک کر دیوار کے ساتھ لگی چارپائی کی بلی اٹھائی اور ان چاروں کی مرمت کرنے لگا۔ اس ساری کارروائی میں اچھا خاصا شور پیدا ہوا تھا اور قریب قریب واقع گھروں میں لوگ جاگنے لگے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" خالہ جی بھی اس دوران جاگ گئی تھیں اور ساکت و صامت ماہ بانو کے عقب میں کھڑی اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"معلوم نہیں۔ جانے یہ کون لڑکے ہیں جو اچانک ہی اندر گھس کر عامر بھائی سے لڑنے لگے ہیں۔" اس نے خالہ جی کی بات کا جواب ضرور دیا لیکن اس کی نظریں اپنے سامنے ہوتے معرکے سے نہیں ہٹیں۔ عامر کے ہاتھ میں بلی آ جانے کے بعد پست ہوتے ہوئے لڑکوں نے ایک بار پھر سنبھالا لے لیا تھا۔ ان میں سے دو نے مل کر بلی کو پکڑ لیا تھا اور دو پیچھے سے اسے جکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم لوگ کیوں لڑ رہے ہو؟ میں کہتی ہوں رک جاؤ۔" ماہ بانو کی طرح وہیں رک کر لڑائی دیکھنے کے بجائے خالہ جی باہر نکلیں اور ان سب کو پکارا لیکن لڑائی کے جوش میں ان کی کمزوری آواز دب کر رہ گئی۔ اسی وقت آس پاس کے گھروں کے جاگ جانے والے لوگوں میں سے چند لوگ کھلے دروازے سے اندر چلے آئے۔

"روکو ان لوگوں کو۔ ورنہ یہ لڑ لڑ کر ایک دوسرے کی جان لے لیں گے۔" پڑوسیوں کو سامنے پا کر خالہ جی کا حوصلہ بلند ہوا اور انہوں نے ان سے مدد کی درخواست کی۔ پانچ چھ افراد مل کر لڑتے ہوئے لڑکوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر وہ لوگ کچھ دیر کی کوشش کے بعد لڑائی رکوانے میں کامیاب ہو گئے لیکن اس دوران عامر سمیت تمام

> **"خوبی"**
>
> دکاندار نے ریڈی میڈ سوٹ شاہد کو دیتے ہوئے کہا تھا۔
> "یہ آپ کو اس طرح فٹ آئے گا جیسے ہاتھ پر دستانہ۔"
> اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سوٹ میں پتلون چار ٹانگوں والی تھی اور کوٹ ایک آستین والا۔
>
> **"دل"**
>
> کار ڈیوڈ سیکولر کی ایک ایمبولینس کا ڈرائیور ایمبولینس لے کر اسپتال پہنچا تو اس نے دیکھا اسپتال کے دو سرجن باہر فٹ پاتھ پر سڑک کے کنارے کنارے کچھ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔
> "کیا آپ کا کچھ کھو گیا ہے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔
> "نہیں... ہم ایک اہم نکلس اسپیکر کا تبدیلی قلب کا آپریشن کر رہے ہیں۔ اس کے سینے میں رکھنے کے لیے کوئی معقول سا پتھر نہیں مل رہا۔" ایک سرجن نے بتایا۔

لڑکوں کا حلیہ اچھا خاصا بگڑ چکا تھا۔ عامر کی بلی کی زد میں آ کر دو لڑکوں کے سر پھٹ گئے تھے، ایک کی ناک سے خون نکل رہا تھا اور ایک اپنے بازوؤں پر لگنے والی چوٹوں کو سہلا رہا تھا۔ خود عامر کا حلیہ بھی ابتر تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور دائیں آنکھ کے نیچے بھی زخم آیا تھا۔ جسم کے بالائی عریاں حصے پر بھی کئی چوٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔ بے شک وہ بہت بے جگری سے لڑا تھا لیکن تنہا ہونے کی وجہ سے اس نے مار بھی سب سے زیادہ کھائی تھی۔ محلے والوں نے تمام لڑکوں کے زخم دھلوائے اور پھر انہیں بیٹھک میں بٹھا کر جھگڑے کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

"ساری غلطی عامر کی ہے۔ ہم تو صرف اس کی غلطی کا احساس دلانے آئے تھے، اس نے بلاوجہ ہم سے ہاتھا پائی شروع کر دی۔" پرویز کے ساتھ آنے والے کوتاہ قامت لڑکے نے الزام لگایا۔

"الو کے پٹھو! ایک تو تم لوگوں نے مجھ پر بے کار کی الزام تراشی کی، اس پر سے غلطی بھی میری ہی بتا رہے ہو۔" عامر اس کی بات سن کر بھڑکا۔ وہ یوں بھی محلے داروں کی وجہ سے جھگڑے سے تائب ہو گیا تھا ورنہ اس کے اندر غصہ اب بھی بھڑک رہا تھا۔

"دھیرج پتر! آرام سے بات کرو۔ ہم تم سب کی بات آرام سے سنیں گے۔" ایک عمر رسیدہ پڑوسی نے عامر کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے اسے ٹھنڈا رہنے کا اشارہ کیا۔

"آپ دیکھ رہے ہیں چاچا جی! یہ آپ لوگوں کے سامنے بھی کس طرح بھڑک رہا ہے۔ ہم لوگوں نے اسے

www.pkdigest.com

سمجھانے کی کوشش کی تھی تو بھی یہ اسی طرح بھڑک کر ہم سے الجھنے لگا تھا۔ ورنہ ہم نے اس سے صرف اتنا ہی تو کہا تھا کہ یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ یہاں سب ماں بہنوں والے ہیں۔ تم اس محلے میں رہتے ہو تو شریفوں کی طرح رہو اور اپنی ماں کی بیماری کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔"

"کیا مطلب؟ کیا کیا ہے عامر نے؟" ایک لڑکے کے دیے بیان پر صلح صفائی کروانے والے افراد بھی الجھ گئے۔

"کیا کہوں چاچا جی! بات ایسی ہے کہ کچھ کہتے ہوئے زبان رکتی ہے، پر میں اپنی آنکھوں کا دیکھا جھٹلا بھی نہیں سکتا۔ پر آپ تو عقل مند آدمی ہو۔ اس کا حال دیکھ کر بھی بہت کچھ سمجھ سکتے ہو۔ میں نے اسے اور اس کی مہمان لڑکی کو باہر آنگن میں بڑی بے شرمی والی حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔" پرویز نے عامر کے بالائی عریاں جسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک ایسا بیان دیا جس پر سب کے منہ کھلے رہ گئے۔

"جھوٹ بولتا ہے نامراد! میرا بچہ بالکل بھی ایسا نہیں ہے۔ اس کی تو بچپن کی عادت ہے کہ سردی گرمی ہر موسم میں اسی طرح قمیص اتار کر سوتا ہے۔ یہ بچی بہت شریف ہے۔ روزانہ میرے ساتھ میرے کمرے میں سوتی ہے۔" خالہ جی جہاندیدہ عورت تھیں وہ فوراً سمجھ گئیں کہ پرویز بات کو کس رخ پر لے جا رہا ہے اس لیے فوراً تڑپ کر بیٹے کی صفائی میں صدا بلند کی۔

"آپ تو دوائیں کھا کر مدہوش سوتی ہو خالہ جی! آپ کو کیا معلوم چلتا ہوگا کہ کب لڑکی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔" پرویز نے ان کی بات اڑائی۔

"نہ تو تو بتا کہ اگر یہ لوگ اتنے ہی ہوشیار ہیں تو اچھی بھلی بیٹھک ہوتے ہوئے شرمناک حرکتیں دکھانے کو باہر آنگن میں کس لیے جائیں گے؟ اور تو کہاں کا شریف زادہ ہے جو آدھی آدھی رات کو دوسروں کے گھروں میں جھانکتا ہے؟" وہ اس سے دبے بغیر تیز لہجے میں دلیل کے ساتھ بولیں تو وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

"پھر بھی بہن جی! کوئی تو بات دیکھی ہوگی پرویز نے جو ایسا الزام لگایا۔" صلح صفائی کروانے والے بزرگوار خود معاملہ ختم کرنے کے موڈ میں نہیں تھے اور چسکے لینے کے لیے بات کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔

"کوئی بھی بات نہیں ہو سکتی۔ یہ بچی اور عامر دودھ شریک بہن بھائی ہیں۔ اس کی بڑی بہن کے ساتھ اس کی ماں نے عامر کو بھی دودھ پلایا تھا۔ ماں کے دودھ کے رشتے سے عامر اس کی بہن کے ساتھ ساتھ اس کا بھی بھائی ہوا۔ وہ بے چاری بڑی والی تو دو چار برس کی ہو کر ہی مر گئی تھی، اب یہی بچی ہے۔ اس کی ماں کے دودھ کا حق ادا کرنے کے لیے اگر کڑے وقت میں ہم نے اسے اپنے گھر میں رکھ لیا تو کیا برا کیا؟ میں بوڑھی اور بیمار ہوں، پر بے عقل نہیں کہ جوان جہان لڑکی کو یوں ہی گھر میں رکھنے کا خطرہ مول لوں۔" خالہ جی نے ایک جھوٹ کے سہارے ساری صورت حال الٹ کر رکھ دی۔ اب کسی کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ عامر کی ماں تھیں اور ان کے بیان کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ کر کے سب لوگ وہاں سے رخصت ہونے لگے۔ پرویز نے جاتے جاتے ماہ بانو کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ اسے لگا وہ اسے دھتکار رہا ہو۔

"یہ پرویز ہے تو سارے زمانے کا آوارہ گرد اور بدکردار پر میری سمجھ نہیں آ رہا کہ اس نے عامر پر ایسا الزام کیوں لگایا؟" خالہ جی اتنی دیر میں اچھی خاصی نڈھال ہو گئی تھیں۔ سب لوگوں کے رخصت ہوتے ہی انہوں نے اپنا سر کرسی کی پشت سے لگایا اور بڑبڑانے کے انداز میں بولیں۔

"اس کا اصل نشانہ عامر بھائی نہیں، میں تھی خالہ جان! اصل میں وہ مجھے بے عزت کرنا چاہتا تھا۔" ماہ بانو جو اس عرصے میں اپنے ہونٹ سی کر بیٹھی رہی تھی، جھکے ہوئے لہجے میں بول اٹھی۔

"پر کیوں؟" عامر چونکا۔ اس نے پرویز کے رقعہ پھینکنے اور جمیلہ سے شکایت کرنے کا قصہ سنا دیا۔

"بالکل صحیح... میں سمجھ گیا۔ تمہاری شکایت پر جمیلہ نے اپنے ابا سے اس کی شکایت کی ہوگی، وہ بے چارے پہلے ہی اس کے کرتوتوں پر پریشان ہیں۔ انہوں نے غصے میں اسے دو چار ہاتھ لگا دیے ہوں گے اور اس نے انتقام لینے کے لیے یہ سارا ڈراما رچا ڈالا۔ اگر اماں ہمارے دودھ شریک بہن بھائی ہونے کا بہانہ نہ گھڑتیں تو محلے والوں نے پرویز کو جھوٹا مان لینے کے باوجود اس بات پر زور دینا تھا کہ فساد کی جڑ اس لڑکی کو باہر نکالو۔" سارا قصہ سننے کے بعد عامر نے نتیجہ اخذ کیا۔

"میں پہلے ہی اس کی بدمعاشی کو سمجھ گئی تھی۔ پھر مجھے یقین تھا کہ تم دونوں میں سے کوئی بھی ایسا گندا کام نہیں کر سکتا اس لیے ذرا سا جھوٹ بول ڈالا۔ رب میرے اس جھوٹ کو معاف کرے، پر تم دونوں یاد رکھنا کہ اب تمہیں ہمیشہ میرے اس جھوٹ کی لاج رکھنی ہے۔" خالہ جی نے ان دونوں کو نصیحت کی۔

"بالکل اماں! یہ میرے لیے آج سے چھوٹی بہن کی طرح ہی ہے۔" عامر نے ماہ بانو کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے

یقین دہانی کروائی۔

"چلو اب چل کر سو جاتے ہیں۔ کل میں پرویز کی ماں کو بلا کر اس سے کہوں گی کہ بیٹے کو ذرا نرمی سے قابو کرے۔ باپ کی سختی نے اسے زیادہ ہی اکھڑ کر دیا ہے۔ اس وقت بھی باپ نائٹ ڈیوٹی پر ہوگا جو اس نے یہ سارا کارنامہ انجام دے ڈالا۔ اگر اس وقت اس کا باپ موجود ہوتا تو سب کے سامنے چار چوٹ کی لگاتا۔" وہ تبصرہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں تو ماہ بانو نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔ آج یہ نحیف و نزار عورت اس کے لیے بہت مضبوط ڈھال ثابت ہوئی تھی، ورنہ وہ ایک آوارہ گرد کے انتقام کی زد میں آ کر آدھی رات کو بے سائبان ہو جاتی۔

☆☆☆

"پیر آباد سے ماسٹر آفتاب آیا ہے سر!" عبدالمنان کی اس اطلاع پر اس کے دل میں امید کی کرن جاگی۔ اسے علم تھا کہ عبدالمنان نے ماسٹر آفتاب کے ذمے حویلی میں کسی ذریعے سے ماہ بانو کا کھوج لگانے کا کام لگا رکھا تھا۔ اس وقت ماسٹر آفتاب کی آمد کا مطلب تھا کہ اس کے پاس انہیں دینے کے لیے کوئی اہم خبر ہے اس لیے وہ یہاں آیا ہے۔

"اسے اندر بھیج دو۔" اپنی تمام تر مصروفیات ترک کر کے اس نے عبدالمنان کو حکم دیا۔

"السلام علیکم سر!" اگلے لمحے ماسٹر آفتاب اس کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو آفتاب؟" اس نے مصافحہ کرنے کے بعد اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اسکول کی کنسٹرکشن کا کام کیسا چل رہا ہے؟ کہیں کوئی رکاوٹ وغیرہ تو کھڑی کرنے کی کوشش نہیں کی گئی؟ میرے پاس زیادہ بندے نہیں ہیں ورنہ میں کام کی نگرانی کے لیے ٹھیکیدار کے ساتھ اپنا کوئی آدمی بھجوا دیتا۔"

"نگرانی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ کام میں اور میرا ساتھی ٹیچر مل جل کر کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اب تک سارے معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں۔ جیسا کہ ہمیں ڈر تھا کہ چودھری صاحب کی طرف سے کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش کی جائے گی، تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ابھی تک تو ان کے کسی بندے نے اس طرف آ کر جھانکا بھی نہیں۔ لگتا ہے اس معاملے میں انہوں نے ہار مان لی ہے۔" وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ خود شہر یار کو بھی بنا کسی رکاوٹ کے اسکول کی تعمیر کا کام جاری رہنے پر خوشی تھی لیکن وہ چودھری کی طرف سے مکمل طور پر مطمئن نہیں تھا۔ اس کی فطرت کے بارے میں اس نے اب تک جو اندازہ لگایا تھا، اس کے مطابق وہ ایک منتقم مزاج اور کینہ پرور شخص تھا جو موقع ملتے ہی اپنے مخالف کو ڈسنے سے نہیں چوکتا تھا۔ حوراں، صفدر، مولی والا اور دارالامان کی منتظمہ کے قتل کی مثالیں اس کے سامنے تھیں۔ ان سارے حادثات میں چودھری کے ملوث ہونے کا ثبوت نہ ملنے کے باوجود اس کا وجدان کہتا تھا کہ ان اموات کے پیچھے اسی کا ہاتھ ہے۔ اسی نے ماہ بانو کو تحفظ فراہم کرنے اور اس سے ہمدردی رکھنے کے جرم میں ان سارے لوگوں کو ٹھکانے لگوایا ہے اور اب شاید ماہ بانو خود بھی اس کے ہتھے چڑھ چکی تھی جس سے وہ اپنی بے عزتی کا انتقام نہ جانے کس انداز میں لیتا یا لے رہا ہوگا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کتاب شائع ہونے کے بعد مجھے اس کی جو رائلٹی ملے گی اس سے میں اسکول میں فرنیچر

عطاءالحق قاسمی کی تصنیف "نصیحت نامے" سے انتخاب

ڈاکٹر چھرے کا وصیت نامہ

گزشتہ دنوں ایک نارماسونگل کمپنی کی ٹکٹ پر میں ایک ماہ کے لیے یورپ گیا اور غلطی کی جو تمہیں اپنی جگہ بٹھا گیا۔ تم نے میری عدم موجودگی میں اس دولت مند بڑھیا کی ہچکی ٹھیک کر دی جو کئی برسوں سے میرے پاس اس مرض کے علاج کے لیے آ رہی تھی۔ میں نے اس بڑھیا کی ہچکی سے تمہیں پاکستان میں تعلیم دلائی پھر اسی ہچکی سے تمہیں باہر سے ایف آر سی ایس کرایا اور اب اس ہچکی سے تمہاری شادی کرانا تھی مگر تم نے اسے ایک ہفتے میں ٹھیک کر دیا۔ جان سے عزیز بیٹے کیوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتے ہو۔ تمہارے باپ کو لوگ ڈاکٹر چھرا کہتے ہیں لیکن اس چھرے سے لوگوں کی جیب کاٹی جاتی ہے یہ چھرا اپنی گردن پر تو نہیں چلایا جاتا!

☆☆☆

تمہیں یاد ہے تمہارے ایک کلاس فیلو کو کم نمبروں کی وجہ سے پاکستان کے کسی میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں ملا تھا اس نے ماسکو سے روسی زبان میں ایم بی بی ایس کی ڈگری لی کو اسے روسی نہ آتی تھی مگر اس نے پاکستان واپس آ کر قبرستان کے ساتھ اپنا کلینک کھولا الحمدللہ اب وہ کروڑوں میں کھیلتا ہے اس کے حاسدوں کا کہنا ہے کہ وہ صرف کروڑوں میں نہیں کھیلتا لوگوں کی جانوں سے بھی کھیلتا ہے مگر اللہ کی قدرت دیکھو اتنے سال گزرنے اور بالکل برابر میں قبرستان ہونے کے باوجود وہ قبرستان ابھی تک پوری طرح آباد نہیں ہو سکا۔ ابھی وہاں کئی قبروں کی جگہ باقی ہے۔

ڈلواؤں گا۔ بچے بہت خوش ہوں گے جب انہیں بیٹھنے کے لیے پھٹی پرانی دریوں کے بجائے نئی ڈیسکیں ملیں گی۔'' اس کی کیفیات سے بے خبر ماسٹر آفتاب جوش و خروش سے اپنے مستقبل کے پلان سنا رہا تھا۔

''ویری نائس۔ تمہاری یہ اسپرٹ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں نے خود بھی فیصلہ کیا ہے کہ نور پور گاؤں میں اپنے خرچے پر ایک اسکول بنواؤں گا۔ مختلف دیہاتوں میں صحت کے مراکز قائم کرنے کا ایک منصوبہ بھی زیرِ غور ہے۔ اس سلسلے میں جلد کام شروع ہو جائے گا۔'' شہریار نے اسے سراہتے ہوئے خوش خبری سنائی۔

''یہ تو بہت ہی زبردست نیوز ہے سر! مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ اگر آپ اس سیٹ پر موجود رہے تو یہ ضلع بہت ترقی کرے گا۔'' حسبِ توقع ماسٹر آفتاب خوش ہو گیا۔

''میں نے تو ساری زبردست نیوز تمہیں سنا دیں۔ تم سناؤ تمہارے پاس مجھے سنانے کے لیے کون سی نیوز ہے؟'' شہریار بہت سلیقے سے گفتگو کو اس موضوع کی طرف لے گیا جس کے بارے میں جاننے کے لیے وہ بری طرح بے چین تھا۔

''مجھے عبدالستان صاحب کا پیغام مل گیا تھا۔ اتفاق سے حویلی میں کام کرنے والی ایک لڑکی رانی سے میری اچھی خاصی واقفیت ہے۔ میرے کہنے پر اس نے سن گن لینے کی کوشش کی تھی لیکن اسے یقین ہے کہ ماہ بانو چودھری افتخار کے ہاتھ نہیں لگی...''

''اسے یہ یقین کیوں ہے؟ ضروری تو نہیں کہ چودھری ماہ بانو کو حویلی لے کر آئے، وہ اسے کہیں اور بھی تو رکھ سکتا ہے۔'' اس نے ماسٹر آفتاب کی بات کاٹتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔

''ڈیرے پر رانی کے منگیتر کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اپنے منگیتر کے ذریعے اس نے یہ بات کنفرم کروالی ہے کہ ماہ بانو کو ڈیرے پر نہیں لایا گیا۔ ویسے بھی اس کے اس یقین کے پیچھے ایک دوسری وجہ ہے۔ اس نے چودھری کی اس کے خاص بندوں کے ساتھ ہونے والی گفتگو سنی ہے۔ رانی کے مطابق چودھری اپنے بندوں پر سخت خفا ہو رہا تھا کہ وہ لوگ ابھی تک ماہ بانو کو نہیں ڈھونڈ سکے۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ اگر دو چار دن اور اس کے بندے ماہ بانو کو ڈھونڈنے میں ناکام رہتے ہیں تو وہ انعام کے لالچ کے ساتھ ماہ بانو کی تصویر اخباروں میں چھپوا دے گا۔ تصویر اخبار میں چھپنے کے بعد وہ اپنے آپ کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی اور کوئی نہ کوئی لالچ میں آ کر اطلاع ضرور دے گا۔''

''چودھری کے پاس ماہ بانو کی تصویریں کہاں سے آ گئیں؟'' ماسٹر آفتاب کی دی ہوئی اطلاع پر وہ چونکا۔

''کیا کہا جا سکتا ہے؟ لیکن رانی نے خود چودھری کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اس کے تکیے کے نیچے ماہ بانو کی تین چار تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ بتا رہی تھی کہ تصویریں کالج کے یونیفارم میں اور کسی تقریب وغیرہ میں شرکت کے موقع کی ہیں اور کوئی بھی تصویر گاؤں میں کھنچی ہوئی نہیں لگتی۔ شاید چودھری نے نوراں اور غیاث محمد کے ذریعے فیصل آباد سے یہ تصویریں منگوائی ہوں۔'' ماسٹر آفتاب کے پیش کردہ اس خیال کی اس نے تردید نہیں کی لیکن اس کا ذہن حوراں اور صفدر کے قتل کی واردات میں الجھا رہا۔ اسے ملنے والی اطلاعات کے مطابق صفدر کا گھر واردات کے بعد بری طرح بکھری ہوئی حالت میں ملا تھا۔ گھر کی حالت دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ کسی نے وہاں کی تلاشی لی ہو۔ اگر اس واردات میں چودھری کے بندے ملوث تھے تو اس بات کا سو فیصد امکان تھا کہ انہوں نے ہی وہاں سے ماہ بانو کی تصویریں حاصل کر کے چودھری کو پہنچائی ہوں۔ ماسٹر آفتاب کی فراہم کردہ معلومات نے جہاں اسے یہ تسلی دی تھی کہ ماہ بانو ابھی تک چودھری کے ہاتھ نہیں لگی، وہیں وہ اس پریشانی میں بھی گھر گیا تھا کہ آخر وہ کہاں ہے اور کس مشکل میں پھنسی ہوئی ہے؟ آزاد ہونے کی صورت میں اسے یہاں رابطے کی کوشش کرنی چاہیے تھی لیکن اس سوچ کے ساتھ اسے دوسرا خیال یہ بھی آیا کہ ہو سکتا ہے اس نے ڈر کر اس طرف کا رخ نہ کیا ہو۔ اس علاقے میں آنے کی صورت میں چودھری کی نظروں میں آجانے کا زیادہ ڈر تھا۔ لیکن اب چودھری اخبار میں اس کی تصویریں شائع کروانے کا جو کام کرنے جا رہا تھا، اس سے ماہ بانو کے لیے خطرہ بہت بڑھ جاتا۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر تو اس نے رفیق کھوکھر کو اخبار میں اس کا اسکیچ چھاپنے سے روک دیا تھا کہ کہیں کوئی اسے پہچان نہ لے اور وہ اپنی پناہ گاہ میں غیر محفوظ ہو جائے۔ اب چودھری انعام کے لالچ کے ساتھ باقاعدہ تصویر چھپواتا تو خطرہ کئی گنا بڑھ جاتا۔ کوئی دارالامان، فلاحی ادارہ یا کسی ہمدرد کا گھر... کسی بھی جگہ جہاں وہ چھپی ہوئی تھی، ایسا کوئی فرد ہو سکتا تھا جو لالچ میں آ کر چودھری کو اس کا ٹھکانا بتا دے۔

''آپ کس سوچ میں پڑ گئے سر؟'' اس کی خاموشی کو محسوس کر کے ماسٹر آفتاب نے اسے ٹوکا۔

''نہیں، کچھ نہیں۔ بس میں کچھ معاملات پر غور کر رہا تھا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔

www.pkdigest.com

مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی تمہارا تعاون ہمارے ساتھ رہے گا۔''

''اس بات کا تو آپ سو فیصد یقین رکھیں۔ آپ اور میں ایک ہی مشن پر کام کر رہے ہیں اس لیے یہ ممکن نہیں کہ میں آپ کی مدد سے کبھی انکار کروں۔'' وہ شہریار کے جملوں سے ملاقات کا وقت ختم ہونے کا اشارہ بھانپ گیا تھا۔ اس لیے خود بھی گفتگو کو اختتامی رخ دیتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور مصافحہ کرنے کے بعد روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

''کچھ کھانے کو دو نا اماں! بڑی بھوک لگ رہی ہے۔''

نوراں الیاس کا منہ ہاتھ دھلا کر اسے ایسے ہی مدرسے کی طرف دھکیلنے کے چکر میں تھی لیکن وہ رات بھی بھوکے پیٹ سویا تھا اس لیے اس وقت کسی سمجھوتے پر راضی نہیں تھا۔

''ابھی ایسے ہی چلا جا۔ دیر ہو رہی ہے، واپس آ کر کھانا کھا لینا۔ اگر مدرسے دیر سے پہنچا تو مولوی صاحب کی مار کھانی پڑے گی۔'' نوراں نے اسے سمجھا بجھا کر اور ذرا دھمکا کر ایسے ہی مدرسے جانے پر راضی کرنے کی کوشش کی۔

''میں کھا لوں گا مار، پر تم مجھے کچھ کھانے کو دو۔'' وہ بھی اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔

''کہاں سے دوں تجھے کھانے کو۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں ہے۔ جا... جا کر اپنے باپ سے بول، وہ کرے کا تیرے دوزخ کا بندوبست۔'' وہ خود بھی بھوکی تھی اس لیے بچے کی مسلسل ضد پر چڑ گئی۔

''میں کیا اپنی بوٹیاں کاٹ کر تیرے لاڈلے کو کھلاؤں۔ کہتی ہے تو کھلا دیتا ہوں۔ تیری جنی ہوئی ایک اولاد میرا نصیب تو پہلے ہی کھا گئی ہے، اس دوسرے کو میں اپنا آپ کھلا دیتا ہوں۔'' غیاث محمد صحن میں بچھی چارپائی پر سیدھا لیٹا تھا۔ نوراں کی بات اس کے کان میں پڑی تو بلند آواز میں اپنے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرنے لگا۔ ماہ بانو کے غائب ہو جانے سے اس کا عزت دار بننے کا خواب جو ٹوٹا سو ٹوٹا تھا، ساتھ ہی فاقوں کی نوبت بھی آ گئی تھی۔ کئی دن ہوئے چودھری نے اس کے کام پر آنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ نوراں کا بھی حویلی میں داخلہ بند ہو چکا تھا۔ ایسی صورت میں ان کا دال دلیا آخر کس طرح چلتا۔ چودھری کے عتاب کا نشانہ بننے والے شخص کے تو سائے سے بھی گاؤں کا ہر فرد بچ رہا تھا اس لیے کسی یار دوست سے بھی مدد کی کوئی توقع نہیں تھی۔ یار دوستوں کا کیا ذکر یہاں تو اپنے سگے بھائی اور برادری والوں نے منہ موڑ لیا تھا۔ بیٹیاں الگ اپنے اپنے گھروں میں مجبور بیٹھی تھیں۔ غیاث محمد کے گھر میں فاقے نہ اترتے تو کیا ہوتا۔

روٹی کا ٹکڑا

بچہ پٹ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر ندامت نہیں تھی۔ وہ ایسے کھڑا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ عورت اسے پیٹ رہی تھی۔

''جا... جا کر جمعدار ہو جا... تو بھی بھنگی بن جا۔ تو نے ان کی روٹی کیوں کھائی...؟''

بچے نے معصومیت سے کہا۔ ''ماں! کیا ان کے گھر کا ایک ٹکڑا کھا کر میں بھنگی ہو گیا؟''

''اور نہیں تو کیا؟''

''اور جو کالو بھنگی ہمارے گھر میں پچھلے دس برسوں سے روٹی کھا رہا ہے۔ وہ پنڈت کیوں نہیں ہو گیا؟'' بچے نے پوچھا۔

ماں کا اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔ وہ کبھی اپنے بچے کو دیکھتی، کبھی اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا روٹی کا ٹکڑا دیکھتی۔

(ہندی پنجابی ادب... بھوپیندر سنگھ)

(انتخاب: محمد الیاس چوہان، کراچی)

''راتب''

سرکاری افسر کو تین چار ماتحتوں کے ساتھ اپنی دکان کی طرف آتا دیکھ کر اس نے اپنی حالت ٹھیک کی اور جلدی سے گدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ جوڑ کر انہیں سلام کیا اور بٹھانے کے لیے اپنی دھوتی کے پلو سے کرسیاں صاف کرنے لگا۔

وہ لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے کھانے کے لیے خشک میوہ اور پینے کے لیے پھلوں کا رس آ گیا۔ افسر نے کھانے پینے کے بعد اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیریں اور دکاندار سے حساب کتاب کا رجسٹر لے کر جانچ پڑتال کرنے لگا۔ ایک صفحے پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔ وہ حیران بھی ہوا اور مسکرایا بھی۔ اس نے وہ صفحہ اپنے ماتحتوں کو دکھایا۔ وہ بھی پڑھ کر مسکرانے لگے۔

''کیسے لوگ ہیں...؟ انکم ٹیکس بچانے کے لیے کتے کو ڈالی گئی، روٹی کے ٹکڑے کا خرچ بھی درج کر دیتے ہیں۔''

کھلے ہوئے صفحے پر لکھا تھا۔

''12-2-89... کتے کا کھانا، 50 روپے۔''

دکاندار بھی ہی ہی کرتا ہوا ان کے ساتھ ہنسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوگ چلے گئے۔

دکاندار نے رجسٹر دوبارہ کھولا... خشک میوے سے لے کر جوس تک سارا خرچ جوڑا اور رجسٹر میں ایک نئی سطر لکھی۔

''29-8-89... کتوں کا کھانا=/150 روپے۔''

(ہندی پنجابی ادب۔ درشن متوالہ)

(انتخاب: محمد الیاس چوہان، کراچی)

"جا میرا پتر! ابھی چپ کر کے پڑھنے چلا جا۔ پڑھنے کے بعد اللہ سے دعا کرنا کہ وہ ہمارے کھانے کے لیے کچھ بندوبست کر دے۔ اللہ تیری دعا ضرور سنے گا۔" غیاث محمد کا از حد بگڑا ہوا مزاج دیکھ کر نوراں نے ایک بار پھر بیٹے کو ہی سمجھانے کی کوشش کی۔ کچھ دیر قبل وہ لوگوں کے گھروں کے باہر پڑے سبزیوں اور پھلوں کے چھلکے چن کر لائی تھی اور رات بھر سے میں، میں کرتی بھوکی بکری کے آگے وہ چھلکے ڈال کر اس کی میں میں بند کرنے کا انتظام کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ بکری کا پیٹ بھرے گا تو اس کے سوکھے ہوئے تھن سے ایک بار پھر دودھ کی دھار نکل کر ان کے پیٹ کی آگ بجھانے کا بندوبست کرے گی۔ کھیتوں کی طرف ان میاں بیوی کا داخلہ بالکل ممنوع ہونے کی وجہ سے وہ اس معصوم جانور کے پیٹ بھرنے کے لیے بھی کچھ کرنے سے قاصر رہتے تھے۔ اور یہ تو شاید ساری دنیا کا اصول ہے کہ کسی سے کچھ پانے کے لیے پہلے اسے کچھ دینا پڑتا ہے۔ وہ بکری کو اس کے پیٹ بھرنے کا سامان مہیا نہیں کر پائے تھے تو وہ ان کے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اپنا دودھ کیسے دان کرتی۔ پھلوں اور سبزیوں کے چھلکے جمع کر کے اسے کھلانے کا خیال نوراں کو صبح گلی میں جھانکنے کے بعد آیا تھا۔ لوگوں کے گھروں کے سامنے پڑے چھلکے سمیٹنے کا یہ کام بہت ذلت آمیز تھا لیکن وہ پاپی پیٹ کی خاطر سب سے نظریں چرا کر یہ کام کر گزری تھی اور اب بکری کی طرف سے امید باندھ کر بیٹھی ہوئی تھی لیکن فی الحال تو اس کے پاس ایسا کچھ نہیں تھا کہ الیاس کو کھلا پلا سکتی۔ بالآخر وہ اسے بہلا پھسلا کر مدرسے روانہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

"چودھری صاحب نے صاف کہا ہے کہ جب تک ماہ بانو زندہ یا مردہ نہیں مل جاتی، وہ ہرگز ہمیں معاف نہیں کریں گے۔ اب تو رب سے دعا کر کہ وہ نصیبوں جلی کہیں سے مر پڑ کر ہی سہی مل جائے تو ہماری جان اس عذاب سے چھوٹے۔" الیاس کے بسورتے ہوئے گھر سے روانہ ہونے کے بعد غیاث محمد نے جلتے ہوئے انداز میں نوراں کو مشورہ دیا۔ اس نے یہ مشورہ سنا اور خاموشی سے گھر کے کام نمٹانے میں مصروف ہوگئی۔ گھر میں کرنے کو کام ہی کیا رہ گیا تھا۔ صفائی ستھرائی کے بعد وہ بالکل فارغ تھی۔ کچھ پکانے کو تھا نہیں جو ہانڈی چڑھتی اور جب کچھ پکایا کھایا ہی نہیں گیا تھا تو دھلنے والے برتن بھی کہاں سے آتے۔ حویلی کی مشقت اور مصروفیت کی عادی نوراں اندر باہر کے چکر لگا کر وقت کاٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ یہ چند گھنٹے آگے سرکیں گے تو الیاس کھانے کے مطالبے کے ساتھ ایک بار پھر گھر آ دھمکے گا۔ دو مختلف کیفیات میں گھری وہ بھی اس وقت غیاث محمد کی طرح یہی تمنا کر رہی تھی کہ زندہ یا مردہ کسی بھی حال میں ماہ بانو مل جائے تو یہ عذاب ان پر سے ٹلے۔ اس ایک کی قربانی دے کر وہ سب امن میں آ سکتے تھے اور اب تو وہ سوچ رہی تھی کہ قربانی کی بھی کیا بات تھی۔ اگر ماہ بانو زندہ حالت میں چودھری کو مل جاتی تو اس کی زندگی حویلی میں عیش کرتے ہوئے ہی گزرتی۔ کم از کم فاقوں سے مر جانے کے مقابلے میں تو اس کے نزدیک ہر طرح کی زندگی بہتر تھی۔ انہی لایعنی سوچوں کے درمیان بالآخر وقت گزر ہی گیا اور الیاس مدرسے سے واپس آ گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ آتے ہی کھانے کے لیے ہانک لگائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے اپنا سپارہ طاق پر رکھنے کے بعد آرام سے ہینڈ پمپ سے پانی نکال کر منہ ہاتھ دھویا اور بکری کے ساتھ چہلیں کرنے لگا۔

"الیاس پتر! تجھے بھوک تو نہیں لگ رہی؟" نوراں نے ڈرتے ڈرتے اس کے قریب آ کر سوال کیا۔

"نہیں اماں! میں نے تو کھانا کھا لیا۔ مدرسے میں سپارہ پڑھنے کے بعد میں نے اللہ میاں سے دعا مانگی کہ مجھے کھانے کے لیے کچھ دے دو۔ میں دعا مانگ کر آ رہا تھا تو مولوی صاحب نے روک لیا کہ کھانا کھا کر جانا۔ بڑا مزے کا گوشت کا سالن تھا ان کے پاس کھانے کے لیے۔" الیاس نے یوں چٹخارہ لیا جیسے ابھی تک زبان پر اس گوشت کا ذائقہ محسوس کر رہا ہو۔ نوراں جانتی تھی کہ مولوی صاحب کے لیے حویلی سے کھانا آتا تھا۔ گاؤں کی اکلوتی مسجد کا مولوی غلام محمد، چودھری کا منظور نظر تھا اس لیے خوب مزے میں رہتا تھا۔

"اور ہاں اماں! میں مدرسے سے واپس آ رہا تھا تو مجھے نگار آپا کے گھر کے باہر لوگوں کی بھیڑ دکھائی دی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ آپا کی طبیعت خراب ہے، اسے شہر کے اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔" الیاس کو یک دم یاد آیا تو اس نے نوراں کو اطلاع دی۔ اس اطلاع کو سن کر وہ بے چین ہوگئی۔ نگار کی طرف سے خوش خبری سن کر جو اطمینان ہوا تھا، اب اس کی طبیعت کی خرابی کا سن کر بے چینی میں ڈھل گیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ نگار کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہاں اب بھی تین چار عورتیں کھڑی ہوئی تھیں البتہ نگار کو اسپتال لے جایا جا چکا تھا۔

"دو دن سے بڑی بری حالت تھی بے چاری کی۔ درد رک ہی نہیں رہا تھا۔ دائی بے چاری نے تو اپنے سارے ٹوٹکے اور دوائیں آزما دیکھیں، پھر تھک ہار کر کہہ دیا ماسی ممتاز سے کہ اپنی نوں کو شہر کے اسپتال لے جاؤ۔ بڑی مشکل سے بھا

www.pkdigest.com

انور نے شہر جانے کے لیے گڈی کا بندوبست کیا ہے۔ اب رب کرے کہ وہ چاری نگار کی جان اور اس کا بچہ بچ جائے۔ جاتے وقت وہ جس بری طرح درد سے بے حال تھی مجھے تو ڈر ہی لگ رہا تھا۔"

"ہاں، اللہ جانے اچانک ہی لڑکی کو کیا ہو گیا۔ اتنی مشکل سے تو گود ہری ہونے کی خوشی ملی تھی اور رب لگتی کہوں تو ممتاز اپنی نوں کا خیال بھی بڑا رکھ رہی تھی پھر جانے اچانک کیا ہو گیا کہ چنگی بھلی کڑی کو درد شروع ہو گیا۔" دو عورتیں اس سے براہ راست مخاطب نہیں ہو رہی تھیں لیکن ان کے تبصروں کے نتیجے میں اسے ساری معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ وہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے وہ واپس گھر چلی آئی اور غیاث محمد کو ساری تفصیل سنائی۔

"تو اطمینان رکھ۔ نگار کو یہ خوشی پیر سرکار کے در سے ملی ہے۔ اس خوشی کو کچھ نہیں ہوگا۔" غیاث محمد نے اسے تسلی دی۔

"پر جب پیر سرکار کی آل اولاد ہی ہم سے خوش نہیں تو وہ ہمیں کوئی خوشی کیوں دیں گے؟ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کوئی سزا ہے۔" نوراں بے حد خوف زدہ تھی۔ شرک کے اندھیروں میں جکڑے ذہن اسی طرح کے خوف اور اندیشوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ شام ڈھلے جب نگار کی لاش گاؤں واپس آئی تو اس کا وہم حقیقت میں ڈھل گیا۔ میڈیکل سائنس سے ناواقف اوہام اور شکوک میں مبتلا عورت کو خبر ہی نہیں تھی کہ وہ جس خوش خبری کو پیر سرکار کی دین سمجھ رہی تھی، اس کا اول روز سے ہی نگار کا نصیب نہ بننا طے تھا۔ ایمبر یو کی ڈیولپمنٹ یوٹیرس کے بجائے فلوپین ٹیوب میں ہوئی تھی جہاں گروتھ کا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ اگر نگار کو کوئی با سہولت اسپتال میسر ہوتا تو ابتدا میں ہی الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے یہ بات سامنے آ جاتی اور بچے کی قربانی دے کر اس کی جان بچالی جاتی۔ اب تو وہ بے چاری شدید تکلیف سہنے کے بعد ٹیوب کے برسٹ ہو جانے کے نتیجے میں اپنی جان سے چلی گئی تھی۔ دوسری طرف اس کی اندھی عقیدت کا شکار ماں کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ ایسا پیر سرکار کے غیظ و غضب کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس غیظ و غضب کی وجہ سے جو چودھری افتخار کی ناراضی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

☆☆☆

"کون ہے؟" رات کافی گزر جانے کے باوجود اس کے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور وہ بڑے انہماک سے لکھنے میں مصروف تھا۔ دروازے پر ابھرنے والی غیر متوقع دستک نے اس کے انہماک میں خلل ڈالا اور میز پر دائیں جانب رکھے ٹائم پیس کی طرف ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے بلند آواز میں سوال کیا۔

"میں ہوں ماسٹر صاحب! رانی..." جواب میں باہر سے سرگوشی سے کچھ بلند آواز سنائی دی۔

"رانی! اس وقت..." حیرت سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے دروازے کا رخ کیا اور چٹخنی گرا دی۔ فوراً ہی بڑی سی چادر میں لپٹی ایک لڑکی اندر داخل ہوئی اور پلٹ کر تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ کمرے میں موجود روشنی میں وہ لڑکی کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ وہ لڑکی رانی نہیں تھی۔

"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا بی بی!" پہچان کا مرحلہ طے ہوتے ہی اس نے آنے والی کو ٹوکا۔

"میں شاید نہ آتی لیکن آپ نے مجبور کر دیا۔" وہ دھیرے سے بولتی ہوئی اس کرسی پر جا ٹکی جس پر کچھ دیر قبل وہ بیٹھا ہوا تھا۔

"میں نے... میں نے کب آپ کو مجبور کیا یہاں آنے پر؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کسی کی بات کا جواب نہ دیا جائے تو پھر اسے جواب لینے کے لیے خود چل کر آنا ہی پڑتا ہے۔" وہ اپنے خطوط کے جواب میں اختیار کی ہوئی خاموشی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ ماسٹر آفتاب نے ایک گہرا سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کی اچھی خاصی خوش شکل اور خوش بدن لڑکی تھی۔ خاندانی مرتبے کی بلندی نے لاشعوری طور پر اس میں ایک پُرغرور تمکنت پیدا کر دی تھی۔ وہ سوالی بن کر آئی تھی لیکن اس کا انداز شہزادیوں کا سا تھا۔

"جواب تو میں نے دے دیا تھا۔ کیوں اس راہ پر چلتی ہیں جس پر کانٹے ہی کانٹے بچھے ہیں؟ اس راہ پر چلیں گی تو پیروں کو زخموں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔" اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"دل کو جو روگ لگا ہے، اس کے بعد لگتا ہے کہ ہر زخم بے معنی ہے۔"

"آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں؟ اگر کسی نے آپ کو یہاں دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی۔ آپ نے تو یہاں آتے ہوئے یہ تک نہیں سوچا کہ میں یہاں تنہا نہیں رہتا۔ اگر اس وقت میرا ساتھی ٹیچر یہاں ہوتا تو آپ کیا کرتیں؟" وہ اس کا جواب سن کر جھنجلایا۔

"مجھے معلوم تھا کہ آج آپ تنہا ہیں اور آپ کا ساتھی اپنے گھر والوں سے ملنے گیا ہوا ہے۔ میں نے رانی سے سب کچھ معلوم کروا لیا تھا۔" اس نے اعتراف جرم کرنے والے انداز میں بتایا۔

"آپ اس وقت آئی کیسے ہیں؟ کیا رانی آپ کو لے کر آئی ہے؟" آفتاب نے چونک کر سوال کیا۔

"ہاں۔ رانی نے ہی میری خاطر یہ خطرہ مول لیا ہے۔ باہر وہ اور اس کا منگیتر تانگے میں بیٹھے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"مجھے بڑی حیرت ہے۔ آخر آپ نے رات کے اس پہر اپنی حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کے درمیان سے یہاں آنے کی راہ نکالی کیسے؟ آپ کو اپنے پکڑے جانے کا خوف محسوس نہیں ہوا؟" وہ پریشان سا کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"حیرت کی بھلا کیا بات ہے؟ آپ نے سنا نہیں کہ جہاں چاہ وہاں راہ۔ ویسے بھی دیواریں جتنی بلند اور مضبوط ہوں، ان کی قید سے گھبرا کر اتنے ہی چور راستے بنائے جاتے ہیں۔ رہی ڈرنے کی بات تو اب کسی بات سے ڈر نہیں لگتا۔ دل آج کل جس لے پر دھڑکتا ہے، وہ اتنی خوب صورت ہے کہ کسی بدصورتی کا خیال ہی نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کیفیت میں اگر موت بھی آ گئی تو وہ بھی بہت خوب صورت ہو گی۔" وہ بڑے جذب سے بول رہی تھی۔

"لیکن پھر بھی آپ کو ایسا..." وہ اب بھی اسے سمجھانا چاہتا تھا لیکن وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور اس کے قریب آ کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔

"ساری نصیحتیں، سارے ڈر اور سارے اندیشوں کو اس وقت بھول جائیں آفتاب! بس یہ سوچیں کہ میں کتنی مشکل سے اپنے آپ کو داؤ پر لگا کر یہاں آئی ہوں۔ میری اس ساری جدوجہد کو اپنے وہم اور اندیشوں کی نذر نہ کریں۔ مجھے کچھ دیر کے لیے اس بات پر خوش ہونے دیں کہ میں آپ کے ساتھ، آپ کے پاس ہوں۔" اس کی انگلیاں اب بھی آفتاب کے ہونٹوں پر تھیں۔ نرم و گداز ان چھوٹی ان انگلیوں کے لمس نے اس کے ہونٹوں پر قفل ڈال دیا تھا۔

"میری زندگی کی حقیقتیں اتنی تلخ ہیں کہ میں سوچتی تھی میرا کسی خواب پر کوئی حق نہیں۔ میں تو صرف لفظوں کی دنیا میں رہ کر اپنی زندگی گزار رہی تھی لیکن پھر جانے کیا ہوا؟ جس دن سے آپ کو دیکھا خواب خود ہی خود میری آنکھوں میں اترنے لگے۔ میں نے کوشش بھی کی، پر ان خوابوں کو اپنی آنکھوں سے نوچ کر پھینکنے کی ہمت نہیں کر سکی۔" وہ دوبارہ کرسی پر جا بیٹھی تھی اور سر جھکائے اپنی کیفیات بتا رہی تھی۔

"محبت بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ یک وقت آدمی کو بہت بزدل اور بہت بہادر بنا دیتی ہے۔ میں اس بات سے بہت ڈرتی ہوں کہ مجھے میرے خوابوں سے دست بردار ہونے کا حکم دیا جائے، دوسری طرف مجھے کسی شے سے کوئی خوف نہیں آتا۔ مجھے اس بات سے بھی ڈر نہیں لگتا کہ میں اس جرم میں جان سے ماردی جاؤں گی۔ ہاں میں اس بات سے ضرور ڈرتی ہوں کہ آپ میری محبت کو ٹھکرا دیں گے۔ میں آپ کو اس قابل نہیں لگوں گی کہ آپ میری محبت کو قبول کر سکیں۔ مگر پھر بھی میں آپ سے یہ سوال کرنے یہاں آ گئی ہوں۔ کیا آپ میری محبت کو قبول کریں گے آفتاب؟" جھکے سر کے ساتھ سوال کرتی کشور کے چہرے پر اتنی سچائی تھی کہ وہ جواب تک ساکت کھڑا تھا، نفی میں جواب نہیں دے سکا۔ ایک لڑکی جو بہت کمزور تھی صرف اس کی خاطر، اس کی چاہت میں سارے پہرے توڑ کر، اپنی جان کی پروا کیے بغیر رات کے اس پہر اپنی محبت کا انمول تحفہ لے کر اس کے در پر آئی تھی۔ وہ اسے مایوس لوٹانا بھی چاہتا تو اتنی ہمت کہاں سے لاتا؟ وہ تو خود اس شدت کے سامنے ہارنے لگا تھا۔

"میں ناشکرا نہیں ہوں کشور بی بی کہ بن مانگے خود چل کر اپنے در پر آنے والے خدا کے سب سے بڑے تحفے کو ٹھکرانے کی ہمت کر سکوں۔ میں آپ کے جذبے کی دل سے قدر کرتا ہوں لیکن میری آپ سے درخواست ہے کہ آئندہ کبھی خود کو یوں خطرے میں مت ڈالیے گا۔ آپ کو کوئی نقصان پہنچا تو مجھے بہت تکلیف ہوگی۔" جانے کون سا سحر تھا جس کے زیر اثر اس نے کشور کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر یہ جملے ادا کیے۔ کشور اس کے الفاظ سن کر کھل اٹھی۔

"آپ کی بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے آفتاب! آئندہ میں کبھی اس طرح یہاں نہیں آؤں گی۔ میں حویلی کی بلند دیواروں کے بیچ سانس لیتے ہوئے اس وقت کا انتظار کروں گی جب محبت اپنا کوئی معجزہ دکھائے گی۔" اس نے بہت جذب سے یہ جملے کہے اور اپنے ہاتھ پر رکھے آفتاب کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آفتاب نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ خوشبو کے ایک مہک رو جھونکے کی طرح اس کے قریب سے گزر کر باہر نکل گئی۔ باہر تاریکی میں وہ تانگا کھڑا تھا جس میں رانی اور اس کا منگیتر منتظر تھے۔ بڑی سی چادر میں چہرے سمیت اپنا سارا وجود چھپائے وہ تانگے کے قریب پہنچی اور تانگے میں سوار ہونے سے پہلے پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ آفتاب کا ہاتھ بھی خود بہ خود ہی اٹھ گیا۔ وہ پروہ لگے تانگے میں سوار ہوئی

www.pkdigest.com

تو تا نگا حرکت میں آ گیا۔ حرکت کرتا ہوا تانگا تاریکی کا حصہ بن کر نظروں سے اوجھل ہو گیا، تب بھی وہ بہت دیر تک یونہی کواڑ تھامے ساکت وصامت کھڑا رہا۔ کچھ دیر قبل جو کچھ ہوا تھا، خود اس کی اپنی سمجھ سے بھی باہر تھا۔

☆☆☆

خط کا مضمون پڑھنے کے بعد اس نے خط والے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ یہ ہلکے نیلے رنگ کا مقامی خط وکتابت کے لیے استعمال ہونے والا عام سا لفافہ تھا۔ لفافے پر اس کے آفس کا پتا لکھا ہوا تھا لیکن خط بھیجنے والے کا پتا موجود نہیں تھا۔ لفافے پر لگی ڈاک خانے کی مہر ذرا سی کوشش کے بعد آرام سے پڑھی جا سکتی تھی اور اس مہر سے ظاہر تھا کہ یہ خط نورکوٹ کے ڈاک خانے سے بھیجا گیا ہے۔ عام ڈاک سے آنے والے اس خط نے انہیں اچھی خاصی الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ معمول کے مطابق دفتر کے پتے پر آنے والی ڈاک کو پہلے عبدالمنان نے دیکھا تھا۔ عام نوعیت کی ڈاک کو ہمیشہ وہی دیکھتا تھا اور پھر وہ خطوط جن میں کوئی توجہ طلب مسئلہ ہوتا تھا، انہیں فائل کر کے شہریار کے سامنے پیش کر دیتا تھا لیکن آج صبح کی ڈاک سے آنے والا یہ خط اتنا عجیب وغریب تھا کہ وہ چونک گیا تھا اور باقی خطوط کے ساتھ اسے فائل کرنے کے بجائے فوری طور پر شہریار کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

خط کے مضمون نے اسے بھی الجھن میں ڈال دیا تھا اور وہ ایک بار اسے پڑھنے کے بعد پھر دوبارہ پڑھ رہا تھا۔ شکستہ لکھائی میں املا کی لاتعداد غلطیوں کے ساتھ دیہاتی طرز گفتگو میں لکھے گئے اس خط کے نفس مضمون سے ظاہر تھا کہ خط لکھنے والا بہت معمولی تعلیمی استعداد کا مالک ہے۔ خط بچوں کے اسکولوں میں استعمال ہونے والی سنگل لائن کی کاپی کے صفحات پر لکھا گیا تھا۔ نیلے بال پوائنٹ سے لکھے گئے اس خط کو پڑھنے کے لیے تھوڑی جدوجہد سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ خط لکھنے والے نے ابتدا میں باقاعدہ اسسٹنٹ کمشنر صاحب کا تخاطب استعمال کیا تھا لیکن املے کی غلطی کی وجہ سے اسسٹنٹ کمشنر کا لفظ اسٹیٹ کمشنر پڑھا جا رہا تھا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ دیہاتوں کے معمولی پڑھے لکھے کسی فرد کے ہاتھوں لکھے گئے خطوط میں اس طرح کی غلطیاں عام ہوتی تھیں مگر جو خط اس کے ہاتھ میں تھا، وہ اس اعتبار سے مختلف نوعیت کا تھا کہ اسے بھیجنے والے نے نہ تو لفافے کے اوپر اور نہ ہی خط کے آخر میں اپنا نام لکھا تھا۔ یہ خط کسی ذاتی ضرورت یا مسئلے کی نشان دہی کے لیے بھی نہیں لکھا گیا تھا۔ اس میں ایک اطلاع فراہم کی گئی تھی اور وہ اطلاع اس نوعیت کی تھی کہ خط لکھنے والے کا اپنا نام چھپانا سمجھ آتا تھا۔ خط لکھنے والے نے ابتدائی سطور میں اپنا جو مختصر سا تعارف لکھا تھا، اس کے مطابق وہ چودھری افتخار کے لیے کام کرنے والے کارندوں میں سے ایک تھا لیکن در اصل وہ چودھری کے ساتھ رہ کر موتی والا کے لیے کام کرتا تھا۔ موتی والا سے اسے اپنی اس وفاداری کی باقاعدہ قیمت ملتی تھی۔ موتی والا کی موت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے اس نے شک ظاہر کیا تھا کہ اس کے قتل میں چودھری کے بندے ملوث ہیں۔ خط لکھنے والے کے مطابق وہ جنگل میں کام کرنے والے آدمیوں میں سے ایک تھا اور شہریار کو پچھلی بار لکڑی کی اسمگلنگ سے متعلق دی جانے والی اطلاع کے لیے اسی نے معلومات فراہم کی تھیں۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں لکھا تھا کہ اب تک وہ معاوضہ لے کر ہر کام کرتا رہا تھا لیکن اس بار جذبۂ حب الوطنی نے اسے اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ جنگل سے لوٹی جانے والی قومی دولت کو بچانے کے لیے کوئی قدم اٹھائے۔ اس نے اپنے خط میں واضح کر دیا تھا کہ وہ ایک غریب اور بے حیثیت آدمی ہے اس لیے خود سامنے آنے کی ہمت نہیں کر سکتا لیکن دل سے اس بات کا خواہش مند ہے کہ ملک کے ساتھ دشمنی کرنے والے اور قومی دولت لوٹنے والوں کی روک تھام کے لیے کچھ کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے اس نے اطلاع دی تھی کہ چوبیس تاریخ کو شب بارہ بجے کے بعد سفید رنگ کی ایک بڑی سوزوکی پک اپ ابتدائی پروسس سے گزری ہوئی جانوروں کی کھالیں لے کر ضلع سے باہر جائے گی۔ اگر آپ چاہیں تو اس سوزوکی پک اپ کو روک کر اسمگلنگ کے اس مال کو پکڑ لیں اور ساتھ ہی اصل مجرموں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

"تمہارا کیا خیال ہے اس خط کے بارے میں؟" دوبارہ پورا خط پڑھنے کے بعد اس نے دو تین صفحات پر مشتمل اس خط کو تہ کر کے واپس لفافے میں رکھتے ہوئے عبدالمنان سے پوچھا۔

"حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا سر... لیکن پچھلی بار کے حوالے سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ خط لکھنے والا یہ بندہ موتی والا کے لیے کام کرتا رہا ہے۔ یقیناً چودھری افتخار جیسے بندے کے ساتھ کام کرتے ہوئے موتی والا مکمل طور پر اس پر اعتبار نہیں کرتا ہوگا اور اس نے اپنے کچھ مخبر وغیرہ اس کام پر لگائے ہوئے ہوں گے کہ وہ کسی بھی غیر معمولی بات کی اطلاع اسے پہنچا دیں۔ شاید پچھلی بار موتی والا نے ہمیں جو لوڈرز کے نمبر وغیرہ فراہم کیے تھے، وہ اپنے اس آدمی کے

ذریعے ہی حاصل کیے ہوں گے۔ چودھری کے ساتھ رہ کر اس کے مظالم برداشت کرنے والے کسی بندے کے لیے موتی والا مقابلتاً ایک مہربان آدمی رہا ہوگا۔ موتی والا کی موت پر صدمے کا شکار ہونے والا شخص حق نمک ادا کرنے کے لیے اتنی جرأت کر سکتا ہے کہ اس کے مشن کو سمجھتے ہوئے چودھری کو زک پہنچانے کا ایک موقع فراہم کرنے کی کوشش کرے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ کم از کم اس اطلاع پر کوئی کارروائی کرنے میں، میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ اطلاع صحیح اور غلط دونوں ہونے کے چانسز برابر ہیں۔ ہم صحیح کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی کارروائی کرتے ہیں، ہو سکتا ہے ہمیں کامیابی ہو جائے۔ اگر ناکامی بھی ہوئی تو کوئی حرج نہیں۔ کچھ نہ کرنے سے کچھ کر کے ناکام ہونا بہتر ہوتا ہے۔" عبدالمنان کی تائید کرتے ہوئے اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"لیکن ہم اس مسئلے کا کیا کریں گے جس کی وجہ سے پچھلی بار بھی ناکامی اٹھانی پڑی تھی۔ اس کام کے لیے ہمیں پولیس سے مدد تو لینی ہی ہوگی۔ اور پچھلے تجربے نے ہم پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ ایس پی معظم تارڑ، چودھری کے گروپ کا بندہ ہے۔ اس کی ہمدردیاں چودھری کے ساتھ ہیں۔ وہ اس بار بھی ایسا کوئی بندوبست کر دے گا کہ صورت حال پلٹ جائے۔" عبدالمنان نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

"اس بار ہم ایس پی کو انوالو ہی نہیں کریں گے۔ میرے ذہن میں جو پلان آ رہا ہے اس کے مطابق ہم چوبیس تاریخ کو اچانک ہی ایک ایس آئی اور چار پانچ کانسٹیبلز کو سیکیورٹی کے بہانے سے بلوائیں گے۔ میرے خیال میں یہ بہانہ کہ مجھے رات کے وقت سفر کرنا ہے اور اس کے لیے سیکیورٹی درکار ہے، کافی معقول رہے گا۔ بس تم یہ یقینی بنا لینا کہ ہمیں جو بندے بھیجے جائیں، وہ ایکٹیو ہوں اور فوری طور پر ایکشن لینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس ساری کارروائی کو میں خود ہینڈل کروں گا۔ پولیس والوں کو عین موقع پر یہ بات سمجھائی جائے گی کہ ہمیں ایک سوزوکی پک اپ کو روک کر اس کی تلاشی لینا ہے اور غیر قانونی اسمگلنگ کو روکنا ہے۔ میرے خیال میں پک اپ والوں کے ساتھ ایک دو مسلح افراد ہی ہوں گے اور ہم آسانی سے انہیں گھیر لیں گے۔" وہ حسب فطرت جوش میں آ چکا تھا اور منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

"میرے خیال میں یہ سب بہت رسکی ہو جائے گا سر! اس قسم کی مہم جوئی آپ کو سوٹ نہیں کرتی۔ یہ کام پولیس کا ہے اور انہیں ہی کرنا چاہیے۔" عبدالمنان نے زمانے کے بہت اتار چڑھاؤ دیکھ رکھے تھے، چنانچہ اس کے جوش میں ساتھ دینے کے بجائے اسے روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

"پولیس کی کارکردگی ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ میں دوبارہ ان لوگوں پر اعتبار کرنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔ اس طرح کے مواقع ہمیں بار بار نہیں مل سکتے۔ یہ دوسرا موقع ہے کہ ہمیں چودھری اور اس کے ساتھیوں کو بے نقاب کرنے کا چانس مل رہا ہے۔ اگر یہ بھی ضائع ہو گیا تو ہمارے لیے اس پر گرفت کرنا اور بھی مشکل ہوتا جائے گا۔ ویسے بھی ہم اس ساری کارروائی کو کسی ویل پلانڈ پروگرام کے بجائے اتفاق کے کھاتے میں ڈال دیں گے۔ پریس اور پبلک کے سامنے یہی شو کیا جائے گا کہ یہ معاملہ بالکل اتفاق سے سامنے آ گیا۔ اس سلسلے میں ہم یہ اسٹوری بنا سکتے ہیں کہ جس وقت میں سفر کر رہا تھا، اسی وقت سوزوکی پک اپ بھی سڑک سے گزر رہی تھی۔ پولیس والوں کے اشارہ کرنے کے باوجود بھی پک اپ نے راستہ نہیں دیا۔ پک اپ کا ڈرائیور بہت رف ڈرائیونگ کر رہا تھا اور اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ نشے میں ہے، اس لیے پولیس کی گاڑی نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اب اس کے بعد کی کہانی حالات کے مطابق بنائی جا سکتی ہے۔ اگر پک اپ والوں نے خاموشی سے گرفتاری دے دی تو بہت اچھی بات ہے، اگر انہوں نے مزاحمت کی تو پھر پولیس کے پاس جوابی کارروائی کا بہانہ موجود ہوگا۔ ہمارے ساتھ جو پولیس والے ہوں گے، اس کارکردگی کو دکھانے پر انہیں تھوڑے سے انعام یا ترقی وغیرہ کے لیے اپنی ہاں میں ہاں ملانے پر آسانی سے راضی کیا جا سکتا ہے۔" وہ لمحوں میں سب کچھ طے کر چکا تھا اور انداز اتنا اٹل تھا کہ عبدالمنان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ جو کچھ سوچ چکا ہے، اس سے پیچھے ہٹنا ہرگز بھی پسند نہیں کرے گا۔

"ٹھیک ہے سر! جیسا آپ کہیں۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟" نیم دلی سے راضی ہوتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"تم یہیں رہنا، میرے ساتھ صرف مشابرم خان جائے گا۔ وہ اسلحے کے استعمال سے اچھی طرح واقف ہے اس لیے اس کارروائی میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ تھوڑی بہت شوٹنگ وغیرہ تو مجھے بھی آتی ہے۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ تمہیں میں جان بوجھ کر اپنے ساتھ نہیں رکھ رہا ہوں۔ تم اپنے گھر پر ہی رہنا۔ گھر سے فون کر کے اپنی بیماری کا بہانہ کر کے ایمبولینس بلوا لینا۔ اس ایمبولینس کو تم ضرورت کے وقت کس طرح موقع پر لاتے ہو، یہ تمہاری صوابدید پر ہے۔ بس میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر کوئی

www.pkdigest.com

ٹکراؤ ہوا اور دونوں اطراف میں سے کوئی بھی بندہ زخمی ہو تو اسے فوری طور پر طبی امداد مل سکے۔" عبدالمنان کی پیشکش کو رد کرتے ہوئے اس نے اپنے ذہن میں موجود منصوبہ بتایا۔

"مجھے یہ معاملہ خطرناک لگ رہا ہے سر! خدانخواستہ اس کارروائی میں آپ کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو مجھے بہت سے لوگوں کے سوالوں کے جواب دینے پڑیں گے۔" عبدالمنان کچھ گھبرا رہا تھا۔ معاملہ بے حد نازک تھا۔ شہریار کی اس قسم کی کسی ایکٹیوٹی میں شمولیت کسی طور مناسب نہیں تھی اس لیے اپنے طور پر اس نے ایک بار پھر اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"وہ زندگی ہی کیا جس میں خطرہ نہ ہو۔ آدمی کو جو بڑے سے بڑا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، وہ اپنی جان جانے کا ہوتا ہے... تو جان بہر حال ایک نہ دن جانی ہے۔ کسی بہتر کام کو کرتے ہوئے چلی جائے تو کیا برائی ہے۔ البتہ اگر تم گھبرا رہے ہو تو میری طرف سے تم پر کوئی دباؤ نہیں۔ تم اس سارے معاملے سے الگ ہو کر خاموشی سے ایک طرف بیٹھ سکتے ہو۔ جب کوئی تم سے سوال کرے گا تو تم صاف کہہ سکو گے کہ اے سی صاحب نے جو کچھ کیا اپنی مرضی سے کیا اور تمہیں اس معاملے کی کوئی خبر نہیں تھی۔"

"آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں سر! میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں اپنی جان بچانا چاہتا ہوں۔ میں تو آپ کو معاملے کی نزاکت کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں آپ کی اپنی فیملی کے لوگ بھی اس بات کو پسند نہیں کریں گے۔" شہریار کی بات پر وہ کچھ شرمندہ ہو گیا تھا اس لیے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے ایک اور دلیل دی۔

"میری فیملی کے لوگ جانتے ہیں کہ میں سرپھرا ہوں۔ اگر تم ایک سرپھرے کا ساتھ دے سکتے ہو تو ٹھیک ہے، اگر نہیں دینا چاہتے تو کوئی زبردستی یا شکوہ نہیں۔ میں تو بہر حال وہی کچھ کروں گا جو طے کر چکا ہوں۔" شہریار نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"میں آپ کا ہر ممکن ساتھ دوں گا۔" اس بار عبدالمنان کا لہجہ بھی اٹل اور مضبوط تھا۔

☆☆☆

شہریار کی مرسیڈیز سبک رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ مرسیڈیز کے پیچھے پولیس جیپ تھی جس میں ایک اے ایس آئی اور چار کانسٹیبل سوار تھے۔

"بس یہیں روک لو۔" ایک ایسے موڑ پر پہنچنے کے بعد جس سے گزرنا ضلع سے باہر جانے والی ہر گاڑی کے لیے ناگزیر ہوتا تھا، اس نے مشاہرم خان کو حکم دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ صورتِ حال سے پوری طرح آگاہ تھا اور کافی مستعد اور چوکنا نظر آتا تھا۔ مرسیڈیز کے رکتے ہی پیچھے آنے والی پولیس جیپ بھی رک گئی۔

"خیریت ہے سر؟" فوراً ہی اے ایس آئی جیپ سے اتر کر مرسیڈیز کے قریب آیا۔

"ہاں، تم اندر آکر بیٹھو مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" بہت سنجیدگی سے دیے گئے اس حکم پر اے ایس آئی کچھ حیران نظر آیا تاہم اس نے حکم کی تعمیل میں تاخیر نہیں کی اور دروازہ کھول کر گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ شہریار نے جانچنے والی نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ جوان آدمی تھا اور اس کی عائد کردہ شرط کے مطابق کافی چاق و چوبند بھی نظر آتا تھا۔ البتہ اس اچانک پیش آنے والی صورتِ حال کے باعث اس کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی مگر وہ اپنے چہرے کو سپاٹ رکھنے میں کامیاب تھا۔

"اگر تمہارے شولڈر پر ایک پھول کا اضافہ ہو جائے تو تمہیں کیسا لگے گا؟" اس کی ظاہری شخصیت سے اس کی فطرت کا کسی حد تک اندازہ لگانے کے بعد شہریار نے اس سے سوال کیا۔

"ظاہر ہے سر... بہت اچھا۔" اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

"میرے خیال میں میرے پاس تمہاری اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ایک موقع ہے۔ کچھ دیر بعد اس جگہ سے ایک سفید سوزوکی پک اپ گزرے گی۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس سوزوکی کو روک کر تمہیں اس میں موجود بندوں کو گرفتار کرنا ہے۔ سوزوکی میں سے جو مال برآمد ہوگا اس کی برآمدگی پر تمہیں بہت سراہا جائے گا، ساتھ میں ترقی بھی پکی۔" سوزوکی پر لوڈ مال کی نوعیت اور اس سے چوہدری افتخار کا تعلق ظاہر کیے بغیر وہ عبدالمنان سے طے کیے ہوئے منصوبے کے چیدہ چیدہ نکات اسے سمجھاتا گیا۔ اے ایس آئی نے اس کی ساری بات بہت توجہ سے سنی۔

"میں سمجھ گیا ہوں سر! سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔" تفصیلات سننے کے بعد اے ایس آئی نے دبے دبے جوش کے ساتھ اسے یقین دہانی کروائی۔

"میں اور میرا ڈرائیور پیچھے رہ کر ساری کارروائی پر نظر رکھیں گے۔ اگر تمہیں مدد کی ضرورت ہوئی تو ہماری طرف سے مداخلت ہوگی ورنہ تم اور تمہارے ساتھی مل کر سب کچھ سنبھال لیں گے۔ ہر دو صورتوں میں کریڈٹ تمہیں ہی ملے گا۔ میرا بیان یہی ہوگا کہ اتفاقی طور پر مجرم نظر میں آئے اور تم نے

www.pkdigest.com

اپنی ٹیم کے ساتھ بروقت کارروائی کرتے ہوئے انھیں گرفتار کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا۔" شہریار نے اسے مزید یقین دہانی کروائی تو اس کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ جوش سے بولا۔

"آپ فکر ہی نہ کریں سر! انشاء اللہ آپ لوگوں کو زحمت کرنی ہی نہیں پڑے گی۔ میں اور میرے ساتھی سب سنبھال لیں گے۔"

"یہ یاد رکھنا کہ مجرموں کو زندہ گرفتار کرنا ہے۔ ان کے ذریعے ہم اصل بندے تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔"

"رائٹ سر! جیسا آپ کہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔" اے ایس آئی نے یقین دلایا۔

"ٹھیک ہے پھر تم جا کر اپنے سپاہیوں کو سمجھاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں رہا ہے۔" شہریار کے اس حکم پر وہ گاڑی سے اتر کر پولیس جیپ کی طرف چلا گیا۔ مشابرم خان نے طے شدہ حکمت عملی کے تحت مرسیڈیز سڑک سے کچے میں اتار لی۔ اب سڑک سے گزرنے والی کسی گاڑی سے مرسیڈیز کو دور سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف اے ایس آئی اپنے بندوں سے بات کر رہا تھا۔ شہریار دور سے ہی ان کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ ذرا دیر کی گفت وشنید کے بعد وہ لوگ حرکت میں آ گئے تھے۔ پولیس جیپ کے ڈرائیور نے جیپ سڑک پر بائیں جانب بالکل کنارے پر لے جا کر کھڑی کر دی تھی۔ رات کے اس پہر حسب معمول اس سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ اگر کوئی گاڑی گزرتی بھی تو پولیس جیپ کی وجہ سے اسے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ پولیس جیپ اسی وقت رکاوٹ بنتی جب مطلوبہ سفید سوزوکی پک اپ وہاں سے گزرتی۔ اے ایس آئی دو سپاہیوں کے ساتھ جیپ میں ہی بیٹھا ہوا تھا جبکہ دو سپاہیوں نے سڑک پر دائیں جانب ذرا نیچے آ کر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ شہریار کی گاڑی ان سے ذرا فاصلے پر پیچھے اور پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ تاہم یہ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیاں ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتیں۔ انتظار کے سنسنی خیز لمحات آہستہ آہستہ گزرنے لگے۔ ایک گمنام خط پر کی جانے والی یہ کارروائی ٹوٹلی رسک تھی۔ بہت ممکن تھا کہ اس کارروائی کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور سرے سے ایسی کوئی گاڑی سڑک پر نمودار ہی نہیں ہوتی جس کا خط میں ذکر کیا گیا تھا۔ مگر امکان تو اس بات کا بھی تھا کہ خط میں فراہم کی جانے والی اطلاع درست ہو۔ وہ خود کو ملنے والے اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے موہوم سی امید کے سہارے ہی یہ سارا کھڑاگ پھیلا کر بیٹھ گیا تھا۔

ناکامی کی صورت میں اے ایس آئی اور سپاہیوں کو تھوڑی بہت رقم دے کر خاموش رہنے کا حکم دیا جا سکتا تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ آف دی ریکارڈ تھا اس لیے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا تو بھی بات چند لوگوں کے درمیان ہی ختم ہو جاتی۔ حسب خواہش نتیجہ نکلنے کی صورت میں اتفاق والا کھاتہ کھلا ہوا تھا۔ اس کھاتے میں مطلوبہ کارروائی ڈال کر کام بھی ہو جاتا اور اے ایس آئی کے بھی مزے آ جاتے۔ انتظار کے بوجھل لمحے گزرتے چلے گئے۔ آخر تاریک سڑک پر سوزوکی پک اپ کی سفیدی جھلکی۔ شہریار کو اپنے جسم میں خون کی گردش تیز ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اسے یقین تھا کہ باقی لوگ بھی اسی کیفیت سے گزر رہے ہوں گے۔ البتہ اس کی بے چینی اس لیے سوا تھی کہ چاہنے کے باوجود وہ خود ایکشن میں نہیں آ سکتا تھا۔ اسسٹنٹ کمشنر کی پوسٹ نے اس کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اعلیٰ عہدے اور اونچے مقامات بھی کسی گرداب کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے بیچ پھنسا آدمی ان دیکھے دائروں میں قید خود ہی اپنے باحیثیت ہو کر بے عمل ہونے کی اذیت سے گزرتا رہتا ہے۔ اس وقت وہ اسی اذیت سے دوچار تھا۔ اس کی مہم جو فطرت کہتی تھی کہ میدان عمل میں اتر کر خود بچھ کر گزرے لیکن عہدے کا تقاضا تھا کہ وہ خود پر بند باندھے رکھے۔ فی الحال اس نے یہی کیا اور ہونٹ بھینچے سڑک کا منظر دیکھتا رہا۔ سوزوکی پک اپ کو دیکھ کر پولیس جیپ کا انجن ایک غراہٹ کے ساتھ جاگ گیا تھا اور پولیس جیپ بہت تیزی سے حرکت کرتی ہوئی سڑک کے وسط میں آ رکی تھی۔ پیچھے سے آنے والی سوزوکی پک اپ کو لامحالہ رکنا پڑا۔ پک اپ کے رکتے ہی اس میں سے شلوار قمیص میں ملبوس شخص ڈرائیونگ سیٹ کی طرف والا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اے ایس آئی بھی جیپ سے اتر آیا۔ پھر اس کے اور سوزوکی ڈرائیور کے درمیان گفتگو ہونے لگی۔ ان دونوں کی آوازیں زیادہ بلند نہیں تھیں اس لیے وہ لوگ اس گفتگو کو صرف بھنبھناہٹ کی صورت میں سن سکتے تھے۔ تاہم گفتگو کی نوعیت کا شہریار کو اندازہ تھا۔ اے ایس آئی نے یقیناً سوزوکی ڈرائیور سے تلاشی کی بات کی تھی۔ ذرا سی پس وپیش کے بعد وہ راضی ہوتا ہوا نظر آیا۔ اس کی رضامندی اور سکون نے شہریار کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ایک تو وہ شخص اکیلا تھا، دوسرے اس بات پر فکرمند بھی نظر نہیں آتا تھا کہ سوزوکی کی تلاشی کی صورت میں وہاں سے کوئی قابل اعتراض شے برآمد ہو سکتی ہے۔ اے ایس آئی کے ساتھ موجود کانسٹیبل اس کے اشارے پر تلاشی لینے کے لیے آگے بڑھ گئے تھے، تاہم

دائیں طرف موجود دونوں سپاہی بدستور اپنی پوزیشن پر جمے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہیں سپاہیوں اور سوزوکی پک اپ کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ خاموش انجن والی وہ جیپ پیچھے سے کب نمودار ہوئی، انھیں اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس آف تھیں اور ان لوگوں کی نگاہوں نے اسے اس وقت نوٹس کیا تھا جب وہ بالکل قریب آ چکی تھی۔ اس جیپ کو سڑک پر سے گزرنے والے معمول کے ٹریفک کا حصہ قرار دے کر آسانی سے گزرنے کا راستہ دیا جا سکتا تھا لیکن جیپ کے ڈرامائی انداز میں نمودار ہوتے ہی ہر شخص اپنی جگہ ٹھٹک گیا تھا۔ جیپ پک اپ سے کافی پیچھے رک گئی تھی۔ تلاشی کے لیے آگے بڑھنے والے کانسٹیبلز بھی اپنی جگہ رک کر اسے دیکھ رہے تھے۔ جیپ میں سوار لوگوں کے بارے میں جانے بغیر کوئی ردعمل نہیں ظاہر کیا جا سکتا تھا۔ اے ایس آئی کے اشارے پر ایک کانسٹیبل شاید یہی جاننے کے لیے اس طرف بڑھنے لگا تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے صورت حال یک دم ہی بدل گئی۔ جیپ کی پچھلی نشستوں پر سوار افراد نے دائیں اور بائیں دونوں جانب سے چھلانگیں لگائیں اور جیپ جس کا انجن ابھی تک بند نہیں کیا گیا تھا، تیزی سے متحرک ہو کر سڑک پر اس انداز میں آڑی کھڑی کر دی گئی کہ جیپ سے چھلانگیں لگا کر اترنے والوں کو آڑ مل گئی۔ پھر فضا میں کلاشنکوف کا برسٹ چلنے کی آواز گونجی اور جیپ کی طرف بڑھنے والا سپاہی ایک جھٹکے سے الٹ کر پیچھے کی طرف گرا۔ یہ ساری کارروائی لمحہ بھر میں ہوئی تھی اور کوئی شخص بھی کچھ سمجھ نہیں پایا تھا مگر پھر اے ایس آئی اور اس کے ساتھ موجود کانسٹیبل نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے خود کو پک اپ کی آڑ میں کر لیا تھا۔ پک اپ کا ڈرائیور بھی اس دوران کہیں پناہ لے چکا تھا۔ اب پولیس والوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ دونوں طرف کے فائر بے سود جا رہے تھے اور کوئی بندہ ان فائروں کی زد میں نہیں آ رہا تھا۔

"میں آگے جا کر پولیس والوں کی مدد کرتا ہوں سر!" مشابرم خان کے پاس رائفل تھی اور وہ اسے استعمال کرنے کے لیے بے چین نظر آتا تھا۔ اپنی بات کہنے کے بعد وہ رکا نہیں اور اپنی جانب موجود کانسٹیبلز کے قریب پہنچ کر ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ شہریار ابھی تک میدان عمل میں نہیں اترا تھا لیکن اس کی نظریں ہر طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ جذبات میں آ کر وہ ایک غلط قدم اٹھا چکا ہے۔ اسے ملنے والا گمنام خط اس کے کسی ہمدرد نے نہیں بلکہ دشمن نے لکھا تھا۔ اسے باقاعدہ منصوبہ بندی بنا کر گھیرا گیا تھا۔ وہ جو اپنے تئیں بہت اچانک مجرموں کے سر پر پہنچ کر انھیں زک پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا، خود گھر چکا تھا اور ایک بڑا نقصان بھی اٹھا چکا تھا۔ سڑک پر پڑی کانسٹیبل کی لاش اس کے نقصان کا ثبوت تھی۔ پھر ایک نقصان اور سامنے آیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے بیچ ابھرنے والی انسانی چیخ بہت بھیانک تھی۔ قاتل اور مقتول دونوں اس سے پوشیدہ نہیں رہے تھے۔ گولی کھا کر گرنے والا جواں سال اے ایس آئی تھا۔ اس پر گولی پک اپ کے ڈرائیور نے چلائی تھی۔ وہ نہ جانے کس طرح پولیس جیپ کی آڑ لینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور پشت پر سے فائر کر کے اس نے اے ایس آئی کو نشانہ بنایا تھا۔ اس دوسرے نقصان کے بعد شہریار کے لیے میدان عمل سے دور رہنا ممکن نہیں رہا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور رینگ کر اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے پک اپ ڈرائیور کی طرف ریوالور کا رخ کر کے گولی چلائی۔ اس کی چلائی گئی گولی ضائع نہیں گئی اور پک اپ ڈرائیور کی چیخ فضا میں ابھری لیکن وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ گولی نے صرف پک اپ ڈرائیور کے بازو کو نقصان پہنچایا ہے۔ گولی کھا کر بھی پک اپ ڈرائیور نے اپنی حرکت نہیں روکی تھی۔ غم اور غصے سے بے حال شہریار اسے نشانہ بنانے کے لیے جوش میں اندھا دھند آگے بڑھا۔ اپنے اس جوش میں وہ اس پوزیشن میں آ گیا تھا کہ اس کے اپنے ساتھیوں کو فائر روکنا پڑا۔

"نیچے لیٹ جائیں سر!" وہ ہاتھ سیدھا کر کے پک اپ ڈرائیور پر دوسرا فائر کرنا چاہتا تھا کہ مشابرم خان کی تیز آواز ایک جھٹکے سے اسے ہوش میں لائی۔ اس نے تیزی سے خود کو نیچے گرایا لیکن اس دوران کہیں سے وہ فائر ہو چکا تھا جو یقیناً اس کے جسم کے کسی حصے کو نشانہ بنا کر ہی کیا گیا تھا لیکن اس فوری حرکت کی وجہ سے گولی جسم کے کسی حصے میں پیوست ہونے کے بجائے اس کے دائیں شانے کو رگڑتی ہوئی گزر گئی۔ اس رگڑ کا نتیجہ بھی ایک آتشیں درد کی صورت میں تھا۔ تاہم اسے اندازہ تھا کہ حماقت کے باوجود اچھی خاصی بچت ہو گئی ہے۔ اس پر ہونے والے اس فائر کے بعد صورت حال تیزی سے بدلنے لگی۔ یوں لگا کہ سامنے والی پارٹی مقابلہ ختم کر کے فرار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ اگلے دو منٹوں میں یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔ مجرموں کی جیپ کا انجن زوردار آواز میں غرایا اور پھر فضا میں ٹائروں کی چرچراہٹ گونجی۔ ان لوگوں کی طرف سے جیپ پر فائر کیے گئے لیکن متحرک جیپ کا ڈرائیور بڑی مشاقی سے اسے موڑ کر واپس پیچھے کی طرف لے گیا۔ جیپ لمحہ بہ لمحہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی

www.pkdigest.com

لیکن وہ اسے روکنے کے لیے کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ مجرموں کی پک اپ اور پولیس جیپ دونوں کے ٹائر فائرنگ کے نتیجے میں برسٹ ہوچکے تھے اور شہریار کی مرسیڈیز کافی پیچھے کھڑی تھی۔ ویسے بھی اب وہ مفرور مجرموں سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی فکر میں مبتلا تھا۔ کانسٹیبل کے بارے میں تو اسے یقین تھا کہ وہ زندہ نہیں ہوگا۔ چیک کرنے پر اس یقین کی تصدیق ہوگئی۔ اے ایس آئی کی طرف سے جو موہوم سی امید تھی، وہ بھی اس کی خاموش نبض نے توڑ دی۔ وردی پر ایک اور پھول سجانے کے شوق میں اس بے چارے کی پوری وردی گل رنگ ہوچکی تھی۔ اس کے ساتھ موجود کانسٹیبل البتہ زخمی ہونے کے باوجود زندہ تھا۔ اسے کوئی جان لیوا زخم نہیں لگا تھا۔ گولیوں نے اس کے ایک بازو اور ایک ٹانگ کو نشانہ بنایا تھا۔ ان زخموں سے خون کا اخراج تھا لیکن امید کی جاسکتی تھی کہ طبی امداد ملنے پر وہ ٹھیک ہوجائے گا۔

"اس کے زخموں پر کچھ باندھو مشابرم خان!" ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے اس نے مشابرم خان کو حکم دیا۔ احتیاطی تدبیر کے طور پر وہ عبدالمنان کو جس ایمبولینس کے لیے کہہ کر آیا تھا، اب اسے اس کا انتظار تھا۔ اگر ایمبولینس نہ آتی تو وہ وقت ضائع کیے بغیر اپنی گاڑی میں بھی زخمی کو لے کر اسپتال کے لیے روانہ ہوسکتا تھا لیکن ایمبولینس آجاتی تو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ایمبولینس میں ہی زخمی کو فوری طبی امداد دے دی جاتی۔

"سر! آپ کو بھی زخم لگا ہے۔ میں آپ کے زخم کو دیکھ لیتا ہوں۔" مشابرم خان سے پہلے کانسٹیبل خود اپنے زخمی ساتھی کی مدد کے لیے پہنچ گئے تھے اس لیے وہ شہریار کے قریب آکر اس سے بولا۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ معمولی زخم ہے۔ تم ایسا کرو گاڑی لاؤ، اب ہمیں وقت ضائع کیے بغیر اسپتال کی طرف روانہ ہوجانا چاہیے۔ ایمبولینس کا تو کوئی نام ونشان نظر نہیں آتا۔" وہ اندر ہی اندر اپنی حماقت اور ناکامی پر جھنجلایا ہوا تھا اس لیے شانے سے مسلسل ہونے والے خون کے اخراج کو نظر انداز کرتے ہوئے سخت لہجے میں مشابرم خان کو حکم دیا۔ وہ بے چارہ تو حکم کا بندہ تھا، نہ چاہتے ہوئے بھی حکم کی تعمیل کے لیے پیچھے کھڑی مرسیڈیز کی طرف بڑھ گیا مگر پھر مرسیڈیز کے استعمال کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مخصوص سائرن بجاتی ہوئی ایمبولینس سڑک پر نمودار ہوئی اور ان لوگوں کے قریب آکر رک گئی۔ ایمبولینس میں عبدالمنان موجود تھا جو جائے وقوعہ کا منظر دیکھ کر کافی کچھ سمجھ چکا تھا۔

"سر! آپ زخمی کانسٹیبل اور مشابرم خان کو ساتھ لے کر اسپتال کے لیے روانہ ہوجائیں، میں یہاں کے معاملات نمٹاتا ہوں۔" عبدالمنان کے اس مشورے پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور چپ چاپ خود ہی ایمبولینس میں جا بیٹھا۔ شدید قسم کا احساس شکست تھا جس نے اسے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ اس وقت وہ خود کو اس لائق بھی نہیں پارہا تھا کہ کچھ سوچ سمجھ سکے، البتہ اس کیفیت میں بھی اسے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ عبدالمنان سمجھ داری سے اس ساری صورت حال کو سنبھال لے گا۔

☆☆☆

جوتوں کی کھٹاکھٹ کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا اور سجاد رانا اندر داخل ہوا۔ وہ سویلین ڈریس میں تھا لیکن ظاہر ہے، باہر ڈیوٹی پر موجود سپاہی کے لیے بہ حیثیت ڈی آئی جی اس کی تکریم فرض تھی۔ سجاد رانا کی آمد سے لمحہ بھر پہلے سنائی دینے والی جوتوں کی کھٹاکھٹ یقیناً سپاہی کے زوردار سیلوٹ کا نتیجہ تھی۔

"کیا حال ہے؟" بیڈ کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے شہریار سے دریافت کیا۔

"ٹھیک ہوں۔ گولی بس چھو کر گزر گئی تھی اس لیے کچھ زیادہ گہرا زخم نہیں آیا۔ یہ تو ڈاکٹرز نے زبردستی مجھے روک رکھا ہے ورنہ میرے خیال سے تو میں بالکل فٹ ہوں اور گھر جاسکتا ہوں۔"

"ہر معاملے میں اپنی ذاتی رائے کے مطابق عمل کی کوشش مت کیا کرو۔ جو کام جس کا ہو، وہی کرے تو مناسب رہتا ہے۔" سجاد رانا کا موڈ کچھ خراب تھا۔ وہ اس بات کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

"کیا ہوا تھا؟ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے حد درجہ سنجیدگی سے سوال کیا۔

"تفصیل تو کچھ خاص نہیں، بس میں ایک جگہ کا دورہ کرنے کے بعد واپس آرہا تھا تو راستے میں کچھ نامعلوم لوگوں سے تصادم ہوگیا۔ وہ تو اتفاق ہی تھا کہ میں واپسی میں دیر ہوجانے کے امکان کے پیش نظر سیکیورٹی کے خیال سے پولیس والوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا اس لیے بچت ہوگئی۔ ان لوگوں نے بڑی جانفشانی سے حملہ آوروں کو مقابلہ کرکے انہیں پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کردیا، ورنہ شاید وہ مجھے ٹارگٹ بنانے میں کامیاب ہوجاتے۔ آپ پلیز خیال رکھیے گا کہ محکمے کی طرف سے ان لوگوں کو اس کارکردگی پر کوئی انعام وغیرہ دے دیا جائے۔ خاص طور پر ہلاک ہونے والے اے ایس

آئی اور کانسٹیبل کے لواحقین کے لیے مالی اعانت کا بندوبست ضرور ہونا چاہیے۔ میں نے ماموں جان سے بھی اس سلسلے میں بات کی تھی۔ انہوں نے یقین دلایا ہے کہ وہ کوشش کریں گے پھر بھی چونکہ معاملہ آپ کے محکمے کا ہے، اس لیے میں آپ سے خاص طور پر درخواست کررہا ہوں۔"

"حملہ آوروں نے تمہیں ٹارگٹ بنانے کی کیوں کوشش کی؟ تم سے انہیں کیا دشمنی تھی؟" سجاد رانا نے اس کی بات توجہ سے سنی ضرور لیکن اس پر کسی قسم کا اظہار رائے کیے بغیر تفتیش کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کی خبر سن کر فوری طور پر اسپتال نہیں پہنچ سکا تھا اور فون پر مختصر سی بات کرکے اپنی تسلی کرلی تھی لیکن اب فرصت میں اس کے پاس بیٹھا بال کی کھال نکال رہا تھا۔

"دشمنی کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے، ظاہر ہے میں اپنے ضلع میں جو کام کررہا ہوں اس پر بہت سے لوگوں کو اعتراض ہوسکتا ہے... بلکہ ہے۔ انہی لوگوں میں سے کسی نے مجھے تنبیہ کرنے کے لیے یہ کارروائی کی ہوگی۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، حملہ آوروں کا مقصد مجھے قتل کرنا نہیں بلکہ صرف ڈرانا تھا، ورنہ وہ مجھ پر صرف ایک گولی چلانے پر اکتفا نہیں کرتے۔" وہ سجاد رانا سے حقیقت چھپانے کی کوشش کررہا تھا لیکن اپنے اس خیال پر اسے خود بھی یقین تھا کہ اس پر کیا جانے والا فائر ہلاکت خیز نہیں تھا۔ وہ جس بے دھڑک انداز میں باہر نکل گیا تھا، وہ لوگ چاہتے تو آسانی سے اسے ختم کرسکتے تھے لیکن انہوں نے صرف ایک گولی چلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

"اب وہ بات بھی بتادو جو تم نے ابھی تک مجھے نہیں بتائی ہے۔" سجاد رانا نے اسے گھورتے ہوئے حکم دیا۔

"سب کچھ تو بتا چکا ہوں۔ آپ کس بات کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟" وہ انجان بنا۔

"دیکھو شہریار! میں کوئی میڈیا کا بندہ نہیں ہوں کہ تمہاری بتائی ہوئی کہانی پر یقین کرلوں۔ بہت سے معاملات پہلے ہی میرے علم میں ہیں۔ تم مسلسل ایسی ایکٹیویٹیز میں انوالو ہو جو تمہیں سوٹ نہیں کرتیں۔ کبھی تم گھر سے بھاگی ہوئی ایک لڑکی کو سپورٹ کرنے کے لیے خوار ہوتے ہو تو کبھی لکڑیوں کی اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے خود میدان میں اتر آتے ہو۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ اس قسم کا کوئی معاملہ تمہارے علم میں آئے تو تم اسے پولیس کے سپرد کرکے خود ایک طرف ہٹ جاؤ۔ اس طرح خود ہر معاملے میں بھاگ دوڑ کرنا اور اپنی جان خطرے میں ڈالنا کسی بھی طرح ہوش مندی کی بات نہیں۔ مجھے شک ہے کہ تمہارے ساتھ پیش آنے والا حادثہ بھی تمہاری اپنی کسی ایکٹیویٹی کا نتیجہ ہے، ورنہ تو تمہارے آدھی رات کو کسی دورے سے آنے کی کوئی تک ہی نہیں بنتی۔ تم یہ مت سمجھو کہ میں تمہارے بے خبر رکھنے پر بے خبر رہ جاؤں گا۔ مجھے تھوڑی سی کوشش سے سب کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔"

سجاد رانا کا لہجہ غصیلا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس غصے کے پیچھے ان کی گہری محبت چھپی ہوئی ہے اس لیے ذرا برا نہ مانا مگر ایس پی معظم تارڑ کے لیے جو غصہ اس کے اندر دبا ہوا تھا وہ اس وقت باہر نہیں نکلتا، یہ ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ بیڈ کے سرہانے رکھے تکیوں سے ٹکی اپنی پشت کو سیدھا کرکے بیٹھتے ہوئے قدرے تلخی سے بولا۔ "آپ کی پولیس اس لائق ہے ہی کب کہ میں کسی معاملے میں اس پر اعتبار کرسکوں۔ جنگل سے لکڑیوں کی اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے ایک اتنا زبردست موقع مجھے ملا تھا لیکن اس ایس پی کی نمک حرامی کی وجہ سے معاملہ بگڑ گیا۔ وہ خبیث شخص پولیس کی وردی پہن کر مجرموں کی پشت پناہی کرتا ہے۔ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد ہی میں رسک لینے پر مجبور ہوا تھا۔" وہ سجاد رانا کو ساری تفصیلات سناتا چلا گیا۔

"اس طرح ایک گمنام خط پر کارروائی کے لیے دوڑ پڑنا بھی تمہاری حماقت تھی۔ تمہارے مخالفین تمہاری جذباتیت کو سمجھ چکے ہیں اسی لیے انہوں نے تمہارے جذباتی پن کا فائدہ اٹھا کر تمہیں ٹریپ کرنے کی کوشش کی۔ وہ تمہیں مار بھی دیتے اگر تم ہمارے خاندان کا حصہ نہیں ہوتے۔ انہیں معلوم ہے کہ تمہیں کچھ ہوجاتا تو ہم سب مل کر ان کا ناطقہ بند کردیتے لیکن انہوں نے تمہیں یہ پیغام ضرور دیا ہے کہ وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں، اس لیے تم کچھ ہونے سے پہلے سنبھل جاؤ۔" اس کے خاموش ہونے کے بعد سجاد رانا نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"مگر میں انہیں بتادوں گا کہ میں ان کے ہتھکنڈوں سے ڈر کر پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے انہیں کھل کھیلنے کا موقع ہرگز نہیں مل سکے گا۔"

"پھر وہی جذباتیت... تم جس سیٹ پر ہو وہاں اس جذباتیت سے کام نہیں چلتا۔ کچھ نہیں تو اوپر والے ہی اعتراض کرسکتے ہیں اس لیے میری مانو تو کچھ عرصے خاموش رہ کر سکون سے کام کرو۔ میں اور پاپا مل کر کوشش کریں گے کہ تمہارے ضلع میں کچھ ایسی انتظامی تبدیلیاں کردی جائیں کہ تمہیں اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا تعاون مل جائے یا پھر اگر تم کہو تو تمہارا کسی دوسری جگہ ٹرانسفر کروادیتے ہیں۔" سجاد

www.pkdigest.com

رانا نے اسے تنبیہ کرنے کے ساتھ تسلی بھی دی اور ایک تجویز بھی پیش کی۔

"ہرگز نہیں۔ ٹرانسفر تو میں کسی صورت نہیں کرواؤں گا۔ میرے مخالفین کی تو سب سے بڑی خواہش ہی یہ ہوگی کہ مجھے کہیں اور ٹرانسفر کر دیا جائے لیکن آپ سب اس بات کو دھیان میں رکھیے گا کہ میری مرضی کے خلاف میرا کہیں ٹرانسفر نہ ہو سکے۔ میں واضح تبدیلی وقوع پذیر ہونے تک اپنی سیٹ پر جما رہنا چاہتا ہوں۔"

"او کے! نہیں ہوگا ٹرانسفر... لیکن تمہیں بھی دھیان رکھنا ہوگا کہ سنبھل کر اور خود کو بچا کر کام کرو۔ ضلع کے بااثر لوگوں سے براہِ راست ٹکر لینے سے جتنا بچ سکتے ہو، بچنے کی کوشش کرو... ورنہ وہ لوگ بھی اپنے تعلقات کی ڈوریاں ہلا کر تمہارے لیے مشکلات کھڑی کرنے کی کوشش میں لگ جائیں گے۔ طاقت اور اختیار کے اس گیم میں کب کس طرف کا پلڑا جھک جائے، کچھ معلوم نہیں ہوتا۔" سجاد رانا نے اسے یقین دہانی کروائی لیکن اپنے تجربے کی روشنی میں نصیحت کرنے سے بھی باز نہیں آیا۔

"میں کوشش کروں گا۔" شہریار نے اسے جواب دیا۔ تاہم جب وہ اسپتال سے روانہ ہوا تو اسے یقین تھا کہ شہریار نے کوشش بھی کی تو اپنے مزاج کی وجہ سے اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

☆☆☆

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔ ویسے تو دن کا وقت ہے اس لیے کسی پریشانی کی بات نہیں پھر بھی تم دھیان سے دروازہ بند کر کے رہنا۔ آنگن میں بھی زیادہ نکلنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خبیث پرویز سارا وقت اپنے گھر کی چھت پر چڑھا کبوتر بازی کرتا رہتا ہے۔ تمہیں دیکھ کر خوامخواہ چھیڑ خانی کی کوشش کرے گا۔ میں نے سرمد سے کہہ دیا ہے، اگر اسے موقع ملا تو اس طرف کا چکر لگائے گا ورنہ میں تو ان شاء اللہ رات تک تمہارا کام نمٹا کر واپس آ ہی جاؤں گا۔" چھوٹا سا سفری بیگ شانے سے لٹکائے عامر، ماہ بانو کو ہدایات اور تسلیاں ساتھ ساتھ دے رہا تھا۔ بڑی کوشش کے بعد وہ اپنے دفتر سے چھٹی لینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب ماہ بانو کے کام سے جا رہا تھا۔ پرویز کی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس دن کی جانے والی حرکت نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ بے جگری سے اس کا مقابلہ کرنے کے باوجود وہ جانتا تھا کہ پرویز اپنی اس شکست پر آرام سے نہیں بیٹھے گا اور مسلسل اس کوشش میں لگا رہے گا کہ کسی نہ کسی طرح اسے یا ماہ بانو کو زک پہنچائی جائے۔ پرویز کی ایسی کسی حرکت سے پہلے وہ ماہ بانو کو یہاں سے نکال دینا چاہتا تھا۔ ماہ بانو کی حیثیت اس کے گھر میں ایک امانت کی سی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کو ذرا بھی نقصان پہنچے۔ سرمد کو بھی وہ رات ہی اپنے پروگرام سے مطلع کر چکا تھا۔ اس نے بھی اس کے فیصلے کی تائید کی تھی بلکہ وہ عامر سے بھی زیادہ بے چین تھا کہ جلد از جلد خوامخواہ مول لی ہوئی اس ذمے داری سے نجات حاصل کر لی جائے۔

"آپ میری طرف سے بالکل فکر نہ کریں۔ میں خالہ جی کے ان کے کمرے میں ہی رہنے کی کوشش کروں گی۔ ویسے بھی دن دن ہی کی تو بات ہے۔ دن بھر تو ویسے بھی آپ دفتر میں ہی رہتے ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ سارا دن آرام سے بغیر پریشانی کے گزر جاتا ہے۔" اس نے عامر کو تسلی دی تو وہ اپنی ماں کے کمرے میں جا کر ان سے ملاقات کرنے لگا۔ انہیں اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنے دفتر کے کچھ اہم کاغذات وغیرہ پہنچانے کے لیے ایک دن کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ انہوں نے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا۔

"دھیان رکھیے گا، وہاں جا کر اسے کی شہریار صاحب یا ان کے پی اے کے سوا کسی سے نہیں ملنا۔ ان دونوں سے ہٹ کر کسی تیسرے فرد کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتائیے گا۔" عامر کے پیچھے دروازے تک جاتے ہوئے اس نے کئی بار کی ہوئی نصیحت ایک بار پھر دہرائی۔ عامر یا سرمد کو اس نے اپنے تمام حالات تفصیل سے نہیں سنائے تھے۔ ان لوگوں کو بس اتنا علم تھا کہ وہ اپنے کچھ دشمنوں سے چھپتی پھر رہی ہے اور اس سلسلے میں اسے اے سی شہریار وغیرہ کی سپورٹ حاصل ہے۔

"مجھے تمہاری ہدایت اچھی طرح یاد ہے۔ تم بے فکر رہو اور دروازہ بند کر کے اندر بیٹھنے کے بعد آرام سے میری واپسی کا انتظار کرو۔" وہ اسے جواب دے کر باہر نکل گیا۔ اس کا رخ شہر سے باہر جانے والی بسوں کے اڈے کی طرف تھا۔ اڈے پر پہنچ کر اس نے پہلے ٹکٹ خریدا پھر ایک کیبن سے سگریٹ کا پیکٹ خریدنے کے بعد اس کے سامنے لگے اسٹال سے آج کا اخبار بھی لے لیا۔ وہ باقاعدگی سے اخبار پڑھنے کا عادی نہیں تھا۔ کبھی کبھار کسی اہم خبر کے لیے اخبار خرید لیتا تھا۔ اس وقت اس نے راستے کی بوریت سے بچنے کے لیے اخبار لیا تھا لیکن بس میں بیٹھنے کے بعد اسے بور ہونے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا مسافر بے انتہا باتونی تھا جو بڑی بے تکلفی سے اس سے باتیں کرتے ہوئے قصوں پر قصے سناتا جا رہا تھا۔ مسافر کا انداز گفتگو اتنا سادہ اور برجستہ تھا کہ اسے وقت

www.pkdigest.com

گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ خود بھی اسے اپنے دفتر اور دوستوں کے متعلق کئی باتیں بتاتا رہا۔ اپنے خوش اخلاق ہم سفر کی وجہ سے اسے احساس بھی نہیں ہوا اور سفر تمام ہو گیا۔ ساتھی مسافر سے ایک گرم جوش مصافحہ کرنے کے بعد وہ بس سے اتر آیا اور اڈے پر موجود رکشوں میں سے ایک میں سوار ہو کر اسے اے سی صاحب کے آفس پہنچانے کا کہا۔ لاہور کے بس اڈے سے خریدا ہوا اخبار رول کی شکل میں اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ رکشے میں بیٹھے بیٹھے اس نے اخبار کو کھولا اور اس کا یونہی سرسری سا جائزہ لینے لگا۔ سرسری جائزہ لیتی اس کی نظریں ایک تصویر پر آ کر ٹھہر گئیں۔ وہ تلاش گمشدہ کا اشتہار تھا جس میں تصویر میں موجود لڑکی کے بارے میں اطلاع فراہم کرنے والے کے لیے ایک لاکھ روپے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اعلان کے ساتھ ایک موبائل نمبر بھی موجود تھا جس پر لڑکی کے متعلق جاننے والا رابطہ کر سکتا تھا۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ وہ اس کے گھر میں ہی مقیم تھی۔

''بھائی ذرا تیز چلاؤ، مجھے جلدی پہنچنا ہے۔'' اشتہار پڑھ کر وہ خود لالچ میں مبتلا نہیں ہوا تھا لیکن اسے اندازہ تھا کہ وہ سارے لوگ جنہوں نے ماہ بانو کو اس کے گھر میں دیکھا تھا، ان میں سے کسی کی بھی نظر اگر اس اشتہار پر پڑ گئی تو ایک لاکھ کے لالچ میں اس فون نمبر پر ضرور اطلاع دیں گے۔ اخبار میں گمشدگی کا اشتہار دینے والے لوگ اس کے خیر خواہ تھے یا دشمن، اس بارے میں کیا کہا جا سکتا تھا... اس لیے اس کی خواہش تھی کہ جلد از جلد ان لوگوں کے پاس پہنچ جائے جن کے بارے میں ماہ بانو کو حتمی یقین تھا کہ وہ اس کے سچے ہمدرد اور خیر خواہ ہیں۔

☆☆☆

پھول کی پتیوں سے بھرا تھیلا گاڑی میں رکھنے کے بعد اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ موتی والا کی موت کے باوجود ابھی اس کی ملازمت جاری تھی۔ موتی والا کے کزن نے کسی طرح اس بات کی اجازت لے لی تھی کہ کوٹھی کے ایک دو کمرے اس کے چالیسویں تک کھلے رکھے جائیں اور اب وہ اپنے عقیدے اور مسلک کے مطابق وقتاً فوقتاً ان کمروں میں کوئی نہ کوئی ایسا کام کرواتا رہتا تھا جو اس کے یقین کے مطابق موتی والا اور اس کی بیوی کی مغفرت کے لیے مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ مرنے والا اپنے ساتھ اپنے اعمال نامے میں جو لکھوا کر لے گیا ہے، اس کی بنیاد پر اللہ کے ہاں اس کا معاملہ ہوگا۔ اس حقیقت سے نظر چرائے مرنے والوں کے لواحقین اپنے طور پر اس کوشش میں لگے ہی رہتے ہیں کہ کسی طرح جانے والے کے لیے ایسا

کوئی بندوبست کر دیں کہ وہ جہنم کے شعلوں سے بچ کر جنت کے باغات میں جا نکلے۔ اس خواہش میں بعض لوگ اپنی حد سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں اور ایسے ایسے کام کرنے لگتے ہیں جو صریحاً خلاف شرع ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان ساری رسوم کے پیچھے مرنے والے سے محبت یا ہمدردی کے بجائے دنیا داری کے تقاضے نبھانا بھی مقصود ہوتا ہے۔ موتی والا کا کزن اس دوسری کیٹیگری کا بندہ تھا۔ آج بھی اس نے ایصالِ ثواب کے نام پر جانے کن کن مدرسوں اور مسجدوں کے مولویوں کو جمع کر کے ان کی دعوت کا انتظام کیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ لوگ قبرستان بھی جانے والے تھے۔ پھول کی یہ پتیاں قبر پر ڈالنے کے لیے ہی منگوائی گئی تھیں۔

''میں پتیاں لے کر آ گیا ہوں... تو بتا کہ اندر کا کیا حال ہے؟ کھانا وانا ہو گیا یا نہیں؟'' کوٹھی پہنچنے کے بعد شاکر سے سامنا ہونے پر اس نے اس سے پوچھا۔

''کھانا اتنی جلدی کیسے ختم ہوگا؟ ایسی شان دار مرغی کی بریانی اور کڑھائی پک کر آئی ہے کہ جب تک حلق تک نہیں ٹھونس لیں گے کسی کا ہاتھ نہیں رکے گا۔'' شاکر نے جواب دیا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''چل جو بھی ہے ابھی تو ہماری نوکری چل رہی ہے۔ چالیسویں تک ہم بھی بھاگ دوڑ کر کے اپنے لیے کوئی نئی نوکری تلاش کر لیں گے۔ میرا ارادہ ہے کہ یہاں سے فارغ ہو کر ایک جگہ انٹرویو کے لیے جاؤں گا۔ ایک دوست نے بتایا تھا کہ ایک سیٹھ صاحب کو اپنی بیوی کی گاڑی چلانے کے لیے ڈرائیور کی ضرورت ہے۔''

''ہاں بھئی، اب تو یہی کرنا ہے۔ کاش! صاحب کی مہمان لڑکی کا ہی کچھ پتا معلوم ہوتا تو عیش ہو جاتے۔''

''کیا مطلب؟ کیا فائدہ ہونا تھا اس کا پتا معلوم ہونے سے؟'' وہ شاکر کی بات پر چونکا۔

''آج کے اخبار میں اس لڑکی کی فوٹو آئی ہے۔ لڑکی کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے ایک لاکھ کا انعام ہے۔''

''کہاں ہے اخبار؟ مجھے بھی دکھا۔'' وہ بے چین ہوا۔

''میں نے سامنے گرل میں ہی اٹکا دیا تھا۔ یہاں اب اخبار پڑھنے والا ہے ہی کون؟ میں ہی کبھی کبھی نظر مار لیتا ہوں۔ پہلے خیال آیا تھا کہ صاحب کے کزن سے کہوں کہ اخبار بند کروا دیں پھر سوچا کہ جس طرح مہینے بھر کے لیے ہماری روزی لگی ہوئی ہے، بے چارے اخبار والے کا بھی بھلا ہو جائے۔'' شاکر اور بھی کچھ بول رہا تھا لیکن اس کی توجہ شاکر کی باتوں کی طرف نہیں تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ

کر تیزی سے گرل میں اٹکے ہوئے اخبار کی طرف بڑھ چکا تھا اور اب اخبار کھولے شاکر کی فراہم کردہ اطلاع کی تصدیق کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جلد ہی اس نے اشتہار تلاش کر لیا۔ انعام کی رقم اور فون نمبر دونوں دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ منزل تک پہنچنے کے لیے ایک راستہ کھلا نظر آ رہا تھا۔

''یار شاکر! یہ گاڑی کی چابی رکھ۔ پھولوں کی پتیاں گاڑی میں ہی رکھی ہیں۔ مجھے نوکری کے لیے انٹرویو دینے جانا ہے۔ تو صاحب سے بہانہ بنا دینا کہ میری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اس لیے میں جلدی گھر چلا گیا۔'' اخبار کا اشتہار والا صفحہ رول کر کے اپنے قبضے میں کرتے ہوئے اس نے عجلت میں گاڑی کی چابیاں شاکر کو تھمائیں اور کوٹھی سے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

''یار! کہیں صاحب اس طرح جانے پر ناراض نہ ہوں۔'' شاکر نے اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

''ہوتے ہیں تو ہو جائیں۔ میرا جانا ضروری ہے۔'' وہ مڑے بغیر جواب دے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ خود اس کے پاس موبائل نہیں تھا اور اس علاقے میں کوئی پی سی او بھی نہیں تھا۔ بڑی بڑی کوٹھیوں والے علاقے سے تیز تیز چل کر نکلتے ہوئے اس نے قریب واقع کمرشل ایریا کا رخ کیا۔ اس علاقے میں کئی کوٹھیاں بنے ہوئے تھے۔ ان کوٹھیوں کے سامنے مختلف شاپنگ اسٹور اور دیگر دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ اسے امید تھی کہ وہاں کسی دکان پر سے پبلک کال کی سہولت مل جائے گی۔ اس کا یہ یقین غلط ثابت نہیں ہوا۔ ایک میڈیکل اسٹور پر اسے پبلک فون مل گیا۔ اس نے اخبار کھول کر اشتہار نکالا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس میں دیا ہوا فون نمبر ملایا۔

''ہیلو!'' رابطہ ملنے پر ایک کرخت سی آواز سنائی دی۔

''آج کے اخبار میں ایک لڑکی کی گمشدگی سے متعلق جو اشتہار چھپا ہے، وہ آپ نے ہی چھپوایا ہے؟'' کسی بھی قسم کی اطلاع فراہم کرنے سے پہلے اس نے تصدیق کرنا ضروری سمجھا۔

''ہاں ہاں، اشتہار ہم ہی نے دیا ہے۔ تم بولو، تمہیں لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟'' دوسری طرف سے بے تابی سے پوچھا گیا۔

''کچھ نہیں، بہت کچھ معلوم ہے مگر کوئی بھی اطلاع دینے سے پہلے میں انعام کی رقم کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ موتی والا کی کوٹھی سے یہاں تک کا فاصلہ طے کرنے تک مسلسل اپنا دماغ دوڑاتا رہا تھا اور اب ایک طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق گفتگو کر رہا تھا۔

''انعام کا کوئی مسئلہ نہیں۔ انعام تمہیں ضرور ملے گا مگر پہلے تم کچھ بتاؤ تو۔'' وہاں لگتا تھا کہ صبر کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

''انعام تو تمہیں دینا ہی ہوگا لیکن میری شرط یہ ہے کہ میں انعام میں ایک لاکھ کے بجائے دو لاکھ روپے لوں گا۔'' اس نے اپنا مطالبہ بیان کیا۔

''دو لاکھ... یہ تو بہت زیادہ ہے۔'' کرخت آواز والے نے اعتراض کیا۔

''زیادہ ہے تو رہنے دو۔ میں بھی اطلاع نہیں دوں گا۔''

''اچھا اچھا رکو۔ ایسا کرو پانچ منٹ صبر کرو۔ میں مشورہ کرنے کے بعد تمہیں جواب دیتا ہوں۔'' اس کی دھمکی پر وہ گھبرا کر جلدی سے بولا۔

''ٹھیک ہے، تم مشورہ کر لو۔ میں پانچ منٹ بعد دوبارہ فون کرتا ہوں۔'' اس نے فون بند کر دیا اور ٹہلتا ہوا آگے نکل گیا۔ پانچ منٹ کا وقت اتنا زیادہ نہیں ہوتا لیکن اسے زیادہ لگ رہا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ پانچ منٹ کے اس وقفے میں کوئی دوسری کال آ جائے جو ماہ بانو کے بارے میں اطلاع دے دے۔ آخر سرمد کے محلے میں کئی افراد ماہ بانو کی صورت آشنا تھے۔ ان میں سے بھی تو کوئی یہ اشتہار دیکھ کر فون کر سکتا تھا۔ یہ کسی اور کے اس مختصر وقفے میں فون کرنے کے خدشے کو وہ اس تسلی کے سہارے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب صبح سے اب تک کسی نے اخبار دیکھ کر فون نہیں کیا تو اب کون اتنی سی دیر میں فون کر دے گا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ پانچ منٹ گزر رہے۔ اس بار اس نے ایک ذرا فاصلے پر متصل اسٹور کا فون استعمال کیا۔ دوسری طرف سے کال اسی پہلے والے بندے نے ریسیو کی۔

''پھر کیا فیصلہ کیا تم لوگوں نے؟'' اس کی آواز سنتے ہی اس نے اپنے لہجے کو ذرا رعب دار بناتے ہوئے پوچھا۔

''ہم راضی ہیں، تم لڑکی کا پتا بتاؤ۔''

''پتا جاننے کے لیے تم پون گھنٹے بعد بھاٹی گیٹ پہنچ کر مجھ سے ملو۔ ساتھ میں دو لاکھ کی رقم بھی لانا۔''

''ٹھیک ہے لیکن ہم تمہیں پہچانیں گے کیسے؟'' اس کی بات سنتے ہی دوسری طرف سے بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

''میں نے خاکی رنگ کی پتلون پر سفید قمیص پہن رکھی ہوگی اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ بھی ہوگا۔''

خود پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے اپنا حلیہ بیان کیا اور فون بند کر کے کال کی ادائیگی کرنے کے بعد سڑک پر آ کر ایک ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ یہاں سے بھاٹی گیٹ پہنچنے کے لیے اس کا لگایا ہوا وقت کا اندازہ بالکل درست تھا۔ ٹیکسی نے پون گھنٹے سے بس ایک آدھ منٹ اوپر ہی اسے وہاں پہنچایا۔ ٹیکسی کا کرایہ دے کر وہ جیسے ہی نیچے

www.pkdigest.com

اترا، دو بندے لپک کر اس کی طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سیاہ چرمی بیگ تھا۔

"تم ہی ہو نا ہمیں فون کر کے اطلاع دینے والے۔ تمہاری فرمائش پر ہم دو لاکھ روپے لے کر آگئے ہیں۔ اب تم ہمیں لڑکی کا پتا بتاؤ۔"

"پہلے رقم۔" اس نے مطالبہ کیا جواباً اس کے ہاتھ میں بیگ تھما دیا گیا۔ اس نے بیگ کی زپ کھول کر اندر جھانکا۔ اندر رقم موجود تھی اور خاصی محسوس ہوتی تھی۔ رقم گننے کا موقع نہیں تھا اس لیے اسے اندازے پر ہی یقین کرنا تھا۔

"اب چلو... اور ہاں، یاد رکھنا کہ ہمیں دھوکا دینے کی کوشش نہ کرنا۔ ہمارے بندے اردگرد موجود ہیں۔ تم نے ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ تمہیں لگنے والی گولی کس طرف سے چلائی گئی ہے۔" رقم سے بھرا بیگ دینے والے کا لہجہ بہت سرد تھا۔ اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس ہوئی لیکن رقم کے لیے اتنا رسک تو لینا ہی تھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" خود کو بااعتماد ظاہر کرتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ ذرا سا فاصلہ طے کرتے ہی اسے احساس ہونے لگا کہ علاقے میں کچھ کشیدگی سی ہے۔ جگہ جگہ لوگ ٹولیوں کی صورت میں کھڑے آپس میں باتیں کرتے نظر آرہے تھے۔ وہ اس صورتِ حال کو نظرانداز کر گیا۔ اسے اس علاقے میں رہنے والوں کے مزاج کے بارے میں واقفیت تھی۔ ذرا ذرا سے مسئلوں پر وہ لوگ اسی طرح ٹولیاں بنا کر گھنٹوں آپس میں تبصرے اور بحث کر سکتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ موجود بندوں کو لے کر آگے بڑھتا گیا۔ وہ چوکنے سے اس کے پیچھے چلتے رہے۔ راستے میں انہوں نے ایک پولیس موبائل کو بھی دیکھا۔

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟" اس کے پیچھے چلتے ہوئے بندوں میں سے ایک نے غراہٹ آمیز سرگوشی میں پوچھا۔

"میری طرف سے تو نہیں ہے۔ اگر تم پولیس موبائل دیکھ کر کہہ رہے ہو تو غلطی پر ہو۔ پولیس تو کہیں بھی آجا سکتی ہے لیکن کم از کم میں پولیس کو اس معاملے میں انوالو کر کے دو لاکھ کی رقم سے محروم ہونا پسند نہیں کروں گا۔" اس کا جواب حقیقت تھا اس لیے وہ لوگ خاموشی اختیار کر گئے مگر عامر کی گلی کے کونے پر پہنچ کر وہ خود بری طرح ٹھٹک گیا۔ وہاں پولیس والوں کی اچھی خاصی تعداد نظر آرہی تھی۔ لوگوں کا بھی کافی ہجوم تھا اور ہر چہرے پر خوف کی تحریر صاف پڑھی جارہی تھی۔

"کیا ہوا بھائی... کیا معاملہ ہے؟" ہجوم میں نظر آنے والے ایک شناسا چہرے کو دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھا۔ وہ عامر کی گلی کے کونے والے گھر میں رہنے والا ایک سبزی فروش تھا۔

"تم عامر کے دوست ہو نا؟" بجائے اس کے سوال کا جواب دینے کے، اس شخص نے اس سے پوچھا۔

"ہاں ہاں، میں عامر کا دوست ہوں لیکن آپ بتاؤ کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ یہ اتنی پولیس کیوں جمع ہے اور لوگوں کو گلی کے اندر کیوں نہیں جانے دے رہے؟" اس نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

"بہت برا حادثہ ہوا ہے بھائی۔ تمہیں شاید معلوم ہو کہ عامر کے پڑوس والے گھر میں پٹاخے، پھلجھڑیاں، انار اور دوسری بارود والی چیزیں بنتی تھیں۔ پتا نہیں وہاں کس طرح آگ لگی اور سارا بارود لپیٹ میں آگیا۔ دھماکے کی آواز اتنی زوردار تھی کہ ہمارے گھروں کی کھڑکیاں دروازے ہل کر رہ گئے۔ وہ کم بخت گلو خود تو مارا ہی گیا، ساتھ میں دوسروں کو بھی لے ڈوبا۔ بے چارے عامر کے گھر کی دیوار تو اس کے بارود والے کمرے سے بالکل ملی ہوئی تھی۔ گلو کے گھر کے ساتھ وہاں بھی تباہی آگئی۔ عامر کی ماں اور اس کی رشتے دار لڑکی کی لاشیں بھی ابھی ابھی پولیس والوں نے ملبے سے نکال کر اسپتال بھجوائی ہیں۔ تمہیں اگر عامر کے بارے میں کچھ معلوم ہے تو اسے اس تباہی کی خبر کر دو۔ بے چارے کی ایک ماں ہی تو تھی، اب وہ بھی نہیں رہی۔ گھر بھی تباہ ہو گیا۔ یہ سب جب اسے معلوم ہوگا تو اسے بڑا صدمہ ہوگا۔ صدمہ تو خیر سارے محلے کو ہے۔ اکٹھے تین بندے مر گئے ہیں۔ لوگوں کا جو مالی نقصان ہوا، وہ الگ ہے۔ پیچھے پرویز کے گھر کی دیوار بھی چٹخ گئی ہے۔ برکت خالہ کے باورچی خانے کی ٹنکیاں اڑ گئی ہیں۔ کئی لوگوں کے گھروں میں شیشے کے برتن وغیرہ ٹوٹ کر گر گئے ہیں۔" وہ جانے کون کون سے نقصانات گنوا رہا تھا لیکن سرمد کا ذہن تو اپنے ہی نقصان میں اٹکا ہوا تھا۔ عامر کی ماں اور اس کی رشتے دار لڑکی کی ملبے سے نکلنے والی لاشوں کی اطلاع نے خود اس کے اپنے خوابوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ ان ٹوٹے ہوئے خوابوں کا ملبہ اس پر دھڑا دھڑ گر کر اسے کسی گہری قبر میں دفن کرتا جارہا ہے۔ بائیں ہاتھ میں تھاما ہوا بیگ جس میں دو لاکھ کی رقم موجود تھی، اس کی گرفت سے پھسلتا جارہا تھا۔ وہ جس کا سودا کر کے اس دو لاکھ کی رقم کا مالک بنا تھا جب وہی نہیں رہی تھی تو یہ دو لاکھ بھی کیسے اس کے رہ سکتے تھے؟ رقم لے کر فرار ہو جانے کا خیال بھی بے کار تھا کہ وہ دونوں منکر نکیر بنے سر پر ہی سوار تھے۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

کارا کی بہت پریشان تھی کیونکہ مہاپجاری نے اس کے محبوب نیمو کو دیوتا کے حضور قربان کرنے کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ وسطی میکسیکو کی اس قدیم ریاست میں اب کسی مرکزی سلطنت کا وجود باقی نہیں رہا تھا اور اس پورے علاقے میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں جن کے اپنے خود مختار حاکم تھے۔ یہ ریاستیں چھوٹے چھوٹے شہروں میں قائم تھیں اور ہمہ وقت آپس میں برسرِپیکار رہا کرتی تھیں۔ ایک ریاست کا آدمی غلطی سے بھی دوسری ریاست کی حدود میں آجاتا تھا تو اسے پکڑ کر کسی نہ کسی دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا یا اذیتیں دے کر مار دیا جاتا تھا۔

یہ وہ نفسانفسی کا دور تھا جب سفید فام امریکا کے برِاعظم پر اپنے منحوس قدم رکھ چکے تھے اور شمالی اور وسطی امریکا کے قدیم باشندوں کی تباہی کا آغاز ہو گیا تھا۔ البتہ میکسیکو ان غارت گر حملہ آوروں سے ابھی محفوظ تھا۔ مگر یہاں پر موت کسی اور صورت میں رقصاں تھی۔ یہاں قدیم قبیلے آپس میں برسرِپیکار رہتے تھے اور مخالف قبیلے کا کوئی باشندہ دشمن کے ہاتھ آجاتا تو وہ اسے اذیتیں دے دے کر مار دیتے تھے۔ لڑائی میں ان کے بے شمار نوجوان مر چکے تھے اور بے شمار دشمن کی قید میں

محبت کے سفر میں جدائی، تنہائی اور انتظار کا کشت اٹھانے والے پجاریوں کا پراثر قصہ

جہدِ بقا

مریم کے خان

حیاتِ انسانی زندگی کی ان گنت منازل طے کر چکی ہے ..... مگر اس دنیائے حیرت کے کچھ گوشے اب بھی ..... عقل، علم اور تہذیب کی روشنی سے دور تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں ..... جہاں اب بھی دورِ غلامی کا راج ہے۔ قبیلوں میں بٹی ریاست کے تاریک روز و شب کا تحیر انگیز تماشائے عبرت۔

www.pkdigest.com

جانے کے بعد مارے جا چکے تھے یا ان کو کسی دیوتا پر قربان کر دیا گیا تھا۔ اس خطے میں نوجوانوں کی اکثریت بہت کم ہو گئی تھی اور بوڑھوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ عورتیں زیادہ تھیں اور ایک ایک آدمی کی پانچ چھ بیویاں تھیں۔ تمام ہی جوان آبادی جبراً فوج میں بھرتی کر لی جاتی تھی اور زمین کاشت کرنے کے لیے صرف بوڑھے اور عورتیں رہ گئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ یہ سارا خطہ غذائی قلت کا شکار تھا۔ بھوک سے مرنے والوں کی تعداد بھی ہزاروں میں تھی مگر کسی کو اس کی فکر نہیں تھی۔ اگر فکر تھی تو بس یہ کہ ان کے قبیلے کا نام نہ نیچا ہو۔ وہ سب رفتہ رفتہ اجتماعی خودکشی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ایسے میں صرف چند لوگ تھے جنہیں صورت حال کی سنگینی کا اندازہ تھا اور وہ اسے درست کرنے کی کوششوں میں لگے تھے۔ مگر حکمرانوں سے لے کر عام آدمی تک سب ان کے مخالف تھے بلکہ حکمران طبقہ تو ان کا دشمن بن گیا تھا کیونکہ انہیں ان دردمندوں کی باتوں میں اپنے اقتدار کی موت نظر آتی تھی۔ مختلف قبیلوں سے تعلق رکھنے والے ان افراد نے مل کر ایک تحریک کی بنیاد رکھی تھی جس کا مقصد اس علاقے میں ایک بار پھر مرکزی حکومت کا قیام تھا تا کہ یہ روز روز کے جھگڑے ختم ہوں اور وہ ایک قوم بن کر پھر سے ترقی کی منازل طے کر سکیں۔ اس خطے میں ایک زمانے میں مایا تہذیب کی سلطنت قائم تھی مگر رفتہ رفتہ یہ سلطنت سکڑتی چلی گئی اور میکسیکو میں آباد قبائل اسی تہذیب کا ایک حصہ ہونے کے باوجود اس سے الگ ہو گئے۔ اس وقت ان کا دعویٰ تھا کہ وہ مایا قوم سے الگ ایک قوم بن چکے ہیں۔ اس طرح انہوں نے کمزور پڑتی مایا قوم سے علیحدگی اختیار کر لی مگر تقسیم کا یہ سفر رکا نہیں تھا بلکہ یہ لوگ بھی منقسم ہو گئے۔ ہر قبیلے نے اپنی جگہ حکومت بنالی اور دوسرے کو دشمن قرار دے دیا۔ اب یہ حال تھا کہ سوائے چند بڑے شہروں کو چھوڑ کر باقی ہر جگہ لوگ نہایت پسماندہ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے پاس کھانے کے لیے خوراک نہیں تھی اور رہنے کے لیے مکانات نہیں تھے۔ ایک پُرشکوہ اور وسیع تہذیب سے تعلق رکھنے والے اب وحشیوں کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے لیے ذرائع زندگی محدود ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے باوجود وہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

جن قبیلوں کی آبادی بہت کم ہو جاتی، ان پر طاقت ور اور بڑے قبیلے حملہ کر کے انہیں نیست و نابود کر دیا کرتے تھے۔ ان کے مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے یا غلام بنا کر لے جاتے۔ ان کو بھی عام طور سے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا اور باقی کو وحشیانہ کھیلوں میں ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا اور جو لوگ بوڑھے ہوتے تھے انہیں بھی مار دیا جاتا تھا۔ قبیلے کی زمین پر قبضہ کر لیا جاتا۔ حتیٰ کہ کوئی دوسرا بڑا قبیلہ ان پر حملہ کر دیتا اور یہ چکر اسی طرح چلتا رہتا۔

کارا کی کا قبیلہ وسطی میکسیکو کے سب سے بڑے شہر سے کچھ دور آباد تھا اور اس نے شہر کے حکمران کی اطاعت قبول کر رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ قتل و غارت گری سے بچے ہوئے تھے۔ مگر اس امن کے عوض انہیں ہر سال شہر کے حکمران کو سو کنواری لڑکیاں اور اپنی زمین سے حاصل ہونے والی آدھی پیداوار دینی پڑتی تھی۔ یہ لگان انہیں مار ڈالنے کے لیے کافی تھا کیونکہ مختصر آبادی والے اس قبیلے سے ہر سال سو کنواری لڑکیاں نکالنا مشکل کام تھا اور یہ مسئلہ روز بروز گمبھیر ہوتا جا رہا تھا۔ جوان عورتوں کی تعداد مستقل گھٹ رہی تھی اور اسی تناسب سے ان کی آبادی بھی کم ہو رہی تھی۔ ایسے میں وہ لڑکیاں کہاں سے لاتے؟ قبیلے کے حکمران نے شہر کے حکمران سے رحم کی اپیل کی تھی کہ ان کے بیاج میں کمی کی جائے مگر اس کی طرف سے انکار کر دیا گیا تھا۔

کارا کی کے محبوب نیمو کا باپ اسی مان اس تحریک کا ایک سرگرم کارکن تھا جو ان خطے کے لوگوں کو پھر سے متحد کرنا چاہتی تھی اور یہی اس کا سب سے بڑا جرم بن گیا۔ قبیلے کے حکمران نے اسے مہا پجاری سے ساز باز کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مہا پجاری نے اعلان کیا تھا کہ اسی مان کو دیوتا کے حضور قربانی کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ اب پندرہ سال بعد اس نے نیمو کے بارے میں یہی اعلان کیا تھا۔ نیمو کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ کارا کی کا محبوب تھا اور اس نے مہا پجاری کی بیٹی مست ٹیپ کی محبت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مست ٹیپ ایک آوارہ مزاج اور عیش پسند لڑکی تھی جو بہت پہلے اپنی دوشیزگی کھو چکی تھی اور کم سے کم درجن بھر افراد اس سے شناسائی کے دعوے دار تھے۔

نیمو، کارا کی سے محبت کرتا تھا۔ کارا کی اس کے قبیلے کی حسین ترین دوشیزہ تھی۔ ابھی وہ صرف سولہ سال کی تھی اور اس کے باپ نے نیمو سے وعدہ کیا تھا کہ جب وہ سترہ سال کی ہو جائے گی تو وہ اس کی شادی نیمو سے کر دے گا۔ مگر اس سے پہلے ہی یہ افتاد آ گئی تھی۔ مہا پجاری نے سالانہ قربانی کا موسم قریب آنے پر اچانک یہ اعلان کر دیا کہ نیمو کی قربانی دیوتا کو بڑی پسند آئی ہے اس لیے اس بار اسے قربان کیا جائے گا۔ یہ سن کر کارا کی تو جیسے پاگل ہو گئی۔ اس نے نیمو سے کہا۔

”تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

”میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔“ اس نے انکار کر دیا۔

”تم جاؤ ورنہ یہ تمہیں مار دیں گے۔“ کارا کی نے کہا۔

”میں اس طرح نہیں جا سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس بار جن لڑکیوں کو شہر بھیجا جائے گا، ان میں تم بھی شامل ہو۔“

کارا کی نے جواب دیا۔ ”نہیں، وہ مجھے نہیں بھیجیں گے۔“

نیمو حیران ہوا۔ ”کیوں تمہیں کیوں نہیں بھیجیں گے؟“

”کیونکہ ایست توم مجھے پسند کرتا ہے۔“ کارا کی نے تلخی سے کہا۔ ”اور وہ مہا پجاری کا بیٹا ہے اس لیے اس کا باپ مجھے ان لڑکیوں میں سے نکال دے گا۔“

نیمو یہ سن کر بپھر گیا۔ ”اس کی یہ ہمت...!“

”تم بے فکر رہو، وہ کبھی مجھے حاصل نہیں کر سکتا۔“ کارا کی نے اسے تسلی دی۔

”یہ لوگ اسی طرح ہماری کنواری لڑکیاں ان لوگوں کو دیتے رہے تو کچھ عرصے بعد ہمارے ہاں بچے پیدا ہونے بند ہو جائیں گے۔ پھر ہم لڑکیاں نہیں دیں گے تو دشمن ہم پر حملہ کر کے ہمیں فنا کر دے گا۔“ نیمو پریشان تھا۔

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔“ کارا کی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اگلے سال ہم اتنی لڑکیاں نہیں دے سکیں گے۔ اس کے بعد شہر والوں کی فوج آ جائے گی اور یہاں رہنے والے ہر فرد کو قتل کر دے گی۔“

”نیمو! تم اس کی فکر کرنے کے بجائے یہاں سے جانے کی فکر کرو۔“ کارا کی نے اصرار کیا۔

”میں نے کہہ دیا ہے کہ میں تمہارے بغیر نہیں جاؤں گا۔“

”تو کیا میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟“ کارا کی نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں، اس میں کیا حرج ہے؟ اگر میں نے تمہیں یہاں چھوڑ دیا تو یہ میرا بدلہ بھی تم سے لیں گے۔“

”تم اکیلے آسانی سے جا سکتے ہو، میرے ساتھ تمہیں مشکل ہوگی۔“

”جب تم میرے ساتھ ہوگی تو میرے لیے کوئی مشکل مشکل نہیں رہے گی۔“ نیمو نے یقین سے کہا۔

”مگر ہم کہاں جائیں گے؟“

”جنوب کی طرف۔“ نیمو نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”اس طرف جہاں اب بھی مایا سلطنت موجود ہے۔ ہمیں وہاں پناہ مل جائے گی۔ وہاں ہم اپنا گھر بھی بسا سکیں گے۔“

”سچ... ہم اپنا گھر بسا سکیں گے؟“ کارا کی کی آنکھوں میں خواب جاگ اٹھے۔ عورت کسی بھی دور کی ہو، ہمیشہ گھر کا خواب دیکھتی ہے۔ نیمو نے سر ہلایا۔

”ہاں اگر ہم وہاں پہنچ گئے تو ہم محفوظ ہو جائیں گے۔“

”کیا وہ ہمیں پناہ دے دیں گے؟“

”ہاں، وہ مجھے اور تمہیں پناہ دے دیں گے۔“

”تب میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ کارا کی نے رضامندی ظاہر کر دی۔

☆☆☆

قبیلے کے سرکردہ افراد کا اجلاس ہو رہا تھا کیونکہ مسئلہ بہت ہی اہم تھا۔ قربانی کے لیے منتخب کیا جانے والا نیمو غائب تھا اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ قبیلے کی ایک لڑکی کارا کی بھی غائب تھی۔ اس بات پر مہا پجاری کا بیٹا ایست توم چراغ پا تھا اور اپنے باپ سے بار بار مطالبہ کر رہا تھا کہ اسے اجازت دی جائے۔ وہ ایک جتھا لے کر ان دونوں کے تعاقب میں جائے اور انہیں زندہ یا مردہ گرفتار کر کے لے آئے۔ مگر مہا پجاری بہت طاقت ور ہونے کے باوجود اس قسم کا فیصلہ از خود نہیں کر سکتا تھا۔ یہ فیصلہ صرف قبیلے کا سردار کر سکتا تھا۔ اس نے بیٹے کو تسلی دی۔

”تم فکر مت کرو۔ نیمو کے مقدر میں اپنے باپ کی طرح موت لکھی ہے۔“

”لیکن میں اسے اپنے ہاتھ سے مارنا چاہتا ہوں۔“

ایست نے بے تابی سے کہا۔ ''اگر تم نے مجھے اجازت نہیں دی تو میں خود ان کے پیچھے نکل جاؤں گا۔''

''صبر میرے بیٹے! یہ کام سردار کرے گا۔''

''وہ کیسے؟''

''میں اسے راضی کروں گا اور وہ میری بات نہیں ٹال سکتا۔'' مہا پجاری نے کہا اور ایسا ہی ہوا۔ اجلاس میں سردار نے نیمو اور اس کے ساتھ جانے والی کارا کی کو قبیلے کا مجرم قرار دے دیا تھا۔ اس نے کہا۔

''قبیلے کے بہادر نوجوانوں کا ایک جتھا ان بھگوڑوں کے پیچھے جائے گا اور انہیں زندہ یا مردہ گرفتار کر کے لائے گا۔''

''سردار! میری درخواست ہے کہ اس جتھے میں مجھے شامل کیا جائے۔'' ایست نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''میں نے پہلے ہی اس جتھے کے سربراہ کے طور پر تمہیں چن لیا ہے۔'' سردار نے کہا۔ ''اب تم فوری طور پر روانہ ہو جاؤ اور ان لوگوں کو جلد از جلد پکڑ کر لانے کی کوشش کرو۔''

ان لوگوں کے لیے یہ قبیلے کی عزت کا معاملہ بھی تھا۔ اگر یہ بات ان کے حریف قبیلوں کے علم میں آ جاتی تو آنے والے بڑے دیوتا کے تہوار میں ان کے سامنے سارے قبیلے کا سر جھک جاتا۔ اس لیے ایست کی سربراہی میں ایک مسلح جتھا نیمو اور کارا کی کے پیچھے روانہ کر دیا گیا۔ اس جتھے میں ایک کھوجی بھی شامل تھا جو پیروں کے نشان تلاش کر کے مجرم کا تعاقب کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ نیمو اور کارا کی شمال کی طرف گئے تھے۔ یہ سن کر ایست پریشان ہو گیا۔ اس نے کھوجی سے کہا۔

''تمہیں غلطی ہوئی ہے، وہ شمال کی طرف نہیں جا سکتے۔ وہ جنوب کی طرف گئے ہوں گے۔''

''نہیں، ان کے پیروں کے نشان بتا رہے ہیں کہ وہ شمال کی طرف گئے ہیں۔'' کھوجی نے یقین سے کہا۔

ایست کو یقین تھا کہ وہ جنوب کی طرف جائیں گے کیونکہ شمال میں ان کے دشمن قبیلے تھے اور جنوب میں ان لوگوں کو مایا سلطنت میں پناہ مل سکتی تھی مگر کھوجی کے کہنے پر وہ بادلِ ناخواستہ شمال کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

کارا کی اور نیمو بے تکان چلے جا رہے تھے۔ نیمو اس سارے علاقے سے واقف تھا اس لیے وہ جان بوجھ کر ایسے راستے اختیار کر رہا تھا جس پر کسی سے مڈبھیڑ کا امکان کم ہو۔ اگرچہ اس طرف ان کے دشمن کم تھے مگر آج کل کے حالات میں کسی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا اور سب ہی دشمن تھے۔ نیمو کے ساتھ کارا کی تھی جو نہایت حسین لڑکی تھی۔ راہ میں ملنے والے قبیلے اسے ہتھیانے کی کوشش کر سکتے تھے اس لیے وہ ویرانوں سے گزر رہا تھا۔

''کیا ہمارے قبیلے والے دھوکا کھا جائیں گے کہ ہم شمال کی طرف گئے ہیں؟'' کارا کی نے پوچھا۔

''اگر دھوکا نہیں بھی کھائیں گے تو انہیں اس طرف آنے میں وقت لگے گا اور اس دوران میں ممکن ہے، ہمارے نشانات مٹ جائیں اور کھوجی ہمارے راستوں کا پتا نہ چلا سکے۔''

وہ اس وقت صحرا سے گزر رہے تھے۔ یہاں ریت اور پتھریلی زمین تھی جس میں کہیں کہیں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ اگر انہیں کہیں کوئی فصل نظر آتی تو وہ راستہ بدل دیا کرتے تھے کیونکہ فصل کا مطلب تھا کہ وہ کسی قبیلے کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ آج ان کے سفر کا دوسرا دن تھا اور انہیں بہت طویل سفر کر کے موجودہ میکسیکو سے اس جگہ جانا تھا جہاں براعظم جنوبی امریکا کا آغاز ہوتا تھا۔ مایا سلطنت ان دنوں اسی علاقے تک محدود ہو گئی تھی۔ اس کی شان و شوکت ماضی کا قصہ بن چکی تھی لیکن یہ اب بھی ایک طاقت ور سلطنت تھی۔ کم سے کم ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے مقابلے میں بہت طاقت ور تھی جو اس علاقے میں پھیلی ہوئی تھیں۔

نیمو کے پاس کمان اور تیروں سے بھرا ترکش تھا۔ اس کے علاوہ پتھر کا بنا چاقو اور لکڑی اور ہڈی سے بنا ایک کلہاڑی نما ہتھیار بھی تھا۔ وہ لوگ لوہے، کانسی اور تانبے سے ناآشنا تھے۔ صرف سونے اور چاندی سے آشنا تھے مگر ان دھاتوں سے زیادہ سے زیادہ برتن بن سکتے تھے۔ کوئی اوزار یا اسلحہ بنانا ممکن نہیں تھا۔ اسی وجہ سے یہ لوگ پسماندہ تھے اور باقی دنیا کی طرح ترقی نہیں کر سکے تھے۔ اس کے باوجود تعمیرات اور دوسرے فنون میں یہ کسی طرح باقی دنیا سے کم نہیں تھے۔ اپنے عروج کے دور میں انکا اور مایا تہذیبوں میں بڑے بڑے شہر آباد کیے گئے تھے جن کے آثار آج بھی ملتے ہیں۔ مصریوں کی طرح یہ بھی اہرام بناتے تھے مگر پھر یہ دونوں تہذیبیں زوال پذیر ہو گئیں اور یہ لوگ قبائل میں بٹتے چلے گئے۔

کارا کی کے پاس کھانے کا سامان اور پانی تھا۔ کھانا اس نے تھیلوں سے بنی ٹوکری میں رکھا تھا۔ اس نے ایک خاص قسم کی روٹی بنائی تھی۔ یہ مکئی کے آٹے، شہد اور بعض پودوں کی جڑوں کو ملا کر اور گوندھ کر بنائی جاتی تھی۔ اسے کئی ہفتے تک محفوظ کیا جا سکتا تھا۔ پانی کے لیے ایک مٹی کی بنی بوتل تھی۔ وہ صحرا سے گزر رہے تھے اور یہاں کہیں کہیں پانی

نایاب تھا اس لیے پانی لازمی تھا۔ نیمو نے کارا کی کو دیکھا۔

''تم تھک گئی ہو تو یہ مجھے دے دو۔''

''نہیں، میں تھکی نہیں ہوں۔'' اس نے نفی میں جواب دیا۔ ''تم نے کسی جنگل کا کہا تھا، وہ کب آئے گا؟''

''وہ ابھی دور ہے۔'' نیمو نے جنوب کی طرف اشارہ کیا۔ ''لیکن ایک بار ہم اس میں داخل ہو گئے تو محفوظ ہو جائیں گے۔''

کارا کی نے جنگل کے بارے میں سن رکھا تھا لیکن اس نے کبھی جنگل دیکھا نہیں تھا۔ وہ جس جگہ رہتے تھے وہاں صحرا تھا جس میں کہیں کہیں جھاڑیاں تھیں۔ اسے جنگل کا سن کر اشتیاق ہو رہا تھا۔ نیمو نے یہ جنگل دیکھ رکھا تھا اور الفاظ میں اس کی تصویر کشی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کارا کی کے لیے یہ بات ناقابلِ یقین تھی کہ اس جنگل میں ایسے درخت تھے جو ان کے علاقے میں پائے جانے والے کسی بھی درخت سے کئی گنا اونچے تھے۔

گزشتہ دن وہ بے تکان چلتے رہے تھے اور رات کھلے صحرا میں بسر کی تھی۔ آج بھی وہ سارا دن چلتے رہے۔ ان لوگوں کے پاس سواری کے لیے کوئی جانور نہیں تھا۔ وہ گھوڑے اور گدھے سے ناواقف تھے اس لیے ان کا سفر پیدل ہوتا تھا۔ لیکن وہ پیدل چلنے کے عادی تھے اور طویل سفر کر کے بھی نہیں تھکتے تھے۔ ان کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ایک دن میں چالیس پچاس میل کا سفر طے کر لیا کرتے تھے۔ رات ہوئی تو وہ ایک جگہ رک گئے۔ اب تک خوش قسمتی سے انہیں کسی نے نہیں روکا تھا اور نہ ہی انہیں کوئی انسان ملا تھا۔ انہوں نے کھانا کھایا اور سو گئے۔

اگلے روز بھی وہ سارا دن سفر کرتے رہے۔ نیمو نے محسوس کیا کہ کارا کی تھک گئی ہے۔ اصل میں وہ اتنا چلنے کی عادی نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس نے رفتار کم نہیں کی تھی۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ دشمن ان کے پیچھے ضرور آئے گا۔ یہ متکبر مزاج لوگ اتنی آسانی سے ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ دوپہر کے وقت وہ ایک ویران بستی میں داخل ہوئے۔ جہاں لوگوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں بیشتر ڈھانچوں میں بدل چکی تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں گدھ بچی کچی لاشوں کو بھی کھا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی فوج نے اس بستی پر حملہ کر کے اسے تاراج کر دیا تھا اور یہاں رہنے والے ہر باشندے کو قتل کر دیا تھا۔ پوری بستی میں کوئی ایک بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ مرنے والوں کی اکثریت مردوں اور بوڑھوں کی تھی۔ جوان عورتیں اور بچے غائب تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' نیمو نے کارا کی سے کہا۔ جو دکھ سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ ''ہم خود اپنے آپ کو ختم کر رہے ہیں۔''

''یہاں سے چلو۔'' کارا کی نے گھبرا کر کہا۔ لاشیں دیکھ کر اس کا دل خراب ہو رہا تھا۔ ویسے بھی یہاں کچھ نہیں تھا۔ وہ بستی سے نکلنے لگے تھے کہ انہیں کسی بچے کی دبی دبی سی رونے کی آواز آئی۔ نیمو نے تلاش کیا تو اسے ایک ڈھائی تین سال کا بچہ ملا۔ وہ ایک چھوٹے سے گڑھے میں دبکا ہوا تھا اور اس کی حالت بتاتی تھی کہ وہ کئی دن سے بھوکا ہے۔ کارا کی نے اسے روٹی کھلائی اور اس کا جسم صاف کیا۔

''اب اس کا کیا کرنا ہے؟'' کارا کی نے نیمو سے پوچھا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ بچے کے ساتھ سفر کرنا دشوار تھا جبکہ دشمن بھی پیچھے تھا۔ مگر وہ اسے پیچھے چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ نیمو نے کہا۔ ''اسے لے چلو، یہاں چھوڑا تو یہ بھوک سے مر جائے گا۔ راستے میں کہیں کوئی اچھے لوگ ملے تو ان کے حوالے کر دیں گے۔''

کارا کی نے بچے کا نام جاننے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی توتلی زبان میں بتایا تو اس کا نام ربکو کی سمجھ میں آیا۔ کارا کی نے اسے ربکو کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ وہ ذرا سی دیر میں اس سے مانوس ہو گیا تھا۔ مگر اب ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ اسے نہ تو اٹھا کر سفر کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی وہ پیدل چلنے میں ان کا ساتھ دے سکتا تھا۔ مجبوراً نیمو نے اپنا ترکش اور کمان بھی کارا کی کے حوالے کیا اور ربکو کو اٹھا کر اپنی پشت پر سوار کر لیا۔ اس طرح وہ کسی قدر مشکل سے مگر پہلے جتنی رفتار سے سفر کر سکتے تھے۔ اس دن رات ہونے پر وہ ایک ندی کے کنارے رکے۔ اب صحرائی سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ کہیں کہیں ہریالی نظر آنے لگی تھی۔ انہیں راستے میں پانی بھی ملا تھا۔ اس لیے اب پانی کے حوالے سے مسئلہ نہیں رہا تھا۔ کارا کی نے کھانے کے بعد ربکو کو نہلانے کا سوچا اور اسے ندی کنارے لے گئی۔ پانی میں جا کر ربکو خوش ہو گیا تھا اس نے چھپاکے مار مار کر کارا کی کا سارا لباس بھی گیلا کر دیا اس نے دیکھا کہ جب وہ بھیگ ہی چکی ہے تو اس نے خود بھی نہا لینا مناسب سمجھا۔

پھر باہر آ کر اس نے اپنا لباس اتار دیا اور ایک طرف گول مول سی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے اور نیمو کے درمیان صرف تاریکی کا پردہ تھا۔ اس نے اپنا لباس سکھانے کے لیے ایک طرف جھاڑی پر ڈال دیا تھا۔ پھر سردی بڑھی تو ربکو بھی ٹھٹھرتا ہوا اس کے پاس آ گیا اور وہ اسے خود سے لپٹا کر سو گئی۔ اس کی شرم محسوس کر کے نیمو خود اس سے ذرا دور جا کر لیٹ گیا

تھا۔ صبح روشنی ہونے سے پہلے کارا کی نے اپنا نم لباس پہن لیا تھا۔ روشنی ہونے پر انہوں نے تھوڑا بہت کھایا اور آگے روانہ ہوگئے۔ نیمو نے اسے بتایا کہ آج شام یا کل صبح تک وہ جنگل کے پاس پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد اگر دشمن ان کا تعاقب بھی کرتا ہے تو انہیں اتنی پروا نہیں ہوگی کیونکہ جنگل کے آغاز میں اس کے باپ کے ایک دوست کا قبیلہ آباد تھا۔ وہ ان کو تحفظ بھی دیتا اور آگے جانے میں ان کی مدد بھی کرتا۔ اس روز بھی وہ تیزی سے سفر کرتے رہے۔ کارا کی کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی لیکن وہ نیمو کا برابر ساتھ دے رہی تھی۔ نیمو نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے اس سے کھانے کا سامان بھی لے لیا تھا۔ اب وہ صرف تیر اور کمان اٹھائے ہوئے تھی۔ شام تک وہ جنگل میں نہیں پہنچ سکے تھے۔ البتہ وہ ایک بلند ہوتی سطح کے پاس پہنچ گئے تھے اور جب نیمو نے یہاں سے پلٹ کر عقب میں دیکھا تو اسے بہت دور چند ننھے سے کیڑے رینگتے دکھائی دیے۔ ان کیڑوں کا رخ انہی کی طرف تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا۔

"دشمن ہمارے پاس آگیا ہے۔" اس نے کارا کی سے کہا تو اس کا چہرہ سفید ہوگیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"اب کیا ہوگا؟"

"ہمیں یہاں سے جلدی نکلنا ہوگا۔" اس نے کہا اور پھر ریکو کو اٹھا لیا اور وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ اب ان کا انداز بھاگنے والا تھا۔ جیسے انہوں نے پیچھے آنے والوں کو دیکھ لیا تھا اسی طرح انہوں نے بھی ان کو دیکھ لیا ہوگا۔ کارا کی بھی مارے خوف کے اپنی تھکن بھول کر بھاگ رہی تھی۔ جیسے جیسے ڈھلان بلند ہوتی جا رہی تھی، اس پر سفر کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا مگر وہ جیسے تیسے چل رہے تھے۔ کئی بار کارا کی لڑکھڑائی تھی تو نیمو کو اسے بھی سہارا دینا پڑا۔ مگر اس نے ایک بار بھی ریکو کو چھوڑنے کو نہیں کہا تھا۔ حالانکہ اس وقت وہ ریکو کو چھوڑ دیتا تو اس میں حق بہ جانب ہوتا کیونکہ خطرہ اسے اور کارا کی کو تھا، ریکو کو نہیں تھا۔ تعاقب میں آنے والے اسے کچھ نہیں کہتے۔ مگر وہ ہمت سے ریکو کو بھی اٹھائے ہوئے چلتا رہا۔

ڈھلان کے آخر میں انہیں جھاڑیوں کے پار ایسا شور سنائی دے رہا تھا جیسے بلندی سے پانی گر رہا ہو۔ وہ گرتے پڑتے جھاڑیوں تک پہنچے تو ستاروں کی ہلکی روشنی میں ایک عجیب منظر تھا۔ ان کے عین نیچے دریا بہہ رہا تھا اور اس کے پار جنگل تھا۔ کارا کی یہ دیکھ کر سہم گئی۔ اس نے نیمو سے کہا۔ "ہم اس کے پار کیسے جائیں گے؟"

"تیر کر۔" اس نے جواب دیا اور بہت ترچھی ڈھلان پر نیچے اترنے لگا۔ کارا کی اس کے پیچھے تھی۔ وہ رک نہیں سکتے تھے ورنہ یہ بہت خطرناک ڈھلان تھی اور وہ ذرا سی غلطی سے براہ راست دریا میں جا گرتے۔ نیمو بہت احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا اس کے باوجود ایک بچے کے ساتھ یہ بہت مشکل کام تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ ابھی وہ نیچے جا گرے گا۔ اسے کارا کی کا خیال بھی تھا۔ اس نے بھی ایسی کسی جگہ سفر نہیں کیا تھا۔ اس کے لیے یہاں چلنا اور بھی مشکل تھا۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح بغیر لڑھکے نیچے پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ اب ان کے سامنے دریا کا بپھرا ہوا پانی تھا۔ شاید پیچھے کہیں بارش ہوئی تھی اس وجہ سے دریا میں بہت پانی تھا۔ اس وقت اسے عبور کرنا بہت دشوار لگ رہا تھا کیونکہ کارا کی تیرنا نہیں جانتی تھی اور ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ اس کے باوجود انہیں دریا عبور کرنا تھا۔ دشمن ان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ نیمو دریا کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ وہ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں سے دریا آسانی سے عبور کیا جا سکے۔ خاصی دیر تک دریا کے کنارے چلنے کے بعد وہ ایک جگہ پہنچے جہاں دریا کم چوڑا تھا مگر یہاں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا اور اگر وہ بہہ جاتے تو کم سے کم کارا کی اور ریکو کی جان کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔

نیمو نے دریا پار کرنے کا محفوظ طریقہ سوچا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ نہ پائیں۔ اس کی سمجھ میں ایک ترکیب آگئی۔ اس نے دریا کے کنارے کی بیلوں سے ٹکڑے کاٹ کر ان کو بٹ کر رسیاں بنائیں اور ان کی مدد سے کارا کی اور ریکو کو خود سے باندھ لیا۔

"سنو... تم نے خود کو اور ریکو کو پانی سے اوپر رکھنا ہے۔" نیمو نے کارا کی سے کہا۔ "میں تم دونوں کو کھینچ کر لے جاؤں گا۔"

کارا کی دریا کا بہاؤ دیکھ کر ڈر رہی تھی مگر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں تیار ہوں۔"

نیمو دریا میں اترا اور اس نے پاؤں زمین پر ہی رکھے تھے کہ اس کے پیچھے کارا کی اور ریکو بھی دریا میں اتر گئے۔ ریکو بچہ تھا، ڈر کر رونے لگا۔ کارا کی نے اسے اپنے قریب رکھا تاکہ اس کا منہ پانی سے باہر رکھ سکے۔ نیمو کچھ دیر تو چلتا رہا پھر دریا کی گہرائی بڑھ گئی تو مجبوراً اسے تیرنا پڑا۔ اب وہ دریا کی بپھری لہروں کے رحم و کرم پر تھے۔ نیمو تھکا ہوا ہونے کے باوجود اپنے بازوؤں کی ساری طاقت سے سب کو دریا کے پار لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر بہاؤ اس کے اندازے سے زیادہ تیز تھا۔ وہ انہیں کھینچ کر لے جانے لگا۔ رسی کی وجہ سے کارا کی اور ریکو ڈوبنے سے محفوظ تھے۔ لیکن وہ اس پر بوجھ

بن گئے تھے اور ان کے وزن کی وجہ سے نیمو دریا کے پار نہیں جا پا رہا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ ایک ترچھے رخ کے ساتھ دریا کے دوسرے کنارے کے قریب ہوتا جائے۔ یہ کوشش کسی قدر کامیاب رہی اور وہ بتدریج دوسرے کنارے کے پاس ہونے لگے۔ اتنی دیر میں کارا کی بھی پانی سے کسی قدر آشنا ہو کر ہاتھ پاؤں چلانے لگی تھی۔ اس سے بھی نیمو کو مدد ملی اور وہ ایک طویل اور ناقابل یقین جدوجہد کے بعد دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچنے میں کامیاب رہے۔

مگر اس کامیابی نے ان کی ساری طاقت نچوڑ لی تھی اور وہ بے سدھ ہو کر گر گئے۔ ریکو بھی ٹھیک تھا۔ وہ کتنی ہی دیر وہیں پڑے ہانپتے رہے۔ پھر جب کارا کی کی ذرا جان میں جان آئی تو وہ نیمو سے لپٹ گئی۔

"تم نے ہم سب کو بچا لیا ہے۔" اس نے گرم جوشی سے کہا۔

"تم سب میرا ایک حصہ ہو۔" نیمو نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن ہم ابھی محفوظ نہیں ہیں۔ ہمیں جنگل میں جانا ہوگا۔"

"وہ اب کتنا دور ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک دن اور سفر کرنا ہوگا۔" اس نے کہا۔ رات کا نصف حصہ گزر چکا تھا اور نیمو نے باقی رات آرام کا سوچا۔ اس کا خیال تھا کہ دشمن رات کی تاریکی میں دریا عبور کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔

☆☆☆

الیست اور اس کے چار ساتھی تیز رفتاری سے سفر کر رہے تھے۔ شمال کی طرف جانے کا دھوکا جلد ان کے سامنے آگیا تھا مگر اب وہ درست سمت میں جا رہے تھے۔ تین دن تک وہ بہت تیزی سے سفر کرتے رہے تھے۔ الیست کو یقین تھا کہ کارا کی کی وجہ سے نیمو اتنی تیزی سے سفر نہیں کر سکے گا اور وہ اسے جنوب کے جنگل میں داخل ہونے سے پہلے جا لیں گے۔ چوتھے دن وہ ایک ڈھلان کے شروع میں تھے جب کھوجی کی تیز نظر نے آگے سفر کرنے والے کارا کی اور نیمو کو دیکھ لیا مگر ان کے ساتھ ایک بچے کی موجودگی نے الیست اور اس کے ساتھیوں کو پریشان کر دیا تھا کہ یہ نیمو اور کارا کی ہی تھے یا کوئی اور تھے۔ اتنی دور سے وہ صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ الیست نے کہا۔

"ممکن ہے انہیں راستے میں کوئی بچہ مل گیا ہو؟"

"ہاں، اس تباہ بستی سے مل سکتا ہے جس سے ہم کل گزرے تھے۔" الیست کے ایک ساتھی نے اس کی تائید کی۔

"یہ وہی ہیں، ان کا پیچھا کرو۔" الیست نے حکم دیا۔

"ایک اچھی بات ہے۔" کھوجی نے کہا۔ "آگے دریا ہے اور بارش کے موسم میں اس میں بہت پانی ہوتا ہے۔ رات کو اسے عبور کرنا مشکل کام ہے۔ ہم ان کو پکڑ سکتے ہیں۔"

کامیابی کو پاس دیکھ کر وہ اور تیزی سے سفر کرنے لگے مگر جب وہ دریا کے کنارے پہنچے تو نیمو اور کارا کی وہاں نہیں تھے۔ کھوجی نے مشعل کی روشنی میں ان کے نشانات دیکھ لیے۔ "وہ اس طرف گئے ہیں۔"

وہ دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ ایک جگہ رک کر کھوجی نے اعلان کیا کہ وہ دریا میں اتر گئے۔ اس جگہ دریا کا پاٹ کم لیکن بہاؤ بہت تیز تھا۔ اسے عبور کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ الیست کے ایک ساتھی نے کہا۔

"اگر انہوں نے دریا عبور کرنے کی کوشش کی ہوگی تو وہ ڈوب گئے ہوں گے۔"

"اور اگر وہ بچ گئے تو؟" الیست نے سوال کیا۔

کسی کے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا اس لیے اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ہمیں بھی دریا عبور کرنا ہوگا۔"

"اس وقت؟" الیست کا ساتھی پریشان ہوگیا۔

"ہاں، اسی وقت ورنہ کل تک تو وہ ہماری پہنچ سے دور نکل جائیں گے۔" الیست نے غصے سے کہا۔

مگر دریا کی بپھری لہروں کو دیکھ کر وہ سب ہچکچا رہے تھے حالانکہ ان سب کو تیرنا آتا تھا۔ آخر الیست نے انہیں سخت لہجے میں حکم دیا تو وہ بادل ناخواستہ پانی میں اتر گئے۔ جب وہ کنارے سے ذرا آگے نکلے تو انہیں بہاؤ کی شدت کا صحیح سے اندازہ ہوا اور وہ الگ الگ ہونے کی وجہ سے بہہ گئے۔ اب وہ سب اپنی اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ الیست ان میں سب سے آگے تھا کیونکہ اس کے اندر ایک جوش تھا۔ وہ ہر قیمت پر نیمو بلکہ کارا کی تک پہنچنا چاہتا تھا۔ یہی جوش اسے دریا کے دوسرے کنارے تک لے گیا مگر اتنی دیر میں اس کا جسم شل ہوگیا تھا۔ وہ دریا کے کنارے گر کر ہانپنے لگا۔ اسے اپنے ساتھیوں کا کچھ پتا نہیں تھا کہ ان میں سے کتنے بچے تھے اور کتنے دریا کی نذر ہوگئے تھے۔ اسے ان کی فکر بھی نہیں تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ جلد از جلد اس کی حالت سنبھل جائے تاکہ وہ نیمو اور کارا کی کی تلاش میں نکل سکے۔ خاصی دیر بعد اس کی حالت اس قابل ہوئی تو اس نے اٹھ کر دریا کے کنارے ان دونوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ بچ گئے ہیں اور یہیں کہیں ہیں۔

☆☆☆

کارا کی بہت پہلے اٹھ گئی تھی۔ اس نے روشنی ہونے

www.pkdigest.com

سے پہلے اپنا لباس پہن لیا۔ رات بھر بھیگ جانے کی وجہ سے اس نے اسے اتار کر دریا میں دھو کر خشک ہونے کے لیے لٹکا دیا تھا۔ رات کے وقت خاصی خنکی ہو جاتی تھی اور ایسے میں گیلا لباس برداشت کرنا مشکل ہوتا تھا۔ نیمو بے خبر سو رہا تھا۔ کارا کی نے اسے محبت سے دیکھا۔ اس کی خاطر اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے نیمو کو ہلایا۔ وہ اٹھ گیا۔

"کیا ہوا؟"

"بس اب چلو، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

اتنی دیر آرام کرنے کے بعد وہ تازہ دم ہو گیا تھا۔ ریکو سو رہا تھا۔ انہوں نے اسے سونے دیا اور ایسے ہی گود میں اٹھا کر چل پڑے۔ ان کے کھانے اور پینے کا سارا سامان دریا کی نذر ہو گیا تھا۔ صرف نیمو کے ہتھیار بچے تھے۔ انہوں نے روانہ ہونے سے پہلے دریا سے پانی پیا اور چل پڑے۔ ان کو کھانے پینے کی چیزوں کے ضائع ہونے کی اتنی پروا نہیں تھی۔ ایک تو اس علاقے میں جا بجا چاندی نالے نظر آ رہے تھے اور پھر ان کی منزل بھی پاس تھی۔ کارا کی کے ذہن میں ایک خدشہ تھا۔ اس نے نیمو سے پوچھا۔

"کیا وہ ہمیں پناہ دیں گے؟"

"ہاں کیونکہ اس قبیلے کا ایک اہم آدمی میرے باپ کا دوست تھا اور پھر یہ اچھے لوگ ہیں، پُرامن اور دوسروں کی مدد کرنے والے!"

"تب ہم ان کے پاس ہی کیوں نہیں رک جاتے؟"

"میں مایا سلطنت تک جانا چاہ رہا ہوں۔ میں اس جگہ نہیں رہ سکتا جہاں ایک ہی نسل کے لوگ قبیلوں میں بٹ کر ایک دوسرے کا قتل عام کرتے پھر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جلد ان لوگوں کا نام و نشان مٹ جائے گا۔"

"وہاں ہمیں پناہ مل جائے گی؟"

"ہاں کیونکہ ہم ان کا ایک حصہ ہیں۔" نیمو نے سر ہلایا۔

دریا کے پار سرسبز علاقہ شروع ہو گیا تھا مگر جنگل ابھی کچھ دور تھا۔ موجودہ دور کے حساب سے اسے یوں سمجھیں کہ میکسیکو سٹی سے ذرا آگے وہ علاقہ جہاں پڑوسی ملک گوئٹے مالا کی سرحد ملتی ہے۔ یہاں سے خاص استوائی خطے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہاں بے پناہ بارشیں ہوتی ہیں اور بہت گھنے جنگل ہیں۔ نیمو اسی طرف جا رہا تھا۔ اس وقت یہ جنگل مایا سلطنت کی آخری حد بھی بن گئے تھے۔ روشنی نمودار ہوئی تو وہ آسانی سے سفر کرنے لگے۔ انتہائی جنوب میں گہرے سبز رنگ کی ایک لکیر نظر آ رہی تھی۔

"وہ جنگل ہے۔" نیمو نے اشارہ کیا۔

عجیب بات تھی کہ جنگل سے پہلے ایک خشک اور چٹیل میدان تھا جس میں روئیدگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کے بعد گھنے اور اونچے درختوں کی قطار تھی۔ یہ میدان کم سے کم دو میل طویل تھا۔ انہوں نے میدان میں قدم رکھا تو سورج عین سر پر تھا۔ گرمی بے پناہ تھی اور ان کو پانی پیے ہوئے بھی خاصی دیر ہو گئی تھی اس لیے پیاس کا احساس ہو رہا تھا مگر جب انہوں نے اس تپتے میدان میں چلنا شروع کیا تو چند لمحے میں گلا ریت کی طرح خشک ہو گیا۔ کارا کی بوکھلا گئی۔ اس نے نیمو سے پوچھا۔

"آگے پانی ملے گا؟"

"آگے پانی بہت ہے۔" نیمو نے اسے تسلی دی۔ "بس ہمیں ان درختوں تک پہنچ جانے دو۔"

مگر درخت تو ایسا لگ رہا تھا کہ ان سے بہت دور چلے گئے ہیں۔ وہ چلتے جا رہے تھے اور درخت آنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ گرمی اور پیاس کی شدت سے وہ بے حال ہونے لگے۔ کارا کی کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ نیمو کی حالت بھی بری تھی مگر وہ مرد تھا اس لیے ہمت کر کے چل رہا تھا۔ اس کی گود میں ریکو کا چہرہ ذرا سی دیر میں مرجھا گیا تھا۔ اسے بھی پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے دو تین بار پانی مانگا پھر ان دونوں کو چپ پا کر خود بھی چپ کر گیا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ آگ کا بنا یہ میدان کبھی ختم نہیں ہو گا۔ ان کے پیروں پر چمڑے کے مخصوص جوتے تھے اس کے باوجود ان کے تلوے جل رہے تھے۔ کارا کی بار بار درختوں کی طرف دیکھ رہی تھی جو اب بھی اتنے ہی فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔ اچانک ان کو عقب سے ایک دہاڑتی آواز سنائی دی۔ نیمو نے چونک کر عقب میں دیکھا تو اسے دور ایک آدمی دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ اس کا رخ انہی کی طرف تھا۔

"کارا کی! تیز چلو۔" نیمو نے بھی دوڑنا شروع کر دیا۔ کارا کی بھی لڑکھڑاتے قدموں سے دوڑنے لگی۔ مگر تعاقب میں آنے والا تیزی سے ان کے نزدیک آتا جا رہا تھا۔ اب کارا کی نے اسے پہچان لیا۔ وہ ایست تھا۔ اس نے نیمو کو بتایا۔ نیمو نے کہا۔ "رکو مت... درختوں میں جا کر اسے دیکھ لوں گا۔"

درخت قریب آ گئے تھے۔ جب وہ درختوں کے سائے میں پہنچے تب بھی انہیں سکون نہیں ملا۔ منزل سامنے تھی تو پیچھے سے دشمن آ گیا تھا۔ نیمو نے ریکو کو کارا کی کے سپرد کیا۔

"تم اسے لے کر جاؤ۔"

"کہاں جاؤں؟" کارا کی حواس باختہ ہو گئی تھی۔ "تم ساتھ نہیں چل رہے ہو؟"

"میں اسے روکوں گا۔" اس نے اپنا تیر کمان سنبھالا۔

"تب میں کہاں جاؤں؟"

"تم ان درختوں میں داخل ہو کر چلنا شروع کر دو۔ اگر میں بچ گیا تو آ جاؤں گا۔ یہ سارا علاقہ اسی قبیلے کا ہے۔ وہ یہاں کہیں تمہیں مل جائیں گے۔ تم میرے باپ کا بتاؤ گی تو وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ اپتی گاس کا نام یاد رکھنا، وہ میرے باپ کا دوست ہے۔"

"اپتی گاس۔" کارا کی نے دہرایا پھر بولی۔ "نہیں، میں تمہارے بغیر نہیں جاؤں گی۔"

"کارا کی... جاؤ۔" نیمو نے سختی سے کہا۔ "مجھے مرنا گوارا ہے لیکن یہ گوارا نہیں کہ تم ایست کے ہاتھ آ جاؤ۔"

نیمو نے زور دے کر کہا تو مجبوراً کارا کی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ مگر اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ایست ان کے قبیلے کا مانا ہوا لڑاکا تھا۔ اگرچہ نیمو بھی کم نہیں تھا مگر ایست کو ڈیل ڈول میں اس پر برتری حاصل تھی۔ کارا کی اس سے لپٹ گئی۔ نیمو نے اسے خود سے الگ کیا۔

"کارا کی جاؤ... وقت نہیں ہے۔" اس کی نظریں پاس آتے ایست پر مرکوز تھیں۔ کارا کی نے ریکو کو لیا اور درختوں میں غائب ہو گئی۔ نیمو نے اپنے ہتھیار سنبھالے اور ایست سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ ایست قریب آتے ہوئے اس سے ذرا فاصلے پر رک گیا تھا۔ اس نے دانت نکوس کر کہا۔

"اگر تم کارا کی کو میرے حوالے کر دو تو میں تمہیں کچھ کہے بغیر چلا جاؤں گا۔"

"تم کارا کی کو نہیں لے جا سکتے۔" نیمو نے اسے جواب دیا۔ "میری زندگی میں تم ان درختوں میں قدم نہیں رکھ سکتے۔"

"اگر تم مرنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔" اس نے اپنی کلہاڑی سنبھالی۔ اس کے پاس تیر کمان یا چاقو نہیں تھا۔ نیمو کے پاس تیر کمان تھا اور وہ چاہتا تو دور سے تیر مار کر ایست کو ہلاک یا زخمی کر سکتا تھا۔ مگر اس نے یہ گوارا نہیں کیا۔ اس نے تیر کمان اتار کر ایک طرف پھینک دیا اور پھر اپنا کلہاڑی نما ہتھیار سنبھال لیا۔

"ایست! میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا کیونکہ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن اگر تم نے کارا کی کا خیال دل سے نہ نکالا تو میں تم سے لڑوں گا، چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔"

"مجھے کارا کی ہی چاہیے۔" ایست نے دانت نکوس کر کہا اور اپنا کلہاڑا لہراتے ہوئے اس پر حملہ آور ہوا۔ نیمو نے پھرتی سے اس کا وار خالی جانے دیا اور خود اس پر حملہ کیا مگر ایست بھی کم پھرتیلا نہیں تھا۔ اس نے بھی وار بچا لیا۔ اگلے ہی لمحے دونوں میں خوف ناک کشمکش شروع ہو گئی۔ اس لڑائی کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ ان میں سے کسی ایک کی موت پر ختم ہو گی۔ دونوں کے تاثرات وحشیانہ ہو گئے تھے۔ چہرے کی رگیں تن گئی تھیں اور بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگی تھیں۔ دونوں بجلی کے کوندوں کی طرح لپک کر ایک دوسرے پر وار کر رہے تھے یا وار سے بچ رہے تھے۔ جلد نیمو نے محسوس کیا کہ ایست اس پر حاوی آ رہا ہے۔ اس کے واروں میں زیادہ قوت تھی اور وہ اس کے مقابلے میں زیادہ پھرتیلا بھی تھا۔ پھر پہلا زخم نیمو کو لگا۔ اس کے بازو کو ایست کی کلہاڑی چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ایک لمبا زخم بنا اور اس سے خون رسنے لگا۔ نیمو نے اپنے زخم کی طرف دیکھا اور دانت کچکچا کر ایست پر وار کیا، وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے آرام سے نیمو کا وار خالی کیا اور اسے ایک اور ضرب لگائی۔ اس سے بچنے کی کوشش میں نیمو لڑکھڑا کر نیچے جا گرا پھر اسے تیزی سے اٹھنا پڑا کیونکہ ایست کسی شکرے کی طرح اس پر جھپٹا تھا۔

"بس اب انجام ہے۔" ایست نے کہا۔ یہ ان کی زبان کا ایک محاورہ تھا جو دشمن پر آخری وار کرتے ہوئے بولا جاتا تھا۔

"نہیں، ابھی جنگ جاری ہے۔" نیمو سنبھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ "جب تک ہم میں سے کوئی زندہ ہے، یہ جنگ جاری رہے گی۔"

"بہت جلد تیری موت پر یہ جنگ ختم ہو جائے گی۔ میں کارا کی کو ساتھ لے جاؤں گا۔ وہ میری بیوی اور میرے بچوں کی ماں بنے گی۔"

"میں زندہ رہوں یا نہیں رہوں تو کارا کی کو نہیں لے جا سکے گا۔ میں نے اسے اس قبیلے کی پناہ میں دے دیا ہے جو یہاں آباد ہے۔"

"تو ایسا نہیں کر سکتا۔" ایست نے اسے گھورا۔

"میں نے ایسا کر دیا ہے۔ کارا کی اب تک قبیلے کے پاس پناہ لے چکی ہو گی۔"

"غدار!" ایست نے دانت پیس کر کہا۔ "اب تجھے موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔" یہ کہتے ہوئے ایست نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس کا انداز غضب ناک تھا۔ اس بار وہ بہت تیزی سے وار کر رہا تھا اور نیمو کے لیے بچاؤ دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ ایک بار وہ بچنے کے لیے پیچھے ہٹا تو اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ گر گیا۔ ایست نے موقع سے فائدہ اٹھا کر

www.pkdigest.com

اس کے سر پر کلہاڑی گھما کر ماری۔ بچنے کی کوشش کے باوجود کلہاڑی اس کے سر کو چھوگئی تھی اور وار کی شدت نے یک دم ہی نیمو کی آنکھوں کے سامنے دنیا اندھیر کر دی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ ایست اس کے سر پر آ کھڑا ہوا تھا۔ سورج اس کے عقب میں تھا اس لیے نیمو کو اس کا سایہ سا نظر آرہا تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر ہمت نہیں ہوئی۔ پھر اس نے ایست کو کلہاڑی سر سے بلند کرتے دیکھا۔ اس کا آخری وقت آگیا تھا۔

☆☆☆

کارا کی ریکو کو گود میں لے کر بھاگ رہی تھی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور اسے رہ رہ کر نیمو کا خیال آرہا تھا۔ یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھا جارہا تھا کہ اگر ایست نیمو پر غالب آگیا تو...؟ درختوں کے نیچے سایہ اور ٹھنڈک تھی، اس کے باوجود کارا کی کو لگ رہا تھا کہ وہ جل رہی ہے۔ اچانک ہی اسے کہیں پانی بہنے کی آواز آئی۔ وہ اس طرف بڑھی۔ پاس ایک چھوٹی سی ندی تھی اس میں شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ اس نے پانی پیا اور ریکو کو بھی پلایا۔ پانی پی کر اس کے حواس بحال ہوئے۔ تب اس نے سوچا کہ اسے نیمو کو اس طرح چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ اسے کارا کی کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ مگر اس نے سختی سے کارا کی کو جانے کا حکم دیا تھا۔ کارا کی کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے ریکو کو ایک اونچے سے درخت پر چڑھا دیا۔

”تم یہاں بیٹھو... جب تک میں یا نیمو نہ آئے، نیچے مت اترنا۔“

ریکو نے سر ہلایا۔ کارا کی نیچے آئی۔ اس نے چلتے چلتے چند لمبے اور کھردرے پتھر اٹھائے اور پھر درختوں سے لگی بیلوں ... کی سوکھی شاخیں اتاریں اور ان سے چھوٹی چھوٹی رسیاں بٹ کر ان پتھروں سے باندھنے لگی۔ اس طرح اس نے چار پانچ پتھر رسی باندھ کر تیار کر لیے تھے۔ ان کو اپنے شانے سے لٹکا کر اس نے چٹیل میدان کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ اسے رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ نیمو کو اس کی مدد کی ضرورت ہے۔ کارا کی کے قبیلے میں یہ بھی ایک ہتھیار ہوتا تھا کہ پتھروں کو رسی کی مدد سے پھینک کر مارا جاتا تھا۔ یہ بہت موثر ہتھیار تھا۔ خاص طور سے عورتیں اسے آسانی سے استعمال کر سکتی تھیں کیونکہ اس میں طاقت سے زیادہ مہارت کی ضرورت ہوتی تھی۔ کارا کی اس ہتھیار کا استعمال جانتی تھی۔

وہ جنگل میں خاصی آگے نکل گئی تھی اور واپس جاتے ہوئے وہ راستہ بھٹک گئی۔ بڑی مشکل سے اسے صحیح راستہ ملا تھا اور جب وہ درختوں سے نکلی تو اس نے دیکھا کہ نیمو زمین پر گرا ہوا تھا اور ایست اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس کا دل رک سا گیا۔ کیا اسے دیر ہو گئی تھی؟ ایست نے نیمو کو مار دیا تھا؟ مگر نہیں، نیمو زندہ تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی اور کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔

کارا کی کے اندر ... غصے کی ایک لہر اٹھی اور اس نے غضب ناک ہو کر ایک پتھر لیا اور اس کی رسی گھما کر اسے ایست کی طرف پھینک کر مارا۔ اسی لمحے ایست نے اپنی کلہاڑی بلند کی۔ وہ نیمو پر آخری وار کرنے جارہا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ نیمو پر وار کرتا، پتھر اس کے ہاتھ پر لگا۔ کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیمو کے سامنے جا گری۔ ایست درد سے چلایا، چوٹ کاری تھی۔ کارا کی نے دوسرا پتھر لیا اور اسے گھما کر ایست کو مارنے والی تھی کہ اس نے نیمو کو ایست کی کلہاڑی اٹھا کر اسے ایست کے پیٹ پر مارتے دیکھا۔ کلہاڑی کا پھل ایست کے پیٹ میں گھس گیا تھا۔ ایست نے ذبح ہوتے جانور جیسی آواز نکالی اور لڑکھڑا کر پیچھے جا گرا۔ نیمو جھومتے ہوئے اٹھ گیا۔ کارا کی بھاگی اور اس سے لپٹ گئی۔

”یہ کیا ہوا؟“ کارا کی نے اس کے چہرے سے خون صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

”چوٹ لگی ہے۔“ نیمو نے اسے ایک طرف کر دیا اور ایست کی طرف بڑھا۔ وہ اپنے پیٹ سے کلہاڑی نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیمو نے کلہاڑی کا دستہ پکڑا اور اسے ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ ایست نے دل دوز چیخ ماری۔ اس کے پیٹ سے خون فوارے کی طرح ابلا تھا۔ نیمو نے کلہاڑی بلند کی مگر پھر رک گیا۔ ایست کی جو حالت تھی، وہ ویسے ہی کچھ دیر کا مہمان لگ رہا تھا۔ نیمو نے اس کی کلہاڑی ایک طرف پھینک دی اور لڑکھڑاتے قدموں سے کارا کی کی طرف بڑھا۔ اس نے جلدی سے نیمو کو سہارا دیا۔

”ریکو کہاں ہے؟“

”میں نے اسے ایک درخت پر بٹھا دیا ہے۔“ کارا کی نے بتایا۔ ”آؤ چلیں۔“ اس نے ایست پر آخری نظر ڈالتے ہوئے کہا جو نزع کے عالم میں تھا۔ وہ جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد نیمو پانی پی کر اور زخم صاف کر کے تازہ دم ہو گیا تھا انہیں جنگل میں کچھ پھل بھی مل گئے تھے۔ جنہیں کھا کر انہوں نے اپنی بھوک مٹائی تھی۔ اب وہ آگے جانے کے لیے تیار تھے۔ خطرہ باقی نہیں رہا تھا اور منزل ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے ریکو کو لیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

◎

یہ اس روز شام کے ساڑھے چھ بجے کی بات ہے کہ میرے فلیٹ کے نیچے والے فلیٹ میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور اس کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد اسی فلیٹ سے ہربرٹ نکلتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس بھی تھا۔ بعد میں ہربرٹ نے قسمیں کھا کھا کر پولیس کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس وقت اس کی بیوی جیل نہ صرف زندہ تھی بلکہ صحیح سلامت تھی۔ رات کے نو بجے میں وہ خط کھول کر دیکھ رہا تھا جو میں نے اپنے فلیٹ کی طرف آتے ہوئے لیٹر بکس میں سے نکالا تھا کہ میرے دروازے کی اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ہربرٹ کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے لجاجت سے کہا۔ ”مسٹر جان! مجھے افسوس ہے کہ اس وقت تمہیں زحمت دی۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ گزشتہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے دوران تم نے کوئی آوازیں تو نہیں سنیں؟“

ہربرٹ کی بات سن کر میں اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کا لمبا، پتلا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں میں پریشانی کی

اندیشوں کی کوکھ سے جنم لینے والا امید وامکان کے درمیان سفر کرتا جرم پارہ

زندگی میں ایک موڑ ایسا ضرور آتا ہے ...... جب ہمیں شدت سے کسی کی مدد کی ضرورت پڑ جاتی ہے ...... ایک ساتھ روز و شب گزارنے والے دوستوں کا ماجرا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے مددگار و معاون ثابت ہو رہے تھے۔

ملا

مرزا ظفر بیگ

www.pkdigest.com

جھلک تھی۔ وہ اور میں جس طرح کی عمارت میں رہتے تھے، اس کی دیواریں اتنی پتلی تھیں کہ ہر فلیٹ میں رہنے والا دوسرے فلیٹ والے کی آوازیں آسانی سے سن سکتا تھا۔
”نہیں ہربرٹ! میں نے تو کوئی آواز نہیں سنی... مگر بات کیا ہے... خیریت تو ہے نا؟“ میں نے کہا۔
”دراصل میں اپنے فلیٹ کے دروازے پر لگی ہوئی کال بیل بھی بجا رہا ہوں۔“ ہربرٹ نے جواب دیا۔ ”اور کئی مرتبہ دستک بھی دے چکا ہوں مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آرہا۔“
”اچھا!“ میں نے حیرت سے کہا۔
”بڑی عجیب اور پُراسرار سی بات ہے۔“ ہربرٹ نے کہا۔ ”جبکہ ساڑھے چھ بجے ایک ٹیلی فون کال آئی تھی۔“
”ہاں... میں نے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کی آواز سنی تھی۔“ میں نے اس کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔
”جانتے ہو وہ کال کس کی تھی؟“ ہربرٹ نے کہا تو میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اس پر وہ بولا۔ ”ساڑھے چھ بجے کسی نے فون کر کے مجھے یہ پیغام دیا کہ میں فوراً گرین اسپتال پہنچوں جہاں میرا بھائی داخل کیا گیا تھا اور وہ شدید بیمار تھا۔ میں سیدھا گرین اسپتال پہنچا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میرے بھائی سیڈ کا کوئی پتا نہیں تھا۔“ یہ کہہ کر ہربرٹ ایک لمحے کو رکا پھر بولا۔ ”جان! تمہیں زحمت تو ہوگی مگر ذرا میرے ساتھ نیچے تک چلو۔ پہلے میں سیڈ کی خبر سن کر پریشان تھا اور اب فلیٹ کا دروازہ نہیں کھل رہا۔“
”اوہ! تو تمہیں یہ وہم ہو گیا ہے کہ کسی نے تمہارے فلیٹ میں زبردستی داخل ہو کر تمہاری بیوی میبل کو قتل کر دیا ہے... ہے نا؟“ میں نے ازراہِ مذاق کہا۔
میں جانتا تھا کہ میبل ایک کھوجی قسم کی عورت ہے، ہر وقت دوسروں کی ٹوہ میں رہتی ہے۔ اپنے گھر کے دروازے، کھڑکیوں اور پردوں کی آڑ میں کھڑے ہو کر پڑوسیوں کی باتیں سننا اس کی پرانی عادت تھی۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ میرے نام آنے والی ڈاک کو کھولنے کی کوشش کرتی ہے لہٰذا میں نے ڈاک آنے کے وقت سے پہلے ہی مستعد رہنا شروع کر دیا تھا۔ جیسے ہی ڈاک آتی، میں فوراً نکال لاتا تھا۔
ہربرٹ کی یہ پُراسرار قسم کی بیوی میبل ایک ہوٹل میں پارٹ ٹائم ملازمت کرتی تھی۔ وہ استقبالیہ کلرک تھی اور کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ کب وہ ڈیوٹی پر ہے اور کب فلیٹ خالی ہے۔
میں نے اور ہربرٹ نے...... فلیٹ کے لاک کو چیک کیا۔ وہ واقعی اس انداز سے کھولا گیا تھا کہ پھر بند ہونے کے بعد کھلنے کے لائق نہیں رہا تھا۔ چنانچہ میں کھڑکی کے ذریعے کود کر اس کے فلیٹ میں داخل ہوا۔ میبل کہیں نہیں گئی تھی۔ وہ فلیٹ کے اندر ہی تھی مگر اس حالت میں... کہ ایک کاؤچ پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ اس کا سر غیر فطری انداز سے مڑا ہوا تھا اور چہرے کا رنگ بالکل سفید تھا۔ الماری کی تمام درازیں کھلی ہوئی تھیں اور کمرے میں ہر طرف کاغذات بکھرے پڑے تھے۔
”یہ... یہ... سب کیا ہے؟“ ہربرٹ نے بوکھلاتے ہوئے پوچھا۔ ”اس الماری میں میبل صرف خطوط رکھتی تھی۔ اکاؤنٹس کے کاغذات... ان سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟“
میں نے اسے تسلی دی اور پولیس کو فون کر دیا۔ پولیس نے آتے ہی خطوط اور اکاؤنٹس کے کاغذات کو چیک کرنا شروع کر دیا۔ وہ صرف کاغذات نہیں تھے بلکہ نادیدہ سونے کے صفوف میں آئے ہوئے وہ خطوط تھے جن کی قدر و قیمت سے میبل خوب اچھی طرح واقف تھی۔ اس نے ہوٹل کی ملازمت میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا تھا بلکہ اس ملازمت کو دولت کے حصول کا ذریعہ بنایا تھا۔ وہ لوگوں کے خطوط راستے میں غائب کر کے انہیں بلیک میل کرتی تھی۔ ان کاغذات میں ایک بینک بک بھی تھی جس کے مندرجات دیکھ کر اندازہ ہوا کہ میبل کس قدر ہوشیار اور چالاک عورت تھی۔
ہربرٹ نے پولیس کو بتایا کہ اسے اپنی بیوی کی ان پُراسرار اور مجرمانہ سرگرمیوں کا کوئی علم نہیں تھا مگر پولیس نے ہربرٹ کی جان نہیں بخشی۔ ظاہر ہے جب کسی شوہر کی بیوی اچانک اور وحشیانہ طریقے سے ہلاک کر دی جائے تو پولیس کو پہلا شک اس کے شوہر پر ہی ہوتا ہے، چاہے وہ کتنا ہی مظلوم اور بے قصور کیوں نہ ہو۔ اگر میں پولیس کے سامنے یہ گواہی نہ دیتا کہ میں نے اس کے فلیٹ میں ساڑھے چھ بجے فون کی گھنٹی بجنے کی آواز سنی تھی تو صورتِ حال اور بھی سنگین ہو جاتی۔ پولیس کو ہربرٹ کی کسی بات کا یقین نہیں آرہا تھا مگر میرے بیان نے حالات کی سنگینی کو کسی حد تک کم کر دیا تھا۔
کوئی بھی ایسا گواہ نہیں مل سکا جو اس بات کی تصدیق کرتا کہ چھ بج کر چالیس منٹ پر میبل زندہ تھی۔ یہ وہ وقت تھا جس کے بارے میں ہربرٹ کا اصرار تھا کہ وہ اسی وقت عمارت سے باہر نکلا تھا۔ ٹیلی فون کال کس نے کی تھی... کہاں سے کی گئی... اس کا پتا نہیں لگایا جا سکا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ یہ کال کسی پبلک کال آفس سے کی گئی تھی۔ دوسرے یہ انکشاف بھی ہوا کہ میبل کی موت کے بعد اس کے تمام ترکے کا قانونی اور جائز وارث صرف ہربرٹ تھا۔ اس کے علاوہ میبل

کا کوئی اور رشتے دار نہیں تھا۔
پولیس نے ہربرٹ کو اس کی بیوی کے قتل کے شبے میں گرفتار کر لیا اور اسے عدالت میں پیش بھی کر دیا مگر ہربرٹ مسلسل اس سے انکار کرتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل نہیں کیا ہے۔ آخرکار عدالت نے اسے شک کا فائدہ دیتے ہوئے بری کر دیا۔
میبل کی تدفین کے بعد ہربرٹ میرے پاس آیا اور اس نے یہ اعلان کیا۔ ”جان! میں لندن چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“
”کہاں جا رہے ہو تم؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔
”نورفوک!“ ہربرٹ نے جواب دیا۔ ”میرا دل اس جگہ سے بھر گیا ہے۔ اب میں نورفوک میں دریا کے کنارے رہوں گا۔ خوب گھوموں پھروں گا اور پرندوں کو دیکھوں گا۔“
”بشرطیکہ تم وہاں جا سکو۔“
میں نے کہا تو وہ ترنج کر بولا۔ ”اس میں شک والی کون سی بات ہے؟ میں واقعی نورفوک جا کر رہوں گا۔ میری بیوی میبل نے جو کچھ بچت کی تھی، وہ سب محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ میری پنشن بھی شروع ہونے والی ہے۔ میں تمہاری مدد حاصل کر کے...“
”مدد... اور وہ بھی میری؟“ میں نے حیرت سے کہا۔
”ہاں... تم میری مدد کرنے پر مجبور ہو۔“ ہربرٹ نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں حیرت سے اسے تکنے لگا جیسے وہ پاگل ہو۔
”مجھے ایسی نظروں سے مت دیکھو۔“ ہربرٹ نے کہا۔ ”اگر میں پولیس کے پاس جا کر یہ بتا دوں کہ تم نے غلط بیانی سے کام لیا ہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟“
”غلط بیانی... کیا مطلب؟“ میں نے کہا۔
”اس روز تم شام کو ساڑھے چھ بجے اپنے فلیٹ میں تھے ہی نہیں... تو تم نے میرے فلیٹ میں ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز کیسے سن لی؟“ ہربرٹ نے کہا۔ ”تم خود کو بہت ہوشیار سمجھتے ہو حالانکہ تم نرے بے وقوف ہو۔ تم نہیں جانتے کہ میری بیوی میبل اپنے کام میں کتنی ماہر عورت تھی۔ اس نے تمہارا لفافہ کھول کر اصل خط اپنی الماری میں محفوظ کر لیا تھا جبکہ تم نے اس کے ہاتھ کی ماہرانہ نقل پڑھی تھی۔ تمہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ تمہارے خطوط کھولتی ہے اس لیے تم اپنی ڈاک وصول کرنے کے لیے فوراً ہی بھاگتے تھے۔ مگر اس روز جب میں پونے سات بجے گھر سے نکلا تو میل بکس میں تمہارے نام کا ایک خط موجود تھا جبکہ تمہارے معمولات کے حساب سے وہ وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ گویا تم اس وقت گھر نہیں آئے تھے

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ماہ اکتوبر 2009ء کی جھلک عید کی خوشیوں کے ساتھ
انتہا
آخری صفحات پر محی الدین نواب کے قلم سے ایک لازوال کہانی...... زندگی کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کرتی ایک تحریر دل پذیر
خانزادہ
دوسرا اور آخری حصہ ملاحظہ کیجیے......
تاریخی واقعات سے مزین ہمایوں بلگرامی کا تحفہ خاص
حضرت ایوبؑ
اس بندۂ خاص کے صبر اور بے انتہا اجر کے حیرت انگیز واقعات جہاں ابلیس کو ہر مقام پر ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا
تین پتا ایک
ملک صفدر حیات کی تحیر انگیز کاوشوں کا ایک دلچسپ رنگ
اور مستقل سلسلے
دیوتا، اناڑی، محفل شعر و سخن، آپ کے خط
مزید
طاہر جاوید مغل، کاشف زبیر، ڈاکٹر ساجد امجد، مریم کے خان اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کے سحر انگیز شاہکار
اور وہ سب جو آپ سسپنس میں دیکھنا چاہتے ہیں!
تازہ شمارہ فوری حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون: 5895313 فیکس: 5802561

ورنہ وہ لفافہ وہاں نہ ہوتا۔" یہ کہہ کر ہربرٹ مسکرا دیا۔

"تو تمہارے خیال میں، میں کہاں تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"تم اس وقت گرین اسپتال میں تھے اور تم نے ہی وہاں کے پی سی او سے میرے گھر فون کیا تھا۔" ہربرٹ نے کہا۔

"تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟" میں نے غصے سے کہا۔ "ممکن ہے میں کسی کیفے میں کسی دوست کے ساتھ چائے پی رہا ہوں۔"

"مسٹر جان! تم وہ خط بھول رہے ہو جو چار مہینے پہلے آیا تھا اور کسی سنتھیا نامی خاتون کا تھا۔ میل نے تمہارا وہ خط اڑا لیا تھا۔ پولیس کو اس خط سے یقیناً دلچسپی ہوگی کیونکہ جب پولیس نے الماری کی دراز چیک کی تھی تو وہ خط وہاں نہیں تھا۔"

یہ کہہ کر ہربرٹ ایک بار پھر مکاری سے مسکرایا اور بولا۔ "پولیس کو یقین نہیں تھا کہ کرنل ہیتھ خودکشی کر سکتا ہے۔ وہ آج بھی اس مفروضے پر قائم ہے کہ کرنل ہیتھ کو اس کی بیوی سنتھیا اور اس کے نامعلوم عاشق نے ٹھکانے لگایا تھا۔ مگر جب مجھے یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ کرنل کی وصیت کے مطابق اگر اس کی بیوی سنتھیا نے دوسری شادی کی تو اس کی ساری دولت اور جائداد فلاحی اداروں کو چلی جائے گی تو مجھے تم پر بڑا ترس آیا۔ تم نے اتنی محنت کر کے اور اتنا خطرہ مول لے کر کرنل کو راستے سے ہٹایا مگر تمہاری قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے جان!"

"تم بکواس کر رہے ہو ہربرٹ۔" میں نے غصے سے کہا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش کر دیا۔

"زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" ہربرٹ نے کہا۔ "وہ عورت سنتھیا اپنے بوڑھے شوہر کی وصیت سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ وہ اس سے جان چھڑانا چاہتی تھی لہٰذا اس نے تمہیں چارے کے طور پر استعمال کیا اور تمہارے ہاتھوں کرنل کو مروا دیا۔ اس طرح اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک طرف تو کرنل سے نجات پالی، دوسری طرف وہ تمہارے ساتھ شادی پر بھی مجبور نہیں ہے۔"

"بکواس..." میں نے کہا۔ "میرا نام کہیں نہیں آیا تھا... اور یہ خط وغیرہ کی بات بھی سراسر..."

"سکون سے میری بات سنو۔" ہربرٹ نے اطمینان بھرے لہجے میں میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا تو میں نے جھٹک دیا۔

میں نے کہا۔ "زیادہ بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اب تمہاری بکواس نہیں سنوں گا۔"

"مسٹر جان! میری بکواس تو تمہارے اچھے بھی سنیں گے۔" ہربرٹ نے اطمینان سے کہا۔ "دیکھو دوست! میں اب لندن چھوڑ کر نورفوک جا رہا ہوں۔ وہاں جانے کا خرچہ بھی خاصا ہوگا اور ضرورت کا سامان بھی خریدنا ہے۔ رقم کی ضرورت تو ہے۔ اگر تم میری مدد کرو تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ مجھے اپنا دوست، اپنا بھائی سمجھ کر میری تھوڑی سی مدد کر دو۔ اس کے بعد میں نہ تمہیں پریشان کروں گا اور نہ کبھی سامنے آؤں گا۔"

"تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟" میں نے غصے سے کہا تو وہ لجاجت سے مسکرا دیا۔

"نہیں نہیں... ایسا نہ سوچنا۔ میں بلیک میلر نہیں ہوں۔" ہربرٹ نے کہا۔ "میری ضرورت کو سمجھو... میں ضرورت مند ہوں۔ اپنی ضرورت پوری ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔"

میں نے کڑی نظروں سے اسے گھورا تو وہ نرم لہجے میں بولا۔ "اس سے پہلے کہ میں تمہیں اپنی ضرورت کی رقم بتاؤں، تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہوں گا۔ اگر مستقبل میں کسی وقت تمہارا تیسرے قتل کا ارادہ ہو جائے..."

"کیا بکواس ہے؟ کیسا تیسرا قتل؟" میں نے کہا۔

"بھئی، پہلے تم نے کرنل کو قتل کیا۔ پھر میری بیوی میل کو... دو ہو گئے نا؟ اب اگر تمہارا تیسرے قتل کا ارادہ ہو تو پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لینا اور ہوم ورک کر لینا تاکہ ایسی غلطی نہ کرو جیسی تم نے میل کے قتل کے وقت کی تھی۔ اگر تم اسپتال جا کر پتا کر لیتے تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ میرا بھائی سیڈ صبح کی فلائٹ سے علاج کے لیے "ماجورکا" جا چکا ہے۔ اسی لیے جب تم نے مجھے دھوکا دینے کے لیے اسپتال سے کال کی اور مجھے بتایا کہ سیڈ کی حالت نازک ہے تو میں سمجھ گیا کہ تم میرے ساتھ کھیل رہے ہو اور اسی خط کے حصول کے لیے میل کے پاس جانا چاہ رہے ہو جو تمہیں کرنل کی بیوی سنتھیا نے لکھا تھا اور جس کے پولیس کے ہاتھ لگنے کی صورت میں تمہیں موت کی سزا ہو سکتی تھی۔ تم نے میل سے سودے بازی کی کوشش کی ہوگی مگر وہ بہت چالاک عورت تھی۔ ہر کاغذ کی قیمت جانتی تھی۔ شاید اس نے تم سے کوئی زبردست مطالبہ کر دیا تھا۔ تبھی تم نے غصے میں آکر اسے قتل کر دیا۔"

"بکواس بند کرو۔" میں اتنے زور سے چیخا کہ ایک لمحے کو خود بھی حیران رہ گیا۔

"تم اس طرح چیخ کر مجھے ڈرا نہیں سکتے۔" ہربرٹ نے کہا۔ "تمہیں بہرصورت میرا مطالبہ پورا کرنا ہوگا۔ اس کے سوا تمہارے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔"

...اور مجھے اس کے مطالبے کے سامنے سر جھکانا پڑا۔

رمضان کی آمد آمد تھی اس لیے میں دل بھر کر سو رہا تھا کیونکہ اماں نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ اس بار روزے بھی پورے رکھنے ہیں اور ان کے ساتھ کاموں میں ہاتھ بھی بٹانا ہے۔ اماں نے حسرت سے کہا۔

"ارے، اس بڑھاپے میں لگی رہتی ہوں۔"

"تو اماں بہو لے آؤ۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"کہاں سے لے آؤں؟ تو انسان کا بچہ تو بنے۔" اماں نے تنک کر کہا۔

"اچھا، میں تو سمجھتا تھا کہ ابا انسان..." میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور جھکائی دے کر اماں کی فائر کی ہوئی جوتی سے بال بال بچا۔ جوتی جا کر سیدھی جلیل کی بلی کو لگی جو اس نے اپنے کبوتروں کے کردار و افعال کی نگرانی کے لیے پالی تھی۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ جو جس سے ڈرتا ہے اسی سے سدھرتا ہے اس لیے کبوتر بلی سے سیدھے رہیں گے۔ یہ اور بات تھی کہ بلی کا اپنا کردار کچھ مشکوک ہو گیا تھا اور وہ پہلوان اللہ رکھا کے بلے کے ساتھ دیکھی جا رہی تھی۔ میں نے جلیل کو خبردار کیا تھا کہ عنقریب ہمارا گھر میٹرنٹی ہوم بننے والا تھا۔ مگر اس نے اسے اپنی پیاری مانو کے کردار پر حملہ قرار دیا تھا۔ جوتی کھا کر بلی نے پُرخمار نظروں سے اماں کو دیکھا اور غالباً پھر سے پہلوان اللہ رکھا کے بلے کے خوابوں میں کھو گئی۔ آج کل بلی کو خواب میں چھچھڑے نہیں بلکہ بلے آتے ہیں۔ کیبل نیٹ اور کیبل ٹی وی نے جانوروں تک کا

کوئی بھی موقع ہو ...... جلیل میاں کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی منگیتر کے ساتھ وقت گزاریں...... پھر یہ تو عید کا تہوار ہے ...... جسے وہ بھرپور طریقے سے منانا چاہتے تھے ...... مگر اچانک ہی ان کے گھر بن بلائے مہمان آگئے ...... اور ان کی پُرسکون زندگی میں ہلچل مچا دی۔

ہر مشکل اور مصیبت کا توڑ رکھنے والے جلیل کی معرکہ آرائیاں...... کج ادائیاں

کاشف زبیر

دولت محبت اور راجا

اخلاق تباہ کر دیا ہے۔

''اماں! ہر بات پر یہ جوتی کا ڈرون مت چلایا کرو۔ ورنہ میں بھی سرکار کی طرح عادی ہو جاؤں گا۔''

اماں نے برا منایا۔ ''کیا نہ چلایا کروں۔''

اب میں اپنی پیاری اماں کو کیا سمجھاتا کہ ڈرون کیا ہوتے ہیں۔ اس کا تو ہمارے بعض وزرا کو بھی نہیں معلوم جب ان سے کوئی پوچھتا ہے کہ امریکا ڈرون حملے کب بند کرے گا تو وہ حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ ڈرون ہوتا کیا ہے؟

اس وقت بھی میں خواب شنو میں گم تھا۔ میرا خیال ہے کہ خواب خرگوش صرف خرگوشی کو آتے ہیں۔ اماں نے ہمیشہ کی طرح مداخلت کی۔ ''جلیل! اٹھ جا... مجھے کچھ سامان لا دے۔''

''کہاں سے اماں۔'' میں نے انگڑائی لی۔

''بازار سے اور کہاں سے۔'' اماں نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ''اب اٹھ جانا کل پہلا روزہ ہے اور رضیہ بھی آرہی ہے۔''

میں چونکا۔ ''کون رضیہ اماں۔''

''ارے میری نواب شاہ والی ماموں زاد بہن۔''

''وہ جن کی جھلنگا سی بیٹی ہے؟''

''وہی وہی... غزل بھی اس کے ساتھ آرہی ہے۔''

جب میں نے اسے دیکھا اور اس کا نام سنا تھا تو مجھے لگا کہ وہ کسی بہت ہی بھرتی کے شاعر کی غزل تھی۔ اس نے ناک سڑکتے ہوئے منمنا کر مجھے سلام کیا تھا اور اپنے سوکھے ہوئے جسم کو بل دے کر شرمانے کی کوشش کی تھی۔ یہ آج سے کوئی پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ میں غلطی سے اور اماں کے بے جا اصرار پر نواب شاہ چلا گیا تھا۔ ان دنوں نیا نیا اندر سے آیا تھا اور اماں نے بہتر سمجھا کہ مجھے آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے کہیں دور بھیج دیا جائے۔ حالانکہ میں ان دنوں تازہ تازہ شنو کے عشق میں گرفتار ہوا تھا اور مجھ پر اچانک ہی انکشاف ہوا تھا کہ میرے پڑوس میں ہی ایک آفت کی پرکالہ اور بلائے جان رہتی ہے۔ مگر اماں کا حکم تھا جسے ٹالنے کی صورت میں وہ مجھے گھر سے باہر کر دیتیں اور میں شنو سے دور ہو جاتا۔ اس لیے میں نے جانے میں عافیت سمجھی۔

خالہ رضیہ کے شوہر ایک مقامی وڈیرے تھے اور خالہ ان کی تیسری منکوحہ تھیں۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شادی کے وقت خالہ اٹھارہ سال کی تھیں اور خالو اڑتالیس سال کے۔ خالہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب تھیں تو خالو چاند میاں کا دیہاتی ایڈیشن تھے۔ لیکن یہ معمولی فرق تھے کیونکہ خالہ خالی ہاتھ خالو کی زندگی میں آئی تھیں اور خالو ایک ہزار ایکڑ زمین کے مالک تھے جس پر دنیا جہاں کی فصلیں اگتی تھیں اور آم کے باغات تھے۔ مجھے وہاں بھیجنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ممکن ہے خالو اور خالہ مجھے اپنی اکلوتی دختر نیک اختر کے لیے منتخب کر لیں جس نے تازہ تازہ جوانی کی حدود میں قدم رکھا تھا۔

دبلی اور سوکھی سی غزل سانولے رنگ کی تھی اور اس کے بال چڑیوں کے گھونسلے کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اوپر سے اس کی مستقل بہتی ناک... اس لیے جیسے ہی میرے علم میں یہ لرزہ خیز انکشاف آیا کہ اس چیز سے میرا ایا مجھ سے اس کا مستقبل جوڑنے کی تیاری کی جا رہی ہے، میں وہاں سے بھاگ نکلا اور پیدل پیدل چلتا نواب شاہ سے باہر آگیا۔ پھر ایک مال گاڑی نے مجھے خراماں خراماں دو دن میں کراچی پہنچا دیا تھا۔

''اماں اس کی شادی نہیں ہوئی ابھی تک۔''

''نہیں، میرا خیال ہے کہ رضیہ کسی رشتے کے سلسلے میں آرہی ہے۔'' اماں نے کہا۔ ''اس کا کل فون آیا تھا۔ ہمارے ہاں ہی رکے گی۔''

''اس افسوس ناک لڑکی سے کون شادی کر سکتا ہے؟'' میں نے باہر کا رخ کرتے ہوئے سوچا اور اس بے چاری کی قسمت پر افسوس کیا جسے دیکھنے کے لیے خالہ رضیہ آرہی تھیں۔ جیسے ہی میں باہر نکلا شنو دروازے پر آگئی۔

''کہاں جارہے ہو۔'' اس نے کسی تھانے دار کے انداز میں پوچھا۔

''جہنم!'' میں نے جواب دیا۔ شنو ان دنوں میری جاسوسی میں لگی رہتی تھی کہ میں چاند بانو کا کوئی کام کر کے تو نہیں دے رہا ہوں۔

''وہاں تو تم جاؤ گے اپنے اعمال کی وجہ سے... میں پوچھ رہی ہوں ابھی کہاں جارہے ہو۔''

''مارکیٹ!'' میں نے ٹوکری لہرائی۔

''مجھے دو کلو آلو، ایک کلو پیاز اور آدھا کلو ٹماٹر لا دو۔''

''پیسے دو۔'' میں نے مطالبہ کیا۔

''میرے پاس نہیں ہیں۔'' اس نے ہری جھنڈی دکھا دی۔

''تو میں کہاں سے لا کر دوں۔''

''جہاں سے اس حرافہ چاند بانو کو لا کر دیتے ہو۔'' اس نے کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ میں دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتا ہوا روانہ ہو گیا۔

پیارے قارئین کے لیے راجا میری کہانی میں ایسا ہی ناگزیر ہو گیا ہے جیسے سالن میں نمک۔ اس کے بغیر کہانی میں مزہ نہیں آتا۔ میں باہر نکلوں تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ راجا سے کہیں ٹکراؤ نہ ہو۔ اس بار بھی وہ مجھے ایک دکان پر مل گیا۔ اس نے تنگی سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''خبیث کہیں کے... تو نے میرے باپ سے کیا لگائی بجھائی کی تھی؟ بی جمالو کے مردانہ نمونے!''

''لگائی بجھائی تو نہیں کی تھی۔'' میں نے دانت نکالے۔ ''جب اس نے تیرے بارے میں پوچھا تو میں نے سچ بتا دیا۔ ویسے بھی رمضان آرہے ہیں، میں سچ بولنے کی پریکٹس کر رہا ہوں۔''

راجا ہمیشہ کی طرح بھنا گیا۔ ''ابے تو سچ بولنے کے لیے میں ہی ملا ہوں۔ تو نے ابا سے کہا کہ میں نے چرس پینا شروع کر دی ہے۔''

''نہیں، اس نے ہیروئن کے بارے میں پوچھا تھا تو میں نے کہا کہ تیری اوقات چرس سے زیادہ کی نہیں ہے۔''

''اور تو نے یہ کیا اڑائی تھی کہ میں عارفہ سے شادی کرنے والا ہوں۔'' راجا مزید خفا ہو گیا۔

''تیرے باپ نے تجھے سدھارنے کے لیے ایک سرکاری منصوبہ بنایا تھا کہ تیری شادی کر دی جائے۔''

''سرکاری منصوبہ کیسے ہوا؟'' راجا نے اعتراض کیا۔

''جیسے سرکار کے پاس ہر مسئلے کا ایک ہی حل ہے کہ مسئلہ عوام کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ اسی طرح لڑکوں کے والدین کے پاس اپنے مسئلے کا ایک ہی حل ہوتا ہے کہ لڑکا بیوی کے سر مار دیا جائے... تو سرکاری حل ہوا نا۔''

''تو نے عارفہ کا نام کیوں لیا... کیا تو جانتا نہیں ہے کہ ابا نادر شاہ سے کتنی خار کھاتا ہے۔''

''مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے۔'' میں نے سبزی والے کو لسٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''میرے سامنے تو وہ نادر شاہ کے حضور اس طرح موجود تھا کہ اسے دیکھ کر پرائمری اسکول کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔''

''چلو اس نہ کر... ابا کبھی نہیں مانے گا۔''

''تیرا ابا راضی ہو گیا تھا کہ تجھے عارفہ ہی گود لے لے، اس کی جان تو چھوٹ جائے۔''

''میں عارفہ سے شادی نہیں کر سکتا۔'' راجا نے اعلان کیا۔

''ہاں، یہ تو نوسو چوہے کھانے کے بعد حج پر جانے والی بات ہو جائے گی۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ اس پر راجا نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

''ابے میں مجھے شادی کی پہلی رات اور اس کے بعد کی متعدد راتیں حوالات میں نہیں گزارنی ہیں۔''

''دیکھ بے راجا۔'' میں نے سبزی والے کو پیسے دیے۔ ''تو نے کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں شادی کرنی ہی ہے... تو عارفہ کیا بری ہے؟''

''ہاں بری تو نہیں ہے بلکہ اچھی خاصی ہے۔'' راجا بولا۔ ''لیکن وہ بھی تو راضی ہو۔''

''تیرا اصل مسئلہ یہی تو ہے۔'' میں نے کہا اور سبزی والے سے پوچھا۔ ''تم نے کوئی گارڈ نہیں رکھا۔''

''گارڈ... وہ کیوں صاحب؟'' سبزی والا بولا۔

''یہ تم نے جس حساب سے سبزی کے دام رکھے ہیں تو شام تک تمہارے پاس لاکھوں تو جمع ہو جاتے ہوں گے۔ اگر کوئی ڈاکو آگیا تو؟''

''گارڈ کیا کرے گا؟'' سبزی والے نے کہا اور کیش بکس سے ایک پستول نکال کر دکھایا۔ ''یہ ہے نا۔''

میں سرد آہ بھر کر روانہ ہوا تو راجا میرے ساتھ تھا۔ میں

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسہا برس سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جوانی، مردانگی کی بحالی ... [illegible]

حکیم اینڈ سنز

پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

www.pkdigest.com

نے اسے خبردار کیا۔ ”اگر تیرا بے عزتی کرانے کا موڈ ہے تو شوق سے چل۔ اماں کا موڈ بہت خراب ہے۔“

”میں گلی سے مڑ جاؤں گا۔“ راجا نے کہا۔ ”ویسے اگر میں عارفہ سے شادی کرلوں تو...“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”میں تجھے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔“

راجا کا منہ لٹک گیا۔ ”یعنی میری شادی کا کوئی امکان نہیں ہے۔“

”نہیں، ہے تو۔“ میں نے ترس کھا کر کہا۔ پھر مجھے رضیہ خالہ کی بیٹی غزل کا خیال آیا۔ ”یار راجا! ایک چانس ہے تو... بلکہ تیرے لیے تو سمجھ لے جیک پاٹ ہے۔“

”وہ کیا۔“ راجا نے اشتیاق سے پوچھا۔

”اماں کی ایک رشتے کی بہن نواب شاہ سے آرہی ہے، اپنی لڑکی کا رشتہ تلاش کرنے... زمیندار خاندان ہے۔“

”اچھا۔“ راجا کے منہ میں پانی آگیا۔ اس نے پوچھا۔ ”لڑکی کیسی ہے۔“

”یوں سمجھ لے کہ تیرا جوڑا ہے۔“

راجا خوشی سے یوں جگمگانے لگا جیسے ابھی چہرے کا بلاسم سے پالش کرا کے آیا ہو۔ ”سچ؟“

”تیری جان کی قسم۔“ میں نے یقین دلایا۔ معاملہ راجا کی جان کا تھا اس لیے میں نے قسم کھانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا۔

”یار وہ کب آئے گی؟“

”کل لیکن برائے مہربانی تو اس چکر میں میرے گھر کے چکر مت لگانا۔ میں کوشش کروں گا کہ تیرا معاملہ سیٹ ہو جائے۔“

راجا یک دم میرا یار جاں نثار ہو گیا تھا اور میں اسے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کو کہتا تو وہ ایک لمحے کی دیر نہ کرتا۔ بہ مشکل اس سے جان چھڑا کر میں گھر تک آیا تو شنو دروازے پر موجود تھی۔

”میں نے جو منگوایا تھا وہ کہاں ہے۔“

”وہ تو میں بھول گیا۔“ میں نے بوکھلا کر کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ شنو نے میرے ہاتھ سے ٹوکری لے لی اور بولی۔ ”پھر سے جا کر لے آؤ۔“

”اتنی گرمی میں؟“ میں نے فریاد کی۔

”اتنی بھی نہیں ہے اور تم کون سا موم کے بنے ہو۔“

”تم نے تو ابھی سے ظالم بیوی کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا ہے۔“ میں نے آہ بھر کر کہا۔ ”یہ سامان اماں کو دے دینا، اپنے گھر مت لے جانا۔“ یہ کہہ کر میں مارکیٹ کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

میں دم بہ خود رہ گیا تھا۔ اتنا حیران تو میں اس وقت بھی نہیں ہوا تھا جب مرحوم مائیکل جیکسن اچانک گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر سامنے آیا تھا۔ اماں کی ماموں زاد رضیہ خالہ افطاری سے کچھ دیر پہلے ہی وارد ہوئی تھی۔ حالانکہ اس وقت اذان کا انتظار تھا۔ دروازہ بجا تو اماں کے حکم پر میں بادل ناخواستہ دروازہ کھولنے روانہ ہوا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی خالہ رضیہ دھڑام سے اندر آئی تھیں۔ ان کو بھی روزہ لگ رہا تھا اس لیے وہ اماں سمجھ کر میرے گلے لگ گئیں۔

”ارے، میری بہن کیسی ہے تو۔“

”میں بہن نہیں ہوں۔“ میں نے خود کو چھڑاتے ہوئے خفگی سے کہا۔

خالہ نے مجھے غور سے دیکھا اور سر پر ہاتھ مارا۔ ”ارے، میری تو مت اس گرمی نے ماردی۔ تو جمیل ہے نا... ماشاءاللہ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔“

”پانچ سال پہلے بھی میں اتنا ہی بڑا تھا۔“ میں نے اندر کی طرف جانے کے لیے قدم بڑھائے تو اس بار جیسے کوئی بہار ے آنگن میں کود ا... ایک مجسم حسن اندر آیا۔ رنگوں سے بجے جدید طرز کے لباس میں وہ واقعی ہی رنگین تھی جتنا کوئی خوبصورت باغ ہو سکتا ہے۔ سرو قد، سونے جیسی رنگت اور ریشم جیسے سرسراتے بالوں کا ڈھیر... حسین لبوں پر میٹھی سی مسکان اور کجراری آنکھوں میں چمک تھی۔ میں دم بہ خود رہ گیا۔

”خالہ! یہ کون ہے؟“

”ارے شریر اداکاری بھی کرنے لگا ہے۔“ خالہ نے اپنا بھاری ہو جانے والا ہاتھ میرے شانے پر رسید کیا۔

”اس میں اداکاری کہاں سے آگئی؟ میں نے سوال ہی تو کیا ہے؟“ میں نے شانہ ہلا کر چیک کیا۔ خالہ دیہات کا مال کھائی تھیں۔

”اسے پہچانا نہیں... اپنی گجو ہے۔“

”گجو... یعنی غزل؟“ مجھ پر بجلی سی گری اور میں ایک بار پھر دم بہ خود رہ گیا تھا۔

”امی!“ غزل نے احتجاج کیا۔ ”یہ کیا آپ ہر جگہ مجھے گجو کہتی ہیں۔ اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔“

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ واقعی بڑی ہو گئی تھی۔ پانچ سال پہلے کی بانس جیسی غزل پر اب بہار آگئی تھی۔

”چل بکواس نہ کر... بھائی کو سلام کر۔“ خالہ نے اسے جھاڑا۔ اس کا میں نے اور غزل دونوں نے یکساں برا منایا تھا۔ مگر اس نے مجھے سلام کیا۔ اتنی دیر میں اماں بھی نکل آئی تھیں اور بہن سے گلے مل کر اور آنسو بہا کر جب وہ غزل کی طرف متوجہ ہوئیں تو میری طرح دنگ رہ گئیں۔

”رجو! یہ تیری وہی لڑکی ہے؟“

”ہاں نا... کیا بدل گئی ہے۔“ خالہ چہکا گئیں۔

”ارے ایسی ویسی۔“ اماں نے کہا اور میں نے دل ہی دل میں ان سے اتفاق کیا۔ غزل واقعی اب کسی بڑے شاعر کی غزل بن گئی تھی۔

”خالہ پہلے کیا میں بری تھی؟“ غزل اماں کے گلے لگ گئی۔

”ارے نہیں لیکن اب تو تو بالکل بدل گئی ہے۔“

کچھ دیر بعد ہم دسترخوان پر تھے اور غزل یوں اصرار کر کے کھانے کی چیزیں میری طرف بڑھا رہی تھی جیسے وہ میزبان ہو۔ ”یہ بھی لیجیے نا... اللہ! آپ نے اتنے سے پکوڑے لیے ہیں اور لیجیے۔“

”ذکو!“ خالہ نے اماں کے نام کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے ہاتھ میں تو ویسی ہی لذت ہے۔ پر اب تیری کام کرنے کی عمر نہیں ہے۔ جلدی سے بہو لے آ۔“

خالہ کے اس ارشاد پر غزل جس طرح شرمائی تھی میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اماں نے جواب دیا۔ ”کہاں سے لے آؤں؟ یہ کچھ کرے تو بہو لاؤں۔“

”ارے چھوڑ، لڑکوں کا کیا ہے کام تو کر ہی لیتے ہیں... بلکہ جب بیوی سر پر آتی ہے تو کام کرنا ہی پڑتا ہے۔“

”یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔“ اماں نے غور کیا۔

خالہ خوش ہو گئی۔ ”میں ٹھیک ہی کہتی ہوں۔ اللہ بخشے گجو کے ابا بھی یہی کہتے تھے۔“

”امی!“ گجو یعنی غزل نے احتجاج کیا تھا۔

آج پہلا روزہ تھا۔ گزشتہ دن شنو کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اس لیے اسے چاند کی مبارک باد نہیں دے سکا تھا اس لیے نماز پڑھتے ہی چھت کا رخ کیا اور حسب توقع شنو وہاں موجود تھی۔ اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔

”بدلے بدلے سے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔“ شنو نے گنگنا کر کہا۔ وہ چمک کر بولی۔

”میں بدلی ہوں یا تم بدل گئے ہو... سنا ہے نواب شاہ سے ایک چیز آئی ہے؟“

”تم نے درست سنا ہے۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”اگر ہم تمہاری زلف کے اسیر نہ ہو گئے ہوتے تو اس چیز پر ضرور توجہ کرتے۔“

”تو کرو، میں نے کب منع کیا ہے۔“ شنو جانے لگی تو میں نے ٹریس پاس کرتے ہوئے اسے روکا اور کچھ غیر پارلیمانی امور کی دھمکی دی تو وہ واپس آگئی — ”بدمعاش کہیں کے۔“

میں نے دانت نکالے۔ ”تو تم شرافت سے مانتی کب ہو۔“

وہ شرمائی پھر فکرمند ہو گئی۔ ”جمیل! یہ تیری خالہ کس چکر میں آئی ہے۔“

”ظاہر ہے، بیٹی کی شادی کے چکر میں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں اس چکر میں شامل نہیں ہوں۔“

”اچھا۔“ شنو نے طنز کیا۔ ”جبھی اسے دیکھ کر رال ٹپکی ہوئے جا رہے تھے۔“

میں کھسیا گیا۔ ”تو اوپر سے دیکھ رہی تھی؟ ویسے وہ مہمان ہے۔“

”کہیں مستقل ہی مہمان نہ ہو جائے۔“ شنو بولی۔

”مجھے تیرے لہجے سے حسد کی بو آرہی ہے۔“

”ہاں، مجھے اس سے حسد محسوس ہو رہا ہے۔ تجھے کیسے دیکھ رہی تھی۔“ اس بار شنو ابل پڑی۔ ”جمیل! میں تجھے بتا رہی ہوں اگر تو نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں اپنی اور تیری جان ایک کر دوں گی۔“

”سچ!“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔“

وہ ذرا سرخ ہوئی تھی کیونکہ غصے سے پہلے ہی کافی سرخ ہو چکی تھی اور مزید کی گنجائش نہیں تھی۔ ”جمیل! اسے مذاق مت سمجھ۔ سنا ہے تیری خالہ بہت بڑی زمین رکھتی ہے۔“

”سنا تو میں نے بھی ہے۔“ میں نے کسی قدر رنج کے ساتھ کہا۔ ”پانچ برس پہلے میں گیا تھا تو خالہ کا شوہر وڈیرا تھا۔“

”تو اب کیا ہے۔“

”اب تو اس بے چارے کے پاس دو گز زمین رہ گئی ہے۔“

”یعنی مر چکا ہے... تب تو سب تیری خالہ کا ہوا نا۔“

”اب مجھے اس بارے میں اتنا نہیں معلوم ہے اور نہ میرے نزدیک اس کی اتنی اہمیت ہے۔“

”تو پھر کس کی اہمیت ہے... اس گجو کی؟“ شنو نے پھر طنز کیا۔

www.pkdigest.com

”خدا کے لیے کیا تم کوئی اور بات نہیں کر سکتی ہو؟“ میں نے بے زاری سے کہا۔ اسی لمحے کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی۔ ”شنو! کوئی آرہا ہے۔“

شنو جلدی سے منڈیر سے نیچے ہوگئی اور اسی لمحے غزل اوپر آگئی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”خیریت... آپ یہاں اکیلے؟“

”نہیں، اکیلا تو نہیں ہوں۔“ میں نے بوکھلا کر کہا۔

”اچھا... اور کون ہے آپ کے ساتھ۔“

”تم ہونا۔“ میں نے سنبھل کر کہا تو شنو نے عقب سے اتنی زور سے چٹکی کاٹی کہ میں اچھل پڑا۔

”کیا ہوا۔“

”کچھ نہیں، شاید کسی چیونٹی نے کاٹا ہے۔“

غزل میرے قریب چلی آئی تھی۔ اس نے ایک ادا سے کہا۔ ”آپ تو یہاں آکر ہمیں بھول ہی گئے۔ کبھی پلٹ کر بھی نہیں پوچھا۔“

”ہاں، مصروفیت زیادہ ہوگئی تھی۔“ میں نے دانت نکالے۔

”لیکن ہم نے تو آپ کو کبھی نہیں بھلایا۔“ وہ مزید نزدیک آگئی تھی۔ ”ہمیشہ یاد رکھا۔“

اس کی گفتگو رومانی ہوتی جا رہی تھی اور اسی تناسب سے شنو کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے ان چٹکیوں سے ہو رہا تھا جو وہ کاٹ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”ایسا کرو تم نیچے چلو، یہاں مچھر بہت ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ نیچے امی اور خالہ ہیں۔ یہیں ٹھیک ہے۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”یہ بتایئے کہ پانچ سال پہلے کے مقابلے میں اب ہم کیسے لگتے ہیں؟“

میرا دل چاہا کہ سچ کہہ دوں مگر شنو کا خطرہ تھا۔ اس لیے بے دلی سے کہا۔ ”ہاں، ٹھیک ہو۔“

”بس... صرف ٹھیک ہیں؟“

”نہیں، اچھی ہوگئی ہو۔“ میں نے بادلِ ناخواستہ کہا۔

”کیا بات ہے، آپ ہم سے اس طرح چبا چبا کر کیوں بات کر رہے ہیں؟“

”کیونکہ میں نے ایسا نہ کیا تو پیچھے موجود بلی مجھے کچا چبا جائے گی۔“ یہ بات میں نے دل میں سوچی اور منہ سے کہا۔ ”روزہ تھا نا سارا دن... کچھ چبایا نہیں تھا اس لیے چبا چبا کر بات کر رہا ہوں۔“

”تم نے بتایا نہیں کہ میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟“ اس نے بے تکلفی کی طرف ایک اور قدم اٹھایا۔

”اچھی... بھی۔“ میں نے بلبلا کر کہا کیونکہ شنو نے اسی چٹکی لی تھی۔

”سچ!“ اس نے خوش ہو کر کہا اور پھر خود کو ملاحظے کے لیے نمایاں کیا۔ ”مجھ میں کیا چیز اچھی ہے؟“

”سب کچھ۔“ میں بھنا گیا تھا کیونکہ ان دو لڑکیوں کے درمیان بلاوجہ کی فٹ بال بنا ہوا تھا۔ ”یہ بتاؤ کہ اب تک تمہاری شادی کیوں نہیں ہوئی۔“

”امی تو کرنے پر تلی ہوئی تھیں لیکن میں نے انکار کر دیا۔“

”کیوں۔“

”میں شہر میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ وہاں میرے لائق کوئی ہے ہی نہیں۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے، یہاں بھی تمہارے لائق کوئی نہیں ہے۔“

”ایسا مت کہو۔“ وہ اس بار خطرناک حد تک قریب آگئی۔ ”تم کسی سے کم ہو کیا۔“

میری جان پر بن گئی تھی۔ خطرہ تھا کہ شنو عقب سے کوئی جان لیوا حملہ نہ کر دے۔ اس ظالم حسینہ سے کچھ بعید نہیں تھا، پیچھے سے ڈنڈا مار دے۔ میں دیوار کی طرف سرکا۔ ”میں تو کم سے بھی کم تر ہی ہوں۔“

میں خاصی مشکل میں تھا مگر اسی لمحے خالہ رضیہ میری نجات دہندہ بن کر آگئیں۔ ان کے آتے ہی غزل نے جلدی سے دوپٹا درست کر لیا اور بھولی بن گئی۔ ”ارے، تم دونوں یہاں ہو، میں تمہیں نیچے تلاش کر رہی تھی۔“

”جی امی! یہاں ہوا بہت اچھی آرہی ہے۔“

”جی لیکن بدبو بھی بہت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا خیال ہے اب نیچے نہ چلیں؟“

مجھے خطرہ تھا کہ کہیں شنو منظرِ عام پر نہ آجائے۔ مگر شکر ہے اس نے صبر سے سب برداشت کیا اور مجھے قتل وغیرہ کرنے سے گریز کیا۔ خالہ اور غزل کے جاتے ہی وہ دیوار کے دوسری طرف سے یوں نمودار ہوئی جیسے صبح سویرے مشرق سے سورج کا آتشیں چہرہ نمودار ہوتا ہے۔ وہ بھی آگ بگولہ ہو رہی تھی اس نے ایک ہی سانس میں غزل کو ایک درجن خاص زنانہ گالیوں سے نوازا اور دانت پیس کر بولی۔ ”میں اس حرامزادی کو قتل کر دوں گی۔“

”سچ!“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”میری تم دونوں سے جان چھوٹ جائے گی۔“

”جلیل! اسے روک لے ورنہ...“

”نہ بابا... دو گھڑی بات کی تو تمہارا یہ حال ہے اگر مستقل روک لیا تو تم نہ جانے کیا کر گزرو۔“

”میں کہہ رہی ہوں اس کی حرکتوں سے اسے روکو۔“

”میں کیسے روکوں۔“ میں بھنا گیا۔ ”تمہیں روک سکا ہوں آج تک کسی کام سے۔“

”میری بات اور ہے۔“

”بی بی شنو! اس کی بات بھی اور ہے۔ وہ اماں کی بھانجی ہے اور اس گھر پر حق جتانے آئی ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”میں اسے کیسے روک دوں؟“

شنو اداس ہوگئی اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ”تو میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔“

”شنو! تو بلاوجہ پریشان ہو رہی ہے اور مجھے بھی پریشان کر رہی ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”اس چکر میں مت پڑ۔ یہ آج آئی ہیں، کل چلی جائیں گی... پر تو نے تو یہیں رہنا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ خوش ہوگئی تھی۔ پھر اسے مزید خوش کرنے کے لیے مجھے کچھ عملی اقدامات بھی کرنے پڑے تھے جن پر وہ بہ ظاہر ناراض ہوئی مگر اندر ہی اندر خوش ہوئی تھی۔ اسے رام کر کے میں نیچے آیا تو یہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے کہ خالہ اور اس کی آفت کی پرکالہ بیٹی عید کر کے یہاں سے جائیں گی۔ غزل بہت خوش تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”اب ہم پورا مہینا آپ کے ساتھ رہیں گے۔“ سب کے سامنے وہ پھر آپ جناب سے بات کرنے لگی۔

”ہاں نا، یہ تجھے پورا کراچی دکھائے گا۔ تجھے بڑا شوق تھا نا کراچی دیکھنے کا۔“ خالہ نے کہا۔ ”میں تو کہتی تھی کہ تیری شادی کر دیتی ہوں، شوہر کے ساتھ دیکھنا کراچی۔“ شوہر کا لفظ کہتے ہوئے خالہ نے میری طرف دیکھا۔

”خالہ! آج کل حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“ میں نے جان چھڑائی۔ ”ڈبل سواری پر پابندی ہے۔“

”ارے تو کیا ہوا، ہمارے پاس کار ہے۔ تجھے ڈرائیونگ... آتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ ڈرائیور بھی ساتھ ہے۔“

میں حیران ہوا۔ خالہ اپنی کار میں آئی تھیں اور ڈرائیور بھی ساتھ تھا۔ وہ پاس ہی ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ غزل موقع پا کر فوراً سر ہوگئی۔ ”آج چلیں کہیں... میں نے سنا ہے کہ کلفٹن پر ساحل بہت اچھا لگتا ہے۔“

”رات کو وہاں کیا نظر آئے گا؟“ میں نے اسے ٹالا۔

”جی نہیں، مجھے پتا ہے۔ وہاں اب لائٹیں لگ گئی ہیں۔“ اس نے کہا اور پھر اماں نے بھی تائید کی تو مجھے راضی ہونا پڑا۔ خالہ نے ڈرائیور کو کال کر کے گاڑی منگوائی تھی۔ یہ نئے ماڈل کی ٹویوٹا کار تھی۔ میں سمجھا تھا کہ اماں اور خالہ بھی جائیں گی مگر جب تیار ہو کر باہر آیا تو صرف غزل تیار تھی۔

”اور کوئی نہیں جا رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں اور کسی نے جا کر کیا کرنا ہے؟ سمندر تو مجھے دیکھنا ہے۔“ وہ بولی۔ ”بس میں اور تم ہوں گے۔“

”خدا خیر کرے۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

جب ہم جا رہے تھے تو میں نے خالہ لاڈو اسپیکر کی چھت پر ایک سایہ سا دیکھا۔ وہ شنو تھی اور اس نے ہمیں جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میرے سینے پر ایک بوجھ سا آگیا تھا۔ وہ نہ جانے اس بارے میں کیا سوچتی؟ جیسے ہی ہم کلفٹن جانے والی شاہراہ پر آئے، غزل کا دوپٹا اتر گیا۔ ”شکر ہے اس جنجال سے جان چھوٹی۔“

”گھر میں تو تمہارے سر پر ہی ہوتا ہے۔“

”امی کی وجہ سے... کہیں اتر جائے تو شامت آجاتی ہے۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”ویسے لگتا نہیں ہے کہ تم نواب شاہ سے آئی ہو۔“

”یعنی میں پینڈو نہیں لگتی؟“ وہ ہنسی۔ ”ویسے تم کیا سمجھتے ہو چھوٹے شہروں میں لوگ ماڈرن نہیں ہیں؟“

”پہلے سمجھتا تھا، اب نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

ساحل پر رش تھا اور وہ بنا دوپٹے کے باہر نکل گئی تھی۔ میں نے کہا بھی مگر وہ بے پروائی سے بولی۔ ”چھوڑو، یہاں کون دیکھ رہا ہے؟“

”بی بی! ابھی تم باہر تو نکلو، پتا چل جائے گا۔“

اور ایسا ہی ہوا۔ اسے عام سے سوٹ میں بنا دوپٹے کے دیکھ کر اوباش لڑکے ہمارے آس پاس منڈلانے لگے تھے اور پھر انہوں نے آوازیں کسنا شروع کیں تو میں اسے کھینچ کر کار میں لے آیا۔

”کیا ہے، اتنا اچھا لگ رہا تھا۔“ اس نے منہ بنایا۔

”اور وہ جو آوازیں لگا رہے تھے؟“

”کتوں کو بھونکنے دو۔“

وہ گھر سے کیا نکلی تھی جیسے جامے سے باہر ہوگئی تھی۔ مجھے لگا کہ خالہ کے گھر کا ماحول اچھا نہیں تھا۔ خالو مرحوم رنگین مزاج آدمی تھے اور ان کی رنگین مزاجی ان کی صاحبزادی میں بھی آئی تھی۔ بڑی مشکل سے میں اسے واپس لایا تھا اور اس بات پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا لیا کہ اب اس کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔ کم سے کم اکیلے نہیں جاؤں گا۔ وہ تو کسی ایسے ہوٹل میں چلنے کی فرمائش کر رہی تھی جس میں ڈانس ہوتا ہو۔ میں نے کہا۔ ”میں نہ تو کسی ایسے ہوٹل

www.pkdigest.com

سے واقف ہوں اور نہ ہی مجھے ڈانس کا شوق ہے۔"

اس نے منہ بنایا۔ "کراچی جیسے شہر میں رہ کر تم اتنے بیک ورڈ ہو۔"

"بات شہر یا دیہات کی نہیں ہے، مزاج کی ہے۔ میری اماں نے میری پرورش ایسے کی ہے کہ میں کبھی ان چیزوں کی طرف گیا ہی نہیں۔"

"جیل ضرور چلے گئے۔"

"اس میں بھی میرا قصور ہے اور اس سے بھی زیادہ نصیب کا قصور ہے۔" میں نے سرد آہ بھری۔

واپسی پر اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ میں نے پروا نہیں کی۔ مجھے تو شنو کی فکر کھائے جا رہی تھی کہ وہ نہ جانے مجھ سے کیا کیا بدگمانیاں پال رہی ہوگی اور مجھے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑیں گے۔ جب کار رکی، تب بھی مجھے خالہ لاؤڈ اسپیکر کے گھر کی چھت پر ایک سایہ نظر آیا جو فوراً ہی غائب ہو گیا تھا۔

اگلے دو تین دن میں یہ واضح ہو گیا تھا کہ خالہ رضیہ رشتے کا بہانہ کر کے آئی تھیں۔ ورنہ کراچی میں ان کو کوئی رشتہ دستیاب نہیں تھا اور ان کی نظر مجھ پر تھی۔ خالو کے مرنے کے بعد انہوں نے ساری زمین پر قبضہ کر لیا تھا اور ان کی پہلی دو بیویوں کو بہت کم ملا تھا۔ اب اتنی بڑی زمین سنبھالنے کے لیے انہیں ایک کاٹھ کے الو کی ضرورت تھی جو ان کی صاحبزادی کا شوہر بھی کہلا سکے اور وہ اسی کی تلاش میں یہاں آئی ہوئی تھیں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ اماں، خالہ کی باتوں اور ان کی ترغیبات سے کسی قدر متاثر ہو چلی تھیں۔ خالہ رجو باتوں باتوں میں اماں کو اپنی امارت کے قصے سناتی تھیں کہ ان کے پاس سات سو ایکڑ زمین ہے جس سے سالانہ لاکھوں روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ پھر حیدرآباد میں ایک کوٹھی تھی اور اگر وہ غزل کی شادی کراچی میں کر دیتیں تو اس کے لیے بھی یہاں ایک کوٹھی خرید لیتیں۔

"اپنی گڈو کو کراچی بہت پسند ہے۔"

"لیکن یہ پہلے تو کراچی نہیں آئی۔" اماں نے حیرت سے کہا۔ "پھر اسے کراچی کہاں سے پسند آ گیا۔"

"نہیں، ہر سال آتی ہے۔ اس کی ایک سہیلی ہے، وہ یہیں رہتی ہے۔ اس کے پاس آتی ہے۔"

"اچھا، ہمارے گھر تو کبھی نہیں آئی۔" اماں نے کہا تو خالہ کھسیا گئیں۔

"ارے، بس من موجی ہے۔"

"خالہ! لڑکیوں کو اتنی ڈھیل دینا اچھا نہیں ہوتا۔" خلیل نے درمیان میں مداخلت کی۔ وہ ان دنوں تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ اٹھ بیٹھ رہا تھا اس لیے ہر معاملے میں مذہب کا پہلو نکال لیا کرتا تھا۔ "ہمارا مذہب تو عورت کو بغیر پردے کے گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا۔"

"بیٹا! یہ سب پہلے دور کی باتیں تھیں۔" خالہ نے بے زاری سے کہا۔ "آج کل کی لڑکیاں پردے کو کہاں مانتی ہیں۔"

"آج کل کی لڑکیوں پر تو دوپٹا بھاری ہو گیا ہے، گھر سے نکلتے ہی اتار پھینکتی ہیں۔" میں نے غزل کی طرف دیکھا تو وہ مجھے گھورنے لگی۔

"خیر، اب اتنی بے راہ روی بھی ٹھیک نہیں ہے۔" خالہ نے کہا۔

"خالہ! یہی تو بات ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں طے کرنے والے کہ کیا بے راہ روی ہے اور کیا نہیں ہے۔" خلیل نے پھر کہا، اس پر اماں نے اسے گھورا۔

"شروع ہو گئی تیری تبلیغ۔"

"اچھا ہے نا اماں، آدمی گھر سے آغاز کرے۔" اس نے دانت نکالے۔ "پہلے گھر سدھارے اور پھر باہر والوں کو سدھارے۔"

"ہم کون سے بگڑے ہوئے ہیں؟" غزل نے منہ بنا کر کہا۔

"میں نے کب کہا؟" خلیل گڑبڑا گیا۔

آنے کے کوئی ایک ہفتے بعد خالہ نے شاپنگ ٹور شروع کر دیے اور غزل زبردستی مجھے بھی ساتھ لے جاتی تھی۔ میں انکار کرتا تو وہ اماں کی مدد حاصل کرتی تھی اور مجھے اس کے ساتھ جانا ہی پڑتا تھا۔ طارق روڈ اور کلفٹن کے شاپنگ سینٹرز میں وہ پیسا پانی کی طرح بہاتی تھیں۔ کبھی کبھی اماں بھی ساتھ جاتی تھیں تو ان کے اللے تللے دیکھ کر حیران رہ جاتی تھیں۔

"اری رجو! تیرے پاس اتنا پیسا ہے؟"

"ہاں، اس کے ابا چھوڑ کر مرے تھے۔" خالہ کہتیں۔

"تو کیا تو سب خرچ کر کے مرنا چاہتی ہے جو اتنی بے دردی سے لٹا رہی ہے۔"

"ارے کہاں بہن... اللہ کا دیا اتنا ہے کہ خرچ کر کر کے تھک جاتے ہیں لیکن یہ ختم ہی نہیں ہوتا۔" خالہ کے لہجے میں ایک بے پروائی اور غرور آ گیا تھا۔

"اگر تیرے پاس اتنی دولت ہے تو گڈو کے رشتے کے

www.pkdigest.com

چلے ماری ماری کیوں پھر رہی ہے؟ اس کے رشتے تو تیرے گھر آنے چاہئیں۔"

"بس اس کی ضد ہے کہ اس نے وہاں شادی نہیں کرنی ہے۔" خالہ نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "اسی لیے تو میں یہاں آئی ہوں۔"

مگر مجھے لگ رہا تھا کہ خالہ اصل بات چھپا رہی ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ ان کے پاس دولت بے تحاشا تھی مگر جس کے پاس اتنی دولت ہوتی ہے وہ غریب رشتے داروں میں لڑکی دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ خالہ اور غزل کو آئے ہوئے دو ہفتے ہو چکے تھے اور اس دوران میں میری شنو سے ایک بار ہی ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے کئی بار اسے بلانے کے لیے بلی کی آواز میں سگنل دیے تھے مگر اس کے بجائے نیچے سے ہمیشہ غزل چلی آتی تھی۔

"کیا یہاں کوئی بلی اور بھی ہے؟" ایک دن اس نے پوچھا۔

"ایک اور بلی۔"

"ہاں، ایک بلی خلیل کی ہے جو نیچے ہوتی ہے اور ایک بلی اوپر بول رہی ہوتی ہے۔"

"وہ کوئی باہر کی بلی ہوتی ہے۔" میں نے اسے جواب دیا۔

"تمہیں یہاں کچھ زیادہ ہی مزہ نہیں آتا۔" اس نے تجسس سے شنو کی چھت کی طرف دیکھا۔ "میں نے تمہاری پڑوسن کو دیکھا ہے، اچھی خاصی ہے۔"

مجھے افسوس ہوا کہ اماں نے خالہ اور غزل کو میرے اور شنو کے رشتے کے بارے میں نہیں بتایا تھا اور نہ ہی وہ اتنے دن سے خالہ لاؤڈ اسپیکر کے ہاں گئی تھی۔ لگتا تھا اماں بھی رفتہ رفتہ خالہ کے بچھائے جال میں آ رہی تھی۔

"تم نے کب دیکھا۔"

"کل بے چاری پیدل ہی بازار جا رہی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"وہ بے چاری نہیں ہے۔" میں نے کسی قدر غصے سے کہا۔

"اچھا بابا، نہیں ہو گی بے چاری۔" وہ ہنسی۔ "تمہیں اتنا برا کیوں لگ رہا ہے؟"

میں نے مناسب سمجھا کہ اسے صاف بتا دوں۔ "اس لیے کہ وہ میری منگیتر ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" اس نے اطمینان سے کہا تو میں بھونچکا رہ گیا۔

"تم جانتی ہو۔"

"ہاں، خالہ نے تو نہیں بتایا تھا لیکن خلیل نے بتا دیا۔ ویسے تم نے اس میں صورت کے علاوہ اور کیا دیکھا؟" اس کے لہجے میں طنز آ گیا تھا۔

"سچی بات ہے کہ میں نے صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"پھر کیا دیکھا۔"

"میں نے اس کی محبت اور اس کی وفا دیکھی۔"

وہ ہنسی۔ "شہر میں رہ کر بھی تم ایسی بات کر رہے ہو۔"

"شہر میں رہنے کا مطلب یہ کہاں سے ہو گیا کہ انسان صرف جسم یا دولت سے ہی محبت کرے۔"

"جلیل! چھوڑو اسے... وہ کیا دے سکتی ہے تمہیں؟"

"مہربانی کر کے تم اپنی بات کرو، اس کی بات مت کرو۔" میں نے بے زاری سے کہا۔

اس نے محسوس کر لیا تھا کہ میں اس کی بات سے متاثر نہیں ہوا ہوں اس لیے اس نے دوسرا حربہ آزمایا۔ "مجھ میں کیا کمی ہے۔"

"کوئی کمی نہیں ہے۔" میں نے اس پر غور کیا۔ "بلکہ کچھ زیادتی ہے۔"

"اچھا۔" وہ خوش ہوئی۔ "کس کی زیادتی ہے؟"

"ہوشیاری اور خود پسندی کی۔"

"مجھ جیسی لڑکی کو خود پسند ہونا بھی چاہیے۔" اس نے اترا کر کہا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس طرح جان چھڑاؤں؟ میں نیچے اماں کے پاس آیا تو وہاں خالہ بیٹھی تھی۔ وہ اماں سے کہہ رہی تھی۔

"میں تو کہتی ہوں ابھی سے شادی کی تیاری شروع کر دو۔"

"ہاں، میں بھی سوچ رہی ہوں۔" اماں نے بے دلی سے کہا تو خالہ خوش نظر آنے لگی۔ غزل کی باچھیں بھی کھل گئی تھیں اور میں بھنا کر گھر سے نکل گیا تھا۔ غم غلط کرنے کے لیے ایک ہی جگہ تھی، یعنی فتو کا ہوٹل جہاں رمضان کے احترام میں فلک شگاف آواز میں قوالیاں چل رہی تھیں اور حسب معمول کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی مگر فتو کے پرانے گاہک عادی ہو گئے تھے۔ وہ دوسرے کی بات سمجھ بھی لیتے تھے اور اپنی سمجھا بھی لیتے تھے۔ وہاں راجا بھی موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بے تابی سے لپکا۔

"جلیل! تو کہاں تھا میرے یار۔" راجا اس دن کے

بعد سے میرے گھر کے کئی چکر لگا چکا تھا اور ہر بار اماں کے ہاتھوں بے عزت ہو کر رخصت ہوا تھا۔ "سنا ہے ان دنوں تو نئے ماڈل کی کار اور نئے ماڈل کی کزن کے ساتھ اڑا اڑا پھر رہا ہے۔"

"پھنس گیا ہوں یار۔"

راجا حیران ہوا پھر اس نے مجھے سنانی شروع کیں۔ "جلیل! تو سخت ناشکرا ہے۔ اے... اللہ نے گھر بیٹھے دولت مند حسینہ بھیج دی ہے اور تو کہہ رہا ہے کہ پھنس گیا ہے۔"

"بکواس نہ کر... تو شنو کو کیوں بھول جاتا ہے؟"

"اس ماہ جبیں کے سامنے میں دس شنو کو نظر انداز کر سکتا ہوں۔" راجا نے کہا۔

"تو کر سکتا ہے کیونکہ تو راجا ہے، میں نہیں کر سکتا۔ میرے لیے شنو ہی سب کچھ ہے۔"

راجا نے ترحم آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ "اے مجنوں کے گھوڑے اور فرہاد کے خچر... یہ تو کس زمانے کی بات کر رہا ہے؟"

"دیکھ بے راجا... تو میرا دوست ہے مگر میں تجھے شنو کے خلاف بات کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"چل ہم اس پر بات کرتے ہیں جو تیری نواب شاہ کی لندن پلٹ کزن ہے۔" راجا نے مصالحتی انداز اپنا لیا۔

"نواب شاہ کی لندن پلٹ۔" میں ہنسا۔

"ہاں نا، اس کے انداز نہیں دیکھے تو نے...!"

"اس کا مطلب ہے تو جاسوسی کرتا رہا ہے۔"

"بس یار، تیری زبانی سن کر صبر نہیں ہو سکا۔" راجا نے اعتراف کیا۔ "لیکن تجھے اس پر کیا اعتراض ہے؟"

"اعتراض کچھ نہیں ہے یار۔ میں شنو سے محبت کرتا ہوں اور اسے نہیں چھوڑ سکتا۔" میں نے کہا۔

"تب اس سے میرا رشتہ کرا دے۔"

"مشکل ہے، تیری ساکھ بہت خراب ہے اور تیرے رشتے کی بات کر کے میں خالہ کی نظر میں مشکوک ہو جاؤں گا۔"

"تجھے اس سے کیا... رشتہ تو نے وہاں ویسے بھی نہیں کرنا۔"

"احمق... رشتہ کرنا نہیں ہے لیکن ایک رشتہ پہلے سے تو موجود ہے، اس کا خیال بھی نہیں کرنا ہے کیا؟"

"یار! تو کوئی چکر چلا سکتا ہے۔ اگر میری اس سے شادی ہو گئی تو میری زندگی بن سکتی ہے۔"

"ابے پاگل خالہ کو اپنی بیٹی کے شوہر سے زیادہ اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرنے والے کمدار کی ضرورت ہے۔"

"میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔" راجا نے کہا۔

"بکواس نہ کر، تجھے پتا ہے زمین پر کام کرنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ کھڑے ہو کر نگرانی کرنا ہو تب بھی آدمی کا تیل نکل جاتا ہے۔ اور خالہ مجھے جانتی ہے اس لیے میرا رشتہ چاہتی ہے، تجھے کہاں جانتی ہے؟"

"تو جان جائے گی۔"

"اس کے بعد تیرے ساتھ میری شامت بھی آئے گی۔"

"نہیں آئے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ پوری محنت سے کام کروں گا۔"

"راجا! تجھے کام کرنا ہوتا تو اپنے باپ کے ساتھ مل کر نہ کر لیتا۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اس بار راجا بھنا کر اپنی اوقات پر اتر آیا۔ "تو چاہتا ہی نہیں ہے کہ میں کہیں آگے نکل جاؤں... تو مجھ سے جلتا ہے۔"

"میں اور تجھ سے جلوں۔" میں ہنسا اور راجا بکتا جھکتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ اپنی دو چائے کا بل بھی میرے سر مار گیا تھا۔ میں فی الحال اپنی جگہ سے نہیں اٹھنا چاہتا تھا کیونکہ ان ماں بیٹی کا آج پھر شاپنگ کا پروگرام تھا اور وہ مجھے لے جانا چاہتی تھیں اس لیے میں اس وقت تک گھر نہیں جانا چاہتا تھا جب تک وہ انتظار کر کے خود سے نہ چلی جائیں۔ آج میں شنو سے بات کرنا چاہتا تھا... جو ان ماں بیٹی کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں تھی۔ منگنی کے بعد سے ایک رسم بن گئی تھی کہ میں چاند رات پر اسے چوڑیاں پہنانے اور مہندی لگوانے کے لیے لے جاتا تھا۔ اس بار ابھی تک اس سے پروگرام طے کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

جیسے ہی خالہ رضیہ کی کار فتو کے کیفے کے سامنے سے گزری، میں اٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ آج مجھے امید تھی کہ شنو مجھے شرف باریابی بخش دے گی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے اوپر کا رخ کیا اور بلی کی آواز میں شنو کو سگنل دیا۔ خلاف توقع وہ پہلی ہی آواز پر نمودار ہو گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور پپوٹے متورم تھے جیسے وہ روتی رہی ہو۔

"کیا ہے، کیوں بلایا ہے۔" اس نے بیٹھی آواز میں کہا۔

"تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"طبیعت ٹھیک ہے، کام کی بات کر۔" اس نے بے رخی سے دوسری طرف دیکھا۔ میں نے جھک کر اس کی کلائی

www.pkdigest.com

پکڑ لی۔

”شنو! کیا بات ہے، اس طرح کیوں بات کر رہی ہے؟“

”پھر کس طرح بات کروں۔“ اس کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔

”شنو! کیا تو مجھ سے ناراض ہے؟“

”نہیں، بہت خوش ہوں۔“ اس نے جل کر کہا۔ ”جو تم لوگ کر رہے ہو اس پر مجھے اور اماں کو خوشی سے ناچنا اور گانا چاہیے۔“

”شنو! تو اور خالہ بالکل غلط سمجھ رہے ہیں۔“

”ہم ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔ خالہ نے تو تیری شادی کی تیاری بھی شروع کر دی ہے۔“ شنو کی آواز بھرا گئی تھی پھر اس نے بپھر کر کہا۔ ”پر یاد رکھنا، میں تجھے چھوڑوں گی نہیں۔ تیری بارات نہیں جنازہ جائے گا۔“

میں پریشان ہو گیا۔ ”او سلطان راہی کے زنانہ ایڈیشن، میرا قصور کیا ہے؟ مرنا تو مجھے ویسے بھی ہے۔“

”تو اس بھوکی بچی سے شادی نہیں کر رہا ہے۔“

”میں ابھی پاگل نہیں ہوا ہوں۔“ میں نے خفگی سے کہا۔ ”مجھے شادی کرنی ہے غلامی نہیں اور یہ ماں بیٹی کسی غلام کی تلاش میں یہاں آئی ہیں۔“

”پر خالہ جو تیاری کر رہی ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”انہوں نے ہمارے گھر آنا اور ہم سے بات کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔“

میں بھی فکر مند ہو گیا تھا کیونکہ اماں کے تیور مجھے بھی بدلے بدلے سے لگ رہے تھے۔ وہ خالہ رضیہ کی دولت سے متاثر ہوئی تھیں۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس حد تک متاثر ہوئی ہیں کہ میری شادی غزل سے کرنے پر آمادہ ہو گئی تھیں... یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں شنو کے سوا کسی سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے شنو کو تسلی دی۔

”اماں کی بہن آئی ہوئی ہے اور پھر رمضان ہیں، اماں کہاں نکل پاتی ہیں۔ اور اماں نہیں آ رہیں تو تم آ جاؤ۔“

”اماں نہیں مانیں گی، کل وہ رو رہی تھیں۔“

”شنو! تو مجھ پر تو یقین رکھتی ہے نا۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، تجھ پر یقین نہ ہوتا تو یوں تیرے بلاوے پر دوڑی آتی؟“

”بس تو اطمینان رکھ... جلیل صرف تیرا ہے اور تیرے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا۔“ میں نے حلف دینے کے انداز میں کہا۔

اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ ”سچ کہہ رہا ہے نا۔“

میں نے اسے عملی طور پر یقین دلایا تو اس نے گھبرا کر مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ ”پاگل ہوئے ہو، ابھی کسی نے دیکھ لیا تو۔“

”یہاں کون ہے؟“ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ سامنے والے ناصح بڑے میاں کی بد نظر سے محفوظ رہنے کے لیے میں نے دیوار اونچی کروا لی تھی اور جب بڑے میاں نے مزید اوپر ہو کر میری اور شنو کی جاسوسی کرنے کی کوشش کی تو میں نے ان کی سیڑھی کھینچ لی تھی۔ ایک ہفتہ اسپتال میں گزارنے کے بعد بڑے میاں کو جاسوسی کے مرض میں خاصا افاقہ ہوا تھا۔ شنو جلدی سے پیچھے ہٹ گئی تھی۔

”پر اماں کا کیا کروں؟ انہوں نے تو اپنا بلڈ پریشر ہائی کر لیا ہے۔“

”کچھ نہیں، بس چند دن کی بات ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”اس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”جلیل! مجھے تجھ پر اعتبار ہے پھر بھی ڈر لگتا ہے۔ اگر خالہ اپنی بہن کی باتوں میں آ گئیں تو کیا ہو گا؟“

”شادی!“ میں نے کہا تو شنو اچھل پڑی۔

”کیا۔“ اس نے غرا کر کہا۔

”میرا مطلب ہے تم سے۔“ میں نے جلدی سے وضاحت کی۔ ”اگر اماں نے میری شادی نہیں اور کرنا بھی چاہی تو میں تجھے لے کر فرار ہو جاؤں گا۔“

میں بہ ظاہر شنو سے ہنسی مذاق کر رہا تھا مگر اندر سے میں بھی فکر مند ہو گیا تھا کہ اگر اماں خالہ کی باتوں میں آ گئیں تو پھر کیا ہو گا؟ بے شک وہ میری شادی زبردستی غزل سے نہیں کر سکتی تھیں مگر اس کے بعد شنو والا معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔ رات گئے جب خالہ اور غزل شاپنگ سے واپس آئے تو بہت خوش تھے۔ اماں نے مجھے طلب کیا۔

”کہاں چلا گیا تھا تو؟“

”کہیں نہیں۔“ میں نے منہ پھلا کر کہا۔

”تجھے پتا نہیں تھا کہ بازار جانا ہے؟“

”ارے چھوڑ نا۔“ خالہ رضیہ نے کہا۔ ”لڑکا ہے، بھول گیا ہو گا۔“

”اچھا دیکھ، میں تیری دلہن کے لیے کپڑے لائی ہوں۔“ اماں نے کہا۔ انہوں نے ایک بڑا سا شاپر اٹھا رکھا تھا۔

”وہ کس لیے... مجھے شادی نہیں کرنی۔“ میں نے تنک کر کہا۔

”کیوں نہیں کرنی؟“

”کیونکہ تم ہی مجھے صبح شام کہتی رہتی ہو کہ میں کچھ کروں گا تو میری شادی ہو گی۔“

”ہاں سوچا تو میں نے بھی یہی تھا، پر رجو کی بات نے مجھے قائل کر لیا ہے۔ جب تیرے سر پر پڑے گی تو تو خود کام کرے گا۔“

میرا دل بیٹھنے لگا۔ شنو کی بات درست ثابت ہو رہی تھی۔ اماں واقعی بدل گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں پر خالہ رضیہ کی دولت کی پٹی بندھ گئی تھی۔ میں نے جذباتی ہو کر کہا۔ ”اماں! پر ٹھیک نہیں کر رہی ہو۔“

”ارے، تیری شادی کر رہی ہوں۔“ اماں نے حیرت سے کہا۔ ”کل تک تو تو شادی کے لیے مرا جا رہا تھا۔“

”مجھے نہیں کرنی یہ شادی۔“

خالہ اور غزل مسکرا رہے تھے۔ ”ان کے تو اچھے بھی کریں گے شادی۔“ غزل چہک کر بولی۔ وہ بہت خوش لگ رہی تھی۔ ”آپ فکر نہ کریں خالہ... میں اسے راضی کر لوں گی۔“

”بے شرم... تو کاہے کو راضی کرے گی۔“ خالہ رضیہ نے اسے گھر کا۔

”ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔“ اماں نے خلاف توقع غزل کی تائید کی۔ ”یہ جلیل کو راضی کر لے گی۔“

میں بھنا کر وہاں سے اٹھ گیا۔ غزل بھی میرے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔ ”کیا ہے... تم کیوں آ رہی ہو؟“

اس نے میرے لہجے کا برا منائے بغیر شوخی سے آنکھیں گھمائیں۔ ”اب تو خالہ نے بھی اجازت دے دی۔“

”اگر انہوں نے اجازت دے دی ہے تو ان کے پاس جاؤ، میرے پاس کیا کرنے آئی ہو۔“

”تمہیں راضی کرنے۔“ وہ اطمینان سے میرے بستر پر بیٹھ گئی۔

”غزل! تمہارا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہو گا۔“ میں نے اسے آگاہ کیا۔

”کیوں۔“

”کیونکہ میں شنو کا ہوں اور اسی کا رہوں گا۔“

”جلیل! تم جذباتی ہو رہے ہو۔“

”ہاں، جب معاملہ شنو کا ہو تو میں دماغ کے بجائے دل سے سوچتا ہوں۔“ میں نے اقرار کیا۔

”جلیل! وہ تمہیں کیا دے گی؟“

”جو تم یا کوئی بھی لڑکی مجھے نہیں دے سکتی۔“

”کیوں نہیں دے سکتی؟“ اس نے چیلنج کرنے کے انداز میں کہا۔ ”جلیل! تم ایک بار کہہ کر تو دیکھو۔ مجھے آزما کر تو دیکھو۔ اگر میں شنو سے کم نکلی تو بے شک مجھے مسترد کر دینا۔“

”یہ دعویٰ مت کرو۔ شنو سے میں جان مانگوں تو وہ جان بھی دے دے۔“

”میں بھی دے سکتی ہوں، تم مانگ کر تو دیکھو۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”شنو! میری ہر بات مانے گی۔“

”میں بھی مانوں گی۔“ اس نے فوراً کہا۔

”وہ میری خاطر ہر قربانی دے سکتی ہے۔“

”میں بھی دے سکتی ہوں۔“

”اچھا۔“ میں نے سوچا۔ ”ایسا نہ ہو کہ بعد میں تم اپنی بات سے مکر جاؤ۔“

”اگر نہ مانوں تو کہنا۔“ اس نے یقین سے کہا۔

”چلو دیکھتے ہیں۔“ میں طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

اماں اور خالہ زور و شور سے شادی کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ روزے گزرتے جا رہے تھے اور عید قریب آ رہی تھی۔ شنو اور خالہ لاؤڈ اسپیکر اب بالکل خاموش تھیں۔ مجھے اماں کے طرز عمل پر حیرت تھی۔ انہوں نے خالہ لاؤڈ اسپیکر کا برسوں کا ساتھ یوں بھلا دیا تھا۔ اب انہیں سوائے غزل اور خالہ رضیہ کے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ مگر اماں سے کچھ کہنے کا مطلب اپنی شامت کو آپ دعوت دینا تھا۔ میں یہی سوچ کر خاموش تھا کہ آخری فیصلہ تو میرے ہاتھ میں ہے اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے شنو سے دور نہیں کر سکتی تھی۔

عید سے دو دن پہلے غزل نے کہا۔ ”مجھے چوڑیاں پہنانے اور مہندی لگوانے کے لیے لے چلو گے۔“

”اتنی جلدی بھی کیا ہے، پہلے فیصلہ تو ہو جانے دو کہ تم شنو کا مقابلہ کر سکتی ہو یا نہیں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”میں نے کہا ہے نا، جب چاہو آزما لینا۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

اماں اور خالہ کی شاپنگ خدا خدا کر کے مکمل ہو گئی تھی۔ اس روز افطاری کے بعد اماں اور خالہ باتیں کر رہی تھیں کہ خالہ نے کہا۔ ”میں نے اپنی زمین غزل کے نام کر دی ہے۔“

”اچھا، وہ کیوں۔“ اماں نے پوچھا۔

”بھئی اسی کی ہے اس لیے اس کے نام کر دی۔“ وہ اماں کو پرچانے کی پوری کوشش کر رہی تھیں۔ حالانکہ اماں

پہلے ہی ان ماں بیٹی کے جال میں آ چکی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا۔ تم لوگوں کو بھی مزہ نہ چکھایا تو میرا نام جلیل نہیں۔ میں نے بڑے بڑوں کو سیدھا کیا ہے، تم لوگ چیز ہی کیا ہو۔ مجھے خالہ اور غزل کی پروا بھی نہیں تھی مگر مجھے اماں کے رویے پر افسوس ہو رہا تھا۔ خیر، اماں کو میں بعد میں سمجھا سکتا تھا اور ان کو منانا اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔ وہ ذرا پٹری سے اتر گئی تھیں۔ میں انہیں پھر سے پٹری پر لے آتا۔

☆☆☆

چاند کا اعلان ہو گیا تھا۔ کل عید تھی۔ میں افطاری سے پہلے گھر سے نکل گیا تھا اور افطاری کے کچھ دیر بعد گھر... آیا تو میرا حلیہ خراب ہو رہا تھا۔ میرے سر سے خون نکل رہا تھا اور لباس پر بھی جا بہ جا خون کے دھبے تھے۔

”یہ کیا ہوا جلیل؟“ اماں گھبرا گئیں۔

”اماں! ایک آدمی سے جھگڑا ہوا تھا، میں نے اسے قتل کر دیا ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے چھپنا ہوگا، پولیس میرے پیچھے آنے والی ہوگی۔“

”کس کو مار دیا تو نے؟“ خالہ رضیہ نے سینے پر ہاتھ مارا۔

”خالہ، بس غلطی ہو گئی۔“ میں نے مسمسی سی صورت بنا کر کہا۔

”ارے کم بخت آدمی مار دیا اور کہہ رہا ہے غلطی ہو گئی۔“

”خالہ، تم مجھے اپنے گھر لے چلو۔“ میں نے کہا۔ ”پولیس کے ہاتھ آ گیا تو ساری عمر کے لیے اندر ہو جاؤں گا۔“

خالہ رضیہ بدک گئیں۔ ”ارے واہ... میں کیوں لے جاؤں؟“

”کیوں، داماد بنا کر بھی تو لے جا رہی تھیں؟“ میں نے یاد دلایا۔

”میں کسی قاتل کو داماد کیوں بنانے لگی؟“

”اب مصیبت پڑی ہے تو تم آنکھیں پھیر رہی ہو۔“ میں نے فریاد کی اور غزل کی طرف دیکھا۔ ”اپنی امی کو دیکھ رہی ہو۔“

”تو میں کیا کروں؟“ وہ رکھائی سے بولی۔

”لڑکے... تو نے کیا کیا ہے اور میں تو تیری شادی کی تیاری کر رہی تھی۔“ اماں نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

”جس سے کرنا چاہ رہی تھیں، ان کا رویہ دیکھ رہی ہو۔“ میں نے خالہ اور غزل کی طرف اشارہ کیا تو اماں کا منہ کھلا رہ گیا۔

”جلیل! کیا بک رہا ہے؟ میں نے کب اس سے تیرے رشتے کی بات کی؟ اور تیرا رشتہ تو طے ہو چکا ہے... شمو کے ساتھ۔“

اس بار میں دم بہ خود رہ گیا۔ ”تو کیا آپ کا... میرا مطلب ہے غزل سے...“

”ارے تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے۔ جب تیری بات ایک بار طے ہو گئی ہے تو میں کسی اور سے تیرا رشتہ کیوں کرنے لگی؟“

رضیہ خالہ اچھل پڑیں۔ ”کیا کہہ رہی ہے ذکو؟ کیا تو...“

”جو تو سمجھ رہی تھی، وہ نہیں کیا۔“ اماں نے اس کی بات کاٹی۔

”تو مجھے بے وقوف بنا رہی تھی؟“ رضیہ خالہ کا غصے سے برا حال ہو گیا تھا جیسے میرا خوشی سے برا حال ہو گیا تھا۔ میں اماں سے لپٹ گیا۔

”میری پیاری اماں۔“

”چل ہٹ اور یہ جو تو چاند چڑھا کر آیا ہے۔“ اماں پریشان ہو گئی تھیں۔ ”جلیل! سچ بتا تو نے کسی کو مار دیا ہے نامراد؟“

”نہیں اماں، وہ تو بس ایسے ہی ذرا آپ لوگوں کو پریشان کر رہا تھا۔“ میں نے ہنس کر غزل کی طرف دیکھا۔ ”چلو اچھا ہوا، اس بہانے کچھ لوگ تو پہچانے گئے۔“

”امی! یہاں سے چلیں۔“ غزل نے اچانک کہا۔

”ہاں، عید اپنے گھر میں اچھی ہوتی ہے۔“ میں نے اس کی تائید کی۔

”شکر ہے۔“ اماں نے سکون کا سانس لیا۔

”ہاں... ہاں، ہمارے جانے پر شکر ادا کر۔“ رضیہ خالہ نے غصے سے کہا۔ اماں پریشان ہو گئیں۔

”ارے میں تو اس نامراد کی بات غلط ہونے پر خدا کا شکر ادا کر رہی ہوں۔ تیرے جانے پر کیوں کروں گی؟“

”اماں جانے دو۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے دیکھا ذرا سی افتاد کیا پڑی، خالہ نے کیسا رنگ بدلا تھا۔ یہ تو مجھے داماد بنانے جا رہی تھیں۔ کیوں، اب تم کیا کہتی ہو؟“

”امی! چلیں یہاں سے۔“ غزل نے منمنا کر کہا۔

”بس اسی برتے پر شمو کا مقابلہ کرنے چلی تھیں۔“

خالہ سامان سمیٹنے لگیں اور غزل کال کر کے ڈرائیور کو بلا رہی تھی۔ اماں خالہ کو روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ”رجو! میں نے تجھے بتا تو دیا تھا کہ جلیل کی منگنی ہو گئی ہے۔“

”تب مجھ سے کہا کیوں نہیں کہ شادی بھی اسی سے کر رہی ہو۔“ خالہ جھلا گئیں۔

”رجو! تو اتنی احمق ہو گی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ارے جس سے لڑکے کی منگنی کی ہے اسی سے شادی کروں گی نا... کسی اور سے کیوں کروں گی؟ اور جہاں تک تمہاری سوچ کا تعلق ہے تو اس کی ذمے دار میں تو نہیں ہوں۔ اپنے دل میں تم جو چاہے سوچتی رہو۔ میں نے کب کہا تھا کہ جلیل کی شادی تیرے گھر کروں گی۔“

”بس بس... مجھے اور بے وقوف نہ بنا۔“ خالہ نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”میں سب سمجھتی ہوں۔ تو جلتی ہے مجھ سے۔“

اماں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”رجو! تیرا ذہن بہت چھوٹا ہے۔ تو نے کیا مجھے دولت کا لالچی سمجھا تھا کہ میں تیری دولت دیکھ کر بیٹا دے دوں گی؟“

”ارے ہاں، میں تو یہی سمجھ رہی تھی۔“ خالہ رو دینے والی ہو رہی تھیں۔ غزل کا چہرہ بھی سفید تھا۔ میرے ایک معمولی سے ڈرامے نے ان کی اصلیت اس طرح کھول دی تھی کہ وہ اماں یا مجھ سے نظر ملا کر بات کرنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ غزل چپ تھی اور خالہ جو واویلا کر رہی تھیں، یہ بھی جھینپ مٹانے کی ایک کوشش تھی۔ میں نے خالہ کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ ”خالہ! جو ہوا مجھے اس کا افسوس ہے۔ مجھے معلوم ہے، تم ماں بیٹی کو ایک کاٹھ کے الو کی تلاش ہے اور اتفاق سے ایک کاٹھ کا الو میرے پاس موجود ہے۔ وہ غزل سے ہنسی خوشی شادی کر لے گا اور ساری عمر تم دونوں کے پاؤں دھو دھو کر پیے گا۔“

”ارے جا... میری گجو کو لڑکوں کی کوئی کمی ہے کیا۔“

”خالہ! بے وقوف اسے بنایا کرو جو عقل مند ہو۔ میں تو پہلے سے ہی بے وقوف ہوں۔ ورنہ تمہاری دولت پر نہ کھنچا چلا آتا۔ اگر گجو کے اتنے ہی رشتے ہیں تو تم یہاں اپنی غریب بہن کے گھر کیوں بھاگی آئیں؟“

”مجھے تو بہن کا خیال آ گیا تھا۔“

”خالہ! لگتا ہے تم پوری طرح سن کر جاؤ گی۔ اصل بات یہ ہے کہ وہاں غزل کے جو رشتے آ رہے ہیں، وہ سب بڑے لوگ ہیں۔ ان سے شادی کی تو اپنی بیٹی کے ساتھ زمین سے بھی ہاتھ دھو لو گی اس لیے تم کسی داماد کی تلاش میں آئی ہو جو تمہاری زمینوں کے لیے خطرہ نہ بن سکے۔“

خالہ کچھ بولی نہیں مگر ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ میری کہی بات سو فی صد درست ہے۔ اس اثنا میں خالہ کا ڈرائیور کار لے کر آ گیا تھا۔ میں صحن میں نکلا تو وہاں شمو اور خالہ لاؤڈ اسپیکر کھڑے تھے اور شاید انہوں نے ہماری ساری باتیں سن لی تھیں۔

”ارے خالہ تم؟“ میں نے شمو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لڑکے! میں یہاں ہوں تو کہاں دیکھ رہا ہے؟“ خالہ نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ شمو کے آنسو ایسے تھے جیسے بارش کے بعد گلاب پر پانی کی بوندیں ہوں۔ اماں بھی باہر نکل آئی تھیں۔ وہ خالہ لاؤڈ اسپیکر کے گلے لگ گئیں۔

”نفیسہ! تو کب آئی؟“

”ابھی... میں نے سوچا میں مل آؤں، آج چاند رات ہے نا۔“

”میں خود آنے والی تھی، پر اچھا ہوا کہ تو آ گئی۔“

”اور تم بھی آ گئیں۔“ میں نے شمو سے سرگوشی میں کہا۔

”تمہاری مہمان کہاں ہے؟“

”واپس جا رہی ہے۔“ میں نے باہر جاتی غزل کی طرف دیکھا۔ ”پتا نہیں کیوں لوگوں کو موازنے اور مقابلے کا شوق ہو جاتا ہے۔“

غزل ہماری طرف دیکھے بغیر باہر جا کر کار میں بیٹھ گئی تھی۔ خالہ بھی منہ پھلا کر اماں سے ملیں اور باہر جانے لگیں۔ میں دروازے تک چھوڑنے آیا تو اچانک خالہ نے آہستہ سے کہا۔ ”جلیل! وہ تو کسی جانے والے کا ذکر کر رہا تھا رشتے کے لیے۔“

میں دل ہی دل میں ہنسا اور خالہ رضیہ کو راجا کا نام اور گھر کا پتا دے کر اندر آ گیا۔ اب یہ راجا کی قسمت تھی کہ اسے کیا ملتا ہے۔ اماں اور خالہ لاؤڈ اسپیکر یوں مل رہی تھیں جیسے برسوں کی بچھڑی بہنیں ملتی ہیں۔ یعنی رونے دھونے کے راؤنڈ کے بعد مطلع صاف تھا۔ میں نے جاتے ہی خالہ لاؤڈ اسپیکر سے کہا۔ ”خالہ! میں شمو کو چوڑیاں پہنانے اور مہندی لگوانے لے جا رہا ہوں۔“

”ارے تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟ لے جا، تیری منگیتر ہے۔“

”اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ تم اور اماں بعد میں بے عزتی کرتی ہو۔“

اپنی اماں کے پہلو میں دبکی شمو کے چہرے پر حیا کے رنگ تھے۔ میں جلدی سے خلیل سے بائیک کی چابی لینے لپکا کہ یہ رنگ کہیں پھیکے نہ پڑ جائیں۔

www.pkdigest.com

فرقت کی چبھن، وطن کے گداز اور محبت کے راز افشا کرتے قلم کا شاہکار

پرواز

طاہر جاوید مغل

آخری قسط

ایک سیدھے سادے لیکن ہر فن مولا کی داستان۔ اس کے بازو توانا تھے اور قدم مستحکم۔ منطقی ذہن اس کا رہنما تھا اور نقارے بجاتا دل محبت کی تال پر دھڑکتا تھا۔ رگوں میں خون کی جگہ جوش دوڑتا اور لبوں پر نغمے مچلتے رہتے... پھر اس کی سماعت میں گھلنے والے رس نے اس کے لبوں کو ایک نئی تشنگی سے آشنا کیا اور وہ طلب کے منہ زور دھارے کے آگے بے دست و پا ہو گیا۔ بے کراں طلب اور تند جذبوں کے اس بہاؤ میں وہ تنہا نہ تھا۔ وہ ہستی بھی اس کے ہم دوش تھی جس کی فقط ایک نگاہ نے اس کے دل کا فیصلہ کر دیا تھا۔ بہاؤ کی سمت غلط تھی یا درست، اس سے بے خبر، اس سیلِ بلا خیز میں وہ بہے چلے جا رہے تھے!

ایک دلربا کی جستجو میں سحر... اور اسی کے خیال میں شام کرنے والے پجاری کا احوال

میں گھوڑے پر سوار تھا۔ یہ ایک تیز رفتار گھوڑا تھا۔ تاہم میرا ذہن اس سے بھی زیادہ رفتار کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جو کچھ راجوال میں ہونے والا تھا، اس کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے تھا اور میں سوچ رہا تھا، میں راجوال کو ایک برے انجام سے بچانے کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ مگر سوال پھر وہی تھا۔ کیا راجوال والے میری آواز پر اٹھ کھڑے ہوں گے؟ کیا وہ ایک بار پھر یک جان ہو کر میرا ساتھ دیں گے اور اپنے دشمنوں کے دانت کھٹے کریں گے؟

ذہن جو جواب دے رہا تھا، وہ گہری مایوسی کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ تاہم میں اس دھند کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

... صبح صادق کے آثار دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید ابھی اس روشنی کے دکھائی دینے میں دیر تھی۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ آسمان پر گہرے بادل بھی موجود ہیں۔ تاریک راتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بادل آسمان پر پہرے جمائے کھڑے رہتے ہیں اور بندے کو پتا ہی نہیں چلتا۔ پتا تب چلتا ہے جب اچانک تابڑ توڑ بارش شروع ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اچانک تیز بارش شروع ہو گئی۔ میں نے کچھ دور تک ایسے ہی سفر کیا مگر پھر گھوڑے کا پاؤں پھسلنے لگا۔ مجھے اپنی، راجوال والی پسندیدہ گھوڑی یاد آ گئی۔ وہ بھی تو مچھلی فارم کے نواح میں ایسے ہی پھسل کر اپنا پاؤں تڑوا بیٹھی تھی۔ میں دھیمی رفتار سے سفر کرتا رہا پھر مجھے ایک جگہ چھوٹے سے گاؤں کی دو چار روشنیاں نظر آ گئیں۔ میں نے گھوڑے کا رخ ادھر موڑ دیا۔ اب میں جاگیر کے نواح میں پہنچ چکا تھا۔ شام پور یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن بارش چونکہ تیز ہو گئی تھی، اس لیے رکنا پڑا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک نوجوان نے دروازہ کھولا۔

"کیا بات ہے بھرا جی؟" اس نے مجھے سرتاپا دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بارش تیز ہو گئی ہے، بس تھوڑی دیر کے لیے رکنا چاہتا ہوں۔"

اس نے ایک بار پھر میرا جائزہ لیا اور دیہاتی خوش اخلاقی سے بولا۔ "آ جاؤ جی... گھوڑا ادھر باندھ دو ٹاہلی کے نیچے۔"

میں نے شکریہ ادا کر کے گھوڑا باندھ دیا اور نوجوان کے ساتھ گھر کے اندر چلا گیا... گھر میں نوجوان اور اس کی بوڑھی والدہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ نوجوان کا نام شریف تھا اور وہ کھیت مزدوری کرتا تھا۔

وہ مجھ سے دو چار باتیں کر کے پھر سو گیا۔ اس کی والدہ جاگتی رہیں۔ وہ تہجد کے لیے بیدار ہو چکی تھیں۔ ان کی باتوں کے انداز اور شکل و صورت میں مجھے بے بے جی کی جھلک نظر آئی۔ شاید ساری مائیں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ مجھے پُتر کہہ کر بلاتی رہیں، میں انہیں اماں جی کہتا رہا۔ انہوں نے مجھے اپنے بیٹے کے کپڑے دیے اور میرے گیلے کپڑے نچوڑ کر آگ کے سامنے پھیلا دیے۔ انہوں نے مجھے کاڑھنی کا گرم دودھ بھی پلایا۔

بارش کا زور ٹوٹنے میں نہیں آرہا تھا۔ نماز پڑھ کر وہ پھر میرے پاس آبیٹھیں۔ وہ مجھے سالار شاہ خاور کی حیثیت سے نہیں جانتی تھیں... نہ ہی اس سیدھی سادی عورت کی خواہش تھی کہ وہ میرے بارے میں کچھ جانے۔ باتوں باتوں میں جاگیر کا ذکر چھڑ گیا۔ اماں جی کے چہرے پر اداسی پھیل گئی۔ وہ بولیں۔ ”اب تو جاگیر کا اللہ ہی حافظ ہے۔ جب تک اللہ بخشے والی جی تھے، سب کچھ تھا۔ اب تو سکھا شاہی ہے۔ جس کا جو دل چاہے، وہ کر رہا ہے۔“

میں نے اماں کے خیالات جاننے کے لیے کہا۔ ”شروع میں تو سالار شاہ خاور نے بھی کافی اچھے کام کیے تھے۔ اب پتا نہیں وہ کیا کر رہا ہے۔“

اماں کے چہرے پر بے زاری کا سایہ لہرا گیا۔ لالٹین کی روشنی میں ان کی آنکھوں میں ابھرنے والی نفرت میں نے صاف دیکھی۔ وہ بولیں۔ ”جاگیر کی جڑیں کاٹنے میں اصل بندہ یہی ہے۔ اسی کا بویا ہوا آج جاگیر والے کاٹ رہے ہیں۔ اس نے جو کچھ کیا، اپنے مطلب کے لیے کیا۔ اب سارے جان گئے ہیں کہ وہ ٹھیک بندہ نہیں تھا۔ اس کے دل میں کھوٹ تھا۔“

”کھوٹ تھا؟“

”ہاں پُتر!“ اماں نے اپنی آواز دھیمی کر لی۔ حالانکہ اس بارشی رات میں کون اس کی آواز سننے والا تھا۔ وہ ہولے ہولے آگے پیچھے جھولتے ہوئے بولی۔ ”وہ جب سے یہاں آیا تھا، والی جی کی گھر والی کے چکر میں تھا۔ اس نے پچھلے سالوں میں جو بھی اچھے یا برے کام کیے سب اسی چکر میں کیے۔ اب تو بچے بچے کو پتا ہے کہ شاہ خاور بیگم کے ساتھ پھنسا ہوا تھا۔“ (ناجائز تعلق رکھتا تھا)۔

کسی ساتھ والے کمرے سے بوڑھے بندے کے کھانسنے کی آواز گاہے بہ گاہے ابھرتی تھی۔ میں نے اپنے اندر کے درد کو دباتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے اماں جی... کیا بیگم بھی ایسی ہی زنانی ہے؟ ہم نے تو سنا تھا کہ وہ بڑی خدا ترس اور نیک ہے۔ نماز، روزے کی پابند ہے۔ علاقے کی بے شمار بے آسرا لڑکیوں کی شادیاں اس نے اپنے خرچے سے کرائی ہیں۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے پُتر! پر سیانے کہتے ہیں کہ عورت کی عقل کمزور ہوتی ہے۔ خاص طور سے جوان عورت کی۔ یہ شاہ خاور ایسا ہاتھ دھو کر بیگم جی کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ اس کی بھی مت مار کر چھوڑی۔ سب جانتے ہیں کہ والی جی کے مرنے کے بعد یہ دونوں بہت کھل کھلا کر آپس میں ملتے رہے ہیں۔ پر پھر کسی نہ کسی طرح بیگم جی کو عقل آگئی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس طرح وہ ذلیل و خوار ہو کر رہ جائے گی۔ اسے یہ بھی اچھی طرح پتا چل گیا تھا کہ اس کے برادری والے بھی اس کی شادی شاہ خاور کے ساتھ نہیں ہونے دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے خود آگے ہو کر شاہ خاور کی شادی لیبروں میں کرائی۔ شہوار کو بیاہ کر راجوال میں لانے والی بیگم ہی تھی۔“

”مگر پھر شہوار بھی قتل ہو گئی۔“

”قتل ہو نہیں گئی، اسی بدمعاش خاور نے خون کیا اس کا۔ شہوار کا قصور بس اتنا تھا کہ وہ خاور پر شک کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اب بھی بیگم جی سے ملتا ہے۔ اب پتا نہیں اس کا شک جھوٹا تھا یا سچا۔ پر اگر جھوٹا بھی تھا تو اتنی سی گلتی کی سزا اتنی نہیں تھی کہ اس بالڑی کو خوامخواہ خون کر کے مار دیا جاتا۔ یہ شاہ خاور بڑا زہریلا بندہ ہے۔ اپنے مطلب کے لیے یہ ہر کام کر سکتا ہے۔ اپنا گناہ چھپانے کے لیے اس نے داشاد کی یتیم کڑی ثمینہ کو بھی مارا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اس کڑی کا خون بھی اسی بدمعاش کی گردن پر ہے۔“

”پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے اماں جی کہ خاور کے دشمنوں میں سے کسی نے یہ چال چلی ہو۔ اس کی بیوی کو مار کر اسے پھنسا دیا ہو۔“

”نہیں پُتر! اللہ کی خلقت کی زبان پر جو بات آجاتی ہے، وہ جھوٹ نہیں ہوتی۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اگر وہ خبیث قصوروار نہیں تھا تو پھر بھاگا کیوں؟ اب وہ اپنے سوہرے (سسر) اور پولیس دونوں سے چھپتا پھر رہا ہے۔ اس نے جاگیر میں اپنا آپ منوانے کے لیے جو دشمنیاں پالی تھیں، وہ اب جاگیر والوں کے گلے پڑ رہی ہیں۔ لوگ دن رات اس کو بددعائیں دے رہے ہیں۔ شریف کا ابا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ بھیڑے لوگوں کی زندگی لمبی ہوتی ہے۔ اچھے بندوں کو اللہ جلدی اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ والی جی چلے گئے۔ تین چار دن پہلے گلزار بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ جاگیر والوں کو چودھری عزیز کا تھوڑا بہت آسرا تھا، وہ

بے چارہ بھی اسی منحوس کو پولیس والوں سے بچاتے ہوئے اپنی جان ہار گیا۔ جن کو زندہ رہنا تھا وہ مر گئے جس کو مرنا چاہیے تھا وہ خونی ہو کر بھی دندنا رہا ہے۔“

مجھے اپنی آنکھوں میں نمی سی محسوس ہوئی۔ آج اس بارش کی رات میں، اس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر اس ضعیف عورت کی زبانی... اپنی اصلیت معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے پتا چل رہا تھا کہ اب خلقِ خدا مجھے غائبانہ کیا کہتی ہے۔ یہ میری شخصیت کا وہ رخ تھا جو جاگیر والے دیکھ رہے تھے۔ یہ رخ سچا تھا یا جھوٹا مگر اب یہی رخ لوگوں کے سامنے تھا۔

یہ حالات کا ستم تھا۔ میرے اپنے پرائے ہو چکے تھے۔ میں اپنے پاس اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت نہیں رکھتا تھا۔ میں اپنا سینہ چیر کر دکھا سکتا تھا مگر سینے کے اندر بھی کچھ لکھا تو نہیں ہوتا۔ اور اگر لکھا بھی ہو تو بدگمانی کی دھندلاہٹ کچھ دیکھنے نہیں دیتی۔

اماں ایک بار پھر بڑے کرب کے ساتھ سالار خاور اور اس کے کرتوتوں کا ذکر کرنے لگی۔ اس کا لہجہ مجھے سنگسار کر رہا تھا۔ اس دوران میں ساتھ والے کمرے سے بوڑھے کی آواز آئی۔ وہ کھانستے ہوئے نحیف آواز میں بولا۔ ”برکتے! یہ سویرے سویرے فجر ویلے کس کا نام لے کر زبان گندی کر رہی ہے۔ ذکر کر اس کو۔ چل اٹھ میرے لیے تھوڑی سی چا بنا دے۔“ یہ بوڑھا یقیناً اماں کا شوہر تھا۔

اماں چائے بنانے کے لیے چولہے کی طرف چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بلند آواز میں شوہر کو مخاطب کیا۔ ”تم تو جلدی سو گئے تھے۔ رات کو پتا ہے کیا ہوا؟“

”کیا ہوا؟“ بوڑھے نے دوسرے کمرے سے پوچھا۔

”قاسم لوہار کے پتر فخری کو بڑا مارا ہے لوگوں نے۔ وہ بڑا چمچہ بنتا ہے نا سالار خاور کا۔ وہاں ”دائرے“ میں سب بیٹھے ہوئے تھے۔ فخری نے خاور کی حمایت میں کوئی بات کی۔ بشیر قصائی کے پتروں نے اسے پکڑ لیا۔ پھر دوسرے لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب نے چنگی طرح حجامت بنائی ہے اس کی۔ جوتے شوتے بھی پڑے ہیں۔ کپڑے لیرو لیر (تار تار) ہو گئے۔ بھاگ کر تر کھانوں کے گھر گھس گیا۔ لوگوں نے پھر وہاں سے نکال لیا۔“

”وہ کہتے ہیں نا کہ خواجے کا گواہ ڈڈو ہوتا ہے۔ بدمعاش ہی بدمعاش کی حمایت کرتا ہے۔“ بوڑھے نے کھانستے ہوئے کہا۔ ”یہ فخری بھی تو ایک نمبر کا لنگا ہے۔ شروع میں اپنی بھرجائی کے ساتھ خراب ہو گیا تھا پھر اس نے اپنے چاچے کے گھر میں ڈکیتی کرائی۔ دو سال تک تو غائب ہی رہا تھا گاؤں سے۔“

”اب پھر غائب ہو جائے گا۔ رات کو بڑی بے عزتی خراب ہوئی ہے اس کی۔“

میاں بیوی کی باتیں میرے دل پر چرکے لگا رہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ صرف ان میاں بیوی کی نہیں، پورے علاقے کی رائے ہے۔ ہر بچے بوڑھے کی رائے ہے۔

اسی دوران میں بوڑھا کھانستا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا باہر نکلا۔ میں نیم تاریکی میں بیٹھا تھا۔ اس نے ایک اچٹتی ہوئی سی نظر مجھ پر ڈالی اور حقے کی چلم بھرنے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے بوڑھے کی صورت کچھ جانی پہچانی لگی۔ اندازہ ہوا کہ میں حویلی میں یا راجوال میں کبھی کبھار اسے دیکھتا رہا ہوں۔

دل میں عجیب سے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ اگر یہ شخص مجھے پہچان لیتا تو اس کا ردِعمل کیا ہوتا؟ شاید یہ مجھے بے نقط سنانی شروع کر دیتا یا پھر ڈر جاتا اور بیوی سمیت کمرے میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کر لیتا... یا پھر خوف کے عالم میں اپنے بیٹے کو آوازیں دینا شروع کر دیتا۔ میں نے اپنا چہرہ چادر کی اوٹ میں کر لیا تاکہ یہ شخص مجھے ٹھیک سے دیکھ نہ سکے۔

وہ حقے کی چلم بھر کر میرے سامنے سے گزر گیا۔

میرے دل کی کیفیت کچھ عجیب ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ میں ایک ناقابلِ معافی مجرم ہوں اور ہزاروں ملامتی نگاہیں مجھے گھور رہی ہیں۔ ہزاروں ہاتھ مجھے سنگسار کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ ان گنت لوگ ہیں جو مجھ سے مخاطب ہو کر بہ یک زبان پکار رہے ہیں... تم گناہ گار ہو۔ تم ایک حریص انسان ہو۔ تم نے اس جاگیر میں آکر اپنی خواہشیں پوری کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ تم صرف اپنے ہی لالچ پورے کرتے رہے ہو۔ ہم تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتے۔ تم اپنا منحوس سایہ ہمارے بستے بسے گھروں پر سے اٹھا لو۔ ہم اپنی مصیبتیں خود جھیل لیں گے۔ تم جہاں سے آئے ہو، وہیں پر دفع ہو جاؤ۔ ہمیں اپنے درمیان تم جیسے بے کردار اور موقع پرست بندے کی کوئی ضرورت نہیں۔

مجھے لگا کہ میرے سینے میں دل کا شیشہ ٹوٹ گیا ہے اور ہر طرف اس کی کرچیاں بکھر گئی ہیں۔ میرے اندر سے آواز آنے لگی۔ ”خاور!! اگر تم ان حالات میں راجوال گئے تو مزید ذلت اور خواری کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ فی الوقت تمہارے اپنے ہی تمہارے دشمن ہیں۔ تم غیروں کے ساتھ کیسے لڑ سکتے ہو؟ جاگیر کے لوگوں کو ان کی قسمت پر چھوڑ دو اور خود کو بالکل الگ کر لو۔“

www.pkdigest.com

بارش اب رک گئی تھی، تاہم بادلوں کی وجہ سے صبح کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ میں نے اپنے کپڑے پہنے اور اماں سے جانے کی اجازت طلب کی۔

کچھ ہی دیر بعد میں گھوڑے پر سوار ایک بار پھر ویران جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے درمیان سفر کر رہا تھا۔ مگر اب دل کا موسم کچھ اور تھا۔ میں نے فی الحال حالات کے سامنے پسپائی اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کسی مناسب جگہ پر گھوڑا چھوڑ دوں گا اور بس وغیرہ کے ذریعے گوجرانوالہ پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ وہاں رشید بٹ کے ذریعے کچھ دن بعد بلقیس سے رابطہ کروں گا اور اس سے کہوں گا کہ وہ کسی طرح میری والدہ اور بہن کو گوجرانوالہ پہنچا دے۔ اس کے بعد ان دونوں کو لے کر جنوبی پنجاب کے کسی دور دراز گاؤں کی طرف نکل جاؤں گا۔ جاگیر کو... جاگیر والی کو اور جاگیر کے لوگوں کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دوں گا۔ اس کے بعد اگر مناسب محسوس ہوا تو کسی وقت خود کو قانون کے سامنے بھی پیش کر دوں گا۔

انہی خیالات کے ہجوم میں، میں گھوڑا دوڑاتا ایک کچے راستے پر آگے بڑھتا چلا گیا۔ دل پر عجیب افسردگی تھی۔ آسمان پر بادل تھے تاہم صبح کا اجالا نمودار ہو چکا تھا۔ ارد گرد کا ہر منظر دھلا دھلایا اور صاف نظر آرہا تھا۔ اچانک مجھے گھوڑے کی رفتار دھیمی کرنا پڑی۔ میں اپنے سامنے ایک تانگا دیکھ رہا تھا۔ تانگا بان ایک بوکے کے ذریعے گھوڑے کو پانی پلا رہا تھا۔ تانگے پر دو تین سواریاں موجود تھیں۔ ان سواریوں کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ ان میں منشی منظور اور حامد کو میں نے صاف طور پر پہچان لیا۔ تیسرا شاید حامد کا گن مین تھا... میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میں اب ان کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کسی کا بھی سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب چبھتی ہوئی نظریں اور ان نظروں میں سے جھانکتے ہوئے الزامات میری برداشت سے باہر ہو چکے تھے۔

تانگے والے بھی دھیان سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح مجھے پہچان سکتے، میں نے گھوڑے کا رخ موڑا اور ایک بغلی راستے پر ہولیا۔ گھوڑے کو ایڑ لگا کر میں نے اس کی رفتار تیز کردی۔ اچانک میں بری طرح چونک گیا۔ ایک باریک گونجتی ہوئی آواز نے میرا پیچھا کیا۔ ”ماسٹر چاچا... ماسٹر چاچا...“

بلاشبہ یہ حامد کی آواز تھی۔ میں گھوڑا دوڑاتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ جلد ہی یہ آواز پیچھے رہ جائے گی مگر چند سیکنڈ بعد اتنے ہی فاصلے سے آواز دوبارہ ابھری۔

”چاچا... رک جاؤ ماسٹر چاچا... میری بات سنو۔“

میں نے مڑ کر دیکھا۔ حامد اندھا دھند دوڑتا ہوا میرے پیچھے آرہا تھا۔ وہ دھاری دار سویٹر اور شلوار قمیص میں تھا۔ اس کے عقب میں گن مین باجوہ تھا...

میں نے دل کڑا کر کے گھوڑا بھگانا جاری رکھا۔ تو تیز حامد کی ہانپتی اور پکارتی ہوئی آواز میرا پیچھا کرتی رہی۔

وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کھیتوں میں اور پگڈنڈیوں پر پوری رفتار سے میرا پیچھا کر رہا تھا۔ گن مین باجوہ ذرا فربہ ہونے کے سبب چالیس پچاس قدم پیچھے رہ گیا تھا۔ آخر میں حامد کے اس طرح اندھا دھند بھاگنے کا منظر برداشت نہیں کر سکا۔ میں نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔

حامد ہاتھ لہراتا اور بھاگتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ اس کے پاؤں سے جوتی اتر چکی تھی۔ وہ ننگے پاؤں میرے سامنے کھڑا تھا۔ مشقت سے اس کا رنگ زرد تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

میں گھوڑے سے اترا اور آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ کچھ بولا نہیں لیکن جب میں نے اس کو خود سے جدا کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

”آپ بھاگ کیوں رہے تھے چاچا؟“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میری قسمت میں اب شاید بھاگتے رہنا ہی لکھا ہے۔“ میں نے آزردگی سے کہا۔

گن مین باجوہ بھی اب ہانپتا ہوا ہمارے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا۔

اس سے پہلے میں نے باجوہ کو تب دیکھا تھا جب بلقیس اور چودھری عزیز میری والدہ اور بہن کو نگران والی کی محفوظ پناہ گاہ میں چھوڑ کر آرہے تھے اور مغلوں والے باغ کے پاس میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے باجوہ کی آنکھوں میں بھی وہی اجنبیت اور دوری نظر آئی تھی جو دیگر محافظوں کی نگاہوں میں تھی... لیکن آج صورت حال کچھ اور تھی۔ باجوہ کے سلام میں عقیدت کی جھلک نظر آئی اور اس کی آنکھوں میں ایک دبا دبا جوش تھا۔

”آ... آپ کہاں جارہے تھے چودھری جی؟“ باجوہ نے پوچھا۔

”تم کہاں جارہے ہو؟“ میں نے جوابی سوال کیا۔

”ہم تو چھوٹے مالک کو ڈسکہ لے کر جارہے ہیں۔ ان کے دانت میں درد ہے۔ دوائی لے کر دینی ہے۔“

”کیا ہوا ہے حامد؟“ میں نے پیار سے اس کے سر پر

ہاتھ پھیرا۔

وہ سی ان سی کر کے بولا۔ ”آپ کہاں چلے گئے ہیں... آپ حویلی کیوں نہیں آتے؟ میں آپ کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ امی بھی کرتی ہیں۔ وہ روتی رہتی ہیں۔ آپ کیوں کر رہے ہیں ایسا؟“ وہ سادہ دلی سے بولتا چلا گیا۔

”میں ابھی کچھ دنوں تک نہیں آسکتا۔ مجھے کچھ کام ہیں۔“ میں نے کہا۔

باجوہ کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر عجیب انداز میں بولا۔ ”چودھری خاور! کل سے راجوال میں حالات بڑے بدل گئے ہیں۔ شاید آپ کو پتا نہیں چلا۔“

”کیا مطلب؟“

”چودھری رونق نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے جی۔“

”رونق؟ رونق تو قبرستان میں... میرا مطلب ہے، وہاں اسے گولی لگی تھی...“

”نہیں جی... کچھ نہیں ہوا رونق صاحب کو۔ بس بازو پر ایک زخم آیا ہے۔ وہ بالکل بچ گئے ہیں۔ وہ ایک دو دن کہیں چھپے رہے۔ پھر کل سویرے اچانک راجوال میں آگئے۔ انہوں نے آتے ساتھ ہی پنچایت بلائی اور سب کو چودھری عزیز کی وہ آواز سنائی جس میں انہوں نے اپنی زبان سے اپنا جرم مانا ہے۔ اب تک تو شاید راجوال کا ہر بندہ یہ آواز سن چکا ہو۔“

مجھے اپنے کانوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ رگ و پے میں ایک عجیب سی سنسنی تیرنے لگی۔ میں نے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”مگر... مگر وہ آواز والی ٹیپ تو پولیس والوں کے پاس رہ گئی تھی...“

”جی... ٹیپ رہ گئی ہوگی۔ آواز والی کیسٹ تو چودھری رونق بھائی کے پاس تھی۔“

یکایک ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ اس کے ساتھ ہی سینے میں شادیانہ سا بج اٹھا۔ یوں لگا کہ میں کئی دنوں سے جو ایک پہاڑ جیسا بوجھ سر پر اٹھائے پھر رہا تھا، وہ اچانک اتر گیا ہے اور میں ہوا کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں۔ لیکن ابھی مجھے باجوہ کی بات پر پوری طرح یقین نہیں آیا تھا۔ میں اس سے مزید تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے سب کچھ بتایا۔

رونق علی نے وہ کام کر دکھایا تھا جس کی مجھے اس سے توقع نہیں تھی۔ اس نے اپنی ساری سستیوں اور کاہلیوں کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔ جب قبرستان میں پولیس اندھا دھند

کون کہتا ہے کہ؟
اولاد نہیں ہوسکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہوسکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0547-521787
فون اوقات
صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک
آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

فائرنگ کر رہی تھی، رونق علی نے ٹیپ ریکارڈر میں سے کیسٹ نکالی تھی اور دھند کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ پولیس اسے اور کیسٹ کو ڈھونڈتی پھر رہی ہوگی۔ وہ ایک دو روز کے لیے کھن والی میں چھپا رہا تھا اور کل صبح سویرے کیسٹ سمیت راجوال پہنچ گیا تھا۔ پہلے اس نے بڑوں کے اکٹھ میں یہ کیسٹ سنائی پھر عام لوگوں تک بھی اس کیسٹ کی آواز پہنچ گئی۔ باجوہ کو امید تھی کہ اب تک اس کیسٹ سے دو تین مزید کیسٹیں بھی تیار ہو چکی ہوں گی۔ آج سالار نصر اللہ، چودھری یعقوب اور رونق وغیرہ کا پروگرام تھا کہ اس کیسٹ کو میلے میں لاؤڈ اسپیکر پر سنوایا جائے گا۔

میں نے باجوہ سے اپنی والدہ اور بہن کی خیر خیریت دریافت کی۔

باجوہ نے کہا۔ ”بیگم جی نے انہیں اپنی جان سے لگا کر رکھا ہوا ہے جی۔ تھانے دار وارث ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گیا تھا، پر بیگم جی نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ دوسری طرف آپ کے سسر لبڑ آصف جاہ نے بھی بڑے ہاتھ پاؤں مارے ہیں مگر بیگم جی ان کے سامنے ڈھال بنی رہی ہیں۔ شاید آپ کو پتا ہی ہو، ککراں والی میں تو ٹھیک ٹھاک لڑائی بھی ہوئی ہے۔ لبڑ آصف کے کارندے آپ کے گھر والوں تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد بیگم جی راتوں رات خود ککراں والی پہنچیں۔ وہ عام کپڑوں میں تھیں اور ان کے ساتھ صرف ایک گارڈ تھا جس نے اپنی رائفل کپڑوں کی گٹھڑی میں چھپائی ہوئی تھی۔ وہ آپ کی والدہ اور بہن کو بڑی حفاظت سے لے کر واپس راجوال آ گئیں۔“

اس بارے میں، میں اس سے پہلے کے نو کے یار قیصے سے بھی سن چکا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ بلقیس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر بے بے جی اور عارفہ کو واپس راجوال پہنچایا ہے۔ باجوہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور سچ پوچھیں جی تو اللہ بخشے چودھری عزیز نے بھی اس معاملے میں بیگم جی کا پورا ساتھ دیا تھا۔ انہوں نے ہر طرح سے آپ کے گھر والوں کی حفاظت کی ہے۔“

میں خاموش رہا، اس بارے میں میرا ذہن اب بھی الجھن کا شکار تھا۔ چودھری کو مجھ سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی؟

میں نے باجوہ سے پوچھا۔ ”اب راجوال میں کیا حالات ہیں؟ موکلوں کی طرف سے کوئی نئی شرارت تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں جی، ابھی تک تو خیریت ہی ہے۔“

باجوہ کے جواب سے پتا چلتا تھا کہ وہ آنے والے طوفان سے بے خبر ہے۔

میں نے کہا۔ ”موکلوں کے بندے میلے میں تو نظر آتے رہے ہوں گے؟“

”ہاں جی، میلے میں تو آتے رہے ہیں۔ چھوٹا موکل بھی آیا تھا۔ اس نے کبڈی دیکھی تھی اور اپنے ہاتھ سے انعام شام بھی دیے تھے۔“

”کوئی بات تو نہیں کی تھی اس نے؟“

”نہیں جی، کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔“ پھر جیسے ایک دم باجوہ کو یاد آیا۔ وہ بولا۔ ”موکل پاشا اور اس کے بندے مزار کے اندر گئے تھے۔ انہوں نے متولی جی کے ساتھ تھوڑی سی بدتمیزی بھی کی۔ اس سے کہا کہ وہ چندے کا پورا حساب کتاب رکھے کیونکہ یہاں صرف جاگیر کا نہیں، سارے علاقے کے لوگوں کا چندہ اور نذرانے جمع ہوتے ہیں۔ اس کو سارا حساب دینا پڑے گا۔“

”اس کے علاوہ؟“ میں نے پوچھا۔

”انہوں نے اپنا ایک خادم بھی مزار میں چھوڑا ہے۔ کہا ہے کہ یہ بھی جھاڑ پونچھ کیا کرے گا۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ان باتوں سے تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟“

باجوہ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”ہو سکتا ہے جی... کہ موکل کچھ دنوں بعد پھر مزار کی ملکیت والا جھگڑا کھڑا کریں۔“

”کچھ دنوں بعد نہیں... آج ہی... بلکہ ابھی، بس ایک دو گھنٹے کے اندر۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

باجوہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ وہ ہکلایا۔

”مجھے پکی اطلاع ملی ہے۔ آج موکلوں نے ہلا بولنا ہے۔ مزار پر قبضہ کرنا ہے اور وہاں اپنا متولی بٹھانا ہے۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ آ رہے ہیں۔“

باجوہ کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ ”اب کیا ہوگا؟“ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

اس کے گندمی چہرے پر اندیشوں کے گہرے سائے تھے مگر پھر بہ تدریج یہ سائے چھٹتے چلے گئے... چند سیکنڈ کے اندر اندر اس کے چہرے پر امید کا اجالا نظر آنے لگا۔ اس نے میری طرف دیکھا... اس کے دیکھنے کے انداز میں انتہا درجے کا والہانہ پن تھا۔ اس کی آنکھیں جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھیں۔

شاہ خاور! تم سب کچھ کر سکتے ہو۔

ہم سب کو تم پر پورا بھروسا ہے۔

ہم سب تمہاری آواز پر ایک ہو سکتے ہیں۔

ہر ان ہونی کو ہونی کر سکتے ہیں۔

تم ہمارے درمیان ہو گے تو ہمیں کوئی ڈر نہیں۔ کوئی ڈر نہیں۔

میری سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ذہن دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ اہم ترین سوال یہی تھا کہ کیا واقعی راجوال میں سب کچھ بدل چکا ہے؟ کیا مجھے راجوال پہنچ جانا چاہیے؟ کیا میں وہاں پہنچ کر ایک بار پھر اپنے چاہنے والوں کی امیدوں پر پورا اتر سکوں گا؟ ذمے داری کا ایک نادیدہ بوجھ میرے کاندھوں کو توڑنے لگا۔ مجھے اپنے قدموں میں لرزش محسوس ہوئی لیکن ایک بار پھر... ایک بار پھر اسی ان دیکھی توانائی نے مجھے سہارا دیا جو... راجوال میں گزرے پچھلے برسوں میں پل پل میرے ساتھ رہی تھی۔

دل دریا سمندروں ڈونگے

کون دلاں دیاں جانے ہو

میں نے حامد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں راجوال جانے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆

ہم کوشش کے باوجود ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے راجوال نہیں پہنچ سکے۔ راجوال کے نواح میں پہنچ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے دیکھا، باجوہ کا رنگ بھی بدل گیا ہے۔ راجوال کی طرف سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔

”یا اللہ خیر۔“ باجوہ کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

حامد بھی پریشان نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔

ہم قدرے تیزی سے آگے بڑھے... اور پھر ہمارے اندیشے حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔ سب سے پہلے راجوال کے ہی چند افراد نظر آئے۔ وہ ریڑھے پر سوار تھے۔ ان میں دو عورتیں، دو مرد اور چند بچے تھے۔ وہ دائیں طرف ایک کچے راستے پر سرپٹ جا رہے تھے۔ باجوہ نے انہیں دیکھ کر آوازیں لگائیں۔ ”رحمت... رحمت... بخشو... بات سنو یار!“

انہوں نے سنتے ہوئے بھی کچھ نہیں سنا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ابھی ہم تھوڑی دور گئے تھے کہ ہمیں راجوال ہی کا ایک شخص نظر آیا۔ اس کی ٹانگ پر کلہاڑی کا گہرا وار لگا تھا۔ ران کے اوپر میلی سی پٹی بندھی ہوئی تھی اور پٹی میں سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ اس شخص کا نام رشید تھا۔ رشید کا رنگ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔ دو ادھیڑ عمر افراد اسے دونوں طرف سے سہارا دے کر لے جا رہے تھے۔ وہ خود بھی تھوڑے بہت زخمی تھے۔

میں نے ان میں سے ایک شخص کو پہچان کر کہا۔ ”کیا ہوا چاچا کریم؟“

کریم نے پہلے مجھے دھیان سے دیکھا، پھر پہچان لیا اور اس کے چہرے پر ہیجانی آثار نظر آنے لگے۔ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”اب کیا لینے آئے ہو تم؟ انہوں نے سب کچھ برباد کر دیا ہے۔ پنڈ کا شاید ہی کوئی بندہ گھائل ہونے سے بچا ہو۔ بہت سوں کی جان چلی گئی ہے۔ ظالموں نے آگ لگا دی ہے آدھے پنڈ کو۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”یقین نہیں تو جا کر دیکھ لو۔ جو لڑائی تم نے چھیڑی تھی اس کا انجام بڑا برا ہوا ہے سالار خاور! موکلوں نے پورا پورا بدلہ لیا ہے۔ وہ ہماری زنانیوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ مزار پر قبضہ کر لیا ہے۔ پتا نہیں کتنے بندوں کی جان لے لی ہے۔“ چاچے کریم کی آواز بھرائی چلی جا رہی تھی۔

میرے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے موکل پاشا کا چہرہ اپنی پوری نحوست کے ساتھ جلوہ گر ہو گیا۔ اس کی بھوری آنکھوں کی مکروہ چمک، اس کی فاتحانہ ہنسی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ مچھلی فارم والی زمین کے بدلے مجھے بہت کچھ دینا پڑے گا اور بہت کچھ سہنا پڑے گا۔ شاید آج اس نے اپنا کہا پورا کر دکھایا تھا۔

یہ کیا ہو رہا تھا میرے ساتھ؟ حالات اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ میرا دماغ ان کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے باجوہ نے مژدہ سنایا تھا کہ چودھری عزیز والی کیسٹ، راجوال کے بہت سے لوگوں کے کانوں تک پہنچ گئی ہے۔ وہ اصل مجرموں کے چہرے پہچان گئے ہیں اور اب وہ ہر طرح میرا ساتھ دینے پر تیار ہوں گے۔ مجھے امید کی روشن کرنیں نظر آئی تھیں مگر اب صرف ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے پتا چل رہا تھا کہ راجوال میں ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے۔

میں نے ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پوری رفتار سے راجوال کی طرف بڑھا۔ راستے میں مجھے دل دوز مناظر دیکھنے کو ملے۔ عورتیں اور بچے کھیتوں میں بھاگتے ہوئے محفوظ جگہوں کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ لوگ اپنے ڈور ڈنگر آگ کی لپیٹ سے بچا کر کھلی جگہ لے آئے تھے اور اب انہیں اندھا دھند ہانک کر آگے بڑھ رہے تھے۔ میں

نے دو چارپائیاں دیکھیں۔ انہیں حواس باختہ افراد نے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا اور پتا نہیں کس طرف دوڑے جا رہے تھے۔ چارپائیوں پر موجود افراد زخموں سے چور تھے۔ پتا نہیں وہ زندہ تھے یا دم توڑ چکے تھے۔ چارپائیوں سے ٹپکنے والا لہو، چارپائیاں اٹھانے والوں کے کپڑے داغ دار کر رہا تھا۔ ایک جلی ہوئی عورت پگڈنڈی پر پڑی تھی، اس کے گرد کئی عورتیں بین کر رہی تھیں۔ مجھے ایک نوجوان بھی نظر آیا۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی مگر وہ دو ننھے بچوں کو اٹھائے کھیتوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے گر جائے گا۔

میں نے یہ سارے مناظر دیکھے مگر رکا کہیں نہیں۔ میرا گھوڑا سرپٹ دوڑتا راجوال کے اندر داخل ہوا۔ راجوال کا دایاں حصہ آگ کی لپیٹ میں تھا اور اس کی حدت پوری آبادی کو متاثر کر رہی تھی۔ آگ کے قریب میں نے دو گھوڑوں کی لاشیں بھی دیکھیں۔ مزار اس آگ کی دوسری طرف کھلی جگہ پر واقع تھا۔ میں نے میلے کے بہت سے شامیانوں اور ایک آسمانی جھولے کو بھی آگ کی لپیٹ میں دیکھا۔

میں نے لگامیں موڑیں اور حویلی کی طرف بڑھا۔ مجھے گلیاں سنسان اور کھڑکیاں دروازے بند نظر آئے۔ تاہم حویلی کے گرد بہت سے مسلح افراد موجود تھے۔ ان میں مجھے نصراللہ، برکت اور شبیر کی صورتیں بھی دکھائی دیں۔ ان میں سے اکثر لوگ زخمی نظر آ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے پوری طرح پہچان پاتے اور میرے گرد جمع ہو جاتے، میں گھوڑا دوڑاتا ہوا حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے حویلی کے وسیع احاطے کو گھوڑے پر ہی پار کیا اور رہائشی حصے میں پہنچ گیا۔

یہاں بھی پہرا تھا۔ قریباً بیس پچیس افراد چوکس کھڑے تھے۔ تاہم ان کے چہرے بھی دھوئیں کے اندر دھواں نظر آ رہے تھے۔ حفاظت کی غرض سے رہائشی حصے کے دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا تھا۔

''کون؟'' حویلی کے عباس نامی جاں نثار نے میرے سامنے آتے ہوئے پوچھا۔

پھر مجھے پہچان کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ''خاور صاحب... آپ؟'' اس نے بے پناہ حیرت سے کہا اور اس کی رائفل کی نال جھک گئی۔

''دروازہ کھولو۔'' میرے لہجے میں تحکم تھا۔

عباس ایک لمحے کے لیے تذبذب میں نظر آیا مگر پھر فوراً ہی اس نے جیب سے چابی نکال کر زنان خانے کا بھاری بھرکم قفل کھول دیا۔ میں گھوڑے سے اتر کر اندر چلا گیا۔ ادھر سہمی ہوئی نوکرانیاں اور پڑوسی عورتیں دکھائی دیں۔ مجھے پہچان کر ان کی آنکھوں میں بھی ہیجانی کیفیت نظر آنے لگی تھی۔ میں برآمدے کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ میرے ہاتھ میں رائفل تھی اور کمر میں گولیوں والی بیلٹ۔ میرے اندر کی آگ میری آنکھوں کو جلا رہی تھی اور میری رگوں میں چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ ''بیگم بلقیس کہاں ہیں؟'' میں نے ایک عورت سے پوچھا۔

اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ میں نشست گاہ میں داخل ہوا۔ نشست گاہ میں بلقیس کے بڑے ماموں یعقوب موجود تھے۔ اس کے علاوہ بلقیس کے دو بھائی اور ایک کزن بھی تھے۔ بلقیس بھی ایک طرف صوفے پر بیٹھی تھی اور ایک کاغذ پر جلدی جلدی کچھ لکھ رہی تھی۔ (بلقیس، حادثے کے بعد لکھنا پڑھنا سیکھ چکی تھی)۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مجھے اچانک دیکھ کر وہ سب کھڑے ہو گئے۔

''خاور! تم کہاں تھے؟'' چودھری یعقوب نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''بس کہیں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''تمہیں پتا ہے، یہاں کیا ہو گیا ہے؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں اور نہ میں آپ لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں صرف بلقیس سے دو منٹ بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اس کی اجازت عنایت کریں گے؟'' میرے لہجے میں زہر گھلتا جا رہا تھا۔

چند لمحے کے لیے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ آخر بلقیس کا منجھلا بھائی چودھری جمشید بولا۔ ''تمہیں جو مشورہ کرنا ہے خاور... ہمارے سامنے ہی کرو۔ ہو سکتا ہے کہ ہم بھی کوئی اچھا مشورہ دے سکیں۔''

میں پھٹ پڑا۔ ''تم لوگ کوئی مشورہ دینے یا کچھ کرنے کے قابل ہوتے تو آج یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ تم لوگ صرف آپس میں جھگڑ سکتے ہو۔ ایک دوسرے کی جاگیریں چھین سکتے ہو اور اپنی عیاشیوں میں نوٹ لٹا سکتے ہو۔ اس جاگیر کے لیے اور اسے چلانے والوں کے لیے تم نے مصیبتیں کھڑی کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے۔ مجھے تمہارا مشورہ نہیں چاہیے۔ میں صرف بلقیس سے بات کرنا چاہتا ہوں اور اگر تم نہیں چاہتے تو میں چلا جاتا ہوں یہاں سے۔''

چودھری یعقوب نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں نہیں... ایسا کوئی بات نہیں۔ تم بات کرو۔ میں ان کو باہر لے جاتا ہوں۔''

بلقیس کے ایک جوشیلے چچا زاد نے کچھ کہنا چاہا مگر چودھری یعقوب نے اسے اشارے سے خاموش کر دیا اور ان چاروں پانچوں کو لے کر باہر چلا گیا۔

بلقیس نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں غم اور ہزیمت کے بوجھ سے سرخ تھیں۔ مجھے صاف محسوس ہوا کہ وہ اس بات پر ناخوش نہیں ہے کہ میں نے اس کے ماموں اور بھائیوں کو باہر نکالا ہے۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ لرزتی آواز میں بولی۔ ''تم کہاں تھے خاور! دیکھو یہاں ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ شاید موکھل یہ چاہ رہے ہیں کہ اب ہم سانس لینا بھی چھوڑ دیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے بغیر کسی وجہ کے... بغیر کسی جھگڑے کے گاؤں پر ہلا بولا ہے۔ کوئی آدھے گھنٹے تک اندھا دھند گولیاں چلتی رہی ہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ کتنے مرے ہیں اور کتنے زخمی ہوئے ہیں۔'' اس کا گلا رندھ گیا اور آنسو گرنے لگے۔

''پولیس نے کچھ نہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''تم جانتے ہو خاور! میاں وارث اور اس کا ڈی ایس پی موکھلوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ وہ انہیں پورا پورا موقع دے رہے ہیں۔ میاں وارث تو ویسے ہی چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ ڈی ایس پی کا پتا نہیں کہ وہ کس جگہ پر ہے۔''

''راجوال تھانے کی پولیس کہاں مر گئی ہے؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں۔ ابھی نصراللہ بتا رہا تھا، بس چودہ پندرہ سپاہی آئے تھے۔ انہوں نے موکھلوں کو روکنے کے لیے دکھاوے کی ہوائی فائرنگ بھی کی مگر پھر وہ تتر بتر ہو گئے۔ اب کہیں کوئی بھی پولیس والا نظر نہیں آ رہا۔''

''انہوں نے نظر آنا بھی نہیں ہے بلقیس۔ اگر کچھ کرنا ہے تو ہمیں خود ہی کرنا ہے۔''

''اب کرنے کو رہ کیا گیا ہے خاور! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں حویلی میں گھس آئیں گے۔ یہاں بھی لوٹ مار کریں گے۔ عورتوں کو بے عزت کریں گے۔''

''ان کی یہ ہمت نہیں ہے بلقیس!'' میری آواز میں گرج تھی۔ ''میرے ہوتے ہوئے وہ آنکھ اٹھا کر بھی ادھر نہیں دیکھ سکتے۔ وہ میری لاش گرا کر ہی حویلی میں آ سکتے ہیں، اس کے بغیر نہیں۔''

''لیکن میں تمہاری لاش دیکھنا نہیں چاہتی۔ بالکل نہیں چاہتی۔'' وہ سسکی۔ ایک آنسو ناک کے کونے میں اٹک گیا۔ خدا کے لیے خاور... خدا کے لیے، میری بات مان لینا، انکار نہ کرنا۔ تم بے بے جی اور عارفہ کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ مجھے ان کی طرف سے بہت ڈر ہے۔ مجھے پتا ہے، اندر سے یہ موکھل اور لیلا آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ موکھلوں میں آصف جاہ کے بندے بھی ہوں۔ آصف جاہ کے کارندے ہر صورت تم تک اور تمہارے گھر والوں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی بڑی مشکل سے انہیں بچایا ہے۔ تم ان کو لے کر چلے جاؤ خاور! دیکھو... میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔''

میں نے بڑے سکون سے کہا۔ ''مجھے پتا تھا کہ تم یہی کہو گی بلقیس! لیکن یہ ہو نہیں سکتا۔ اب ہمارا جینا مرنا ساتھ ہے اور ساتھ ہی رہے گا۔ اب جو بھی ہوتا ہے، ہم سب کے ساتھ ہونا ہے۔''

آگ کی تپش بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ صبح نو دس بجے کا وقت تھا لیکن گاڑھے سیاہ دھوئیں کی وجہ سے شام محسوس ہو رہی تھی۔ ''بے بے جی اور عارفہ کہاں ہیں؟'' میں نے بلقیس سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، ایک طرف سے عارفہ نمودار ہوئی۔ اس کی گود میں اس کا بچہ تھا۔ وہ بچے سمیت مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے جسم کا حصہ بن گئی۔ پھر والدہ نمودار ہوئیں اور انہوں نے بھی روتے ہوئے مجھے گلے سے لگا لیا۔ ''میرا پتر! تو کہاں چلا گیا تھا؟ کیوں چھوڑ گیا تھا ہمیں اس طرح؟ دیکھ یہاں ویریوں نے ہمارے لیے جینا مشکل کر دیا ہے۔ یہ کڑی بلقیس نہ ہوتی تو شاید اب تک ہم بھی دوسروں کی طرح قبر میں پہنچ گئے ہوتے۔'' بے بے جی نے بلقیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، دھماکے کی گونج دار آواز آئی۔ پتا چلا کہ گاؤں کے جلتے ہوئے اسکول کی چھت گر گئی ہے۔

میں نے کھڑکی میں سے دیکھا، زنان خانے کے بہت سے محافظ دروازے کے سامنے جمع تھے۔ ان میں نصراللہ بھی تھا۔ یہ سب لوگ اب یہاں میری موجودگی سے آگاہ ہو چکے تھے اور مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب تھے مگر وہ تب ہی مل سکتے تھے جب میں زنان خانے سے باہر آتا۔

میں نے ایک ملازمہ سے کہہ کر صرف نصراللہ کو اندر بلایا۔ نصراللہ کچھ دن پہلے بھی زخمی ہوا تھا۔ اب پھر اس کے سر پر تازہ زخم دکھائی دے رہا تھا۔ تاہم ہمیشہ کی طرح اس کا حوصلہ جوان تھا۔ وہ میرے گلے سے لگا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''نصراللہ! باہر کی کیا

صورتِ حال ہے؟''

''صورتِ حال ٹھیک نہیں ہے جی۔ موکھلوں نے مزار شریف پر قبضہ جما لیا ہے۔ راجوال کے لوگوں کو مار کر وہاں سے بھگا دیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ انہوں نے کئی جگہ آگ بھی لگائی ہے۔ ان سب نے شرابیں پی رکھی ہیں اور بھنگڑے ڈال رہے ہیں۔ ابھی تو وہ ایک جگہ رکے ہوئے ہیں مگر زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔ وہ ایک بار تو حویلی تک ضرور آئیں گے۔''

''تمہارے پاس کتنے بندے ہیں؟''

نصراللہ کا چہرہ بجھ گیا۔ ''اس وقت تو بس جتنے بھی ہیں، آپ کو نظر آ رہے ہیں۔ باقی سب تتر بتر ہو گئے ہیں۔ چالیس پچاس کے قریب تو زخمی ہوئے ہوں گے۔ کم از کم آٹھ دس لاشیں بھی گر چکی ہیں۔ ایک پولیس والا بھی مرا ہے۔''

''پولیس والا... اسے کس نے مارا ہے؟''

''پتا نہیں جی۔ پر مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے کسی کی گولی اسے نہیں لگی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بھی موکھلوں اور میاں وارث کا کوئی ڈراما ہے۔ ایک پولیس والے کی جان لے کر یہ سارا ملبہ ہمارے اوپر ڈالنے کی کوشش کریں گے۔''

میں نے باہر نظر دوڑائی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ نصراللہ کے ساتھ فی الوقت تیس چالیس سے زیادہ بندے نہیں ہیں اور جو ہیں وہ بھی حوصلہ چھوڑے بیٹھے ہیں۔ ان میں نصراللہ سمیت بہت سے زخمی بھی تھے۔

اسی دوران میں حامد بھی ہانپتا کانپتا ہوا پہنچ گیا۔ بلقیس اسے دیکھ کر مزید پریشان ہوئی۔ غالباً اسے یہ تسلی تھی کہ اس مشکل ترین وقت میں حامد راجوال میں نہیں ہے۔ اس نے حامد کو دانت کی دوا کے لیے ڈسکے روانہ کیا ہوا تھا۔ اب وہ اچانک واپس آ گیا تھا اور موجودہ خطرات میں شامل ہو گیا تھا۔

میں نے نصراللہ سے رونق علی کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولا۔ ''وہ نہیں کہیں ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر لاتا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی وہ باہر نکل گیا۔

میں نے کہا۔ ''بلقیس! ایک بات تو طے ہے کہ ہم راجوال کے مزار کو ان بدبختوں کے حوالے نہیں کریں گے اور نہ ہی پیچھے ہٹیں گے۔ اب میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور دو موتی پھر اس کی آنکھوں سے جھڑ گئے۔ ''نہیں خاور! یہ دلیری نہیں بے وقوفی ہوگی۔ اگر یہ لوگ حویلی کی طرف نہیں آتے تو پھر ہمیں بھی ابھی خاموش رہنا چاہیے۔ دیکھنا چاہیے کہ بات کس طرف جاتی ہے۔''

''یہ تمہاری بھول ہے بلقیس! میں ان کتوں کو بہت اچھی طرح جان چکا ہوں۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ یہ مزار لینے کے بعد آرام سے بیٹھ جائیں گے تو ہم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔ یہ حویلی کی طرف ضرور آئیں گے۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ ان کے سر پر خون سوار ہے۔ یہ آج بہت کچھ کریں گے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا خاور۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

عارفہ نے بھی بلقیس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''بھاجی! اس وقت حویلی سے باہر نکلنا بالکل ٹھیک نہیں۔ آپا بلقیس ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم کو انتظار کرنا چاہیے کہ گھمن وال اور شام پور سے لوگ یہاں پہنچ جائیں یا پھر پولیس ہی کچھ کرے۔''

''تم چپ رہو۔ کوئی کچھ نہیں کرے گا۔ پولیس کو تو بھول جاؤ۔ گھمن وال اور شام پور سے بھی کوئی تب ہی آگے بڑھے گا، جب ہم کچھ کرنے کے قابل ہوں گے۔ ہارنے اور بھاگنے والے کا ساتھ کوئی نہیں دیتا۔''

''پر بھاجی! آپ...''

''تم چپ رہو عارفہ! تمہیں کچھ پتا نہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ پھر میں نے بلقیس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''سنا ہے کہ رونق علی نے چودھری عزیز والی کیسٹ پنچایت میں سنائی ہے اور دوسرے لوگوں میں بھی؟''

''ہاں، وہ کیسٹ تو تقریباً سب نے سن لی ہے۔ کوئی دو گھنٹے پہلے جب موکھلوں نے ایک دم ہلا بولا، اس وقت بھی میلے میں لاؤڈ اسپیکر پر یہی کیسٹ چل رہی تھی اور بہت سے لوگ اکٹھے ہو کر سن رہے تھے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میری بے گناہی والی بات لوگوں تک پہنچ گئی ہے۔''

''کم از کم راجوال کے لوگوں تک تو پہنچ ہی گئی ہے۔ ان کے سامنے بالکل چانن ہو گیا ہے۔ جب کچھ دیر پہلے یہ کیسٹ چل رہی تھی، بہت سے لوگ تمہارے حق میں نعرے بھی لگا رہے تھے۔''

میں نے گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے بلقیس! اگر میرے لوگ میرے بارے میں دوسری طرح سوچنے لگے ہیں تو پھر مجھے کوئی پروا نہیں۔ مجھے پورا بھروسا ہے کہ وہ میرے لیے باہر نکلیں گے... وہ ضرور نکلیں گے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب میں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی مجھے جانے دو۔''

''کہاں؟'' تین آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ ان میں بے بے جی اور عارفہ کی آوازیں بھی تھیں۔

''میں موکھلوں سے بات کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں پتر! میں نہیں جانے دوں گی۔'' بے بے جی نے مجھے بانہوں میں لے کر میرا راستہ روک لیا۔ عارفہ بھی میرے سامنے آ گئی۔

''نہیں بے بے جی... میں نہ گیا تو پھر بہت کچھ ختم ہو جائے گا۔ مجھے جانا ہے۔'' میرے اندر بھڑکتی ہوئی نیلی آگ روشن تر ہو رہی تھی۔

بے بے جی چلائیں۔ ''بلقیس! یہ تمہاری بات مانتا ہے۔ تم روکو اسے۔''

بلقیس روتے ہوئے بولی۔ ''نہیں خاور! وہ مار دیں گے تمہیں۔ تم نہیں جا سکتے ہو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے آوازیں دیں۔ ''نصراللہ... نصراللہ... برکت!''

مگر میں کسی کے آنے سے پہلے ہی خود کو چھڑا چکا تھا۔ میں انہیں روتا چلاتا چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے کو تیزی کے ساتھ باہر سے بند کر دیا۔ وہ دروازہ کوٹنے لگیں۔

بلقیس مسلسل محافظوں کو آوازیں دے رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ محافظ اس وقت بلقیس سے بھی زیادہ میری آواز کو اہمیت دیں گے۔ وہ سب جانتے تھے... یہ میرا وقت ہے۔ اس وقت جو بھی کرنا ہے، مجھے کرنا ہے۔ اب یہاں جو کچھ بھی اچھا یا برا ہونا تھا، اس کا دارومدار مجھ پر تھا۔

میں بگولے کی طرح باہر نکلا۔ بھری ہوئی رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میرے تاثرات دیکھ کر نصراللہ اور دیگر محافظ چونک گئے۔ ''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' نصراللہ نے پوچھا۔

''مزار پر۔''

نصراللہ کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ پھر وہ ایک دم سنبھل کر بولا۔ ''اگر آپ نے جانا ہی ہے تو پھر آپ اکیلے نہیں جائیں گے۔ ہم بھی ساتھ چلیں گے۔''

''نہیں، ابھی کسی کی ضرورت نہیں۔'' میں دہاڑا۔ ''ابھی مجھے اکیلا جانے دو۔ جب ضرورت ہوگی۔ تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔''

نصراللہ اور دیگر محافظوں کو سکتہ زدہ چھوڑ کر میں حویلی کے بڑے احاطے میں پہنچ گیا۔ میرے عقب میں ابھی تک بے بے جی، عارفہ اور بلقیس کی چلاتی ہوئی آوازیں آ رہی تھیں۔ جلد ہی میں حویلی کے بڑے دروازے سے باہر تھا۔

میرے سامنے دھوئیں سے آلودہ سنسان گلیاں تھیں۔ کھڑکیاں دروازے بند تھے... جیسے کسی دیوزاد کی دہشت ان کوچوں کی رونق چاٹ گئی ہو۔ میں راجوال کے چوراہے میں پہنچ گیا۔ مزار گاؤں سے باہر تھا مگر موکھلوں کے گھوڑے چوراہے کے آس پاس تک دندنا رہے تھے۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا۔ میں براہِ راست موکھل پاشا سے ٹکرانا چاہتا تھا۔ ایک کے مقابلے میں ایک۔ اگر کسی طرح ایسا ہو جاتا تو میرا راستہ آسان ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں موکھل پاشا کو زیر کر لوں گا اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ پاشا کے ساتھیوں کو اس کی ہار کسی طور قبول نہیں ہوگی۔ وہ پاشا کو گرتے دیکھ کر بیچ میں کود پڑیں گے اور اگر وہ بیچ میں کود پڑتے تو پھر بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھی میری مدد کو آگے بڑھ سکتے تھے اور گاؤں کے لوگ بھی اشتعال میں آ سکتے تھے۔ اگر گاؤں کے عام لوگ ایک بار نکل پڑتے تو پھر موکھلوں کے لیے پاؤں جمائے رکھنا ممکن نہیں تھا۔

میں دیوانہ وار آگے بڑھتا رہا... لیکن اگلے تین چار منٹ میں جو کچھ ہوا، وہ میری توقع اور پلاننگ کے بالکل خلاف تھا۔ ابھی میں مزار سے کافی دور تھا کہ ایک دم دائیں طرف سے دو افراد نمودار ہوئے۔ یہ دونوں موکھل کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ ایک موکھل نے بھڑک مار کر میرے رائفل والے ہاتھ پر کلہاڑی کا وار کیا۔ شاید مجھے سیکنڈ کے دسویں حصے کی تاخیر بھی ہوتی تو میرا ہاتھ رائفل سمیت کٹ کر میرے جسم سے جدا ہو جاتا۔ کلہاڑی کا بلیڈ میری کلائی کو چھوتا ہوا گزرا۔ میں نے اپنے سر کی بھرپور ضرب کلہاڑی بردار کے چہرے پر لگائی، وہ ڈکراتا ہوا ایک فروٹ والی ریڑھی پر جا گرا۔

دوسرے کلہاڑی بردار کی کلہاڑی اٹھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ شخص دو تین قدم اٹھاتا اور اس کی کلہاڑی میرے سر کو نشانہ بناتی، میں نے اس پر فائر کیا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی اور وہ کلہاڑی سمیت گر گیا۔ مگر یہی وقت تھا جب سائیڈ کے شامیانے سے ایک شرابی موکھل طوفان کی طرح آیا اور میری رائفل پر جا پڑا۔ میں نے رائفل چھڑانا چاہی لیکن وہ جونک کی طرح چمٹ گیا تھا۔ یکایک دو تین افراد مزید مجھ سے لپٹ گئے۔ شاید وہ مجھے گرا لیتے، تاہم میرے جسم میں بھڑکتی ہوئی آگ نے میرے اندر ایسی توانائی بھر دی تھی کہ میری قوتِ برداشت کئی گنا ہو گئی تھی۔ اس توانائی اور برداشت نے

www.pkdigest.com

مجھے گرنے نہیں دیا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا رکھا۔ رائفل تو میرے ہاتھ سے نکل گئی لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا اور ان سے بھڑ گیا۔ اگلے ایک دو منٹ میں، اس دھواں دھواں گلی میں، ان جلتے ہوئے شامیانوں کے درمیان اور اس لہریں مارتی سنسنی میں، میرے اور حملہ آوروں کے درمیان ایک زبردست لڑائی ہوئی۔

وہ لوگ جانتے تھے کہ مجھے زیر کرنا آسان نہیں۔ اس لیے وہ اپنی تمام تر طاقت استعمال کر رہے تھے۔ میرے اردگرد گالیوں اور للکاروں کی بوچھاڑ تھی۔ پھر میں نے کچھ فاصلے سے ایک اور موکھل کی للکارتی ہوئی آواز سنی۔ وہ حملہ آوروں کو حوصلہ دیتے ہوئے پکارا۔ ”شاوا جوانو... آج جانے نہ پائے۔ یہیں پر قیمہ کردو اس کتے کا۔“

اس کے عقب سے ایک اور آواز آئی۔ ”گولی نہیں چلائی۔ زندہ پکڑو اس کو۔“

میرے گرد حملہ آور بڑھتے جا رہے تھے لیکن میں ہار ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ اس اندھا دھند جدوجہد میں، میں نے موکھل پاشا کو بھی چند تسلی بخش ضربیں لگائیں... میں زخمی ہو گیا تھا مگر پوری طاقت سے مزاحمت کر رہا تھا۔ ایک لاٹھی کے زوردار وار سے بچ کر میں نیچے جھکا تو چھوٹے دستے کی ایک کلہاڑی میرے ہاتھ میں آگئی۔ ہاتھ میں کلہاڑی آنے کے بعد میری مزاحمت کی شدت کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی۔ اپنے کندھے اور بازو سے بہنے والے خون کی پروا کیے بغیر میں اندھا دھند کلہاڑی چلاتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ میں گر گیا تو اس کے ساتھ ہی راجوال کے ہر شخص کی ہمت بھی گر جائے گی۔ وہ مجھ پر بے تحاشا بھروسا کرتے تھے۔ شاید میری صلاحیتوں سے بھی بڑھ کر بھروسا کرتے تھے۔ میں جانتا تھا جاگیر کے ہر گھر میں میری دلیری اور بے خوفی کی باتیں کی جاتی ہیں۔ مجھے ایک انوکھے شخص کے روپ میں دیکھا جاتا ہے میرے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ میں جو کام بھی کرنا چاہوں وہ کر گزرتا ہوں۔ ان گنت نوجوانوں نے مجھے ایک آئیڈیل کی طرح اپنے دل میں جگہ دے رکھی ہے۔

تو پھر آج کیا ہوگا؟

کیا آج وہ میری بے بسی دیکھ کر خون کے آنسو بہائیں گے؟

کیا آج میں ان کے سامنے بے دست و پا ہو کر اپنے ہی لہو میں ڈوب جاؤں گا؟

کیا ان کا شیر شاہ آج ہزیمت کی مٹی میں دفن ہو جائے گا؟

... میں لڑ رہا تھا اور یہ خیالات انگاروں کی طرح میرے ذہن میں دہک رہے تھے... کسی شخص کے اعتماد کا بوجھ اٹھانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ یہ بوجھ کندھے توڑ دیتا ہے اور جسم کو پیس ڈالتا ہے... اور پھر جب اعتماد کرنے والے ایک دو نہ ہوں، سیکڑوں ہزاروں ہوں تو قیامت گزر جاتی ہے۔

میں دیوانہ وار لڑ رہا تھا لیکن میرا گھیرا ٹوٹنے والا نہیں تھا۔ ہر سانس کے ساتھ سینے میں دھواں اتر رہا تھا اور ذہن میں دھند بھر رہی تھی اور پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ راجوال کی سنسان گلیوں میں... بند دروازوں اور کھڑکیوں سے آگے، پُرہول سناٹے کو توڑتا ہوا ایک شخص برآمد ہوا۔ یہ کوئی جوان رعنا نہیں تھا... نہ ہی کوئی کڑیل محافظ تھا۔ یہ ایک لڑکھڑاتا ہوا، خستہ حال بوڑھا تھا۔ یہ چاچا عسکری تھا جو مدت سے بستر علالت پر پڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ چاچے عسکری کے ہاتھوں میں کلہاڑی ہے اور سر پر سرخ رنگ کی وہی بوسیدہ پگڑی ہے جو وہ کبھی سالار کی حیثیت سے پہنتا تھا۔ وہ اپنی کلہاڑی سے گلی کے بند دروازوں کو کوٹتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کی دور افتادہ آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ اپنی بوڑھی آواز میں پکار رہا تھا۔ ”اوئے باہر نکلو... اوئے کہاں مر گئے ہو سب؟ اوئے دیکھو وہ مار رہے ہیں اس کو۔ دروازے کھولو... باہر نکلو۔ اوئے باہر نکلو۔“

پھر لڑتے لڑتے میں نے دیکھا کہ ایک گھڑسوار موکھل تیزی سے چاچے عسکری پر حملہ آور ہوا۔ چاچے نے جھک کر اس کا وار بچایا اور اپنی کلہاڑی سے گھوڑے کی ٹانگ کو زخمی کیا۔ گھوڑا اور گھڑسوار دونوں گرے اور دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ یہ بوڑھے شیر کی شاید آخری جھپٹ تھی۔ اس کے بعد میں چاچے عسکری کو نہیں دیکھ سکا۔ ہاں، اپنے مدمقابلوں سے لڑتے ہوئے مجھے یہ اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ چاچا عسکری بھی مجھ سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر موجود ہے اور موکھلوں سے لڑ رہا ہے۔ یہ سب واقعات تین چار منٹ کے اندر اندر وقوع پذیر ہوئے۔

اسی دوران میں مجھے بائیں طرف ہلچل محسوس ہوئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ نصراللہ نے اپنے بیس تیس ساتھیوں سمیت ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر مزار کی طرف ہلا بول دیا ہے۔ فائرنگ کی آواز سے مزار کے آس پاس کا علاقہ گونجنے لگا۔ لیکن میں جس بلے کا انتظار کر رہا تھا، وہ یہ نہیں تھا۔ وہ کوئی اور تھا۔ جب ایک عام شخص کے سینے میں چنگاری بھڑکتی ہے۔ جب وہ کسی مقصد، کسی نظریے یا منزل کی طرف اٹھ کھڑا ہوتا

ہے۔ اور یہ کوئی ایک چنگاری نہیں ہوتی... یہ ہزاروں چنگاریاں ہوتی ہیں جو ایک ہی انداز میں، ایک ہی حدت کے ساتھ ایک ہی جیسے ان گنت سینوں میں بھڑکتی ہیں... اور یہ چنگاریاں نہیں ہوتیں، درحقیقت یہ آگ کا ایک طوفان ہوتا ہے جو اپنی راہ میں آنے والی ہر زندہ و بے جان شے کو خاکستر کر دیتا ہے۔

اور مجھے اسی آگ کا انتظار تھا۔

... اور پھر میں نے دھواں دھواں گلی میں دو تین دروازے کھلتے دیکھے۔ چند متحرک سائے نظر آئے... پھر ان سایوں میں کچھ اور سائے شریک ہوئے... پھر ان میں کچھ اور... میرے بازوؤں میں نئی توانائی بھرنے لگی۔ جیسے کسی نے بجھتے ہوئے دیے میں مزید تیل ڈال دیا ہو۔ میرے لوگ آ رہے تھے... میری طرف بڑھ رہے تھے۔ زخموں سے چور ہونے کے باوجود میں نے حتی الامکان مزاحمت جاری رکھی۔ موکھلوں نے مجھے دبوچ لیا تھا اور اب مجھے گھسیٹتے اور کھینچتے ہوئے مزار کی طرف لے جا رہے تھے۔

میرے ذہن میں دھند بھرتی جا رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ میری ہمت جواب دے جائے گی۔ میں خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ پھر میں نے بہت سی للکارتی ہوئی آوازیں سنیں۔ یہ آوازیں بڑی تیزی سے قریب آ رہی تھیں۔ یہ راجوال کے عام لوگوں کی آوازیں تھیں... یہ میرے لوگوں کی آوازیں تھیں۔ میرا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ میں نے چند شدید جھٹکوں کے ساتھ خود کو آہنی ہاتھوں سے آزاد کرایا اور اس کلہاڑی کی طرف جست لگائی جو کچھ دیر پہلے میرے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔

ایک کاشت کار کی کڑکتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”کھڑے ہو جاؤ سالار جی! ہم آگئے ہیں۔“

... ہاں، یہی وہ چنگاری اور یہی وہ آگ تھی۔ راجوال کے لوگ نکلے تو پھر نکلتے چلے گئے۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی، وہ بھڑکیں مارتے اور لاٹھیاں، کلہاڑیاں لہراتے مزار کی طرف بڑھنے لگے... لڑائی میں ایک دم شدت آگئی۔ حویلی کے وہ محافظ جو زخمی یا بددل ہو کر تتر بتر ہو گئے تھے، بدلی ہوئی صورت حال دیکھ کر پلٹ پڑے۔ ہر طرف گرد نظر آنے لگی۔ قریباً چار پانچ منٹ تک گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ یہ جگہ مزار سے تقریباً ایک سو گز دور تھی۔ موکھل خم ٹھونک کر میدان میں آگئے۔ لیکن اب ان کا مقابلہ صرف حویلی کے محافظوں سے نہیں تھا... ان کے سامنے راجوال کے لوگ بھی تھے اور ان کی تعداد میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ خلقِ خدا تھی اور خلقِ خدا کا راستہ کوئی کب روک سکا ہے؟

کہیں دور سے موکھل پاشا کی للکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”گولی چلاؤ... بھون ڈالو حرامزادوں کو۔“

اس کے ساتھ ہی مزار کی طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ چند لمحوں کے لیے لگا کہ لوگ منتشر ہو رہے ہیں۔ وہ بغلی گلیوں کی طرف سمٹ گئے لیکن یہ صورت حال آٹھ دس سیکنڈ سے زیادہ نہیں رہی۔ وہ پلٹے اور ایک بار پھر ریلے کی شکل اختیار کر گئے۔ پچھلے چند ہفتوں میں موکھلوں نے ان پر بہت سے ستم توڑے تھے۔ ان کے مویشی ہانک کر لے گئے تھے، ان کو گلیوں میں گھسیٹ گھسیٹ کر رسوا کیا تھا اور آج ان کی عورتوں پر بھی ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اب یہ سارا ستم طیش بن کر رگوں میں دوڑ گیا تھا اور آگ بن کر آنکھوں سے نکل رہا تھا۔ ظلم جہاں بھی ہو، اس کا ردِعمل ایسا ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔

بہت جلد موکھلوں کی طرف سے فائرنگ بند ہو گئی۔ میں نے اور نصراللہ نے موکھلوں کو مزار سے پیچھے ہٹتے اور پھر بھاگتے دیکھا۔ وہ مکمل طور پر پسپا ہو رہے تھے لیکن بہت سے موکھل ابھی تک مزار کے پچھلے احاطے میں موجود تھے اور انہیں بھاگنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ لوگوں کے سیلابی ریلے کو خود سے دور رکھنے کے لیے بار بار گولی چلا رہے تھے... تاہم اب ان کی فائرنگ جارحانہ نہیں دفاعی تھی... یقیناً وہ بھی جانتے تھے کہ وہ بہت سارے لوگوں کو مار کر بھی زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ راجوال کے لوگوں نے اندھا دھند باہر نکل کر ان کے سارے اندازے غلط ثابت کر دیے تھے۔

”وہ دیکھو جی... وہ بھاگ رہا ہے موکھل پاشا۔“ نصراللہ انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے چلایا۔

میں نے بھی سیاہی مائل دھوئیں کے اندر سے دیکھ لیا۔ وہ پاشا ہی تھا۔ تین چار گھڑسوار اس کے ساتھ تھے۔ وہ کورکے کی طرف جا رہا تھا۔ یہ شخص معصوم صورت والی ثمینہ کا قاتل تھا۔ شہوار کے قتل میں بھی اس کے مشورے شامل رہے تھے۔ یہ چھوڑے جانے کے قابل نہیں تھا۔ اس کی کم از کم سزا پھانسی کا پھندا ہونی چاہیے تھی۔ میں برکت، شبیر اور دیگر تین چار ساتھیوں کے ہمراہ تیزی سے پاشا کے پیچھے گیا۔ کھیتوں کے درمیان کچے پھسلواں راستے پر ہم نے برق رفتاری سے پاشا اور اس کے ساتھیوں کا پیچھا کیا۔ انہوں نے بھی ہمیں تعاقب میں دیکھ لیا تھا۔ وہ شارٹ کٹ استعمال کرنے لگے۔ ہم نے بھی ان کے پیچھے کھیتوں میں گھوڑے ڈال دیے۔ کچھ

www.pkdigest.com

دیر پہلے تک جاری رہنے والی بارش کے سبب زمین اس گھڑ دوڑ کے لیے مناسب نہیں تھی۔ تاہم پنجابی کی یہ مثال ہم پر بالکل صادق آرہی تھی کہ بھاگنے والوں کے لیے واہن (ہل چلے کھیت) ایک جیسے ہوتے ہیں۔

اگر ہماری رفتار کم تھی تو پاشا اور اس کے ساتھیوں کی بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔ ہم آگے پیچھے بھاگتے راجوال سے قریباً چار میل آگے آگئے۔ ایک جگہ پاشا کا ایک ساتھی گھوڑا پھسلنے سے گر گیا۔ میرے دو ساتھیوں نے گھوڑے روک کر اسے چھاپ لیا۔ ہم نے پاشا کا تعاقب جاری رکھا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ پاشے کا رخ اپنے گاؤں گورکیکے کی طرف نہیں ہے۔ تو پھر وہ کہاں جا رہا تھا؟

اسی دوران میں شبیر نے بھی گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے یہی بات کہی۔ وہ بولا۔ ”چودھری خاور! مجھے لگتا ہے کہ موکھل پاشا کہیں اور جا رہا ہے۔“

”کیا اندازہ ہے؟“

”پتا نہیں جی۔“

اچانک مجھے اپنے جسم کا سارا خون سر کو چڑھتا محسوس ہوا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جوشِ تعاقب میں ہم ایک بڑی غلطی کر چکے ہیں۔ جونہی ہم چارے کے ایک کھیت میں سے باہر نکلے، مجھے اپنے عین سامنے دو تین گاڑیاں نظر آئیں۔ ان میں میرے سسر آصف جاہ کی جیپ صاف پہچانی جا رہی تھی۔ ان جیپوں کے اردگرد گھوڑے اور کارندے موجود تھے۔ پس منظر میں سلوکی ہاؤنڈ کتوں کی خونی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہی آٹھ عدد مہلک جانور جن کے پنجے اور جبڑے کسی بھی ذی روح کو سیکنڈوں میں ادھیڑ سکتے تھے۔

پاشا اور اس کے ساتھی تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ان گاڑیوں کے پیچھے اوجھل ہوگئے۔ ہم نے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں۔ ہم تذبذب کے لمحے تھے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہاں رکیں یا تیزی سے واپس ہو جائیں۔ اسی اثنا میں ہمارے سامنے آصف جاہ کے مسلح کارندے نمودار ہوگئے۔ ان کی تعداد درجنوں میں تھی۔ جب تک ہم پوری طرح سنبھل سکتے، کئی رائفلیں ہماری طرف اٹھ چکی تھیں۔

یہ ایک بڑا ڈرامائی موڑ آیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ لبرٹ آصف جاہ بھی اس کارروائی سے آگاہ تھا جو آج موکھلوں نے راجوال کے میلے میں کی تھی۔ عین ممکن تھا کہ آصف جاہ کے کچھ لوگ بھی اس کارروائی میں شریک ہوں۔ خود آصف جاہ اور اس کے ساتھی یہاں کسی زمیندار کے ڈیرے پر موجود تھے۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے آصف جاہ کے کارندوں نے صورتِ حال کو پوری طرح سمجھ لیا تھا۔ انہوں نے حرکت کی اور ہمارے قریب آگئے۔ اگر ہم اس موقع پر پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کرتے تو وہ یقیناً ہم پر فائر کھول دیتے اور ڈھیر کر دیتے۔ پھر مجھے آصف جاہ کی صورت نظر آئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ شراب کی حدت سے تمتما رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح بیڑی اس کی انگلیوں میں دبی تھی۔ اس کے پیچھے دو مسلح محافظ تھے۔ وہ بڑے اعتماد سے چلتا ہوا میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”تو آخر تم دوبارہ نظر آہی گئے؟“ اس نے عجیب لہجے میں کہا۔

”آصف جاہ! پاشا ہمارا مجرم ہے۔ اس کو ہمارے حوالے کر دو۔“ میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اٹل لہجے میں کہا۔ رائفل پر میری گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ آج میں ہر حد تک جانے کے لیے تیار تھا۔

آصف جاہ نے ایک بار پھر سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ”تم پاشے کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔“

”کیوں نہیں لگا سکتا؟“

”بس نہیں لگا سکتے۔“ وہ بولا۔

تب میں نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ لبرٹ آصف جاہ کے دو تین صحت مند کارندوں نے پاشے کو بری طرح دبوچا ہوا تھا اور اسے کھینچتے ہوئے آصف جاہ کی طرف لا رہے تھے۔ پاشا مزاحمت کر رہا تھا اور بلند آواز میں کچھ بول رہا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔

کارندوں نے پاشے کو آصف جاہ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے آصف جاہ؟“ پاشا چلایا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔

اس کے بعد کا منظر بھی حیران کن تھا۔ آصف جاہ کا بھرپور تھپڑ پاشے کے گال پر پڑا اور وہ کارندوں کی گرفت میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔

پاشے کے ساتھ یہاں پہنچنے والے گھڑ سواروں میں سے دو افراد نے اس بدلی ہوئی صورتِ حال میں ایک دم بھاگنے کی کوشش کی، تاہم آصف جاہ کے کارندوں نے ان کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ انہیں بھی پکڑ لیا گیا اور رائفل کے کندوں سے مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج آصف جاہ کی آنکھوں کے سامنے سے بھی پردہ ہٹ گیا ہے۔ شاید میری توقع کے مطابق، راجوال میں سنائی جانے والی کیسٹ کی گونج آصف جاہ کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔

آصف جاہ کی آواز نے مجھے چونکایا۔ وہ پاشے کا گریبان تھامے ہوئے بولا۔ ”تم اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے ہو شاہ خاور! اسے میں ہاتھ لگاؤں گا... کیونکہ یہ میرا مجرم ہے۔ شہوار کو مارنے کے مشوروں میں یہ حرامزادہ بھی پوری طرح شامل تھا۔ میں سب جان گیا ہوں۔“

شہوار کا نام لیتے ہوئے آصف جاہ کے لہجے میں عجیب سا کرب سمٹ آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آواز میں ایک جنونی کیفیت در آئی تھی۔ اس کیفیت کا تعلق یقیناً اس بے پناہ وابستگی سے تھا جو وہ اپنی مرحومہ بیٹی سے رکھتا تھا۔ اس نے ابھی تک اپنی بیٹی کے بچپن کی چھوٹی چھوٹی اشیا کو سینے سے لگا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک غیر معمولی کردار تھا۔

آصف جاہ نے اشارہ کیا اور اس کے آٹھ دس کارندوں نے پلک جھپکتے میں پاشے کو زمین پر گرا کر رسی سے باندھ دیا۔ یہ بڑی اچانک اور سنسنی خیز صورتِ حال تھی۔ ”آصف جاہ! یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ تمہیں اس کا بہت برا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ تمہارے گاؤں میں لاشیں بچھ جائیں گی۔“ پاشا دہاڑا۔

”جو کچھ بھی ہوگا پاشے... لیکن تم اب کچھ نہیں دیکھ سکو گے۔“ آصف جاہ کی آواز میں قہر اور جنون تھا۔ ”تمہیں آج، ابھی اور اسی جگہ اپنے سارے کالے کرتوتوں کی سزا بھگتنا ہوگی۔“

”تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔ تمہیں پتا نہیں تم کیا کر رہے ہو۔ تمہارے بڑھاپے کی مٹی پلید ہو جائے گی آصف! موت کو ترسو گے۔“ پاشے نے پھر گرج کر کہا۔

آصف جاہ کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ وہ جیسے پتھر کا ہو چکا تھا۔ کوئی آواز، کوئی منظر اس کی حسیات پر اثر نہیں کرتا تھا۔ وہ بس اپنے سرخ انگارہ چہرے کے ساتھ بیڑی کے طویل کش لیتا جا رہا تھا۔

پاشے نے جب دھمکیوں کو بے اثر دیکھا تو ایک دم اپنا لہجہ نرم کر لیا... اس نے دوسرے انداز سے وار کرنے کی کوشش کی۔ وہ سمجھانے والے لہجے میں بولا۔ ”آصف جاہ! اگر تمہارے دماغ میں چودھری عزیز والی کیسٹ ہے تو تم دھوکے میں آ رہے ہو۔ وہ جعلی کیسٹ ہے۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ چودھری عزیز کی آواز نہیں ہے۔ وہ سارا ان نوسربازوں کا رچایا ہوا ڈراما ہے... وہ ڈراما ہے آصف جاہ۔“

پاشے کی اس بات کا جواب ایک بھرپور ٹھوکر کی صورت میں تھا۔ آصف جاہ کی یہ ٹھوکر پاشے کے چہرے پر لگی اور وہ خون اگلنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ٹھوڑی اور گردن لہولہان ہوگئی۔ یہی وقت تھا جب آصف جاہ کے چار پانچ محافظ سلوکی ہاؤنڈ کتوں کی زنجیریں تھامے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان مصری کتوں کی دمیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں اپنے اندر ”تاریک براعظم افریقا“ کی ساری پُراسراریت اور ہلاکت آفرینی سمیٹے ہوئے تھیں۔ یہ بڑی خوفناک آنکھیں تھیں۔ انہیں دیکھ کر جسم میں جھرجھری جاگتی تھی۔ یقیناً ان آنکھوں کو دیکھ کر موکھل پاشا کا پتا بھی پانی ہو گیا... مدھم دھوپ میں، میں نے دیکھا کہ پاشا کا رنگ بالکل ہلدی ہو گیا ہے۔ اس نے اپنی اذیت ناک موت کو بالکل اپنے سامنے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اضطراری طور پر اٹھنے اور بھاگنے کی کوشش کی مگر اس کے ہاتھ پاؤں رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ اور یہ رسی نہ بھی ہوتی تو بھی وہ پوری طرح کارندوں کے نرغے میں تھا۔ وہ بے بسی کی انتہا کو چھو گیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ ڈری ڈری آوازیں نکلیں۔ ہاں، یہی وہ بھوری سرد آنکھوں والا پاشا تھا جو بے رحمی اور سفاکی میں نام رکھتا تھا۔ اس نے ایک معمولی گناہ کی پاداش میں ایک پورے خاندان کو آتش بازی کے بارود سے اڑا دیا تھا۔ اس کے رائل بنگال ٹائیگر نے کئی بے گناہوں کے جسم ادھیڑے تھے اور طویل عرصے تک لاتعداد لوگوں کا خون خشک کیے رکھا تھا۔ شاداں اور ثمینہ جیسی کئی لڑکیاں اس کے پنجوں میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑائی تھیں اور رہائی کی بھیک مانگتی رہی تھیں... آج وہ خود موت کے پنجے میں تھا اور پھڑپھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زندگی کس کو پیاری نہیں ہوتی؟ پاشے جیسے سفاک لوگوں کو بھی پیاری ہوتی ہے۔

میں تیزی سے آگے بڑھا۔ ”نہیں آصف جاہ! آپ اس کے خون سے ہاتھ نہ رنگو۔ اسے قانون کے حوالے کرو۔ یہ پھانسی کے پھندے سے بچ نہیں سکے گا۔“

”تم پیچھے ہٹ جاؤ خاور۔“ آصف جاہ دہاڑا۔ ”تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا یا کرتا، آصف جاہ کا اشارہ پا کر اس کے کارندوں نے پاشے کو دھکیل کر چند قدم دور ایک چھوٹے سے گڑھے میں پھینک دیا۔ کتوں کے رکھوالوں نے منہ سے مخصوص آوازیں نکالیں اور کتوں کی زنجیریں کھول دیں۔ یہ سب کچھ پلک جھپکنے میں ہو گیا۔ خوں خوار کتے بجلی کی طرح گڑھے کی طرف لپکے۔ پاشے کی آخری آوازیں بڑی دردناک تھیں۔ آٹھ عدد کتوں نے ایک لحظے

www.pkdigest.com

میں پاشے کے جسم کو ڈھانپ لیا۔ اس کے بعد کا منظر دیکھنا میرے بس میں نہیں رہا۔ میں نے اپنا رخ پھیر لیا۔ شاید میری طرح اور کئی افراد نے بھی یہی کیا ہوگا۔ بس ہمارے کانوں تک ''مصروفِ کار'' کتوں کی غصیلی آوازیں ہی پہنچ رہی تھیں۔

لمبڑ آصف جاہ مستحکم قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے بوتل منہ سے لگا کر شراب کے چند بڑے گھونٹ لیے اور جنونی لہجے میں بولا۔ ''ابھی میرا بدلہ پورا نہیں ہوا ہے خاور... ابھی نہیں ہوا ہے۔'' اس کا گریبان شراب سے بھیگ رہا تھا۔

''اب کیا رہ گیا ہے؟''

''اب رہ گیا ہے چودھری عزیز اور اس کا گماشتہ جس نے شہوار کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا۔ اسے تڑپا تڑپا کر مارا۔''

''لیکن وہ دونوں تو قبر میں پہنچ چکے ہیں۔''

''گھبراتا کیوں ہے۔ انہیں قبر سے نکالوں گا اور ان کے ساتھ بھی یہی کچھ کروں گا جو اس بدبخت کے ساتھ کیا ہے۔''

''آصف جاہ! یہ بہت زیادہ ہے۔''

''تم مجھے زیادہ یا کم بتانے والے کون ہوتے ہو؟ تم تو خود مجرم ہو... ہاں، تم بھی مجرم ہو۔ تم اس کے شوہر تھے۔ وہ ہر طرح سے تمہاری ذمے داری تھی۔ میں نے اسے تمہارے حوالے کیا تھا۔ تم اس کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے۔ وہ اپنے بابل کے گھر سے دور ایک اَن جان چار دیواری میں ایک درندے کے ہاتھوں جان ہار گئی اور تم بے خبر پڑے رہے۔ کسی وقت تو جی میں آتا ہے کہ تمہیں بھی گولی مار دوں۔'' اس نے وحشت کے عالم میں رائفل میری طرف سیدھی کر لی۔ یہ روسی ساخت امپورٹڈ رائفل تھی۔

میں اپنی جگہ جما کھڑا رہا... اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آصف جاہ! اگر وہ تمہاری بیٹی تھی تو میری بیوی بھی تھی... مجھے بھی اس کی موت کا دکھ ہے... گہرا دکھ ہے۔''

وہ پھنکارا۔ ''یہ سکہ بند داماروں والی وہی رٹی رٹائی بات ہے جو داماد ایسے موقعوں پر کرتے ہیں۔ اگر تم اسے بیوی سمجھتے اور تمہاری ماں اسے بہو اور تمہاری بہن اسے بہن سمجھتی تو وہ اس طرح بے آسرا ہو کر اپنی زندگی نہ ہارتی۔''

''تو ٹھیک ہے۔ اگر تم واقعی مجھے قصوروار سمجھتے ہو تو پھر مار دو گولی۔ اگر شہوار کی روح اس طرح خوش ہو سکتی ہے تو اسے خوش کر لو۔''

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔ میرے دل میں سچائی تھی۔ شہوار کا شوہر بننے کے بعد میں نے اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی بہت سی تلخیاں بھی برداشت کی تھیں۔ میرا دل مطمئن تھا اور گواہی دے رہا تھا کہ بے حد جذباتی ہونے کے باوجود آصف جاہ اب مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا... اور اس نے نہیں پہنچایا۔ اس کی رائفل کئی سیکنڈ تک میری طرف اٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں شعلہ فشاں رہیں مگر اس نے فائر نہیں کیا۔

اس نے ہوا میں کئی گولیاں چلائیں اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ وہ گرجا۔ ''جاؤ... میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے وہ یاد آتی ہے۔ جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے۔ ابھی تمہیں کچھ نہیں کہہ رہا... پر چھوڑوں گا تمہیں بھی نہیں۔ نہیں چھوڑوں گا۔''

پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ تیزی سے مڑا اور گاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ اس کے پاؤں سے جیسے اب بھی بگولے بندھے ہوئے تھے۔

کتوں کے رکھوالے اب انہیں سنبھال رہے تھے۔ ان کی گردنوں میں زنجیریں ڈال رہے تھے۔ کتوں کی چکنی چکنی تھوتھنیاں پاشے کے خون سے سرخ تھیں۔ میں گڑھے کے دل دوز منظر سے نگاہ بچانا چاہ رہا تھا، پھر بھی میری اچٹتی ہوئی سی نظر پڑ ہی گئی۔ گڑھے میں خون اور انسانی گوشت کے لوتھڑوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا... ایک لوتھڑے پر چھوٹے بال تھے۔ یہ شاید پاشے کے پُرغرور سر کی کھال تھی۔

دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

☆☆☆

میں تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس راجوال پہنچا۔ یہاں کچھ اور ہی منظر تھا۔ ہزاروں لوگ راجوال کی گلیوں میں جمع تھے۔ انہوں نے مزار کو بھی اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ لڑائی میں موکھلوں کے قریباً ساٹھ بندے پکڑے گئے تھے۔ ان سب کو مزار کے بیرونی جنگلے کے ساتھ ساتھ رسیوں اور کپڑوں سے باندھا گیا تھا۔ ہر خاص و عام نے جوتوں اور ڈنڈوں کے ساتھ ان کی تواضع کی تھی اور یہ تواضع اب بھی جاری تھی۔ جاگیر کے لوگ اس توہین کا خاطر خواہ بدلہ لے رہے تھے جو کچھ دن پہلے ان پر مسلط کی گئی تھی۔

دو برادریوں میں ہونے والی اس شدید لڑائی میں مرنے والوں کی تعداد اڑتالیس کے قریب تھی۔ سو کے قریب لوگ زخمی ہوئے تھے۔ لاشوں کو چارپائیوں پر دو قطاروں کی صورت میں رکھ دیا گیا تھا اور ان پر چادریں وغیرہ ڈال دی گئی تھیں۔ بیشتر مکانوں کی آگ اب بجھ چکی تھی۔ کچھ اوہ

جلے گھروں پر لوگ اب بھی پانی وغیرہ پھینک رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک چارپائی کو مزار کے احاطے میں رکھا گیا تھا اور اس کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے... مجھے دیکھ کر نصراللہ تیزی سے میرے قریب آیا۔ اس کے چہرے پر فتح مندی کی چمک اور پیشانی پر لہو کے چھینٹے تھے۔ میں نے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”وہاں کیا ہے؟“

وہ جذباتی انداز میں بولا۔ ”چاچے عسکری کی میت!“

میں تیزی سے احاطے میں داخل ہوا۔ بوڑھا شیر چارپائی پر ساکت پڑا تھا۔ اس کی کمزور گردن اور استخوانی کندھوں پر کلہاڑی اور برچھی کے کئی وار تھے۔ اس کی سالار والی سرخ پگڑی اس کے سینے پر پھیلا دی گئی تھی۔ وہ خود تو زیادہ نہیں لڑ سکا ہوگا مگر وہ دوسروں کو لڑنے کا جو حوصلہ دے گیا تھا، وہ بیش بہا تھا۔

لوگوں نے مجھے دیکھا تو میرے گرد اکٹھے ہوگئے۔ پھر ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ وہ فلک شگاف نعرے لگانے لگے۔ ان نعروں میں میری ستائش تھی۔ موکھلوں کے لیے نفرت تھی اور ان سے انتقام کا مطالبہ تھا۔

لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر مجھے رونق علی نظر آیا۔ وہ مجمع کو چیرتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ جیسے کوئی مست ہاتھی گنے کی فصل کو روندتا ہوا آ رہا ہو۔ اس کے چہرے پر بلا کی چمک تھی۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کے انداز میں بے پناہ گرم جوشی تھی۔

”خاور! ہم کامیاب ہو گئے۔“ وہ جذباتی انداز میں بولا اور مجھے جھنجوڑ دیا۔

”تم ٹھیک ہو نا؟“ میں نے اسے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

”تم ٹھیک ہو تو میں بھی ٹھیک ٹھیک ہوں۔“

لوگوں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے بلند آہنگ میں پوچھا۔ ”جن عورتوں کو موکھلوں نے پکڑا تھا، ان کا کیا بنا؟“

”وہ زیادہ نہیں تھیں۔ بس تین تھیں۔ انہیں حاجی فیروز کے گھر کے پاس ہی ایک کمرے میں بند کیا گیا تھا۔ انہیں چھڑا لیا ہے لوگوں نے۔“

لوگوں کے نعرے فلک شگاف ہوتے جا رہے تھے۔ وہ موکھل پاشا کو گالیاں دے رہے تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ اسے پکڑنے اور جان سے مارنے کے لیے ابھی اور اسی وقت موکھلوں کے پنڈ پر ہلا بول دیا جائے۔

میں لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا اس چبوترے پر چڑھ گیا جو حویلی کے عین سامنے واقع تھا۔ میں نے کبھی تقریر نہیں کی تھی۔ نہ ہی تقریر کا ڈھنگ آتا تھا۔ میں نے ہاتھوں کے اشارے سے لوگوں کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور جب بار بار کی درخواست کے بعد وہ خاموش ہوئے تو میں نے کہا۔ ”میرے ساتھیو! ہم نے جوش کے وقت جوش دکھایا ہے اور ہمیں دکھانا بھی چاہیے تھا لیکن اب ہوش کا وقت ہے۔ جو غلطی موکھلوں نے کی وہ ہمیں نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں فی الحال یہاں سے نکلنے اور ان کے گھر میں گھسنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور جہاں تک موکھل پاشا کی بات ہے تو آپ سب کے لیے میرے پاس ایک اچھی خبر ہے....“

ہجوم میں چہ میگوئیاں ابھریں اور سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دی۔

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ”قدرت نے ہماری مدد کی ہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا ہے۔ قلعہ والا کے لمبڑ آصف جاہ کو بھی اچھی طرح پتا چل گیا ہے کہ اس کی بے گناہ بیٹی کے قاتل کون ہیں... آپ سب کو یہ سن کر بڑی حیرانی ہوگی کہ موکھل پاشا اپنے برے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مارا گیا ہے۔“

ہجوم میں شور ابھرا۔ یہ خبر ان کے لیے حیرت ناک تھی۔ کسی نے پکار کر کہا۔ ”کہاں مرا ہے... کس نے مارا ہے؟“

”اس کی لاش یہاں سے چار پانچ میل دور رکھ پور کے ایک زمیندار کے ڈیرے پر پڑی ہے۔ میں خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔“

مجھے ہجوم کے چہرے تمتماتے ہوئے نظر آئے۔ شاید یہ وہی تمتماہٹ تھی جو خونخوار بنگالی ٹائیگر کی موت کے وقت نظر آئی تھی۔

کسی نے پرجوش لہجے میں پوچھا۔ ”کس نے مارا ہے اسے؟“

میں نے جان بوجھ کر آصف جاہ کا نام وضاحت سے نہیں لیا۔ میں نے کہا۔ ”وہ بھاگ رہا تھا۔ لمبڑوں نے اپنے کتے اس کے پیچھے لگا دیے۔ انہوں نے اسے چیر پھاڑ دیا۔ ٹوٹے ٹوٹے کر دیا۔“

اس خبر نے لوگوں کو جوش سے بھر دیا۔ انہوں نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو ابھی اور اسی وقت پاشے کی مسخ لاش دیکھنا چاہتے تھے۔ ”زوردار نعرے لگنے لگے۔

راجوال کا میلہ بری طرح اجڑ گیا تھا مگر جب دل میں خوشی ہو تو اجڑے ہوئے میلے بھی اداس نہیں کرتے اور لوگوں کے دلوں میں خوشی تھی۔ اردگرد موجود لاشوں اور زخمیوں کے باوجود خوشی تھی۔

میرا جسم زخموں سے چُور تھا۔ اب تک تو حالات کی سنگینی مجھے بھگائے پھر رہی تھی اور میں اپنی جسمانی حالت سے غافل تھا۔ مگر اب، جب سوچنے اور محسوس کرنے کی مہلت ملی تھی، میرے سارے درد ابھر کر سامنے آ گئے تھے۔

نصراللہ اور چودھری یعقوب وغیرہ کو ضروری ہدایات دینے کے بعد جب میں حویلی کے مہمان خانے میں پہنچا تو والدہ اور عارفہ میری حالت دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ خاص طور سے والدہ کی حالت تو غیر ہو گئی۔ وہاں ایک آئینے میں میں نے دیکھا تو خود مجھے بھی اپنی حالت پر یقین نہیں آیا۔ قلعہ والا میں لمبڑ آصف جاہ کے بہیمانہ سلوک نے میرا حلیہ بگاڑ رکھا تھا۔ چہرے پر نیل اور غیر معمولی ورم تھا۔ پورے جسم پر کوڑوں کی مار کے نشانات تھے اور ان میں سے کچھ نشان ابھی تک انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ میرے پاؤں نہایت گرم پانی سے جلا دیے گئے تھے۔ ان پاؤں کے آبلے بھاگ دوڑ میں پھوٹ چکے تھے اور خون رس رہا تھا۔ ران کا پرانا زخم بھی تازہ ہو گیا تھا اور قبرستان کے قریب جنگلی سور کی خوفناک ٹکر سے لگنے والی چوٹ بھی اپنی موجودگی کا پتا دے رہی تھی۔

مجھے یقین نہیں آیا کہ میں پچھلے اڑتالیس گھنٹے میں اسی جسمانی حالت کے ساتھ ساری بھاگ دوڑ کرتا رہا ہوں۔

بے بے جی میرے زخموں پر مرہم لگاتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں۔ ”اللہ کرے کچھ نہ رہے ان ظالموں کا۔ میرے پتر کو خونا خون کر دیا ہے۔ کوئی اس طرح تو ڈھگروں کو بھی نہیں مارتا۔“

عارفہ سسک کر بولی۔ ”آپ اسپتال چلے جاؤ بھا جی! وہاں زیادہ اچھا علاج ہو جائے گا۔“

میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بے بے جی کے ہاتھ سے زیادہ میرے لیے کسی ہاتھ میں شفا نہیں ہے۔ یہ تو مجھے خالی مٹی بھی لگاتی رہیں تو میں دو چار دن میں بھلا چنگا ہو جاؤں گا۔“

بے بے جی اور عارفہ نے رات تک میرے لیے بہت کچھ کیا۔ گرم وٹے اور نمک کی ٹکور کی، ہلدی ملا گرم دودھ پلایا... مولوی بشارت کا دیا ہوا مرہم لگایا اور ساتھ ساتھ بے بے جی نے بہت سی سورتیں بھی پڑھ کر پھونکیں۔

ابھی تک بلقیس کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ تاہم مجھے امید تھی کہ وہ بہت جلد یہاں کا چکر لگائے گی۔

فی الوقت میرے ذہن میں دو پریشانیاں زیادہ اچھل مچا رہی تھیں۔ میری نگاہوں کے سامنے رہ رہ کر قلعہ والا کے اس عقوبت خانے کے مناظر گھوم رہے تھے جہاں سے میں نکل کر آیا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے وہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کے ساتھ دیکھا ہے۔ زنجیروں میں بندھے ہوئے وہ افراد جو جانوروں جیسی زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں جانوروں کے طویلے میں ہی رکھا گیا تھا اور ان کو بدترین اذیت دی جا رہی تھی۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ شومئی قسمت آصف جاہ کی وحشت کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ آصف جاہ کے جنون نے ان لوگوں کو صرف ”داماد“ کے روپ میں دیکھا تھا۔ اب یہ افراد نہ صرف خود غیر معمولی تکلیف کا شکار تھے بلکہ ان کی رشتے دار خواتین کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ لمبڑ آصف جاہ کے نزدیک یہ خواتین صرف خواتین نہیں تھیں، یہ نندیں اور ساسیں وغیرہ تھیں۔ عجب دیوانہ پن تھا۔ اور طویلے میں بند باؤ ارشد جیسے لوگوں کا کہنا تھا کہ اس دیوانے پن کی اصل وجہ میں ہوں۔ یہ میں ہی ہوں جو آصف جاہ کی لاڈلی بیٹی کو اپنے گھر میں خوش نہ رکھ سکا اور آصف جاہ کے سینے میں جلتی ہوئی وحشت پھیلتی چلی گئی۔

مجھے دوسری فکر موکھل پاشا کی طرف سے تھی۔ وہ مر گیا تھا لیکن اس کے پاس اماں دلشاد کی بیٹی شاداں کی نازیبا تصویریں موجود تھیں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ پاشا کی موت کے بعد وہ تصویریں کہاں ہوں گی؟ اور محفوظ بھی رہ سکیں گی یا نہیں۔ پاشا کی موت سے لرزہ خیز مناظر بھی بار بار میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

رات تقریباً دس بجے کا وقت ہوگا۔ میں ہلکی غنودگی میں تھا۔ دروازے کی دوسری طرف مدھم آواز سنائی دی۔ یہ وہی آواز تھی جو برسوں سے براہِ راست میرے دل کے تاروں کو چھیڑتی تھی۔ بلقیس، میری بہن عارفہ سے کہہ رہی تھی۔

”اچھا... میں پھر آ جاؤں گی۔“

”نہیں آپا... وہ ویسے ہی لیٹے ہوئے ہیں۔ تم جاؤ گی تو جاگ جائیں گے۔“

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلنے کی مدھم آواز آئی اور بلقیس اندر آ گئی۔ میں نے آنکھوں کی باریک جھری میں سے دیکھا، وہ مخمل کے چمکیلے تاروں والے لباس میں تھی۔ گرم شال کے ہالے میں چہرے کی چاندنی جھلک دکھائی تھی۔

میں نے خود کو سویا ہوا ظاہر کیا اور چت لیٹا رہا۔ وہ

میرے قریب آکر تذبذب میں کھڑی رہی۔ پھر جیسے اس نے مجھے جگانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

میرے چہرے اور گردن کی چوٹیں دیکھ کر اس کے چہرے پر حزن و ملال کی عجیب سی زردی پھیل گئی۔ آنکھوں میں شاید نمی تھی۔ میں اپنی آنکھوں کی جھری سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اردگرد کوئی نہیں تھا۔ رات کا گہرا سناٹا تھا اور گیس لیمپ کی ہلکی سی روشنی تھی۔ اس نے اردگرد دیکھا پھر اس کا دودھیا ہاتھ میرے سر کے بالوں کی طرف بڑھا۔ یوں لگا جیسے وہ اشک بار انداز میں میرے سر کے بالوں کو چھونا چاہتی ہے۔ لیکن ہاتھ میرے بالوں کے بالکل قریب پہنچ کر واپس چلا گیا۔

وہ واپس جانے کے لیے مڑی تو میں نے آواز دے کر روک لیا۔ ”بلقیس!“

وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اپنی شال درست کرتے ہوئے بولی۔ ...”میں سمجھی تم سو رہے ہو۔“

”نہیں، بس غنودگی سی ہو رہی تھی۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔“

وہ رنگین پایوں والی نواڑی کرسی پر بیٹھ گئی اور منہ پھیر کر اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

”کیا ہوا بلقیس؟“

”تم اتنی بری حالت میں بھی، ہمیں کمرے میں بند کر کے موکلوں سے لڑنے چلے گئے۔ تمہیں کچھ خیال نہیں آیا کہ ہم پر کیا گزرے گی؟“

”لیکن میں نہ جاتا تو پھر جو کچھ ہونا تھا وہ بھی تمہارے سامنے تھا بلقیس۔“

”پر اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو؟“

”تو کیا؟ زندگی موت کا ساتھ تو ہمیشہ سے ہے۔ کسی ایک کے مرنے سے دنیا کے کام رکتے تو نہیں۔ حیاتی کی گاڑی ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔“

”تمہیں نہیں پتا تم ہم سب کے لیے کتنے قیمتی ہو۔ اس جاگیر کے بچے بچے کو تمہاری ضرورت ہے۔“

”میں تو ایک بے کار پتھر تھا بلقیس... اب اگر میری تھوڑی بہت قیمت ہے تو وہ کسی کی نظر کی وجہ سے ہے۔ بس وہ نظر مجھے قیمتی سمجھتی رہے، مجھے کسی دوسرے کی کوئی پروا نہیں۔“

”چودھری عزیز والی کیسٹ تمہارے ہاتھ کیسے لگی؟“ وہ موضوع بدل کر بولی۔

میں نے بلقیس کو اس سوال کا جواب پوری تفصیل اور سیاق و سباق کے ساتھ دیا۔ میں نے اسے اس منحوس رات کے بارے میں بھی سب کچھ بتایا جب شہوار زخم زخم ہو کر موت کی آغوش میں گئی تھی۔ میں نے اسے اپنی اور شہوار کی لڑائی اور پھر صلح کے بارے میں بتایا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ ثمینہ کو مجھ پر قاتل ہونے کا شبہ کیونکر ہوا۔ کس طرح اس نے مجھے شہوار کے ہاتھ سے خنجر چھینتے دیکھا اور یہ سمجھ بیٹھی کہ میں اس کو مارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بعد میں انورے اور اس کی شوخ بیوی کے ذریعے اصل مجرم چودھری عزیز تک پہنچنے کا ماجرا بھی میں نے بلقیس کے گوش گزار کیا۔

وہ سب کچھ توجہ سے سنتی رہی۔ اس دوران میں ایک بار عارفہ اندر آئی اور ہمارے سامنے چائے کی پیالیاں رکھ کر چلی گئی۔ باتوں کے دوران میں، میں نے اچانک گہری نظروں سے بلقیس کو دیکھا۔ وہ میرے اس طرح دیکھنے پر چونک گئی۔ اس کے چہرے پر بڑی پیاری سی حیرت نمودار ہوئی۔ ”کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے ایک بات بالکل سچ سچ بتاؤ بلقیس... بتاؤ گی نا؟“

”ہوں۔“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

”میں کئی دنوں سے سخت الجھن میں ہوں۔ چودھری عزیز کے بارے میں باقی تو سب کچھ صاف ہو گیا ہے۔ وہ بھی میرا انجن تھا ہی نہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ مجھے مارنے یا پکڑوانے کے بجائے، بھگانے میں کیوں دلچسپی رکھتا تھا؟ اس کے علاوہ اس نے بے بے جی اور عارفہ کو میاں وارث اور آصف جاہ سے بچانے میں بھی تمہارا پورا ساتھ دیا۔“

بلقیس کچھ دیر تک خاموش رہی۔ لگتا تھا کہ وہ تذبذب کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔ پھر اس نے ایک لمبی سانس لی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی شفاف گردن میں سامنے کی طرف گڑھا سا پڑ گیا۔ وہ ہولے سے بولی۔ ”... یہ سب کچھ طے تھا خاور!“

”میں سمجھا نہیں۔“

”بس وہی کچھ لینے اور کچھ دینے والا معاملہ... بھائیا عزیز اپنی وہ ساڑھے تیرہ مربعے زمین مجھ سے واپس چاہتا تھا جو تم نے میرے نام کرا رکھی ہے۔ دوسری طرف میں تمہاری اور ماں جی وغیرہ کی حفاظت چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی خاور... بھائیا عزیز کی مدد کے بغیر یہ سب کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ شہوار کے مرنے کے بعد جب تم اور تیمور روپوش ہوئے تو سب کچھ ہی بھائیا جی کے ہاتھ میں آ گیا۔ وہ ان دنوں میں ایک طرح سے سیاہ اور سفید کا مالک بن گیا تھا بلکہ اس سے پہلے بھی بہت کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے مجھے صاف

لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ جب چاہے تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتا ہے اور جب چاہے آصف جاہ کے ہاتھوں ماں جی اور عارفہ کی زندگی ختم ہو سکتی۔ ...اور وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس نے جوڑ توڑ کر کے بڑا اثر پیدا کر لیا تھا۔“

”پھر تم نے کیا کیا بلقیس؟“

”میں نے عزیز سے طے کر لیا کہ وہ تمہیں حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکلنے میں پوری مدد دے گا۔ اس کے علاوہ وہ ماں جی اور عارفہ پر بھی کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔ حالات بہتر ہوتے ہی وہ ان دونوں کو تمہارے بڑے بھائی کے پاس کویت بھجوا دے گا۔ جب تم خیر خیریت کے ساتھ یہاں سے چلے جاؤ گے اور ماں جی اور عارفہ کویت پہنچ جائیں گی تو میں وہ ساڑھے تیرہ مربعے زمین واپس اس کے نام لکھ دوں گی۔“

”تم نے اسے کچھ لکھ کر تو نہیں دیا تھا؟“

”نہیں، اسے میری زبانی بات پر بھروسا تھا۔ ویسے بھی اسے پتا تھا کہ سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے، میں اپنی بات سے مکرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی...“

میری نگاہیں بلقیس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ گیس لیمپ کی روشنی اس کے آدھے چہرے کو روشن کر رہی تھی۔ آدھا چہرہ تاریکی میں تھا۔ عجیب اندھیرے اجالے کا منظر تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ بلقیس اب بھی مجھ سے کچھ چھپا رہی ہے۔ کوئی ادھوری بات ہے جو اس کے لبوں تک نہیں آئی... لیکن وہ بات موجود ہے، کافی عرصے سے موجود ہے۔

میں نے کہا۔ ”بلقیس! میری طرف دیکھو۔“

اس نے دیکھا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔ نگاہیں ایک لمحے کے لیے مجھ سے ٹکرا کر جھک گئیں۔ نہ جانے کیوں چہرے پر رنگ سا لہرایا۔

میرے دل و دماغ میں کافی عرصے سے ایک شبہ موجود تھا۔ شاید ڈیڑھ دو سال سے... لیکن آج اس سرد رات میں، گیس لیمپ کی روشنی میں ان پھول دار پردوں والے کمرے میں بلقیس سے بات کرتے ہوئے یہ شبہ ایک دم نمایاں تر ہو گیا۔ میں نے ایک بار پھر بلقیس کو دیکھا۔ اس کا چہرہ میرے لیے ایک شیشے کی طرح تھا اور کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ میں اس کے آر پار دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے کہا۔ ”بلقیس! سچ بتانا۔ کیا اتنی ہی بات تھی یا اس کے علاوہ بھی کچھ تھی؟“

”کیا مطلب؟“ اس کے ہونٹوں کی پنکھڑیاں لرزیں۔

”بلقیس! تم نے وعدہ کیا تھا کہ کچھ چھپاؤ گی نہیں... کیا چودھری عزیز اس کے علاوہ بھی کچھ چاہتا تھا؟“

”پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ ایک دم روہانسی ہو گئی۔

”لیکن مجھے پتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور مجھے یہ بھی اچھی طرح پتا ہے کہ چودھری عزیز کے بارے میں تمہارے خیالات کیا تھے۔ تمہارے بس میں ہوتا تو تم اس کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہ کرتیں، اس کی آواز سننا بھی پسند نہ کرتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ایک ہی حویلی میں رہنا تمہاری اور والی جی کی مجبوری تھی۔ وہ جاگیر کے ایک بڑے حصے کا مالک تھا۔ میں سب جانتا ہوں بلقیس! میں صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا چودھری عزیز تم سے اپنی زمینوں کی واپسی کے علاوہ بھی کچھ چاہتا تھا؟“

بلقیس میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت پیشانی پر کرب کی سلوٹیں تھیں۔ پھر دو تین آنسو اس کی آنکھوں سے جھڑے اور گود میں رکھے ہاتھوں پر گر گئے۔ اس نے ایک چھوٹی سی آہ بھر کر اثبات میں سر ہلایا۔ ”تم ٹھیک سمجھ رہے ہو خاور!“

”تمہارا جواب اب بھی آدھا ہے۔“

”ہاں خاور... وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“

”اور تم نے اقرار کر لیا؟“

بلقیس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ ایک آنسو اس کے خوب صورت کوکے میں چند سیکنڈ کے لیے اٹکا پھر گود میں گر گیا۔ میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ بلقیس کی خاموشی ہی اس کا اقرار تھا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا بلقیس؟“

”میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔“ وہ سسکی۔ ”اگر میں ایسا نہ کرتی تو وہ شاید اسی دن تمہیں مروا دیتا جب تم ہمیں کیکراں والی کے راستے میں ملے تھے۔ وہ ہم پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا خاور!“

”اس کا مطلب ہے کہ اگر میں کچھ عرصے کے لیے قبائلی علاقے میں نکل جاتا اور عزیز کے ساتھ بھی وہ سب کچھ نہ ہوتا جو اب ہوا ہے تو تم اس کے نکاح میں چلی جاتیں۔ اس شرابی بھینسے کی بیوی بن جاتیں؟“

وہ عجب رسان سے بولی۔ ”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، میں تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ کر سکتی ہوں... سب کچھ کر سکتی ہوں۔“

”لیکن... لیکن میری محبت اور چاہت کے لیے کچھ نہیں

www.pkdigest.com

کرسکتی ہو میرے پیار کی جھولی میں ڈالنے کے لیے تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔" میں نے بڑے کرب سے کہا۔

وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔ "یہ اور بات ہے... میں اس کا جواب تمہیں پہلے بھی دے چکی ہوں خاور! کچھ بھی ہے، میں ایک کمزور عورت ہوں۔ میں اس راہ پر نہیں چل سکتی جو میرے خاندان اور میری برادری سے ٹکراتا ہو۔"

"شاید تمہارا یہ سچ بھی پورا سچ نہیں ہے۔ شاید تم کچھ چاہتی ہی نہیں ہو۔ تم بس... تم بس یہ چاہتی ہو کہ کوئی ساری عمر تمہارے لیے تڑپتا رہے۔ تمہاری یادوں کو سینے سے لگا کر روتا سسکتا رہے۔ اپنی زندگی کی آخری سانس تک تمہاری راہ دیکھتا رہے اور تمہیں یہ سکون رہے کہ... ہاں کوئی ہے جو تمہارے لیے آنسو بہاتا ہے، تمہاری راہ دیکھتا ہے... شاید تمہارے نزدیک اسی کا نام محبت ہے۔"

"مجھے غلط مت سمجھو خاور! میری مجبوریوں کو سمجھو۔ میں زمانے سے نہیں ٹکرا سکتی۔ یہ جگ ہنسائیاں نہیں سہہ سکتی۔"

"تو پھر وہ سب کیا تھا جو تم نے کئی سال پہلے شروع کیا... کیوں میرے دل میں امیدوں کا بیج ڈالا؟ کیوں خوشیوں کی آس دلائی؟"

"وہ ہماری غلطی تھی خاور... بلکہ... میری غلطی تھی۔ میں اس کے لیے تم سے ہزار بار معافی مانگتی ہوں۔ اس کے لیے تم مجھے مرنے کی سزا بھی دو تو وہ بھی قبول ہے۔" آنسو اب تواتر سے اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

"لیکن بلقیس! سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ سزا ہی تمہارا یا میرا مقدر کیوں ہے؟ کیا اب تک میں جو کاٹ رہا ہوں وہ سزا نہیں ہے؟ تم سے دن رات محبت کی ہے اور تم سے دور رہا ہوں۔ اپنے من کو مارنے کی ہزار کوششیں کی ہیں، اپنی سوچوں کو بدلنے کے لیے بے شمار جتن کیے ہیں لیکن جو کچھ میرے بس میں نہیں ہے، اس کا کیا کروں؟ اوپر والے سے ہزاروں لاکھوں بار تمہیں مانگا ہے اور یہ بھی مانگا ہے کہ اگر تم مقدر میں نہیں ہو تو پھر میرے دل کو سکون ہی مل جائے لیکن کچھ نہیں ہوتا... کوئی راستہ نہیں نکلتا۔"

میرا لہجہ بوجھل تر ہو گیا اور آواز بھرا گئی۔ اس نے جلدی سے میری جانب دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ وہ میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنا چاہتی ہے۔ مجھے چھو کر مجھے تسلی دینا چاہتی ہے لیکن پھر ایسا کرتے کرتے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹ گیا۔ شاید اب وہ مجھے چھونا بھی گناہ سمجھتی تھی۔ شال اس کے سر پر تھی اور وہ لپٹی لپٹائی بیٹھی تھی... اور وہ کوکا جو کبھی میرے ہونٹوں سے مس ہوتا تھا، میرے گالوں پر چبھتا تھا، مجھ سے ہزاروں لاکھوں سال کی مسافت پر تھا۔

میں نے اسی جذباتی لہجے میں کہا۔ "مجھے بس ایک بات بتا دو بلقیس! اگر تمہاری دوسری شادی عزیز سے ہو سکتی تھی تو مجھ سے کیوں نہیں؟"

"اسے شادی کیوں کہتے ہو خاور! وہ تو ایک جان کو عذاب دینے والا سمجھوتا ہوتا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی تھا، اس سمجھوتے کے راستے میں ذات برادری نہیں تھی... اور خاور... ذات برادری کی طاقت کو شاید تم مجھ سے زیادہ سمجھتے ہو۔ میری جیسی عورت اس طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی... ہاں مر سکتی ہے۔" بلقیس کے لہجے کا کرب دل کو کاٹ دینے والا تھا۔

اچانک بے بے جی کی چپل کی آواز آئی۔ بلقیس ٹھٹک کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ "اچھا، میں چلتی ہوں۔ تم آرام کرو۔"

آرام... کا لفظ اس کے جانے کے بعد بھی بڑی دیر تک میرے کانوں میں گونجتا رہا اور سماعت کو اذیت پہنچاتا رہا۔

...تیسرے روز سہ پہر کے وقت مجھے ایک ایسی صورت حویلی کے مہمان خانے میں نظر آئی جس کے نظر آنے کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس صورت کے نظر آنے سے ایک بہت بڑا بوجھ میرے ذہن سے اتر گیا۔ یہ موکل پاشا کی سوتیلی بہن کھماں کی صورت تھی۔ کھماں کو آج میں نے کئی برسوں کے بعد دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ موٹی ہو گئی تھی اور زیادہ کرخت نظر آتی تھی۔ کھماں سے میری آخری ملاقات بے حد سنگین ماحول میں ہوئی تھی۔ اس واقعے کی تلخ یادیں ابھی تک میرے ذہن میں موجود تھیں۔ جب موکل پاشا نے، بہت کوشش کے باوجود شاداں کی عریاں تصویریں واپس کرنے سے انکار کر دیا تھا اور شاداں کی چھوٹی بہن ثمینہ کو بلیک میل کرنا جاری رکھا تھا تو مجھے اور تیمور کو راست اقدام کرنا پڑا تھا۔ اس اندھیری رات میں ہم کھماں کے گھر میں گھسے تھے اور جوابی کارروائی کے طور پر اس کی عریاں تصویریں اتار لی تھیں۔ یہ جوابی کارروائی غلط... یا صحیح تھی مگر اس سے یہ ضرور ہوا تھا کہ پاشا کی بلیک میلنگ مکمل طور پر رک گئی تھی۔

اور آج پاشا کی موت کے بعد اس کی سوتیلی بہن کھماں ایک چادر میں لپٹی لپٹائی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ چادر میں سے بس اس کی آنکھیں اور پیشانی ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے میرے پاس آنے سے پہلے ملازم تاجو نے اچھی طرح اس کی تلاشی لے لی تھی، ایسا حفاظت کی غرض سے کیا گیا تھا کیونکہ کچھ بھی تھا، کھماں حویلی کے ایک ایسے دشمن کی بہن تھی جو صرف دو دن پہلے اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچا تھا۔

میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ میرے سامنے نواڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مجھے وہ دبنگ عورت ایک دم بدلی ہوئی نظر آئی۔ اس کی سرخ آنکھوں میں جھکی جھکی سی نمی تھی۔ وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "میں کوئی پچھلی بات دہرانا نہیں چاہتی، نہ ہی کوئی اور کسی چوڑی گل کرنا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں تب جو کچھ بھی ہوا، اس میں زیادہ قصور میرے بھائی ہی کا تھا۔ اگر وہ تمہارے پنڈ کی کڑی کے ساتھ برا سلوک نہ کرتا تو شاید میرے ساتھ بھی نہ ہوتا۔ جو کچھ بھی ہے، اب وہ سب پرانی باتیں ہیں۔ میں اب تین بچوں کی ماں ہوں۔ اپنے دوسرے خاوند کے ساتھ میری بڑی اچھی گزر رہی ہے۔ میں نہیں چاہتی کبھی کسی وقت ان تصویروں کی وجہ سے میری زندگی میں کوئی طوفان آجائے۔" اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"تو اب تم کیا چاہتی ہو کھماں؟"

"میں اپنی وہ تصویریں تم سے واپس چاہتی ہوں اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کہ ان تصویروں کی وجہ سے میری زندگی میں کبھی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔"

"پر تمہیں میری شرط کا پتا ہوگا، یہی شرط میں نے تمہارے بھائی کے سامنے بھی رکھی تھی۔"

"ہاں سالار خاور! میں اس کڑی کی تصویریں لے آئی ہوں۔ پرسوں بھائی کے مرنے کے بعد میں نے اس کے سامان میں سے سب سے پہلے یہ تصویریں ہی نکالی تھیں۔" اس نے لرزتے لہجے میں کہا اور کانپتے ہاتھوں سے موٹے موٹے کاغذ کا ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس لفافے کی شکنیں، گواہ تھیں کہ یہ برسوں کسی صندوق میں سامان وغیرہ کے نیچے پڑا رہا ہے...

میں نے لفافہ کھولا۔ کارڈ سائز کی تصویروں پر ایک اچٹتی ہوئی سی نظر ڈالی۔ یہ شاداں کی بڑی واہیات تصویریں تھیں۔ کہیں کہیں وہ نیم بے ہوش نظر آتی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس سے زبردستی کی گئی ہے۔ شاید نیم بے ہوش ہونے کے باوجود اس نے مزاحمت کی تھی اور اسے ڈرایا دھمکایا گیا تھا۔ تصویروں کے سارے نیگیٹو بھی لفافے میں موجود تھے۔ تصویروں اور نیگیٹو وغیرہ کی حالت دیکھ کر میرے دل نے گواہی دی کہ یہی وہ لفافہ ہے جس کی واپسی کے لیے شاداں اور ثمینہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہیں اور پاشے کی چیرہ دستیوں کا سامنا کرتی رہیں۔

میرے اور کھماں کے درمیان چند منٹ مزید گفتگو ہوئی۔ پھر میں بستر سے اٹھ کر گیا اور کھماں والی تصویریں لے آیا۔ یہ تصویریں بھی ایک موٹی لفافے میں بند تھیں بلکہ یہ ایک ڈبل لفافہ تھا۔ اندر کا لفافہ کاغذ کا تھا۔ یہ تصویریں میرے ایک صندوق میں سامان کے نیچے پڑی رہتی تھیں۔ شاید قارئین کو تعجب ہو کہ میں نے انہیں اتنی بے پروائی سے رکھا ہوا تھا لیکن یہ تصویریں دراصل تصویریں تھیں ہی نہیں۔ یہ تو کئی برس پہلے ختم ہو چکی تھیں بلکہ میں نے انہیں ختم کر دیا تھا۔

میں نے لفافہ کھماں کے سامنے کر دیا۔ اس نے اپنی چادر میں سے ہاتھ نکال کر لفافے کو دیکھا اور اسے دبا کر ان میں تصویروں کی موجودگی کا اندازہ کرنا چاہا۔ تب اس کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی۔ اس نے جلدی سے لفافہ کھولا اور کانپتی آواز میں بولی۔ "یہ کیا ہے؟"

لفافے میں راکھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "یہ تمہاری تصویریں اور ان کے نیگیٹو ہیں کھماں۔ میں نے چار پانچ سال پہلے ہی انہیں جلا ڈالا تھا۔ تمہارے بھائی کی طرح سنبھال کر نہیں رکھا ہوا تھا... کم از کم میں تو ایسا نہیں کر سکا تھا۔"

"مم... میں کچھ سمجھی نہیں۔"

میں نے لفافے کی راکھ ایک کاغذ پر الٹ دی۔ تصویریں اتارنے کے بعد جب پاشے سے ٹینشن بڑھی تھی تو میں نے فلم رول ڈویلپ کرا لیا تھا مگر تصویریں صرف دو ہی بنوائی تھیں، باقی نیگیٹو کی شکل میں تھیں۔ پھر ایک دن میں نے یہ سب کچھ جلا دیا تھا۔ مجھے یہ بالکل گوارا نہیں تھا کہ میں یہ تصویریں اپنے پاس رکھوں اور یہ ایک عورت کی عزت کے لیے مستقل رسک بنی رہیں۔

کھماں حیرت سے کاغذ پر پڑی راکھ کو دیکھ رہی تھی۔ اس راکھ میں تصویروں کے ایک دو ادھ جلے کونے تھے۔ اس کے علاوہ نیگیٹو بھی جل کر ختم نہیں ہو جاتے۔ ان کی بھی چرمر قسم کی راکھ ہوتی ہے۔ وہ راکھ بھی موجود تھی۔

"میں کیسے یقین کر لوں؟" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"جیسے میں نے یہ یقین کیا ہے کہ پاشے کے پاس بس یہی تصویریں تھیں اور اس نے ان کی کاپیاں وغیرہ نہیں بنوائی ہوئی تھیں۔"

وہ لاجواب سی ہو گئی۔ ایک عجیب جذبے کے تحت میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "جاؤ کھماں! بالکل بے فکر ہو کر جاؤ۔ اب یہ تصویریں کبھی تمہاری زندگی میں نہیں آئیں گی۔

www.pkdigest.com

کیونکہ یہ ہیں ہی نہیں... بلکہ یہ بہت عرصہ پہلے سے ہی نہیں تھیں۔"

نکھاں نے کچھ بولنا چاہا مگر بول نہیں پائی۔ بس دو آنسو اس کے رخساروں پر لڑھکے اور کہیں چادر کی تہوں میں گم ہو گئے۔ ہاں، وہ کافی بدل چکی تھی۔ ان لمحوں میں وہ مجھے پاشے کی منہ پھٹ جھگڑالو بہن نہیں بلکہ ایک گھریلو عورت نظر آئی... کچھ ہی دیر بعد وہ رخصت ہو چکی تھی۔ یہ ایک ابر آلود دن تھا۔ سردی معمول سے زیادہ تھی۔ میرے قریب بھرادے والی کول انگیٹھی دہک رہی تھی۔ میں نے موٹے موٹے کاغذ والا لفافہ کھولا اور شاداں کی تصویریں ایک ایک کر کے انگیٹھی میں جھونکنے لگا۔ ایک دیرینہ کہانی انجام کو پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

جاگیر اور آس پاس کے حالات دگرگوں تھے۔ حالانکہ راجوالوں نے موکھلوں کے دانت بہت اچھی طرح کھٹے کر دیے تھے مگر اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ وہ جوابی کارروائی کریں گے۔ بہر حال، فوری طور پر تو ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ گوجرانوالہ اور ڈسکہ سے پولیس کی بھاری نفری پہنچ چکی تھی۔ دونوں طرف کے تقریباً تین سو بندے پکڑے گئے تھے۔ تین چار دیہات سے پولیس نے ہر طرح کا اسلحہ اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور علاقے میں کرفیو کی سی کیفیت تھی۔ مختلف دفعات کے تحت جو پرچے درج ہوئے تھے، ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ جلد یا بدیر میاں وارث مجھے گرفتار کرنے پہنچ جائے گا لیکن دو تین دن گزر جانے کے باوجود ایسا نہیں ہوا۔

میں بہ دستور بستر علالت پر تھا۔ زخموں سے چور جسم کا علاج مقامی طور پر ہو رہا تھا۔ موکھلوں کی اندھا دھند مار پیٹ کے سبب بائیں بازو میں ایک فریکچر بھی ہوا تھا۔ بلقیس نے لکھنؤ سے ایک ڈاکٹر بلوایا تھا، اس نے پلاستر تو نہیں چڑھایا تاہم پٹی باندھ دی اور مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔

چوتھے یا پانچویں روز ایک شخص مجھ سے ملنے آیا اور مجھے پتا چلا کہ ابھی تک میں گرفتاری سے کیوں بچا ہوا ہوں۔ یہ بارعب صورت والا ایک اڑتیس چالیس سالہ شخص تھا۔ وہ عام کپڑوں میں تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ پولیس کے محکمے میں ہے اور میں نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے۔

"میرا نام امتیاز ہے... ایس پی امتیاز گوندل۔ شاید تمہیں یاد ہو کہ ڈکیت بارے کی موت کے وقت تم سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"ہاں، مجھے یاد آ گیا ہے۔" میں نے تکیے کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا۔

امتیاز گوندل بولا۔ "تمہیں شاید یاد نہ ہو، ڈسکے کے پولیس اسٹیشن میں بیٹھے ہوئے میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ بارے کے سر پر جو انعامی رقم مقرر ہے، اس میں سے تمہیں بھی معقول حصہ ملے گا اور تعریفی سند وغیرہ بھی۔"

"ہاں، کچھ کچھ یاد ہے، کچھ کچھ بھول گیا ہوں... بلکہ بھلا دیا ہے۔"

"میں نے پچھلے سالوں میں کئی بار تم سے رابطہ کرنا چاہا پر نہیں کر سکا۔ شاید ہر کام کا اپنا ایک وقت ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس موقع پر تم سے زیادتی ہوئی۔ بارے کو گھیرنے اور مارنے کا سارا کام تم نے کیا... اور کریڈٹ ہم نے خود لے لیا۔ لیکن یہ مجھ اکیلے کا کام نہیں تھا۔ ہم دو تین انسپکٹر اس میں شامل تھے... اور کئی موقع ایسے ہوتے ہیں شاہ خاور جب بندے کو دوسروں کی رائے کے ساتھ اپنی رائے ملانی پڑتی ہے۔ بہر حال، میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ میں آج سچے دل سے تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت بارے کو مار کر تم نے جو یادگار کام کیا، اس کا سب سے زیادہ فائدہ شاید مجھے ہی پہنچا۔ میں اس وقت سب انسپکٹر تھا... اب ایس پی ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے کندھے پر جو پھول نظر آ رہے ہیں، ان پر تمہاری دلیری اور ہمت کی چھاپ ہے۔"

"اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی مہربانی ہے۔ بہر حال، اب یہ سب پرانی باتیں ہیں۔"

"باتیں کبھی پرانی نہیں ہوتیں خاور! وقت اپنے آپ کو دہراتا رہتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت ہے کہ میں تمہارے احسان کا بدلہ کسی حد تک چکاؤں اور انسپکٹر میاں وارث کی طرف سے تمہارے ساتھ جو ناانصافی ہو سکتی ہے اس کا راستہ روکوں۔"

"آپ کو انسپکٹر وارث کا کیسے پتا چلا؟"

"پولیس والا ہوں۔ اگر میں پتا نہ رکھوں گا تو اور کون رکھے گا؟ آج سے دس سال پہلے میں اور وارث ایک ہی ٹریننگ سینٹر میں تھے۔ میں اس کی فطرت کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"ویسے آپ کی دعا ہے... مجھے اب توقع نہیں کہ وارث بھی کچھ زیادہ ہاتھ پاؤں چلائے گا۔ اس نے ہوا کا رخ دیکھ لیا ہے اور جان لیا ہے کہ لوگ ایک بار پھر میرے ساتھ ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لڑائی والے دن لوگ جس طرح تمہارے پیچھے نکلے ہیں، اس نے سب کو حیران کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ لوگ تم سے بدظن ضرور ہوئے تھے مگر ان کے دلوں سے تمہاری قدر کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنا رویہ بدلنے کے لیے بس کسی چھوٹے سے واقعے کے منتظر تھے۔"

ایس پی امتیاز گوندل سے ہونے والی یہ ملاقات میرے لیے خاصے اطمینان کا باعث بنی۔ مجھے لگا کہ حالات میرے اور میرے گھر والوں کے لیے صحیح رخ پر جا رہے ہیں۔ شاید دانا ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ کرم یعنی عمل کبھی رائگاں نہیں جاتا۔ وہ کسی نہ کسی شکل میں انسان کی طرف لوٹتا ہے۔ گزرے دنوں میں یہ پھانس اکثر میرے دل میں چبھتی رہی تھی کہ بارے اور اس کے ساتھیوں کی موت کا سارا کریڈٹ پولیس والوں نے خود لے لیا ہے۔

اگلے روز صبح سویرے ایک اور واقعے کا پتا چلا اور قلعہ والا میں بندے گناہ افراد کے بارے میں میری پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔ رونق علی میرے لیے بکرے کے پائے یعنی کھر اوڑوں کا سالن لے کر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے جو چوٹیں لگی ہیں ان کے لیے کھر اوڑوں کا سالن اکسیر ثابت ہو گا۔ میرے لیے یہ سالن اکسیر ثابت ہوتا یا نہیں لیکن رونق علی کے لیے اکسیر ضرور ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ سالن لاتا تو میرے لیے تھا مگر اس کا زیادہ حصہ خود رونق کے پیٹ میں رونق افروز ہو جاتا تھا۔ وہ کھاتا جاتا تھا اور ساتھ ساتھ اپنے "بلڈ پریشل" کا رونا بھی روتا جاتا تھا۔

تاہم اس روز ناشتے کے موقع پر رونق کچھ سنجیدہ تھا۔ اس نے کہا۔ "تمہیں پتا ہے رات کو کیا ہوا ہے؟"

"نہیں۔"

"ابھی کسی کو بھی پتا نہیں۔ پر ایک دو گھنٹے میں یہ خبر سارے علاقے میں پھیل جانی ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، بہت برا ہوا ہے۔"

"کچھ بتاؤ بھی۔"

رونق نے لرزاں آواز میں کہا۔ "رات کو کچھ لوگوں نے عزیز کی لاش کو قبر سے نکالا ہے۔ اس کا کفن پھاڑا ہے اور کلہاڑی کلہاڑی سے اس کے ٹوٹے کر دیے ہیں۔"

میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ دھیان فوراً چند دن پہلے کی اس ملاقات کی طرف گیا جو میرے اور آصف جاہ کے درمیان ہوئی تھی۔ پاشے کی موت کے بعد آصف جاہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ شہوار کے قاتلوں کی لاشوں کو بھی معاف نہیں کرے گا۔

رونق علی نے کہا۔ "یہ سب تمہارے سسر کا کام ہے۔ بیٹی کے غم میں وہ بالکل جنونی ہو رہا ہے۔ اب تو اس کے اپنے بندے بھی اس سے خوف کھانے لگے ہیں۔"

مجھے سخت بے چینی محسوس ہوئی۔ میرا خیال ایک بار پھر ان افراد کی طرف گیا جنہیں آصف جاہ نے صرف داماد ہونے کی پاداش میں پکڑ رکھا تھا۔ وہ کسی بھی وقت اپنے طیش کے بہاؤ میں ان کی زندگی سے بھی کھیل سکتا تھا۔ میری نگاہوں میں غازی محمد اور باؤ ارشد وغیرہ کے چہرے گھومنے لگے۔ خاص طور سے غازی محمد نے مجھے اس عقوبت خانے سے نکالنے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ میں نے وہاں سے نکلتے ہوئے غازی محمد سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے اور باقی افراد کو اب زیادہ دیر یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ مجھے فرار میں مدد دینے کی پاداش میں غازی محمد کا حشر خراب ہو سکتا ہے۔

یہ سارے خیالات اتنی شدت سے میرے ذہن میں آئے کہ میں اپنے زخمی جسم کو سنبھالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا خاور؟ یار، ناشتا تو کرو۔" رونق حیران ہو کر بولا۔

"نہیں، ابھی کچھ دل نہیں چاہ رہا۔" میں نے کہا اور لنگڑاتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔

اگلے ایک گھنٹے میں، میں نصر اللہ کے ذریعے ایس پی امتیاز گوندل سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ امتیاز گوندل ابھی شہر واپس نہیں گیا تھا۔ وہ ڈسکے کے قریب اپنے ایک زمیندار دوست کے پاس ٹھہرا ہوا تھا اور اس نے علاقے کے حالات پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ اس کی مہربانی کہ وہ میری درخواست پر فوراً راجوال چلا آیا۔

میں نے ایس پی امتیاز کو قلعہ والا کے حوالے سے ساری تفصیل بتائی اور اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ اس تفصیل نے ایس پی امتیاز کو بھی حیران کیا۔ بہر حال، آج جو کچھ راجوال کے قبرستان میں ہوا تھا، اس کے بعد آصف کے حوالے سے کسی بھی بات پر یقین کیا جا سکتا تھا۔ گاؤں کے چند لوگوں نے عزیز کی کٹی پھٹی لاش کو خاموشی سے دوبارہ دفن کر دیا تھا اور بلقیس کی ہدایت پر قبر پر پہرا بٹھا دیا گیا تھا۔

ایس پی امتیاز کی مجبوری تھی۔ اس نے خود تو فوری طور پر ایک دن کے لیے لاہور جانا تھا تاہم اس نے دو انسپکٹروں کو حویلی بلا لیا۔ علاقے کے تین تھانوں سے پولیس کی بھاری نفری بھی طلب کر لی گئی۔ میاں وارث کا قائم مقام تھانے دار آفتاب خان بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہم پوری تیاری کے ساتھ قلعہ والا کی طرف روانہ ہوئے۔

www.pkdigest.com

میرے حویلی سے نکلنے سے پہلے ہی بہت سے افراد بیرونی دروازے کے سامنے جمع ہو گئے، ان کے چہرے پریشان تھے۔ میں نے نصراللہ سے پوچھا۔ "یہ کیوں اکٹھے ہوئے ہیں؟"

"آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں پریشانی ہے کہ آپ ایسے حالات میں گاؤں سے کیوں جا رہے ہیں؟ دراصل انہیں ڈر ہے کہ آپ شاید پھر کہیں نکل جائیں گے۔"

میں لوگوں کے پاس پہنچا۔ گاؤں کا عمر رسیدہ ماسٹر مختار آگے آیا۔ اس نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ "بیٹا خاور! ابھی چند دن تک تمہیں پنڈ سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہیے۔ تم دیکھ ہی رہے ہو یہاں جو حالات ہیں۔ موکل کسی بھی وقت کچھ کر سکتے ہیں۔"

"پر ماسٹر جی... میں کہیں جا تو نہیں رہا۔ بس قلعہ والا تک جانا ہے۔ شام سے پہلے واپس آ جاؤں گا۔"

امام مسجد مولوی نیاز محمد نے کہا۔ "سچی بات یہ ہے چوہدری جی کہ اب لوگ ہر گھڑی تمہیں اپنے درمیان دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم ادھر ادھر ہوتے ہو تو فکر پڑ جاتی ہے۔"

میں نے لوگوں کے چہرے دیکھے۔ ان میں سے ہر چہرے پر مختلف لفظوں میں ایک یہ بات لکھی تھی۔ "ہمیں چھوڑ کر نہ جانا چودھری خاور۔"

میں نے دلاسا دینے والے انداز میں کہا۔ "میں کہیں نہیں جا رہا۔ یہیں پر ہوں، آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ باقی رہی موکلوں والی بات تو ان کی طرف سے بھی ہمیں فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں۔ آپ جانتے ہیں، دونوں دیہاتوں کے درمیان میں پولیس بیٹھی ہوئی ہے۔ دونوں طرف کا اسلحہ بھی جمع ہو چکا ہے۔"

میرے چند الفاظ سے لوگوں کو کچھ تسلی ہو گئی۔ ہم قلعہ والا کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت دن کے دس بج رہے تھے۔

آصف جاہ کی دہشت علاقے میں ہمیشہ سے موجود تھی۔ اسے ایک سخت مزاج اور من موجی چودھری کے روپ میں جانا جاتا تھا۔ اس کی عزت اس وجہ سے تھی کہ لوگ اس سے خوف کھاتے تھے۔ پولیس بے شک پوری تیاری کے ساتھ قلعہ والا پہنچی، اس کے باوجود دونوں انسپکٹر تذبذب کا شکار تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ حویلی پر ریڈ نہ کرنا پڑے۔ شاید وہ جھمیل میں پڑ کر مجھ سے بیر ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

یقیناً ہمارے گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ہی لمبڑوں کو ہماری آمد کی خبر ہو گئی تھی۔ لوگ چھتوں اور گلیوں کی نکڑوں پر جمع تھے۔ ہم حویلی کے بڑے دروازے کے سامنے پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ کوئی پہرے دار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پُراسراری خاموشی تھی۔ انسپکٹر کرامت علی نے آگے بڑھ کر بار بار دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کہیں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوئی۔

میں نے گاؤں کے ایک معزز شخص کو بلا کر پوچھا کہ کیا بات ہے۔ صادق نامی اس بندے نے بتایا۔ "دراصل جی، کل افواہ پھیل گئی تھی کہ پاشے کی موت کا بدلہ لینے کے لیے موکل یہاں قلعہ والا پر ہلا بولنے والے ہیں۔ پھر کسی نے یہ کہا کہ دو چار بندے چوری چھپے یہاں کسی گھر میں گھس گئے ہیں اور وہ رات کو حویلی میں گھس کر آصف جاہ کو مارنے کی کوشش کریں گے۔ بس ایسی ہی خبروں کی وجہ سے پھاٹک اور دوسرے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔"

ممکن تھا کہ یہ بات درست ہو لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ لمبڑ آصف جاہ اب تک یہاں پولیس کی آمد سے بے خبر ہو۔ وہ یقیناً جان چکا تھا کہ پولیس کی بھاری نفری اس کے دروازے پر پہنچ چکی ہے۔ اب وہ دروازہ کیوں نہیں کھول رہا تھا؟

میں خود بھی گاڑی سے باہر نکل آیا۔ میں نے انسپکٹر سے کہا۔ "کرامت صاحب! میگافون پر اعلان کریں کہ ہم دروازہ کھولنے کے لیے تین منٹ کا وقت دیتے ہیں، اس کے بعد دروازہ توڑ کر اندر گھس جائیں گے۔"

انسپکٹر کرامت نے میگافون پر یہ اعلان دو بار کیا۔ اندر مسلسل خاموشی رہی۔ لگتا تھا کہ آصف جاہ اور اس کے ساتھی قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ یہ لکڑی کا کافی وزنی اور بڑا دروازہ تھا۔ اس پر گولیوں کے وہ نشان موجود تھے جو چند دن پہلے مجھ پر چلائی گئی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس دروازے کا آہنی کھٹکا ان نشانات سے سات آٹھ انچ اوپر ہے۔ تین منٹ پورے ہونے کے بعد میری ہلاشیری پر انسپکٹر کرامت نے ایک ہیڈ کانسٹیبل سے دروازے پر سیون ایم ایم رائفل سے دو تین برسٹ چلوائے۔ اس فائرنگ نے دروازے کا قریباً ایک مربع فٹ حصہ توڑ کر رکھ دیا۔

انسپکٹر کرامت نے دلیری دکھائی اور جیپ کو تیزی سے چلاتا ہوا اندر لے گیا۔ دروازہ اس کا راستہ نہیں روک سکا۔ ایک گاڑی کے پیچھے دوسری اور پھر تیسری بھی اندر چلی گئی۔ پولیس اہلکاروں نے ان گاڑیوں کے پیچھے پوزیشنیں لے لیں۔ باقی گاڑیاں اور گھڑ سوار دروازے کے سامنے نیم دائرے کی شکل میں پھیل گئے۔

ایک دم حویلی کے اندر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ پولیس اہلکاروں نے گاڑیوں کے عقب سے فائرنگ کی۔ ایک منٹ کے اندر حویلی کی کئی کھڑکیوں کے شیشے چھناچور ہو گئے اور مختلف جگہوں پر سائے حرکت کرتے نظر آئے۔ اس فائرنگ میں ایک کانسٹیبل کی ٹانگ میں گولی لگی، دوسری طرف کیا نقصان ہوا اس کا علم نہیں تھا۔

"اگلی دو گاڑیاں آگے لے جاؤ۔" انسپکٹر کرامت نے بلند آواز میں حکم دیا۔

اگلی دو گاڑیاں حرکت میں آ گئیں۔ میں نے انسپکٹر کرامت سے کہا۔ "میں اگلی گاڑی میں جاتا ہوں، مجھے یہاں کے نقشے کا پتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ انسپکٹر مجھے روک سکتا یا کوئی اعتراض کرتا، میں جھک کر بھاگتا ہوا اگلی گاڑی میں پہنچ گیا۔ ان لمحوں میں اپنی جسمانی چوٹوں کی تکلیف میرے ذہن سے بالکل نکل چکی تھی۔ ایک بار پھر حویلی کے مختلف حصوں سے فائرنگ ہوئی۔ پولیس کی طرف سے اس فائرنگ کا جواب دیا گیا۔ جلد ہی یہ فائرنگ ختم ہو گئی۔ حویلی کے اندر سے توقع سے کم مزاحمت ہوئی تھی۔ میں نے لمبڑ آصف جاہ کے کچھ کارندوں کو چھپتے چھپاتے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ برآمدے کے ستونوں کے پیچھے سے گولیاں چلانے والے دو افراد کو انسپکٹر امجد نے پکڑ لیا۔ ان میں سے ایک آصف جاہ کا خطرناک صورت والا کارندہ مولوی مظفر تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے شراب پی رکھی ہے۔ میں جیپ کو رہائشی عمارت کے عقب سے گزار کر اس جگہ لے گیا جہاں کیکر اور ٹاہلی کے بہت سے درخت تھے۔ ان درختوں کے نیچے مویشی باندھنے کی جگہیں تھیں اور وہ منحوس طویلہ بھی تھا جہاں آصف جاہ نے بے گناہ افراد کو بند کر رکھا تھا اور انہیں اذیتیں پہنچا رہا تھا۔

درحقیقت آصف جاہ ان لوگوں میں سے تھا جو زندگی کے کسی دکھ کو برداشت کرنے کے بجائے اسے نفسیاتی مرض بنا لیتے ہیں۔ ماضی میں آصف جاہ کی اکلوتی بہن کی ازدواجی زندگی تلخ ہوئی تھی، حال میں اس کی اکلوتی بیٹی کو مشکل ازدواجی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ کوئی ایسی اَن ہونی نہیں تھی۔ زندگی میں ایسے ناخوش گوار اتفاقات ہوتے رہتے ہیں مگر آصف جاہ نے ان حالات سے بددل ہو کر چند "رشتوں" کو اپنا بدترین دشمن جان لیا تھا جن میں شاید سسر اور داماد کا رشتہ سرفہرست تھا۔

ہم طویلے کے سامنے پہنچے۔ وہاں موجود افراد نے بالکل مزاحمت نہیں کی اور پولیس کی بھاری نفری دیکھ کر راہ فرار اختیار کر لی۔ میں نے اپنے ہاتھ سے طویلے کو لگے ہوئے آہنی تالے پر پستول سے تین فائر کیے۔ تالا ٹوٹ گیا۔ سب سے پہلے میں ہی اندر داخل ہوا۔ اندر کا منظر میرے لیے جانا پہچانا تھا۔ آہنی سلاخوں کے پیچھے قریباً بارہ تیرہ بدحال افراد نظر آ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر گمان ہوتا تھا جیسے وہ مست حال سادھوؤں کا ٹولہ ہو۔ طویلے کے اندر سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ سب سے پہلے مجھے غازی محمد نے ہی پہچانا۔ اس کے چہرے پر جوش لہرایا۔ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ "سالار جی!"

اندرونی دروازے کو بھی قفل لگا تھا۔ ارشد نے پکار کر کہا۔ "چابی پچھلی دیوار پر لٹکی ہوئی ہے جی۔"

میں نے چابی اتاری اور وہ دروازہ کھول دیا جو ان مصیبت زدگان پر کئی ماہ سے بند تھا... اب ان کے گلے کی زنجیریں کھولنے کا مرحلہ تھا۔ پولیس والے یہ منظر دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ غازی محمد، بابا ارشد اور اشفاق وغیرہ مجھ سے لپٹ گئے۔ باقی افراد کے چہروں پر بھی دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ایک بے یقینی کی کیفیت بھی تھی۔ شاید انہیں بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ ان کے جرم بے گناہی کی سزا ختم ہونے والی ہے۔

میں نے غازی محمد سے پوچھا۔ "تم خیریت سے تو ہو؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اندازہ ہوا کہ وہ مجھے فرار میں مدد دینے کے الزام سے بچ گیا ہے۔

جلد ہی پولیس اہلکاروں نے چھوٹی چابیوں کا وہ وزنی گچھا بھی ڈھونڈ لیا جس سے محبوس افراد کی گردنوں کے کڑے کھولے جا سکتے تھے۔ سب سے پہلے میں نے اپنے ہاتھ سے غازی محمد کی گردن کا کڑا کھولا۔ اس کی گردن پر بھی سیاہ نشان پڑ چکا تھا۔ میں نے اس نشان کو محبت سے سہلایا۔

"میں نے کہا تھا نا غازی... میں آؤں گا۔"

غازی کی آنکھوں میں ستارے چمک گئے۔ وہ ایک بار پھر میرے گلے سے لگ گیا۔ اسی دوران میں ایک اے ایس آئی دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے اطلاع دی۔ "لگتا ہے جی، لمبڑ آصف جاہ صاحب دوسری منزل پر ہیں۔ وہاں کے سارے دروازے بند ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" انسپکٹر کرامت نے پوچھا۔

"حویلی کی نوکرانیاں بتا رہی ہیں۔"

ہم تیزی سے حویلی کے رہائشی حصے کی طرف گئے۔ یہاں اب کوئی مزاحمت کار نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھریلو ملازم چونکہ نہتے تھے اس لیے پولیس کو ان کی طرف سے کوئی خطرہ

www.pkdigest.com

نہیں تھا۔ ان سب کو ایک طرف زمین پر بٹھا دیا گیا تھا۔ دو تین نوکرانیاں موجودہ آفت کے سبب زار و قطار رو رہی تھیں۔ ان میں لگائی بجھائی کرنے والی رشیداں بھی شامل تھی۔ اس نے میری اور شہوار کی زندگی کو مسلسل تلخ کیے رکھا تھا۔ اب مجھے دیکھ کر اس کی نگاہیں زمین میں گڑ گئیں۔ پولیس اہل کار بالائی منزل کی طرف جانے والے دروازے کو کوٹ رہے تھے۔ آخر چند اہل کار ایک چھوٹی سی سیڑھی کے ذریعے ایک بالکونی میں داخل ہو گئے اور بالائی منزل کا دروازہ کھول دیا۔ ہم ہتھیار بدست اندر داخل ہوئے۔ یہاں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی ضرورت تھی۔ ان کمروں میں آصف جاہ کے ذاتی محافظ موجود ہو سکتے تھے۔

ہم قدم قدم آگے بڑھے۔ ایک جگہ مجھے بہت مدھم آوازیں سنائی دیں۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے کرامت کے کان میں سرگوشی کی۔ ''مجھے لگتا ہے یہاں کہیں پاس ہی آصف کے کتے بھی ہیں۔''

ہم قدم قدم بڑی احتیاط سے آگے بڑھتے رہے۔ ایک جگہ کرامت نے اعلان کیا۔ ''آصف صاحب! تم چاروں طرف سے گھیرے میں ہو۔ بہتر یہی ہے کہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ۔''

جواب میں فقط کتوں کی دو چار آوازیں آئیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنی زخمی ٹانگ سے ایک دروازے کو کھولا اور اپنی جگہ جما کھڑا رہ گیا۔ اندر کا منظر حیرت خیز تھا۔ لیبرڈ آصف جاہ قالین پر بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد اس کے آٹھ سلوکی ہاؤنڈز تھے۔ وہ بھی سب بیٹھے تھے۔ بس ان کی دمیں حرکت کر رہی تھیں۔ بارہ بور کی ایک گولی آصف جاہ کی کنپٹی میں داخل ہوئی تھی اور کھوپڑی توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ بندوق آصف جاہ کی گود میں پڑی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے خودکشی کر لی ہے۔ اس کے قریب ہی اس کی پسندیدہ چیڑیاں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ یہ آصف جاہ کا خاص کمرا تھا۔ آج اس کمرے کا قالین آصف کے خون سے داغ دار تھا۔ انسپکٹر کرامت نے ذرا آگے بڑھنا چاہا تو کتوں کے کان کھڑے ہو گئے اور ان کی آنکھوں کی وحشت بڑھ گئی۔ وہ جیسے اپنے مردہ مالک کی حفاظت کر رہے تھے۔

میں نے کرامت کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے میں نے آصف جاہ کے کمرے میں ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ دیواروں پر شہوار کی کئی تصویریں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں اس کے بچپن سے لے کر جوانی تک کی تصویریں تھیں۔ وہ صندوق بھی قریب ہی رکھا ہوا تھا جس میں سے ایک روز آصف نے مجھے شہوار کے کھلونے اور دیگر اشیا نکال کر دکھائی تھیں..... میں نے دروازہ بند کر دیا۔ ایک غیر معمولی شخص، اپنے غیر معمولی جذبات سمیت اپنے غیر معمولی انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اس کی موت پر کسی بھی طرح کا تبصرہ کرنا مجھے مشکل معلوم ہو رہا تھا۔

''لاش کو کیسے نکالیں گے؟'' انسپکٹر امجد نے پوچھا۔

''یہ کام کتوں کے رکھوالے کریں گے۔ اگر ہم کریں گے تو خطرناک ہوگا۔'' میں نے کہا۔

اسی دوران میں ایک اے ایس آئی نے بتایا کہ چار مزید بندوں کو حویلی سے فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔ ان میں سے دو کتوں کے رکھوالے ہیں۔

''انہیں لے کر آؤ۔'' میں نے کہا۔

چند منٹ بعد چاروں افراد ہمارے سامنے تھے۔ ان میں سے ایک سعید شاہ بھی تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے چودھری امین کے ڈیرے پر میری مصیبتوں میں گونا گوں اضافہ کیا تھا۔ میں وہاں پناہ کے لیے گیا تھا لیکن اس شخص نے میری آمد کی اطلاع لیبرڈ آصف جاہ تک پہنچا دی تھی۔ اب وہ ایک مجرم کی طرح میرے سامنے کھڑا تھا۔ جی چاہا کہ اس شخص کی ایک آدھ ہڈی تو ضرور توڑ ڈالوں۔ تاہم پھر کسی نہ کسی طور خود کو سنبھال لیا۔ مصیبت میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے یہ تو پھر ایک عام انسان تھا۔ بعد میں سعید شاہ نے مخبری کا اعتراف کر لیا اور رو دھو کر معافی بھی مانگی۔ سعید شاہ کے بیان سے یہ بھی پتا چلا کہ مجھے پکڑوانے میں چودھری امین کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اس کا قصور بس اتنا تھا کہ اس نے مصیبت کے وقت مجھ سے منہ موڑا تھا اور یہ کوئی قصور تو نہیں یہ تو رواج زمانہ ہے۔

☆☆☆

موکلوں کے بعد چار پانچ دن کے اندر ہی لیبرڈوں کا زور بھی ٹوٹ جانا، جاگیر کے لیے بڑا اچھا شگون ثابت ہوا۔ بہت سے کام آپوں آپ ہی ٹھیک ہونے لگے۔ انسپکٹر میاں وارث نے بلقیس کو خیر سگالی کے پیغام بھجوائے اور پھر حویلی میں آ کر میری خیر خیریت دریافت کی۔ وہ بڑا تجربہ کار انسان تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے اپنی ٹانگیں دونوں کشتیوں میں رکھی ہوئی تھیں کہ جو کشتی بہتر چلے گی، اس میں سوار ہو جائے گا اور اب وہ جاگیر والی کشتی میں آنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

میاں وارث راہ راست پر آیا تو تیمور کے بارے میں بھی پتا چل گیا۔ وہ قبرستان میں سے شاہ نواز اور فیاض سیالی وغیرہ کے ساتھ ہی زخمی حالت میں گرفتار ہوا تھا۔ پولیس نے اسے پوچھ گچھ کے لیے ایک نجی جگہ پر رکھا ہوا تھا۔ میاں وارث نے بتایا کہ اب تیمور کو ڈسکے کے سرکاری اسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے اور وہ روبہ صحت ہے۔ میاں وارث نے ایک اور قابل ذکر کام کیا اور وہ یہ کہ اس ستر ہزار میں سے پچاس ہزار روپے بڑے اصرار کے ساتھ بلقیس کو واپس کر دیے جو اس نے رشوت کے طور پر لیے تھے۔ اس کے بقول دو باقی بیس ہزار ماتحتوں پر خرچ کر چکا تھا۔

مزار پر بھی حالات بالکل ٹھیک ہو گئے تھے۔ راجوال اور جاگیر کے دیگر دو دیہات میں زندگی کا نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو رہا تھا۔ سب ٹھیک جا رہا تھا مگر میرے اندر کچھ ٹھیک نہیں تھا... ایک نکیلے پنجوں والا جانور جیسے ہر وقت میرے سینے کے اندر سے کھرچتا رہتا تھا۔ یہ کیسی اذیت تھی جو کسی طور پر میرا پیچھا چھوڑتی ہی نہیں تھی۔ بلقیس سے چند دن پہلے ہونے والی ملاقات کے بعد یہ اذیت اور بڑھ گئی تھی۔

میرے زخم بہ تدریج ٹھیک ہو رہے تھے۔ بازو کی چوٹ بھی بہتر تھی۔ بے بے جی اور عارفہ دن رات میری دیکھ بھال میں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے ساجے کے ٹو کے بارے میں تجسس تھا۔ ساجے کے ٹو کی غداری کا انعام اسے خوب ملا تھا۔ بہت سے دیگر واقعات کی طرح وہ تاریک رات بھی میرے ذہن میں نقش تھی۔ کے ٹو نوٹوں کے بستر پر ایک بازاری لڑکی کے ساتھ داد عیش دے رہا تھا جب میں نے اسے پکڑا تھا۔ بعد میں وہ اپنی ہی غلطی کے سبب خود کو آگ لگا بیٹھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں بری طرح جھلس گئی تھیں۔ بہت سے کرنسی نوٹ جل گئے تھے۔ تاہم کچھ ابھی تک میرے پاس چاچے رفاقت کی امانت کے طور پر موجود تھے۔ اس واقعے کے بعد سے کے ٹو کا کچھ اتا پتا نہیں تھا لیکن پھر ایک دن جاگیر کے پرانے مخبر رلی کی زبانی پتا چل گیا۔

رلی مجھ سے ملنے آیا تو اس نے بتایا۔ ''چودھری جی! آپ کا یار کے ٹو گوجرانوالہ میں ہے۔ اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئی ہیں۔ ایک گوڈے کے اوپر سے، دوسری گوڈے کے پاس سے۔ بڑی مشکل سے جان بچی ہے جی اس کی۔ سنا ہے کہ اب علاج کے لیے وہ اپنا آدھا مکان بھی بیچ رہا ہے۔''

کے ٹو کے لیے میرے دل میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔ وہ اپنا بویا ہوا کاٹ رہا تھا۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید وہ کسی کی ہلا شیری پر میرے خلاف کیس وغیرہ درج کرانے کی کوشش کرے مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ میں نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا مناسب سمجھا۔

ایک دن ایس پی امتیاز گوندل مجھ سے ملنے آیا۔ وہ جب بھی آتا تھا، بہت سا فروٹ اور مٹھائی وغیرہ لاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے باور کراتا تھا کہ یہ چیزیں حق حلال کی کمائی سے ہیں۔ ترقی ملنے کے بعد وہ عام پولیس والوں سے کافی مختلف ہو گیا تھا۔ میرے ساتھ اس کا ملنا ایک طرح سے اردگرد کے تھانے داروں کے لیے تنبیہ تھی کہ وہ میرے ساتھ بگاڑنے کی کوشش نہ کریں۔

ایس پی امتیاز نے کہا۔ ''آج میرے پاس تمہارے لیے دو خاص خبریں ہیں۔ پہلی تھوڑی سی دردناک ہے، دوسری تھوڑی سی خوشی والی ہے۔ پہلے کون سی سنو گے؟''

''رونق کا خیال ہے کہ نمک والی شے میٹھی شے سے پہلے کھا لینی چاہیے۔''

امتیاز گوندل نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''اس بندے کا پتا چل گیا ہے جس کے حوالے چودھری عزیز نے انورے اور اس کی بیوی کو کیا تھا۔''

''واقعی؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''لیکن اب تمہیں ان دونوں سے کیا؟ تمہاری بے گناہی تو ثابت ہو ہی چکی ہے۔'' امتیاز گوندل نے کہا۔

''مگر وہ دونوں ہیں کہاں؟''

''جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ کم از کم انورا تو وہیں پہ ہے۔ اس کی بیوی کا ابھی ٹھیک سے پتا نہیں۔''

''پوری بات بتاؤ۔''

''عزیز نے میاں بیوی کو ڈسکے کے بابر خان نامی بندے کے حوالے کیا تھا۔ وہ بڑا پرانا کرائے کا قاتل ہے۔ اس نے انورے کو تو فوری طور پر مار کر اور ٹوکے سے اس کے ٹوٹے کر کے اسے نہر میں بہا دیا تھا۔ اس کی بیوی پروین عرف پینو کو اس نے اپنے پاس رکھا تھا مگر عزیز کو یہی بتایا تھا کہ اسے بھی پار کر دیا ہے۔ وہ اور اس کے دو دوست پینو کے ساتھ دس پندرہ دن تک رنگ رلیاں مناتے رہے پھر وہ بھاگنے کی کوشش میں گھر کی سیڑھیوں سے گر گئی اور اس کی کمر میں چوٹ آئی۔ وہ بڑی مشکل سے چل پھر سکتی تھی۔ بابر خان یہ کہتا ہے کہ اس نے پینو کو اسی حالت میں دو قبائلیوں کے ہاتھ پانچ ہزار میں فروخت کر دیا تھا۔ ابھی اس کے اس بیان کی تصدیق باقی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔''

''او خدایا!'' میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ حرص و ہوس بندے کو اتنی دور لے جا کر مارتی ہے جہاں پانی نہیں ملتا۔'' امتیاز گوندل نے کہا۔

میری نگاہوں میں انورے اور پینو کے چہرے گھومنے

www.pkdigest.com

لگے اور پنو کے بالوں میں لگا ہوا رنگ دار کلپ جس میں ایک قیمتی نیلم لگا تھا۔ اس نیلم نے ان میاں بیوی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

میں کافی دیر اس خبر کے اثر میں رہا۔ امتیاز گوندل نے مجھے اس بارے میں دیگر تفصیلات بھی بتائیں۔ آخر میں نے پوچھا۔ ”اور دوسری خبر؟“

”دوسری خبر یہ کہ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ میری تبدیلی ہو رہی ہے گوجرانوالہ میں۔ اب بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ اردگرد کے سارے معاملے ٹھیک ہو جائیں گے۔“

امتیاز گوندل خوش تھا مگر میں خوش نہیں ہوا بلکہ مجھے گوندل کی بات سن کر جھٹکا سا لگا۔ میں نے جیسے چونک کر سوچا۔ امتیاز گوندل یہاں کس کے پاس آنے کی بات کر رہا ہے؟ میں نے تو شاید یہاں ہونا ہی نہیں ہے۔ میری منزل تو شاید اب بہت جلد بدلنے والی ہے۔

میرے اندر جو افسردہ کر دینے والی تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں، ان کا پتا صرف مجھے تھا، کسی اور کو نہیں تھا۔

چند دن بعد جب میری طبیعت کچھ بہتر ہو گئی تو حویلی میں ایک بڑے اکٹھ کا انتظام کیا گیا۔ جاگیر اور اردگرد کے تمام اہم زمیندار اور چودھری وغیرہ اس میں شریک ہوئے۔ ایک بار پھر راجوال کی حویلی سے باہر سجے سجائے تانگوں اور گھوڑوں وغیرہ کی قطار لگ گئی۔ کئی گاڑیاں بھی ان سواریوں میں شامل تھیں۔

بہت سے ایسے زمیندار جو اب تک تذبذب میں تھے کہ علاقے کی چپقلش میں موکھلوں کی طرف داری کریں یا جاگیر کی... اب بڑے جوش و خروش سے جاگیر کے اکٹھ میں شریک ہوئے اور انہوں نے ہمیں ہر طرح سے اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ سچ کہتے ہیں کہ جیتنے والے کا ساتھ ہر کوئی دینا چاہتا ہے اور چڑھتے سورج کی پوجا کا رواج ازل سے رہا ہے۔ اس اکٹھ میں جاگیر کے چودھریوں نے برملا میری تعریف کی اور دل سے میری ساری کوششوں کا اعتراف کیا۔ جاگیر کے رواج کے مطابق مجھے ایک سرخ اور سبز پٹی والی خاص پگ پہنائی گئی۔ اس پگ کو مقامی طور پر ایک عجیب سا نام دیا جاتا تھا۔ یہ پتا نہیں کس زبان کا لفظ تھا، پر اس کا مطلب یہ تھا کہ بڑے رکھوالے کی پگڑی! اس پگڑی کا پہننا ایک اعزاز تھا۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ تھا، اس کے باوجود میں محسوس کرتا تھا کہ میرے اور جاگیر کے چودھریوں کے درمیان ایک فاصلہ سا موجود ہے۔ درحقیقت یہ فاصلہ ہمیشہ سے موجود رہا تھا۔ یہ وہی ذات برادری کا پیدا کیا ہوا فاصلہ تھا۔ بے شک میں بھی زمیندار طبقے سے تھا مگر برادری کے لحاظ سے جاگیر کے چودھری مجھے اپنے سے کم تر جانتے تھے۔ جب ایک موقع پر بلقیس سے میری شادی کی بات چلی تھی تو یہی طبقہ تھا جس نے سخت برا منایا تھا اور اس بات کو ابھرنے سے پہلے ہی سختی سے دبا دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان دنوں بلقیس کو بھی اندر خانے زبردست دباؤ کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس دباؤ کے بعد ہی بلقیس نے میری شادی کے بارے میں سوچنا شروع کیا تھا اور بالآخر میرے لیے شہوار کا رشتہ ڈھونڈا گیا تھا۔ میں اس تناؤ کو آج بھی اسی طرح محسوس کر رہا تھا۔ جاگیر کے لیے سب کچھ کرنے کے باوجود میں آج بھی یہاں کے چودھری طبقے کے لیے ”ٹھس بیٹھیا“ یا آؤٹ سائیڈر ہی تھا۔

اس اکٹھ کے دوران میں، میں نے نوٹ کیا کہ حامد موجود نہیں ہے۔ میں نے قریب بیٹھے چودھری یعقوب سے پوچھا۔ ”آپ کے بھانجے صاحب نظر نہیں آ رہے؟“

”وہ کہیں گیا ہوا ہے۔“ چودھری یعقوب نے مختصر سا جواب دیا۔

میں منتظر ہی رہا کہ شاید وہ کچھ اور بتائے لیکن وہ کسی اور سے بات میں مصروف ہو گیا۔ قریب بیٹھی بلقیس نے بھی یہ سب کچھ سنا تھا... اور شاید محسوس کیا تھا کہ اس کے بھائی کے ادھورے جواب نے مجھے افسردہ کیا ہے۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ اس روز رات کے کھانے کے بعد وہ میرا احوال پوچھنے حویلی کے مہمان خانے میں آ گئی۔ مہمان خانے میں پہلے دن والی ملاقات کے بعد وہ کبھی میرے سامنے اکیلی نہیں آئی۔ شاید وہ چاہتی ہی نہیں تھی کہ میں کوئی سنجیدہ موضوع چھیڑ دوں۔ اس وقت بھی عارفہ اس کے ساتھ تھی۔ بلقیس شال میں لپٹی لپٹائی تھی۔

چند رسمی باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔ ”حامد کہاں ہے؟“

”اسے میں نے گجرات بھیج دیا ہے، اس کی بڑی پھوپی کے پاس۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ کچھ مہینے وہیں رہے۔ جب حالات یہاں ٹھیک ہو جائیں گے تو آ جائے گا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”جاتے ہوئے مجھ سے مل تو جاتا۔ بڑا کورا ہو گیا ہے وہ۔“

”بالکل کورا نہیں ہے بلکہ سچ پوچھو تو وہ ہر وقت تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہتا تھا... خود کبھی کبھی میرا دل بھی چاہتا تھا کہ وہ تمہارے قریب رہے، تم سے کچھ سیکھے۔ پڑھائی میں بھی جتنا اچھا تم اسے پڑھا سکتے ہو، شاید کوئی اور نہ پڑھا

سکے۔ تمہاری ہر بات مانتا ہے وہ۔ لیکن تم بھی جانتے ہو کہ مجبوریاں ہیں۔ یہاں اس کے لیے بہت سے خطرے ہیں۔“

”میری سمجھ میں تو یہ بات پوری طرح نہیں آئی۔ بہرحال، یہ تم لوگوں کا اندرونی معاملہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم نے ٹھیک ہی کیا ہو۔“

وہ کچھ دیر بیٹھی رہی پھر عارفہ کے ساتھ ہی چلی گئی۔ وہ گھر میں بالکل سادہ لباس پہنتی تھی۔ چہرے کو بھی بالکل سادہ رکھتی تھی۔ جیسے یہ ظاہر کرنا چاہتی ہو کہ دنیا کی رنگینی میں اس کی دلچسپی ختم ہو چکی ہے اور اب وہ ایک اور طرح کے طرز زندگی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ لیکن ایسا سوچتے ہی میرے ذہن میں یہ خیال کچوکے لگانے لگتا تھا کہ وہ اس ساری سادگی کو ایک طرف رکھ کر چودھری عزیز سے شادی کی ہامی بھر چکی تھی۔ بلاشبہ یہ فیصلہ اس نے میرے لیے کیا تھا لیکن کیا تو تھا۔ یعنی وہ میری خاطر کسی دوسرے کے پاس جا سکتی تھی لیکن میری خاطر میرے پاس نہیں آ سکتی تھی۔

میں ایسے سوچتا تھا تو پھر مجھے اپنا یہ خیال غلط محسوس ہونے لگتا تھا کہ بلقیس کا چہرہ ایک شیشے کی طرح ہے اور میں اس کے آر پار دیکھ سکتا ہوں۔ پھر مجھے لگتا تھا کہ بلقیس کا چہرہ بھی ایک روایتی عورت کا چہرہ ہے جس پر نا معلوم زمانوں سے گہرے بھیدوں کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ مرد کتنی ہی کوشش کرے، اس پردے کے پیچھے عورت اور عورت کی محبت ایک پہیلی ہی رہتی ہے۔

☆☆☆

جاگیر کے حالات بہت بہتر تھے۔ سب کچھ اچھا جا رہا تھا۔ موکھل زبانی طور پر تو نہیں مان رہے تھے مگر ذہنی طور پر انہوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ پاشے کی اندوہناک موت نے ان کی رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی تھی۔ دن تیزی سے گزرتے جا رہے تھے اور میرے اندر پیدا ہونے والی افسردہ تبدیلیوں کا عمل جاری تھا۔

یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آ چکی تھی کہ مجھے یہ جاگیر چھوڑ کر جانا ہو گا۔ میں اپنے دل سے مجبور تھا۔ میں بلقیس سے دور رہ کر تو شاید زندگی کے دن پورے کر لیتا مگر بے گانوں کی طرح اس کے قریب رہ کر میرے لیے جینا ناممکن تھا۔ وہ اونچی اونچی پگڑیوں کے نرغے میں تھی۔ میں ان پگڑیوں کے پس منظر میں اسے دیکھتا تھا تو میرا دم گھٹتا تھا۔ کبھی کبھی میں سوتے میں ہڑبڑا کر اٹھ جاتا۔ مجھے لگتا کہ میری سانس واقعی بند ہونے لگی تھی۔

ہاں، میں جاگیر چھوڑنا چاہتا تھا لیکن کسی بے گانے کی طرح نہیں، اپنے کی طرح۔ ایک سچے دوست اور خیر خواہ کی طرح۔ میں چاہتا تھا کہ یہاں سے جاؤں تو اپنے پیچھے کچھ ایسے لوگ چھوڑ جاؤں جو میری کمی کا احساس نہ ہونے دیں۔ میں یہاں کے دیہات کی ہنستی بستی فضاؤں کی رونق چھیننا نہیں چاہتا تھا۔ یہاں کے کھیتوں کی ہریالی، یہاں کی گلیوں کی دھوپ چھاؤں، یہاں کی ٹھٹھری ہوئی چاندنی راتوں کا سحر، یہاں کی چلچلاتی دوپہروں کی دل گداز خاموشی اور یہاں کے دہقانوں کے چہروں پر زندگی کی چمک... مجھے ان سب سے پیار تھا۔ میں ان میں سے کسی چیز کا نقصان نہیں چاہتا تھا۔

ایک دن میرے اور نصر اللہ کے درمیان تفصیلی بات چیت ہوئی۔ نصر اللہ نے مجھے اطلاع دیتے ہوئے بتایا۔

”بھرتی پوری ہو گئی ہے جی۔ ڈھائی سو بندے جاگیر کے اندر سے ہوئے ہیں، ایک سو آلے دوالے کے ہیں۔ ان میں سے دو سو کے پاس لائسنسی ہتھیار ہیں۔ باقیوں کا انتظام بھی ایک دو دن میں ہو جائے گا۔“

”گھوڑوں کی کیا پوزیشن ہے؟“

”گھوڑے تو جی اب ضرورت سے زیادہ ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اگلے ایک سال تک تو ہمیں خریداری کی ضرورت نہیں ہے۔ آگے کا پتا نہیں۔“

”مال بھی اچھا ملا ہے؟“

”بالکل جی! موکھلوں کی آنکھیں کھلی رہ گئی ہیں۔“

”یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے نصر اللہ لیکن ایک بات میں تمہیں پھر بتا دوں، اصل طاقت گھوڑے اور بندوقیں نہیں ہوتیں، اصل طاقت لڑنے والوں کا حوصلہ اور ان کا ہنر ہوتا ہے۔ جب بھی حوصلے کی بات آئے گی، چاچے عسکری کا ذکر ضرور آئے گا۔ ذرا سوچو، جب وہ لڑائی والے دن اپنی چارپائی سے اٹھ کر باہر نکلا، اس کے پاس کیا تھا؟ گھوڑا نہ رائفل، نہ جسم میں جان! بس یہ اس کا حوصلہ اور ہنر تھا جو اسے باہر لایا اور وہ موکھلوں سے بھڑ گیا۔ بس یہی لوگ لڑائی جیتنے والے ہوتے ہیں۔“

”آپ کی یہ بات میں اکثر دہراتا رہتا ہوں۔“

”تیمور اور شبیر کے ساتھ مشورہ ہو رہا ہے؟“

”بالکل جی! روزانہ تقریباً ایک گھنٹا بیٹھتے ہیں۔ برکت بھی ساتھ ہوتا ہے۔“

”ضرور... اسے بھی ساتھ رکھو۔ درحقیقت یہ تم چار دل ہی ہو جس پر باقی سارے لوگوں اور نئی پرانی بھرتی کا دارومدار ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میں سے ہر کوئی ایک

www.pkdigest.com

سالار جتنی ذمے داری محسوس کرے۔ اگر کسی وقت تم اپنی ڈیوٹی پر نہ بھی ہو تو کسی کو سالاری کی محسوس نہ ہو۔"

"میں سمجھتا ہوں جی کہ آپ کی کوششوں اور اللہ سوہنے کے کرم سے ہم اب جتنے مضبوط ہیں، پہلے کبھی بھی نہ تھے۔ بلکہ میں تو..." بات کرتے کرتے نصر اللہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔

"کیا بات ہے... اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں جی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور جھکا لیا۔

"نہیں، تم کوئی بات کہنا چاہ رہے تھے۔"

میں نے ذرا اصرار کیا تو وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "کہیں... آپ نے... کہیں جانا تو نہیں؟"

"کیا مطلب؟" میں نے اپنے تاثرات بہ مشکل چھپاتے ہوئے کہا۔

"کک... کچھ نہیں۔ مجھے لگا تھا کہ شاید... آپ کچھ دنوں کے لیے کہیں جانا چاہ رہے ہیں۔"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ لیکن اگر جانا پڑا تو تمہیں بتا کر جاؤں گا۔"

پتا نہیں نصر اللہ میرے جواب سے مطمئن ہوا یا نہیں مگر وہ خاموش ضرور ہو گیا۔

...اگلے تقریباً دو مہینے میں، میں نے جاگیر کے حفاظتی نظام پر بھرپور توجہ دی۔ میں نے کوشش کی کہ نصر اللہ اور تیمور ہر معاملے میں طاق ہو جائیں۔ مجھے خاص طور سے تیمور سے بہت امیدیں وابستہ تھیں۔ بہرحال، اپنی اندرونی کیفیت کے بارے میں، میں نے تیمور کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ رونق سے میں ہر بات کر لیتا تھا مگر اپنے پروگرام کے بارے میں، میں نے اسے بھی یکسر بے خبر رکھا۔

میں نے بھرپور کوشش کی کہ مقامی پولیس سے بھی بلقیس اور چودھری یعقوب وغیرہ کے تعلقات بہت اچھے ہو جائیں اور اس میں مجھے خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اس کامیابی کی ایک وجہ ایس پی امتیاز گوندل بھی تھا جو اب اپنے تمام اختیارات سمیت گوجرانوالہ میں بیٹھا ہوا تھا۔

ان ساری کوششوں کے ساتھ ساتھ میں اپنے لیے پلاننگ بھی کر رہا تھا۔ جاگیر میں اور اردگرد اب میرے پاس کافی زمین تھی مگر جو زمین مجھے سسرال کی طرف سے ملی تھی، اس پر میں اپنا کوئی حق نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اس جگہ میں سے ایک انچ بھی اپنے پاس نہیں رکھوں گا۔ ہاں جو دو ڈھائی مربعے مجھے والی جی صاحب کی طرف سے ملے تھے، ان کو فروخت کرنے کے بارے میں، میں سوچ سکتا تھا۔ اس رقم سے مجھے کہیں اور آباد ہونے میں مدد مل سکتی تھی۔ میرے ذہن میں جو منصوبہ بن رہا تھا، اس کے مطابق مجھے اپنی والدہ اور بہن بہنوئی کے ساتھ جنوبی پنجاب میں کہیں جا رہنا تھا۔ ایک دو جگہوں کے نام میرے ذہن میں تھے۔

☆☆☆

مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ فروری کی ایک ٹھٹھری ہوئی چاندنی رات تھی۔ راجوال کی ایسی ہی کچھ راتیں ہمیشہ کے لیے میرے ذہن پر نقش ہو چکی تھیں، جب حویلی کے زنان خانے میں گاؤں کی خوش رنگ مٹیاریں چرخے کاتتی اور گیت گاتی تھیں۔ ترنجن کے پکوانوں کی مہک سارے میں پھیل جاتی تھی اور پھر ڈھولک کی آواز کے ساتھ بلقیس کی مسحور کن آواز بند دروازوں سے گزر کر میرے کانوں تک پہنچتی تھی۔ کچھ اس قسم کے لوک گیت ہوتے تھے۔

امیاں دیاں بوٹیاں نوں لگ گیا بور نی

رات اے ملاپاں والی ماہی میرا دور نی

یعنی آموں کے پیڑوں پر بور آ گیا ہے۔ یہ حسن اور عشق کی ملاقاتوں والا موسم ہے لیکن میرا ماہی مجھ سے دور ہے۔

...اور پھر وہ صوتی آلہ جسے ہم نے بھوکاٹ کا نام دے دیا تھا۔ گرم انگیٹھی کے سامنے لحاف میں بیٹھ کر رات کے سناٹے میں کی جانے والی وہ سرگوشیاں جو دھیرے دھیرے ایک تیز بہاؤ کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ ایک ایسا بہاؤ جس میں پاؤں جمائے رکھنا ممکن ہی نہیں رہتا۔

ہاں، یہ ویسی ہی ایک سرد چاندنی رات تھی لیکن آج دل کا موسم کچھ اور تھا۔ سینے پر ایک بھاری بوجھ لیے میں بلقیس کی طرف جا رہا تھا۔ جو بات میں کہنے جا رہا تھا، وہ اس بوجھ سے بھی بھاری تھی۔ میں نشست گاہ میں بیٹھ گیا۔ ملازمہ تاجو نے بلقیس کو میرے آنے کی اطلاع دی۔ میں سہ پہر کو ہی بلقیس کو اطلاع دے چکا تھا کہ مجھے... ایک ضروری مشورے کے لیے آنا ہے۔ میں نے یونہی کہہ دیا تھا کہ عارفہ میرے ساتھ ہوگی۔

عارفہ میرے ساتھ نہیں تھی۔ مجھے اکیلا دیکھ کر بلقیس قدرے حیران ہوئی۔ "عارفہ کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اس کے سر میں درد تھا۔" میں نے بہانہ بنایا۔

"اوہو... میں تو اسے کچھ دکھانے کے لیے لائی تھی۔" اس نے کچھ تصویریں ہاتھ میں پھیلاتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا کہ یہ اس اکٹھ کی تصویریں تھیں جب مجھے سرخ اور سبز پٹی والی اعزازی پگڑی پہنائی گئی تھی۔ بہت سی اونچی پگڑیوں اور شملوں کے درمیان یہ پگڑی بالکل مختلف نظر آئی تھی۔ کچھ تصویروں میں علاقے کے زمیندار اور معزز افراد مجھے مبارک بادیں دے رہے تھے۔ لیکن اس تقریب کی اصل اور سچی خوشی مجھے ان چہروں کے بجائے راجوال کے عام لوگوں کے چہروں پر نظر آئی۔ جب میں اکٹھ سے باہر نکلا تھا تو راجوال کے بہت سے لوگ میرے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ اس مجمع کی تصویروں میں خوشی کی اصل لہر دکھائی دیتی تھی۔ لوگوں نے مجھے ہار پہنائے تھے اور کچھ دیر کے لیے کندھوں پر اٹھایا تھا۔

ان تصویروں کو دیکھ کر بلقیس کے چہرے پر خوشی جھلملانے لگی۔ "لوگ تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ انہوں نے تم سے بہت سی امیدیں لگائی ہوئی ہیں خاور!" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

میں نے تصویریں ایک طرف رکھتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی اور افسردہ لیکن مستحکم لہجے میں کہا۔ "بلقیس! آج میں تمہیں ایک اہم اطلاع دینے آیا تھا۔"

"خیریت تو ہے؟" شال کے ہالے میں اس کے چہرے پر رنگ سا لہرایا۔

"میں یہاں سے جا رہا ہوں بلقیس!"

"کہاں... کتنے دنوں کے لیے؟" اس نے ایک ساتھ دو سوال پوچھے۔

"دنوں کا تو پتا نہیں... لیکن یہاں کا چکر ضرور لگاتا رہوں گا۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

بلقیس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ "ہم... میں کچھ نہیں، تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "بلقیس! تمہیں یا چودھری یعقوب وغیرہ کو کسی بھی طرح پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کر رہا ہوں... یونہی چھوڑ کر بھاگ نہیں رہا ہوں۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا، اس وقت نصر اللہ اور تیمور نے ہر طرح میری کمی پوری کی ہوئی ہے۔ پھر شیر اور برکت ہیں۔ یہ چاروں بندے اب چار ستونوں کی طرح ہیں۔ اللہ نے چاہا تو اب انہیں کوئی ہلا نہیں سکتا۔"

بلقیس کا چہرہ یوں بجھ گیا تھا جیسے چودھویں رات کا روشن تر چاند اچانک سیاہ بادل کی اوٹ میں آ جائے۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو خاور... کہیں مذاق تو نہیں... کر رہے؟"

"نہیں بلقیس! میں حتمی فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ اب بے بے جی اور عارفہ کے ساتھ خاموشی سے کسی پُرسکون جگہ پر رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ جاگیر سے میرا رشتہ بالکل ٹوٹ جائے گا۔ میں بھی یہاں کا چکر لگاتا رہوں گا۔" میں نے آخری الفاظ تسلی دینے والے انداز میں کہے۔

بلقیس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی جاگ گئی۔ کوکے کا لشکارا ایک دم نہ جانے کہاں چلا گیا... گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ وہ لرزاں آواز میں بولی۔ "کیا تم واقعی نہیں جانتے خاور کہ تمہارے بغیر جاگیر کا کیا بنے گا؟"

"تم دور دراز کے اندیشوں میں پڑ رہی ہو بلقیس! اب کچھ نہیں ہوگا۔ جاگیر اس وقت جتنی مضبوط ہے، پہلے کبھی نہیں تھی۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ آٹھ دس سال میں کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تب تک حامد بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا ہوگا۔ پریشانیاں تمہارے پاس بھی نہیں پھٹک سکیں گی۔"

"یا تم آن جان ہو یا بن رہے ہو خاور! میں اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتی ہوں، وہ تمہیں بھی نظر آنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم یہاں نہیں ہوگے تو آٹھ دس مہینوں میں ہی یہاں سب کچھ الٹ پلٹ ہو جائے گا۔ کوئی پتا نہیں کہ میرے اور والی جی کے رشتے دار آپس میں ہی لڑنا مرنا شروع کر دیں۔ میں ان کی نیتوں اور ہمتوں کو بڑی اچھی طرح جانتی ہوں... اور پھر اندر کے معاملے ہی نہیں باہر کے معاملے بھی ہیں۔ یہ تمہاری بھول ہے کہ نصر اللہ اور تیمور وغیرہ تمہاری کمی پوری کر سکتے ہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"بلقیس! تمہیں یاد ہوگا، والی جی نے آخری وقت میں ہم دونوں کے سامنے کیا کہا تھا؟ انہوں نے کہا تھا کہ کسی کے چلے جانے سے دنیا کے کام رکتے نہیں۔ انہوں نے سچ کہا تھا۔ آج میں بھی سچ کہہ رہا ہوں... سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں۔"

میرے ٹھوس اور فیصلہ کن لہجے کو محسوس کر کے بلقیس ایک دم چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر تھیں۔ اس نے ایسی عجیب نظروں سے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس مختصر وقت میں وہ جیسے کچھ بہت اہم اور مشکل فیصلے کر رہی تھی۔ آخر اس نے ایک لمبی سانس لی۔ اسے سانس بھی کہا جا سکتا تھا اور ایک طویل آہ بھی! پھر وہ اٹھی اور بغیر کچھ کہے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے بھی اٹھنا تھا۔ میں بھی اٹھ گیا۔

www.pkdigest.com

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ وہ جمعے کا ایک چمکیلا دن تھا۔ رونق علی طوفان کی طرح اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ زلزلوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ وہ آتے ساتھ ہی توپ کے گولے کی طرح مجھ سے ٹکرایا اور لپٹ گیا۔ اس کے بازوؤں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ مجھے اپنی ہڈیاں کڑکڑاتی محسوس ہوئیں۔ ''اوہو... بتاؤ تو سہی کیا ہوا؟'' میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''نہیں، پہلے تم میرا ''بلڈ پریشر'' چیک کرو۔ یہ خبر ایسی ہے کہ میں کسی طرح کا خطرہ شطرہ مول نہیں لے سکتا۔'' اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا اور الماری سے بی پی اپریٹس نکال کر میرے سامنے پھینک دیا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اس کا بلڈ پریشر دیکھا اور بتایا کہ تھوڑا سا زیادہ ہے، خطرے کی کوئی بات نہیں۔

''نہیں، میں پھر بھی ایک گولی کھا ہی لوں۔''

اس نے جھٹ سے ایک گولی نگلی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس کے بہت بڑے چہرے پر دبے دبے جوش کی چمک تھی۔ ''اچھا... اب کچھ بتاؤ بھی یا مجھے ہارٹ اٹیک کراؤ گے۔'' میں نے کہا۔

اس نے مجھے ایک بار پھر اپنے جن جپھے میں لیا اور مجھے بالوں سے جھنجوڑ کر بولا۔ ''خاور! مجھے نہیں پتا آگے کیا ہوگا اور کس طرح ہوگا پر اس وقت تو تیری خوش قسمتی کا ستارہ بڑا اونچا چلا گیا ہے۔''

''اب کچھ منہ سے بھی پھوٹو رونق بھائی۔''

وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے مجھے بلقیس نے بلایا تھا۔''

''تو پھر؟''

''تیری دلی مراد پوری ہو رہی ہے۔ بلقیس تم سے شادی پر راضی ہے۔''

میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ قرب و جوار گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ یہ میں کیا سن رہا تھا؟ کیا واقعی ایسا ہو چکا تھا... یا یہ کوئی جاگتی آنکھوں کا خواب تھا؟

اگلے آدھ گھنٹے میں میرے اور رونق علی کے درمیان تفصیلی بات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ بلقیس نے تمہاری خاطر سارے اندیشوں اور خطروں کو ایک طرف رکھ دیا ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ وہ تمہارا ہاتھ پکڑے گی۔

مجھے ابھی اس خبر پر پوری طرح بھروسا نہیں ہوا تھا پھر بھی سینے میں ایک دھیما سا شادیانہ بجنا شروع ہو گیا۔ یہی جرأت تھی جو میں بلقیس کی طرف سے چاہتا تھا۔ ہاں، یہی توانائی یہی حوصلہ! میں جانتا تھا کہ ہمارے دل میں سچائی ہے۔ ہم آگے بڑھیں گے تو راستے ملیں گے... دشواریاں تو ہر سفر میں ہوتی ہیں۔ مسافر کی ہمت ہی سفر کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہے۔

چودھری رونق بھی درحقیقت علاقے کے اسی زمیندار طبقے سے تھا جو برسوں گزرنے کے باوجود مجھے برابری کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے اور دل میں کدورت رکھتے تھے۔ لیکن اچھوں میں برے اور بروں میں اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ چودھری رونق علی بھی میرے لیے بروں میں ایک اچھا تھا۔ پہلے دن سے آج تک وہ ہر مرحلے میں میرا دوست ہی رہا تھا۔

اس نے اپنے پانچ کلو وزنی ہاتھ سے ایک بار پھر طوفانی انداز میں میری پیٹھ تھپکی اور بولا۔ ''حوصلہ چھوڑنا نہیں کرنا خاور! تم دیکھنا بس دیکھتے دیکھتے سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تم کہہ رہے ہو رونق بھائی کہ برادری کے سامنے اس شادی کا اعلان بعد میں ہوگا۔ کیا یہ بات تب تک چھپی رہ سکے گی؟''

''کیوں چھپی نہیں رہے گی؟ ہم اس کا پورا انتظام کریں گے۔''

''چلو وقتی طور پر چھپ جائے گی لیکن جب اعلان ہوگا... تب؟''

رونق علی نے اپنے مخصوص انداز میں حقے کا ایک طویل کش لیا اور اس کے چہرے پر مدبرانہ سنجیدگی نظر آنے لگی۔ حالانکہ ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ وہ بولا۔ ''خاور! اچھی بات یہ ہے کہ ہماری برادری کے چودھریوں اور زمینداروں نے ہمیشہ تم سے فائدہ لینے کے بارے میں ہی سوچا ہے۔ وہ تمہیں برتتے رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ تمہاری اپنی بھی کوئی زندگی ہے۔'' رونق کے لہجے میں گہرا تاسف تھا۔

کچھ توقف کے بعد اس نے بات جاری رکھی۔ ''دیکھو خاور! غور کرنے والی بات ہے۔ تمہارا نام بلقیس کے ساتھ پہلی بار تو نہیں لیا جائے گا۔ اس سے پہلے بھی لیا جاتا رہا ہے۔ اگر ان میں اتنی ہی غیرت شیرت تھی تو پھر اب تک چپ کیوں رہے؟ اس سوال کا جواب بہت سے لوگوں کو پتا ہے۔ یہ خود کچھ کرنے کرانے کے قابل نہیں۔ یہ دو طبقے ہیں۔ اپنی مجبوری کی وجہ سے تمہارے ساتھ محبت جتاتے ہیں اور تمہیں حویلی میں دیکھ کر ان کے دل میں بھانبڑ بھی جلتے ہیں۔

تمہارے اور بلقیس کے معاملے کو انہوں نے خواہ مخواہ اپنی ضد بنایا ہوا ہے۔ برادری میں اس سے پہلے بھی باہر شادیاں ہوتی رہی ہیں۔ عورتوں کی دوسری شادیاں بھی ہوتی رہی ہیں۔ والی جی کی اپنی ایک بہن تھی جس کا شوہر پرانی دشمنی میں مارا گیا تھا۔ والی جی نے بہن کی دوسری شادی کی تھی۔ میں کہتا ہوں نا کہ یہ بس ضد ہے اور اگر یہ ضد ہے تو پھر ہمیں بھی ان ضدیوں کے سینے پر مونگ دل دینی چاہیے۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔''

''مجھے ڈر اس بات کا ہے رونق بھائی کہ کہیں کوئی فتور پیدا نہ ہو جائے۔ ہم آپس میں ہی لڑنے جھگڑنے نہ لگ پڑیں۔''

''تم دیکھ لینا خاور! کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ان لوگوں کو اپنا عیش آرام سب سے زیادہ پیارا ہے۔ انہوں نے جھاگ کی طرح بیٹھ جانا ہے۔''

میں رات تک اور پھر رات کے آخری پہر تک جاگتا رہا۔ میرے سینے میں ہیجان برپا تھا لیکن میں ہر پہلو پر سوچ رہا تھا۔ بلقیس کی صورت بار بار نگاہوں میں آتی تھی اور میں دل کی گہرائیوں سے یہ محسوس کرتا تھا کہ اگر میں ایک بار بلقیس کو اپنے بازوؤں میں بھر لوں اور جی بھر کر پیار کرلوں اور تھوڑا سا جی لوں تو پھر شاید مرنے کا بھی کوئی افسوس نہیں رہے گا۔ ہاں، وہ میرے لیے کچھ ایسی ہی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ ایک بار پھر وہی بات کہوں گا، دل دریا سمندروں ڈونگے...

اگلے سے اگلے روز رونق علی ہی کی زبانی اس معاملے کی کچھ اور تفصیل سامنے آئی۔ رونق نے بتایا کہ بلقیس کی چھوٹی بہن کے ہاں بچے کی پیدائش ہوئی ہے۔ یہ پہلوٹھی کا بچہ بڑی منتوں مرادوں کے بعد دنیا میں آیا تھا۔ دراصل بلقیس کی اس بہن کا نام خالدہ تھا اور وہ کافی عرصہ بلقیس کے ساتھ حویلی میں بھی رہی تھی۔ خالدہ کی شادی گوجرانوالہ میں ہوئی تھی اور آج کل وہ اپنے شوہر چودھری سلیم کے ساتھ گوجرانوالہ میں ہی رہتی تھی۔ رونق نے بتایا کہ اس خوشی کے موقع پر بلقیس چند روز کے لیے گوجرانوالہ جا رہی ہے۔ وہ اپنے بہنوئی کے گھر میں رہے گی۔ یہ شادی خاموشی سے وہیں پر انجام پائے گی۔ بہنوئی اور بہن، بلقیس کے رازدار ہیں۔ رونق نے بتایا کہ وہ خود بلقیس کے سرپرست کی حیثیت سے گوجرانوالہ جائے گا۔ نصر اللہ اور بہنوئی سلیم دلہن کے گواہوں کی حیثیت سے شرکت کریں گے۔ میرے گواہوں میں تیمور اور شبیر ہوں گے...

رونق کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اندر خانے بہت سا انتظام کرلیا گیا ہے لیکن میں اس سے پہلے ایک بار بلقیس سے مل کر تفصیلی بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''رونق بھائی! میں بلقیس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

وہ مسکرایا۔ ''اب ایک ہی بار مل لینا۔''

میں نے کہا۔ ''رونق بھائی! یہ سب کچھ بہت جلدی میں نہیں ہو رہا؟''

''تم کیا شے ہو یار! جب دیر ہو رہی تھی، تب بھی پریشان تھے... اب جلدی ہو رہی ہے، تب بھی پریشان ہو۔ ایسے کاموں میں ایسے ہی ہوتا ہے یار۔ اب دیکھو نا، یہ ایک سنہری موقع ہے کہ بلقیس کو خالدہ کے گھر جانا ہے۔ اگر اس موقع پر یہ کام ہو جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی؟''

''کیا یہ تمہارا مشورہ تھا؟''

''نہیں... میں سمجھتا ہوں کہ یہ جتنی بھی پلاننگ شلاننگ ہے خود بلقیس بی بی ہی کی ہے۔ وہ اس سارے معاملے کی اونچ نیچ کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہی ہے۔ آج سے پندرہ دن پہلے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب کچھ ہوگا اور اس طرح ہوگا... میرے خیال میں بلقیس ان دنوں بڑی ہمت دکھا رہی ہے۔''

''میں نے ابھی تک بے بے جی اور عارفہ کو کچھ نہیں بتایا اور مجھے یہ بات اچھی نہیں لگ رہی۔''

''بلقیس نے آج خاص طور سے یہ بات کہی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ آج تم والدہ اور عارفہ سے بھی بات شات کرلو۔ بس یہ دھیان میں رہے کہ اس شادی کی خبر ہم کل سات بندوں کو ہوتی ہے۔ چار گواہ، بلقیس کی بہن اور تمہاری بہن اور ماں جی۔ کسی آٹھویں بندے تک یہ بات نہیں پہنچنی ہے۔''

مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب لگ رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی اور بلقیس کی مجبوریوں کا بھی احساس تھا۔ شاید وہ جو کر رہی تھی اور جس طرح کر رہی تھی، ٹھیک کر رہی تھی۔ ایک بار شادی ہو جاتی تو پھر بعد میں معاملات کو سنبھالا جاسکتا تھا مگر شادی سے پہلے بھید ذرا سا بھی کھل جاتا تو شاید حالات بس سے باہر ہو جاتے۔

اس روز نہ صرف والدہ اور عارفہ سے اس بارے میں میری بات ہوئی بلکہ میں نے شام سے پہلے بلقیس سے بھی ایک ملاقات کرلی۔ ہمارے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں جن میں ایک دو باتیں خاصی اہم تھیں۔

میں نے کہا۔ ''بلقیس! یہ تم ایک دم اس فیصلے پر کس

www.pkdigest.com

طرح پہنچ گئیں؟''

وہ مجھ سے نظریں ملائے بغیر بولی۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

''کیا جانتا ہوں؟''

''میں نے کسی بھی صورت تم کو یہاں سے جانے نہیں دینا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ضرورت... محبت سے آگے ہے؟''

''نہیں خاور! محبت آگے ہے اور اتنی آگے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ مگر میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں... بہت زیادہ خوش۔''

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے بلقیس کہ میں... تم سے زبردستی کررہا ہوں۔ بلیک میل کررہا ہوں تمہیں۔''

''خدا کے لیے خاور... محبت کو اور محبت کے جواب کو ایسے گھٹیا نام نہ دو۔ اتنا عرصہ گزر گیا ہے، اب میں تمہارے دل میں دیکھ سکتی ہوں۔ وہاں سب کچھ صاف صاف نظر آرہا ہے مجھے۔'' وہ جذباتی انداز میں بولی۔

''لیکن... لیکن بلقیس! ایسا نہیں لگتا کہ یہ سب کچھ بہت جلدی میں ہورہا ہے؟ کیا ہم اسے زیادہ بہتر طریقے سے نہیں کرسکتے تھے؟''

''نہیں خاور! جو میں دیکھ رہی ہوں شاید تم نہیں دیکھ رہے۔ اس جلدی میں ہی بہتری ہے۔ جو ہورہا ہے اسے ہو جانے دو۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی گردن جھک گئی اور پھول دار شال نے پھسل کر گھونگھٹ سا بنا دیا۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چودھری یعقوب کو بھی کچھ نہیں بتایا؟''

''نہیں... لیکن تم بے بے جی اور عارفہ کو ضرور بتا دو۔''

''میں نے آج بتا دیا ہے۔''

''کیا کہا ہے بے جی نے؟''

''کہا تو کچھ نہیں۔ بس ان کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔''

بلقیس کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ جو کچھ ہورہا تھا، بہت تیز رفتاری سے ہورہا تھا... اور پھر جیسے گرمی کی تپتی دوپہر اچانک کالی گھٹاؤں سے ڈھک جاتی ہے یا سرما کی ٹھٹھری ہوئی صبح کو یکایک سنہری دھوپ کی سوغات مل جاتی ہے... یا پھر ویران شب و روز کے تسلسل کو کسی رنگا رنگ تہوار کی آمد تہس نہس کردیتی ہے... میری زندگی میں بھی وہ دن آگیا جس کا گزر میرے خوب صورت سپنوں میں بھی نہیں ہوتا تھا۔

گوجرانوالہ کے نواح میں چودھری سلیم کا گھر ایک کنال کا تھا اور اس کے ساتھ ہی چھوٹا سا گودام بھی تھا۔ گھر میں صرف دو ملازمائیں تھیں۔ انہیں چند روز کی چھٹی دے دی گئی تھی۔ پروگرام کے مطابق رونق علی، نصر اللہ، تیمور اور شبیر وغیرہ بڑی رازداری سے چودھری سلیم کے گھر پہنچ چکے تھے۔ پتا نہیں کیوں دل میں آخری وقت تک کچھ کھٹکا سا تھا کہ کچھ ہو نہ جائے۔ کوئی عفریت ہماری اس خوشی کو ہڑپ نہ کر جائے۔ وہ خوشی جو ایک زمانے کے بعد اور ہزار زخموں کے صلے میں حاصل ہورہی تھی۔ بے بے جی مسلسل مصلے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اس وقت تک نہیں اٹھیں گی جب تک سب کچھ بہ خیریت انجام نہ پا جائے۔ مولوی صاحب کی آمد میں بہت تاخیر ہورہی تھی۔ آخر وہ عصر کی نماز کے بعد تشریف لائے۔ میں انہیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ دبلے پتلے سے تھے، عمر ساٹھ پینسٹھ ہوگی۔ ان کی وضع میں عجیب سی سادگی اور چہرے پر نورانیت تھی۔ بڑی دھیمی آواز میں بولتے تھے اور سحر سا طاری کردیتے تھے۔ پتا چلا کہ مولانا یوسف نامی یہ بزرگ، بلقیس کے والد کے دوست تھے اور ان کے لیے پیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔

اس گھر کی چار دیواری میں بڑی خاموشی سے میرا اور بلقیس کا نکاح ہوگیا۔ بلقیس ایک نئے لیکن سادہ لباس میں تھی۔ تیمور نے مجھے زبردستی گلاب کے پھولوں کا ایک ہار پہنا دیا تھا۔ مولانا یوسف نے اپنے ہاتھ سے مجھے تھوڑی سی خوشبو لگائی۔

بے بے جی نے دیر تک ہم دونوں کی بلائیں لیں اور ماتھے چومتی رہیں۔ بھائی سلیم نے اپنے گھر کی بالائی منزل ہمارے لیے مخصوص کردی تھی۔ اس کے دو پورشن تھے۔ ایک پورشن میں بے بے جی اور عارفہ کا قیام تھا، دوسرے میں میرا اور بلقیس کا۔ عروس کی شب کمرے میں ٹیوب لائٹ کی روشنی تھی۔ میں نے پہلی بار بلقیس کو اپنی کلائی کا وہ زخم دکھایا جو قریباً آٹھ برس پہلے کی یادگار تھا۔ بلقیس کے لیے دل میں پیدا ہونے والے شدید رومانی خیالات سے خوف زدہ ہوکر میں نے خود کو لالٹین کی چمنی سے جلا لیا تھا اور خود سے عہد کیا تھا کہ ان سوچوں کو اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دوں گا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے میری کلائی کو اپنی حنائی انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا۔

''میرے دیوانے پن کی ایک جھلک!''

''کیسا دیوانہ پن؟''

قریب ہی ایک چھوٹا گول آئینہ پڑا تھا۔ میں نے

www.pkdigest.com

آئینہ اس کے چہرے کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا دیوانہ پن!''

وہ سرخ ہوگئی اور ناراض نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے بانہوں میں بھر لیا اور اس کے بے مثال ہونٹوں پر اپنے پیار کی مہر ثبت کردی۔ پھر میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ جلنے کا یہ زخم کب اور کیسے آیا تھا۔

''تم بڑے عجیب ہو خاور... آہستہ آہستہ تم نے مجھے بھی عجیب بنا دیا۔ میں نے خود سے بڑے بڑے وعدے کیے ہوئے تھے۔ تم سے دور رہنے کی بڑی قسمیں کھائی ہوئی تھیں لیکن تم نے وہ سب کچھ الٹ پلٹ کردیا خاور...'' اس نے تھکے تھکے انداز میں اپنا سر میرے شانے سے لگا دیا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں بلقیس! میں اس وقت خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا ہوں۔ تمہیں اس طرح بانہوں میں لیے لیے مجھے موت بھی آجائے تو ذرا پروا نہیں۔''

وہ اپنی تمام تر خوشبو اور گداز کے ساتھ میرے سینے میں جذب ہوگئی۔ سوئی سوئی آواز میں بولی۔ ''آج مجھ سے ایک وعدہ کرو خاور! اس جاگیر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے، کتنی بڑی مشکلیں بھی کھڑی ہو جائیں، تم جاگیر کے... اور جاگیر والوں کے ساتھ رہو گے۔''

''ہاں، ایسا ہی ہوگا۔''

''وعدہ؟'' وہ مجھ سے لپٹتے ہوئے بولی۔

''ہاں وعدہ۔''

''پکا وعدہ؟''

''ہاں پکا وعدہ۔''

اس نے مجھ پر محبت کی بارش کردی۔ اس کے دل گداز سحور کن پیار نے مجھے ڈھانپ لیا۔ دو جسموں کے ملاپ میں اس کی وارفتگی بے مثل تھی۔ وہ جیسے ایک ہی وقت میں گھنگھور گھٹا بھی تھی اور ترسی ہوئی دراڑوں والی پیاسی دھرتی بھی۔ اس نے میرے ہوش اڑا دیے۔ اس رنگین شب کے سناٹے میں اس ملگجے اندھیرے میں اس کی خود سپردگی نے مجھے دیوانہ کردیا۔ ہاں... میں نے یونہی تو نہیں چاہا تھا اسے... یونہی تو اس کے عشق میں ایک زمانہ نہیں بتا دیا تھا۔ کوئی بات تھی اس میں... کچھ سب سے جدا تھا۔ جب میں اس کے بالکل قریب تھا اور اس کو پوری طرح محسوس کررہا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرے ذہن میں والی جی کا خیال آگیا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ والی جی نے ایک مرد کی حیثیت سے بلقیس کی قرار واقعی قدر نہیں کی یا شاید وہ قدر کرنے کے دور ہی سے گزر چکے تھے۔

اس شب جب میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان تھا اور ایک خوشبودار ریشم میں ڈوبتا اور دھنستا چلا جارہا تھا، میری نگاہ اندھیرے میں چمکنے والے ایک روشن نقطے پر پڑی۔ یہ کیا تھا؟ یہ وہی لشکارے مارتا ہوا کوکا تھا جو محبت کے اس سفر میں پل پل میرے ساتھ رہا تھا۔ جو مجھ سے اشاروں کنایوں کی زبان میں کہتا رہا تھا، حالات کیسے بھی ہوں، سفر جاری رکھنا۔ کیونکہ سفر شرط ہے اور اسی سے منزل کی امید بھی وابستہ ہے۔ میں نے اس روشن نقطے پر اپنے جلتے ہونٹ رکھ دیے۔

... وہ چار پانچ دن بڑے یادگار تھے۔ یوں لگتا تھا کہ دنیا جہان کی مسرتیں اس چار دیواری میں سمٹ آئی ہیں جہاں میں، بلقیس، بے بے جی اور عارفہ رو رہے ہیں۔ رونق علی، نصر اللہ اور تیمور وغیرہ جیسے خاموشی سے آئے تھے ویسے ہی راجوال واپس جا چکے تھے۔ مولوی یوسف صاحب دو دن ہمارے ساتھ رہے پھر وہ بھی چلے گئے۔ ان کی شخصیت میں عجیب سا سحر تھا۔ بندہ جتنی دیر ان کے قریب موجود رہتا تھا، لگتا تھا کہ کسی محفوظ اور سکون بخش حصار کے اندر ہے۔ وہ بلقیس کو بڑی محبت سے بچڑی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

بلقیس اب کوئی لڑکی نہیں تھی۔ اس کی عمر تقریباً 32 سال ہوچکی تھی۔ تاہم وہ اپنی عمر سے کم از کم چار پانچ سال چھوٹی نظر آتی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دل کش چہرے اور بھرپور جسم والی جواں سال عورت کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔ میری عمر بھی تقریباً اتنی ہی تھی یا شاید ایک آدھ سال زیادہ۔ شادی کے بعد میں نے ایک بات فوراً محسوس کی۔ بلقیس نے گہری سنجیدگی اور قنوطیت کے جس خول میں اپنی شگفتگی کو چھپا رکھا تھا، وہ اس نے توڑ کر ایک طرف رکھ دیا۔ اس خول کے اندر سے وہی خوش گفتار، خوش گلو اور ہفت رنگ بلقیس برآمد ہوئی جس کو میں نے کبھی دیکھا تھا... یوں لگتا تھا کہ وہ میری ہر پیاس کو سیراب کردینے پر تلی ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک پیاس اس کی آواز کی بھی تھی۔ ایک ایسا دور بھی تو آیا تھا جب سرما کی طویل راتوں میں اس نے مجھے انٹرکام پر گیت سنائے تھے۔

اب وہ سب کچھ دہرانے کی رت تھی۔ ایک شب میں نے اس کی آغوش میں سر رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو... ہیلو! آواز آرہی ہے؟''

''ہاں، آرہی ہے۔'' وہ شرمیلے انداز میں مسکرائی۔

''کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔ حالانکہ وہ میرے پاس موجود تھی۔

"بستر پر بیٹھی ہوں۔"

"کیا کر رہی ہو؟"

"ایک شرارتی بچے کو سلانے کی ناکام کوشش کر رہی ہوں۔ اس نے اپنا سر میری گود میں رکھا ہوا ہے۔"

"ابھی تو آدھی رات بھی نہیں ہوئی۔ ابھی سے سلانے کی کوشش شروع کر دی۔"

"وہ تو سویرے دس بجے تک سویا پڑا رہے گا۔ مجھے اٹھنا ہے، نماز پڑھنی ہے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "اچھا، اب میرے بارے میں پوچھو نا... کہ میں کیا کر رہا ہوں۔"

"ہاں جی، کیا کر رہے ہو؟" وہ شرمائی اور کھلنے والے انداز میں بولی۔

"ایک نہایت کنجوس دلہن کی گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوا ہوں۔"

"کنجوس... میں نے کیا کنجوسی کی ہے؟" اس نے میری ٹھوڑی کو پکڑا اور ذرا سا جھنجوڑا۔

"اتنی اچھی آواز دی ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں۔ اس میں سے ذرا سی بھی خرچ نہیں کرتی ہو۔ حتیٰ کہ اپنے بے چارے شوہر پر بھی نہیں۔"

"کیا کروں؟" وہ ناک میں کنکنائی۔

"کوئی اچھا سا گیت جو دل کے تاروں کو پھر سے چھیڑ دے۔"

"نہیں خاور! ماں جی اور عارفہ تک آواز چلی جائے گی۔"

"وہ ہماری طرح نہیں۔ وہ سو رہی ہوں گی۔" میں نے تسلی دی۔

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہی۔ پھر کھنکھاری اور گلا صاف کرنے لگی۔ خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے میں اسے دشواری ہو رہی تھی۔

"چلو... شروع ہو جاؤ۔" میں نے تحکم سے کہا۔

چند لمحے بعد اس کی دل نواز آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ وہی آواز جس میں کھیتوں کی ہریالی، پرندوں کی چہچہاہٹ، ہواؤں کی سرسراہٹ اور چرخے کی کوک... سبھی کچھ شامل تھا۔

اس نے ہیر کے چند بند سنائے۔ آواز کم رکھنے کے لیے وہ گلے کے اندر گا رہی تھی۔ اس طرح گانے سے آواز کی دل کشی پوری طرح سامنے نہیں آتی۔ مگر یہ اس کا کمال تھا کہ میں پھر بھی مسحور ہو گیا۔ آخر میں وہ حسب عادت بولی۔

"بس؟"

گئے دنوں میں جب وہ ادا سے "بس" کہا کرتی تھی جی چاہتا تھا کہ اسے بے تحاشا پیار کروں۔ تب میں صرف سوچ سکتا تھا لیکن اب میں سوچ سے آگے بھی جا سکتا تھا۔ میں نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ اس کی چوڑیوں کی چھن چھن اور مدھم ہنسی کی کھن کھن کانوں میں گونجنے لگی۔

"تم "بس" کیوں کہتی ہو؟"

"پوچھتی ہوں کہ کہیں تم اوازار (بور) تو نہیں ہو گئے؟"

"تم صبح تک بھی گاتی رہو تو میں اسی شوق سے سنتا رہوں گا۔"

"صبح تک؟ دیکھ لو... کہیں مکر نہ جانا۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

"تم بڑی تیز ہو۔" میں نے اسے بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

وہ میرے اندر گم ہو گئی۔ اس کیفیت میں اس کے ہاتھ اور ہونٹ بڑی محبت سے میرے شانوں کو چھونے لگتے تھے۔

میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ مجھ سے بھی زیادہ میرے کندھوں پر پیار آ رہا ہے تمہیں؟"

"ہوں۔" وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔

"کیوں؟"

"ان کندھوں نے پوری جاگیر کا بوجھ جو اٹھایا ہوا ہے۔" وہ عجب رسان سے کہہ گئی۔

"کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا بلقیس... یہ قدرت ہی ہے جو کسی سے کوئی کام لیتی ہے، کسی سے کوئی۔ اور میں تو بڑا کمزور بندہ ہوں۔ کبھی کبھی اپنا بوجھ بھی زیادہ لگنے لگتا ہے۔"

"نہیں خاور! میں جانتی ہوں کہ تم کتنی بھاری ذمے داریاں نبھا رہے ہو۔ یقین کرو..."

"نہیں کرتا یقین۔" میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔

وہ ہنسنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ اسی کا انداز تھا جو آج میں نے اپنایا تھا۔ کمرے کے دریچوں سے باہر چاند مغرب کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ مدھم ہوا نے شبنم آلود پھولوں کے منہ چومنا شروع کر دیے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں تھے۔

... مجھے بے بے جی اور عارفہ کے ساتھ پانچ روز بعد راجوال واپس چلے جانا تھا۔ بلقیس کو تین دن بعد آنا تھا لیکن پھر پروگرام بدل گیا۔ بلقیس نے یہاں اپنا قیام تھوڑا سا بڑھا دیا۔ وہ خالدہ کی ایک نند کی منگنی میں شرکت کرنا چاہتی

تھی۔ یوں مجھے اور بلقیس کو ساتھ رہنے کے لیے چند دن اور مل گئے۔

... قریباً دس دن بعد جب میں نے والدہ اور عارفہ کے ساتھ راجوال واپس روانہ ہونا تھا، دل پر ایک دم بوجھ سا پڑ گیا۔ بلقیس نے میرے کمہلائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ "کیا بات ہے؟"

"سوچ رہا ہوں، اب کب ملیں گے؟"

"کیوں... ابھی دل بھرا نہیں؟" وہ مسکرائی۔ "تم تو کہا کرتے تھے، بس ایک بار ہم جی بھر کر ایک دوسرے سے مل لیں پھر پوری زندگی کا سفر بھی خوشی سے کاٹ سکتا ہوں... اور اب تو ایک بار نہیں ملے، کئی بار ملے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پر... تمہاری طلب اور بڑھ گئی ہے۔"

"لیکن... اب تو کچھ دن دور رہنا پڑے گا۔"

"کتنے دن؟"

اس نے ایک آہ بھری۔ "پتا نہیں۔"

"میرے خیال میں تو تم سب سے پہلے بڑے ماموں یعقوب سے بات کرنا۔ شادی کی خبر سنائے بغیر انہیں ٹٹولنے کی کوشش کرو۔ پتا چل جائے گا کہ وہ کس طرح کا رویہ دکھاتے ہیں۔ اس کے بعد..."

"تم پریشان نہ ہو خاور! میں نے سب سوچ رکھا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"لیکن اندازاً کتنے دن لگ جائیں گے؟"

"مہینا ڈیڑھ مہینا... یا شاید اس سے تھوڑا زیادہ۔"

"اور اگر بات بگڑتی نظر آئی تو؟"

"پھر سوچ لیں گے کہ کیا کرنا ہے۔" وہ کھوئی کھوئی سی میرے کندھے سے لگ کر بولی۔

اگلے روز میں، والدہ اور عارفہ کو لے کر راجوال واپس آ گیا۔ بلقیس کی واپسی تین روز بعد ہوئی۔ ہم روانہ بھی اسی طرح وقفے سے ہوئے تھے۔ بلقیس کو رونق علی لے کر آیا۔ ساتھ محافظوں کا دستہ تھا۔ آج کل ایس پی امتیاز کی طرف سے حویلی کو پولیس گارڈ بھی ملے ہوئے تھے۔

بلقیس نے مجھے مکمل طور پر خاموش رہنے کو کہا تھا۔ میں خاموش رہا اور وقت کا انتظار کرتا رہا۔ ہم حویلی کے مہمان خانے میں قیام پذیر تھے لیکن ایک ہی چار دیواری میں ہوتے ہوئے بالکل اجنبیوں کی طرح تھے۔ ملاقات بھی نہیں ہوتی تھی۔

مجھے لگتا تھا کہ یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے یا شاید یہ میرا وہم تھا۔ بہرحال، میں اپنے طور پر منصوبہ بندی بھی کر رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر مقامی چودھریوں کی طرف سے اس شادی پر شدید ردعمل ظاہر ہوا تو یہ جاگیر کے عام لوگ ہی ہیں جو میری حمایت میں آواز اٹھائیں گے۔ وہ کہاں تک میرا ساتھ دے پائیں گے، یہ ایک علیحدہ بات تھی۔ ان جانے اندیشے ہر وقت میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ بے بے جی اور عارفہ بھی فکرمند رہتی تھیں۔ تیمور، رونق اور میں اکثر اس معاملے میں صلاح مشورہ کرتے تھے۔

اسی طرح تقریباً ڈیڑھ مہینا گزرا اور پھر... میری زندگی کا اہم ترین واقعہ ہوا۔ وہ اپریل کی بیس تاریخ تھی۔ صبح نو بجے کا وقت تھا۔ یہ سب کچھ میری ڈائری پر درج ہے۔ ایک ملازمہ حویلی کے اس پورشن میں آئی جہاں ہم رہ رہے تھے۔ اس نے بے بے جی سے پوچھا کہ بیگم جی تو ادھر نہیں آ گئیں؟

بے بے جی نے نفی میں جواب دیا۔ ملازمہ پریشان تھی۔ اس نے بتایا۔ "بیگم جی اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ آنے والے بھی نہیں ہیں۔ انہیں کسی نے حویلی سے نکلتے بھی نہیں دیکھا۔"

ایک دم ہلچل سی مچ گئی۔ ملازمین بھاگ دوڑ کرتے نظر آئے۔ میں نے چودھری یعقوب اور چودھری جمشید کو پریشانی کے عالم میں بڑے گیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔ یہی وقت تھا جب عارفہ کچھ پریشان سی میرے پاس آئی۔ وہ دو تین دن سے بچے سمیت بلقیس کی طرف تھی اور وہیں سو رہی تھی۔ "کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ لفافہ میرے تکیے پر رکھا ہوا تھا۔ لگتا ہے کہ آپا بلقیس نے رکھا ہے۔"

لفافہ بند تھا۔ اوپر لکھا ہوا تھا شاہ خاور کے لیے!

میں نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ اندر چند صفحات پر مشتمل ایک خط تھا۔ میں دیکھتے ہی جان گیا، یہ بلقیس کی تحریر ہے۔ میں وہیں کھڑے کھڑے پڑھنے لگا۔ میں جوں جوں پڑھتا گیا میرے اردگرد دھند سی پھیلتی گئی۔ مجھے اپنے اردگرد کی اشیا گھومتی اور چکراتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ مجھے لگا کہ میں لڑکھڑا جاؤں گا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تحریر یہ دستور بلقیس کے خط پر تھی۔ مضمون کچھ اس طرح تھا۔

"خاور! ان سطروں کو حوصلے سے پڑھنا اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا۔ مجھے امید ہے کہ جب تم ٹھنڈے دل سے سوچو گے تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے جو کیا ہے، غلط نہیں کیا۔ خاور! مجھے پتا ہے کہ تم نے پچھلے ڈیڑھ دو مہینے سخت انتظار میں گزارے ہیں۔ تم چاہتے تھے کہ ہماری

شادی کا جلد از جلد اعلان ہو اور ہم عام میاں بیوی کی طرح اکٹھے رہ سکیں۔ تمہارا خیال تھا کہ میں اپنے طور پر اپنے بڑوں کو منانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ شاید تمہیں یہ سن کر افسوس ہو کہ میں نے ایسی کوئی کوشش کی ہی نہیں۔ مجھے پہلے دن سے پتا تھا کہ ایسا نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ خاور! اپنے خاندان کے بارے میں جتنا میں جانتی ہوں، تم نہیں جان سکتے۔ بہت سی باتوں کا تمہیں پتا ہوگا لیکن بہت سی باتوں کا نہیں ہوگا۔ یہ بڑے ضدی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں خاور! انہیں تمہاری اور میری شادی کسی طور قبول ہو ہی نہیں سکتی۔ ان کے سینوں پر تو اس وجہ سے بھی سانپ لوٹتے رہتے ہیں کہ تم حویلی کے مہمان خانے میں رہتے ہو۔ یہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو میں تم تک پہنچانا نہیں چاہتی کیونکہ اس سے دل دکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

”ڈھائی تین ماہ پہلے جب تم نے مجھ سے جاگیر چھوڑ جانے کی بات کی تو میرے سر پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میں مسلسل سوچتی رہی۔ میرے سامنے تین راستے تھے۔ پہلا یہ کہ میں تمہاری بات نہ مانوں۔ اگر میں نہ مانتی تو مجھے پتا تھا کہ تم نے چلے جانا تھا... کبھی مڑ کر بھی نہیں دیکھنا تھا۔ بے شک! اپنے طور پر تم بڑے مضبوط انتظام کر کے جا رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ سب کچھ چند مہینوں یا ایک آدھ سال کے اندر ختم ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ تمہارے بغیر چل ہی نہیں سکتا تھا۔

”دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں تمہاری بات مان لوں۔ ہم دونوں شادی کر لیں۔ یقین کرو خاور! تمہارے ساتھ کا خیال میرے لیے اتنا پیارا ہے کہ... مجھ جیسی ان پڑھ اسے لفظوں میں بتا نہیں سکتی۔ تمہارے ساتھ کے چند لمحوں کے لیے میں اپنی پوری حیاتی قربان کر سکتی ہوں۔ پر میں جانتی تھی کہ یہ شادی کیا طوفان مچائے گی۔ اور طوفان ہی نہیں مچنا تھا، میرے ساتھ ساتھ تمہاری زندگی بھی سخت خطرے میں آ جاتی تھی۔ ایک تو میری دوسری شادی اور وہ بھی برادری سے باہر۔ یہ کسی کو قبول نہیں ہونی تھی۔ اس بارے میں والی جی نے جو کہا بالکل ٹھیک کہا تھا۔

”تیسرا راستہ میرے پاس یہ تھا کہ میں ہی چپ چاپ کہیں کنارہ کر لوں۔ سب کچھ چھوڑ کر چلی جاؤں اور جاتے جاتے تمہیں یہاں رہنے کا پابند کر جاؤں۔ میں نے سوچا، جب میں تمہیں آس پاس نظر ہی نہیں آؤں گی تو پھر تمہارا دل بھی نہیں دکھے گا۔ پاس رہتے ہوئے بھی دور رہنے کا خیال تمہیں تکلیف نہیں پہنچائے گا... اور آخر میں نے یہی تیسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا لیکن جب میں نے ذرا گہرائی میں جا کر سوچا تو مجھے لگا کہ میں تم سے اس طرح اچانک منہ موڑ کر تو جا بھی نہیں سکتی۔ اگر چلی گئی تو ساری زندگی تم کو ”نہ ملنے“ کا دکھ دیتی رہوں گی اور خود کو بھی کوستی رہوں گی۔ مجھے لگا کہ میں کئی سال سے تمہاری ڈالی ہوئی زنجیروں میں جکڑی ہوں، جب تک تم خود ان زنجیروں کو ڈھیلا نہیں کرو گے، میں یہاں سے ہل نہیں سکوں گی۔ آخر میں نے فیصلہ کیا جو پہلے ماموں رونق علی کے اور پھر تمہارے سامنے آیا۔ بعد میں، میں نے اپنے طریقے سے خالدہ اور سلیم وغیرہ کو بھی اس فیصلے کے بارے میں بتایا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میرا یہ فیصلہ بالکل صحیح ہے۔ اس میں بھی غلطیاں ہوں گی... بلکہ غلطیاں ہیں... لیکن خاور! اگر تمہیں میری کچھ اچھی باتیں یاد ہیں تو خدا کے لیے ان باتوں کے صدقے میری یہ غلطیاں معاف کر دینا۔

”میں آج یہاں سے ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں خاور! حامد بھی میرے ساتھ جائے گا۔ یہ سطریں لکھتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں... اس وقت ہاتھ جوڑ کر تم سے ایک ہی بات کہنی ہے خاور! تمہارے سر پر اب ”بڑے رکھوالے کی پگ“ ہے۔ تم اس جاگیر کو چھوڑ کر نہ جانا۔ یہاں کے لوگوں کی ہر بھلائی اب تمہارے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ وہ تمہیں دیکھ دیکھ کر زندہ ہیں۔ تم انہیں زندگی سے دور نہ کرنا۔ اگر تم جاگیر کو اور یہاں کے لوگوں کو خوش رکھو گے تو میں بھی جہاں ہوں گی، خوش ہوں گی۔ یقین رکھنا خاور! یہاں کے لوگوں کی خوشی مجھ تک ضرور پہنچے گی اور شاید اللہ بخشے والی ماں تک بھی...!

”ایک بات اور تم سے کہنی ہے۔ اگر تم اس وقت میرے سامنے ہوتے تو شاید میں یہ بات تمہارے قدموں میں سر رکھ کر کہتی۔ اب یہی سمجھ لو کہ میرا سر تمہارے قدموں میں ہے۔ خاور! مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ میں اب ملوں گی نہیں۔ کروڑوں انسانوں کے اس ملک میں، میں کسی نامعلوم بستی کی نامعلوم چار دیواری کے اندر اپنی زندگی گزارنے والی ہوں۔ میرے ساتھ میرا ایک بزرگ سرپرست بھی ہے۔ اس لیے تمہیں کبھی کسی بھی طرح سے میرے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔

”ہاں خاور! میری تم سے منت ہے کہ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش میں اپنا وقت خراب نہ کرنا کیونکہ بالفرض محال... فرض محال اگر میں کبھی مل بھی گئی تو مجھے تمہاری دنیا میں واپس نہیں آنا ہے۔ باقی میری طرف سے تم مکمل آزاد ہو خاور! اگر چاہو تو اچھی سی لڑکی دیکھ کر شادی کر لینا۔ ایک ایسی بیوی جو جاگیر کے کاموں میں تمہارا ساتھ بھی دے سکے... مگر یہاں پھر ذات برادری کا چکر ہوگا۔ کوشش کرنا کہ اس بار لڑکی تمہاری اپنی برادری کی ہو۔

”اللہ بخشے بھابیا عزیز والی زمین میں اس کے وارثوں کو واپس کر رہی ہوں۔ یہ انہی کا حق ہے۔ میں نے کاغذوں پر انگوٹھے دستخط کر دیے ہیں لیکن جو زمینیں میرے نام تھیں ان میں سے تقریباً آدھی کے کاغذات میں نے تمہارے نام لکھوائے ہیں۔ تمہارے پاس اپنی زمین بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جاگیر میں تمہاری حیثیت اب اور مضبوط ہو جائے گی۔ اپنی باقی کی آدھی زمین میں سے کچھ رقبہ میں نے عیدگاہ کے لیے اور کچھ جھونپڑا بستی کے لوگوں کے لیے چھوڑا ہے۔ باقی زمین وراثت میں جائے گی۔ پچھلے ڈیڑھ دو ماہ میں، میں یہی کام کراتی رہی ہوں۔“

اپنی اس تحریر میں بلقیس اپنے ملازموں، غریب رشتے داروں اور ان بے شمار بے آسرا لڑکیوں کو بھی نہیں بھولی تھی جن کی شادیاں، اگر وہ یہاں ہوتی تو اس نے کرانی تھیں۔ اس نے ان سب کے لیے کچھ نہ کچھ چھوڑا تھا۔

خط کے آخری الفاظ یہ تھے۔ ”اب تم سے اجازت لیتی ہے خاور! آخری بار تمہیں دیکھنے اور چھونے کو دل چاہتا ہے، پھر ڈرتی ہوں کہ جس دل کو بڑی مشکلوں سے سنبھالا ہوا ہے، کہیں تمہیں دیکھ کر کمزور نہ پڑ جائے۔ اب میں آگے دیکھ رہی ہوں۔ بچپن میں سنتے تھے کہ جو آگے دیکھتے ہیں انہیں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے، نہیں تو پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ میں بھی کہیں پتھر کی نہ ہو جاؤں۔ مجھے جانے دو خاور... مجھے اب جانے دو۔ اللہ تمہاری مدد کرے، اللہ ہمیشہ تمہارا نگہبان ہو...

تمہاری مجبور شریکِ حیات، بلقیس خاور!

☆☆☆

بلقیس کا یوں چلے جانا میرے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ وہ ایک خط چودھری یعقوب کے نام بھی چھوڑ گئی تھی۔ اس خط کے سارے مندرجات تو مجھے معلوم نہیں ہو سکے تاہم اس خط میں اس نے اپنے لواحقین سے باہمی اتفاق اور اتحاد برقرار رکھنے کی التجا کی تھی۔ اس کے علاوہ جاگیر کے انتظامی کاموں کے حوالے سے باتیں لکھی تھیں۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے یہ سب کچھ چھوڑ کر جا رہی ہے اور سچے اس فیصلے سے بہت مطمئن ہے۔

بلقیس نے بہت اصرار کے ساتھ مجھے لکھا تھا کہ میں اسے تلاش نہ کروں۔ لیکن میرے لیے ایسا کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں نے اگلے تقریباً چار ماہ میں سر توڑ کوششیں کیں۔ جہاں جہاں اس کا کھوج مل سکتا تھا، میں وہاں پہنچا۔ جہاں خود نہ جا سکا، وہاں ہرکارے دوڑائے... نصر اللہ کا تو ڈیوٹی پر رہنا ضروری تھا مگر میرے باقی ساتھی رونق علی، تیمور، شبیر اور فیاض میوالی وغیرہ دن رات تلاش کے کام میں مصروف رہے۔

اپنے جانے سے کچھ ہفتے پہلے بلقیس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ حامد کو اس کی بڑی پھوپی کے پاس گجرات بھیج چکی ہے تاکہ وہ یہاں کے حالات سے دور رہے۔ بلقیس کی تلاش کے سلسلے میں، میں سب سے پہلے گجرات کے اس گاؤں میں ہی پہنچا تھا۔ وہاں جا کر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ حامد اپنی بڑی پھوپی کے پاس آیا ہی نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بلقیس نے یہ بات بھی مجھ سے چھپائی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے پیش آنے والے حالات کے تیور پہلے ہی بھانپ لیے تھے اور شاید لاشعوری طور پر کچھ قدم بھی اٹھا لیے تھے۔ اس نے حامد کو پہلے ہی اس نامعلوم مقام کی طرف روانہ کر دیا تھا جہاں وہ خود جانا چاہتی تھی... یا پھر اس نے وقتی طور پر اسے کہیں اور رکھا تھا اور بعد میں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ہم بلقیس کی تلاش کے سلسلے میں اس کے دور دراز کے رشتے داروں تک بھی پہنچے مگر اس کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ تلاش کا کام میں ہی نہیں، بلقیس کے بھائی اور ماموں وغیرہ بھی پوری شدت سے کر رہے تھے مگر کسی کے حصے میں بھی ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں آیا۔

میں ایک دن بلقیس کا آخری خط تیمور کے سامنے کھولے بیٹھا تھا۔ میں نے کہا۔ ”یار تیمور! بلقیس نے یہاں ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ اکیلی نہیں۔ ایک بزرگ سرپرست بھی اس کے ساتھ ہیں۔ یہ کون ہو سکتے ہیں؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”کہیں یہ وہ مولوی یوسف صاحب تو نہیں جنہوں نے ہمارا نکاح پڑھایا تھا؟“

تیمور کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”ہاں، ایسا ہو بھی سکتا ہے۔“

ہم دونوں ایک سیکنڈ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ چند ہی منٹ بعد ہماری جیپ طوفانی رفتار سے گوجرانوالہ کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ گوجرانوالہ پہنچنے کے بعد مولوی یوسف صاحب کا ٹھکانا ڈھونڈنے میں ہمیں دو گھنٹے کے قریب لگے۔ یہ ان کے ایک مرید کا گھر تھا لیکن یہ بھی کوئی مستقل ٹھکانا نہیں تھا۔ دراصل مولوی یوسف صاحب کا کوئی مستقل ٹھکانا تھا ہی نہیں۔ وہ اکثر سفر میں ہی رہتے

www.pkdigest.com

تھے۔ اس صورتِ حال نے ہمارا کام اور مشکل کر دیا مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ اگلے تین چار ہفتے میں ہم نے ان محترم بزرگ کے ہر ممکنہ ٹھکانے تک رسائی حاصل کی مگر یہ سب کچھ بھی بے سود رہا۔ انہی دنوں شاہ نواز بھی اسپتال میں اپنی زندگی کی بازی ہار گیا۔ قبرستان والے واقعے میں اسے کئی گولیاں لگی تھیں۔ وہ کئی ماہ تک اسپتال میں اپنی زندگی کی جنگ لڑتا رہا تھا۔ اس بے لوث مددگار کی موت نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔

... جوں جوں وقت گزرتا گیا، بلقیس کی تلاش کی رفتار دھیمی پڑتی گئی۔ اس کی یادیں مدھم پڑنے لگیں۔ یہی دستورِ زمانہ ہے لیکن دل کی دنیا کے دستور علیحدہ ہوتے ہیں۔ میری آنکھیں اب بھی ہر گھڑی اس کی اور حامد کی متلاشی تھیں۔ ہر صبح آس بندھتی، ہر شام ٹوٹ جاتی تھی۔ مجھے جاگیر کے کاموں کے لیے بھی کافی وقت دینا پڑتا تھا مگر جونہی مجھے ذرا فرصت ملتی تو اس کی تلاش کے کام میں جُت جاتا۔ بے بے جی تعویذ اور دم درود پر بھی بہت اعتماد رکھتی تھیں۔ وہ بھی میرے اور بھی تیمور کے ساتھ دور دراز کے عاملوں تک پہنچتیں اور مشکل کشائی کی کوششیں کرتیں۔

شروع شروع میں کچھ لوگوں نے مجھ پر بھی انگلیاں اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ مجھے بلقیس کی گم شدگی میں ملوث کرنا چاہ رہے تھے مگر جلد ہی بدنیتی سے اڑایا ہوا یہ غبار بیٹھ گیا۔ کچھ بھی ہے، سچ کی اپنی تاثیر ہوتی ہے اور پھر بلقیس نے حویلی کے وکیل اقبال راٹھور کی مدد سے بریت کے جو انتظامات کروائے تھے اور خط کی شکل میں جو تفصیلی تحریر چھوڑی تھی، انہوں نے شبہات کی گنجائش کم ہی رہنے دی تھی۔ جاگیر کے عام لوگ اس بات پر ششدر تھے کہ ان کی بیگم جی اچانک اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے بچے کے ساتھ کس طرف رخ کر گئی ہے؟ اس بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کی جاتی تھیں۔ ایک قیاس آرائی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے قریبی رشتے داروں کے لالچی رویے سے بددل ہوگئی تھی۔ گوجرانوالہ کے مولوی یوسف صاحب بھی دوبارہ کسی کو نظر نہیں آئے۔ اس لیے میرا یہ خیال تقویت پکڑ چکا تھا کہ اپنے خط میں بلقیس نے جس محترم بزرگ کا ذکر کیا، وہ مولوی یوسف ہی تھے۔

بلقیس کی اور میری شادی کا علم کل سات افراد کو تھا۔ ان ساتوں افراد نے اپنی زبانوں کو بالکل بند کر لیا تھا۔ کسی کو بھنک تک نہیں پڑنے دی گئی تھی۔ اس کے باوجود لمبڑ برادری کے کچھ لوگوں نے خیال آرائی کی کہ شاہ خاور، بیگم سے شادی کر چکا تھا۔ بہرحال، اس بات کا چونکہ کوئی ثبوت نہیں تھا اس لیے یہ بات زور نہیں پکڑ سکی۔

میں چاہتا تو مجھے جاگیر میں سب سے بااختیار حیثیت حاصل ہو جاتی۔ مگر میں نے چودھری یعقوب اور والی جی کے چچازاد چودھری فراست کو کارمختار بنایا۔ ایک طرح سے وہ دونوں مشترکہ طور پر جاگیر کا کام چلانے لگے مگر ایسا بہت تھوڑے عرصے کے لیے ہی ہو سکا۔ چند ماہ کے اندر اندر ان لوگوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے یہ لڑائی بڑھتی چلی گئی اور خطرہ پیدا ہوا کہ موکھل جو اب تک پوری طرح دبے ہوئے تھے ایک بار پھر سر اٹھانا شروع کر دیں گے۔ جب حالات بہت بگڑ گئے تو راجوال کے چند بزرگ چودھریوں اور زمینداروں کے مشورے سے میں نے کارمختار کی کرسی خود سنبھال لی اور والی جی کی پہلی بیوی کے بیٹے کو جو قریبی قصبے میں چاولوں کا کام کرتا تھا، کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا کہ وہ میرے ساتھ مل کر جاگیر اور جاگیر کی زمینوں کا کام چلائے۔

آئندہ ایک دو سالوں کے اندر یہ تبدیلی بے حد کامیاب ثابت ہوئی۔ جاگیر کی زمینیں اور اس سے ملحقہ علاقہ بڑا زرخیز تھا۔ حالات ٹھیک ہوئے تو خوش حالی نظر آنے لگی۔ سب سے پہلے بجلی ہمارے ہی علاقے میں پہنچی۔ پھر سڑک کے لیے کوششیں شروع ہو گئیں۔ چھوٹے سے شفاخانے کو اسپتال کی شکل دے دی گئی۔ ان تبدیلیوں کے بعد موکھلوں نے بہتر سمجھا کہ وہ دشمنی کے بجائے ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور جو سہولتیں علاقے میں پہنچ رہی ہیں، ان میں سے اپنا حصہ حاصل کریں۔

ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن دوسری طرف بلقیس کی یادیں پل پل میرے ساتھ چل رہی تھیں۔ اسے جاگیر چھوڑے اب چار سال ہونے کو آئے تھے۔ کبھی کبھی میں تنہا بیٹھتا اور اپنی کامیابیوں پر نظر دوڑاتا تو دل میں امید سی پیدا ہونے لگتی۔ میں سوچتا کہ بلقیس جو کام میرے ذمے لگا گئی تھی، وہ میں بہ احسن طریق کر رہا ہوں۔ کیا پتا کہ وہ میری ان کامیابیوں سے آگاہ ہو۔ میری اس انتھک محنت کے صلے میں وہ میری منتظر آنکھوں کا انتظار ختم کر دے۔ کسی شام جب راجوال کے گھروں میں کھڑکیاں روشن ہو رہی ہوں، وہ دبے پاؤں واپس آجائے۔ عقب سے میرے گلے میں باہیں ڈال دے اور سسک کر کہے۔

”تمہارا امتحان ختم ہو گیا خاور... میں اب تم سے اور دور نہیں رہ سکتی۔“

لیکن شامیں آتی رہیں، کھڑکیاں روشن ہوتی رہیں۔

آس کے دیے جلتے اور بجھتے رہے... کسی نے عقب سے میرے گلے میں باہیں نہیں ڈالیں۔ بھیگی ہوئی آواز میں یہ نہیں کہا۔ ”تمہارا امتحان ختم ہو گیا خاور!“

پھر بھی کبھی جب دل کو کچھ قرار ہوتا، مجھے بلقیس کی ایک بات یاد آتی۔ شادی کے بعد جب گوجرانوالہ سے راجوال واپس آتے ہوئے میں اداس ہو گیا تھا اور میں نے بلقیس سے پوچھا تھا، اب کب ملیں گے؟ اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ”کیوں... ابھی دل بھرا نہیں؟ تم تو کہا کرتے تھے بس ایک بار ہم جی بھر کر ایک دوسرے سے مل لیں، پھر میں پوری زندگی کا سفر بھی خوشی سے کاٹ سکتا ہوں... اور اب تو ایک بار نہیں، کئی بار ملے ہیں۔“

میں اس انداز سے سوچتا تو خود کو ناشکرا محسوس کرنے لگتا۔ میں نے کہیں مشہور فلاسفر شیلے کا ایک قول پڑھا تھا۔ ”محبت کا ایک گھنٹا سو برس کی بے محبت زندگی سے بہتر ہے۔“ اور واقعی ایک دور ایسا تھا جب میں بلقیس سے صرف ایک بھرپور ملاقات کے عوض اپنی ساری زندگی بہ خوشی لٹا سکتا تھا... اور اس نے ایک نہیں، کئی حسین ملاقاتیں میری جھولی میں ڈالی تھیں۔ دس دن یعنی 240 گھنٹے اور ہزاروں منٹ۔ وہ ایک ایک پل اس کی محبت سے معمور تھا۔ ان دس دنوں میں شاید میں نے دس صدیوں کی زندگی جی لی تھی۔ اب وہ کچھ نہیں تھا لیکن ان دنوں کی حسین و جمیل یادیں تو میرے پاس تھیں۔ وہ یادیں میرے لیے زندگی کا قیمتی ترین سرمایہ تھیں۔

اس بارے میں سوچتے ہوئے مجھے یہ بھی یاد آتا تھا کہ شادی کے بعد گوجرانوالہ میں ہمارے قیام کا پروگرام پانچ دن تھا مگر بعد میں بلقیس نے کسی طرح قیام میں پانچ دن کا اضافہ کر لیا تھا۔ یقیناً وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کرنے والی ہے اس لیے زیادہ سے زیادہ وقت میرے پاس گزار لینا چاہتی تھی۔

اگلے ایک دو سال میں میرے دوستوں اور بہی خواہوں نے دو تین بار میری شادی کی بات چلانے کی کوشش کی۔ تیمور اس میں پیش پیش تھا۔ اس نے بے بے جی کو بھی اپنے ساتھ ملایا۔ بے بے جی اکثر آنسو بہاتی تھیں اور کہتی تھیں۔ ”پتر! ابھی تو تو جوان ہے۔ جب عمر ڈھل جائے گی اور ہتھ پیروں میں وہ زور نہیں رہے گا تو کون تیرا سہارا بنے گا؟ تیری نسل آگے کیسے چلے گی؟“

بے بے جی کی ان باتوں کا جواب میرے پاس خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہی خاموشی تیمور اور دیگر خیرخواہوں کے لیے بھی تھی۔ میری زندگی میں اب اور کوئی نہیں آسکتا تھا اور نہ مجھے کوئی خواہش تھی۔ وقت کا پہیا چلتا رہا۔ دن اور رات ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے۔ پل گھڑیوں میں، گھڑیاں پہروں میں اور پہر دنوں اور ہفتوں میں بدلتے رہے۔ میں کاروبارِ روز و شب میں کھویا رہا اور زندگی کا سفر طے کرتا رہا۔ اس سفر میں چھوٹے چھوٹے پڑاؤ بھی آتے تھے۔ کسی سنسان دوپہر کا پڑاؤ، کسی سہانی شام یا چاندنی رات کا پڑاؤ۔ ایسے پڑاؤ میں، میں کہیں کھو جاتا۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی میری آنکھیں دور افق میں کسی کو ڈھونڈنے لگتیں۔ کئی دفعہ انتظار کا انجام معلوم ہوتا ہے پھر بھی انسان انتظار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں بھی بس عادتاً انتظار کرتا۔ افق کی طرف دیکھتا رہتا لیکن وہ نہیں آئی۔ اسے نہیں آنا تھا۔ وہ کہنہ رسم و رواج سے ٹکرانے کی طاقت نہیں رکھتی تھی اس لیے اوجھل ہو گئی تھی۔ بالکل ایسے جیسے صبح کا تارا، جلتے سورج کے روبرو ہونے سے پہلے ہی بدن چرا کر نکل جاتا ہے۔

☆☆☆

ان واقعات کو اب چھبیس ستائیس سال گزر چکے ہیں۔ میری عمر اب ساٹھ کے قریب ہے۔ بیشتر بال سفید ہو چکے ہیں۔ نظر بھی کچھ کمزور ہو گئی ہے۔ میری حیثیت جاگیر کے کارمختار کی ہی ہے۔ والی جی کی پہلی بیوی کا بیٹا احمد نائب کی حیثیت سے میرے ساتھ ہے۔ مگر وہ اپنے مزاج کا بندہ ہے۔ اسے جاگیر کے کاموں سے زیادہ دلچسپی نہیں بلکہ اب وہ اپنے ”چاولوں کے کاروبار“ کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے پاس اس کی ضروریات سے بہت بڑھ کر پیسا ہے۔ اس لیے وہ پہلے سے زیادہ کاہل ہو گیا ہے۔ اس کی والدہ فوت ہو چکی ہیں۔

جاگیر کے گاؤں اب علاقے کے بہترین گاؤں شمار ہوتے ہیں بلکہ اب ان کو قصبہ جات ہی کہنا چاہیے۔ خاص طور سے راجوال میں بجلی، سڑک، فون، اسکول اور اسپتال جیسی ساری سہولتیں میسر ہیں۔ جاگیر کی چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی پھل پھول رہی ہیں۔ یہ سب اللہ کا کرم ہے... اور پھر اس ”قوتِ پرواز“ کا کرشمہ ہے جو کسی کی محبت نے دھیرے دھیرے میرے خون میں شامل کی تھی۔

دس بارہ سال پہلے جب چھوٹا موکھل، چودھری بنا تو موکھلوں سے ایک بار پھر تنازعے شروع ہوئے۔ دو تین لڑائیاں بھی ہوئیں لیکن ہم نے موکھلوں کو دوبارہ سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔

میرے قریبی ساتھیوں میں سے رونق علی داغِ مفارقت دے چکا ہے۔ آٹھ نو سال پہلے جب وہ شراب اور حقہ نوشی چھوڑنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا، اچانک فرشتۂ اجل

www.pkdigest.com

نے آکر اسے ''ہیلو چودھری صاحب'' کہہ دیا۔ اس میں کچھ قصور شاید چودھری رونق کا بھی ہو۔ وہ شراب کو مکمل طور پر چھوڑنے سے پہلے چند روز جی بھر کر پینا چاہتا تھا۔ بس ''لال پری'' سے یہی آخری ملاقاتیں اس کی زندگی کو فل اسٹاپ لگا گئیں۔ اس کی موت نے ایک عرصے تک مجھے غم زدہ رکھا۔

بے بے جی بھی اللہ کے پاس جا چکی ہیں... عارفہ اب چار بچوں کی ماں ہے اور اپنے شوہر جمیل کے ساتھ راجوال میں ہی ہے۔ اماں دلشاد کی تینوں بیٹیاں بھی نارمل زندگی بسر کر رہی ہیں۔ راجوال کے جدی پشتی چودھریوں میں سے کئی اہم زمیندار اپنی کہنہ قدروں سمیت مٹی میں جا چکے ہیں، ان میں چودھری یعقوب بھی شامل ہیں۔ نئی نسل قدرے بہتر ہے۔

اس کہانی میں اب ایک آخری قابلِ ذکر واقعہ آپ کو بتانا چاہتا ہوں، اس کے بعد آپ سے اجازت چاہوں گا۔

پندرہ بیس روز پہلے میں اپنی ڈائری کھولے بیٹھا تھا۔ اس میں آخری چند صفحے سادہ پڑے تھے۔ کئی بار خیال آتا تھا کہ ان آخری صفحات پر بھی کچھ نہ کچھ لکھ دوں اور پھر اس ''پرواز'' نامی روداد کو کہیں محفوظ کر دوں۔ اس دن بھی شاید میں یہی سوچ رہا تھا... یا شاید ویسے ہی ڈائری کے صفحات پر نگاہ دوڑا رہا تھا۔ اچانک نصر اللہ نے آکر بتایا کہ کوئی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے اندر بھیجنے کو کہا۔

ایک جواں سال شخص مستحکم قدموں سے چلتا ہوا اندر آگیا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔ اس کی پیشانی سے بال ذرا اڑے ہوئے تھے مگر چہرہ خوب روشن تھا۔ اس کی عمر چالیس سے اوپر ہوگی مگر وہ اپنی صحت اور اسمارٹنس کی وجہ سے پینتیس چھتیس کا نظر آتا تھا۔ ایک بھرپور شخص!

میں نے اسے دیکھا اور جسم میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ لگا کہ میں نے اس بندے کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ وہ بھی یک ٹک مجھے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی روشن آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک نظر آئی۔ پھر ایکا یک جیسے میرے ذہن میں پھلجھڑیاں سی چھوٹ گئیں۔ میں ہکا بکا کھڑا ہو گیا۔ میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ ''حامد!''

اس کے ہونٹ بھی لرزے۔ ہم دونوں بھاگ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ارد گرد کی ہر شے میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ میں اس کے سر اور پیشانی کو چومتا چلا گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ پیوست تھا اور مجھے اپنی مضبوط بانہوں میں جکڑتا چلا جا رہا تھا۔

ہاں، یہ حامد تھا۔ آج قریباً ستائیس برس بعد میں اسے دیکھ رہا تھا... اور وہ اکیلا تھا۔ ہم کتنی ہی دیر، ایک دوسرے کو دیکھ کر آنسو بہاتے رہے۔ پھر میں نے پوچھا۔ ''تمہاری ماں کہاں ہے؟''

''وہ اب دنیا میں نہیں ہے۔'' حامد نے کہا۔

سینے میں چند لمحوں کے لیے گہری اتھاہ تاریکی پھیل گئی۔ اس تاریکی کے سمندر سے نکلنے میں مجھے کئی منٹ لگ گئے۔ آخر میں نے نم آنکھوں کے ساتھ پوچھا۔ ''کب گئی وہ؟''

''کوئی دو ماہ پہلے۔'' حامد نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے مجھ سے عہد لے کر رکھا تھا چاچا خاور کہ ان کی وفات سے پہلے میں یہاں نہیں آؤں گا اور نہ کسی سے ملوں گا۔ میں نے کئی بار کوششیں کیں لیکن ان سے یہ عہد ختم نہ کرا سکا۔ آپ کو پتا ہی ہے، وہ کچھ معاملوں میں کتنی سخت ہو جاتی تھیں۔ میں ان کے سامنے بالکل مجبور تھا۔''

''کہاں رہے تم اتنا عرصہ؟'' میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''ملتان کے قریب ایک موہل وال نام کا گاؤں ہے۔ یہاں نانا جی کے ایک دوست رہتے تھے۔ وہ مرتے وقت اپنا گھر نانا جی کے نام کر گئے تھے۔''

''کون نانا جی؟''

''مولوی یوسف صاحب، میں انہیں نانا جی ہی کہتا تھا۔ امی ان کو ابا جی کہنے لگی تھیں۔ وہ اپنی طرز کے عجیب انسان تھے۔ انہوں نے ہم ماں بیٹے کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ بی اے پاس تھے۔ امی کے کہنے پر انہوں نے مجھے دسویں تک گھر میں ہی پڑھایا۔ بعد میں، میں شہر کے ایک کالج میں جانے لگا۔ میں نے بی ایس سی کیا، پھر ایگری کلچر میں ڈگری لی۔ مجھے ایک اچھی جاب مل گئی۔ امی کے پاس جو پیسے تھے اس سے نانا جی نے کچھ زمین لے لی تھی۔ اس زمین کی آمدن سے ہماری گزر بسر بڑی آسانی سے ہوتی رہی ہے۔ یہ کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ نانا جی، حج سے واپس آئے اور چند دن بیمار رہ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے بعد امی اور زیادہ اداس رہنے لگیں۔ میں نے انہیں اکثر اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھے دیکھا۔ ان کی خوشی کے لیے میں نے شادی کی۔ اچھی بیوی ملی۔ اللہ نے گھر میں دو پھول بھی کھلائے۔ امی کا دل قدرے بہل گیا۔ لیکن ان کے اندر کی اداسی کبھی ختم نہیں ہوئی چاچا خاور!'' حامد نے عجیب جذباتی لہجے میں کہا۔ ''وہ گاؤں کو اور آپ سب کو بہت یاد کرتی تھیں۔ خاص طور سے...'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر اس نے فقرہ مکمل کر دیا۔ ''اور خاص طور سے آپ کو چاچا...''

میں سکتہ زدہ بیٹھا رہا۔ ایک بیٹے کے منہ سے میں اس کی ماں کے ''پیار'' کے بارے میں سن رہا تھا۔ حامد کے منہ سے ایک بار بے ساختہ یہ بات نکلی تو پھر وہ کچھ نہ چھپا سکا۔ اس نے اشکبار انداز میں کہا۔ ''ہاں چاچا خاور! انہوں نے آپ کو بہت چاہا ہے... بلکہ شاید ہر چیز سے زیادہ چاہا ہے۔ مجھے انہوں نے کچھ سال پہلے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ آپ سے شادی کر چکی تھیں۔ ان کے پاس نکاح نامے کی نقل تھی۔ انہوں نے مجھے وہ نقل بھی دکھائی تھی۔ ان کے پاس جو دو چار بہت قیمتی چیزیں تھیں، ان میں وہ نقل بھی شامل تھی۔ انہوں نے یہ نقل الماری کی ایک دراز میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ اکثر اس دراز کا تالا کھول کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اس دراز میں ایک ہار بھی تھا۔ یہ ہار آپ نے شاید کبھی انہیں تحفے میں دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک سادہ کاپی میں گلاب کے چند سوکھے پھول تھے۔ یہ پھول، آپ کے ساتھ ان کی شادی کی نشانی تھے۔ اور پھر کچھ تہ کیے ہوئے روپے تھے۔ یہ روپے وہ بہت سنبھال سنبھال کر رکھتی تھیں اور پھر ایک روز انہوں نے میرے اصرار پر بتا دیا تھا۔ یہ روپے آپ نے انہیں ''منہ دکھائی'' کے طور پر دیے تھے۔ وہ تہ شدہ روپے آج بھی اسی دراز میں پڑے ہیں۔ اور ہاں، اس کے علاوہ ایک پرفیوم تھا۔ خوشی کے موقع پر وہ یہ پرفیوم تھوڑا سا لگاتی تھیں اور خیالوں میں گم دیر تک خاموش بیٹھی رہتی تھیں۔ ستائیس اٹھائیس سال گزر چکے ہیں لیکن اس شیشی میں تھوڑا سا پرفیوم، گاڑھی حالت میں اب بھی موجود ہے...'' حامد رقت آمیز انداز میں مجھے ماں کی باتیں سناتا رہا۔ خود بھی روتا رہا اور مجھے بھی اشکبار کرتا رہا۔ آخر میں نے پوچھا۔ ''اس کا آخری وقت کیسا تھا؟''

''عصر کی نماز پڑھنے کے بعد وہ دیر تک مصلے پر ہی بیٹھی رہیں۔ میری بیوی سے پانی منگوا کر پیا پھر مصلے پر ہی لیٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا تو وہ جا چکی تھیں۔ دیکھنے میں یہی لگتا تھا کہ سوئی ہوئی ہیں۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے حامد کی آواز بھرا گئی۔ وہ روتے ہوئے بولا۔ ''میری ماں بڑی پیاری تھی، بڑی من موہنی تھی... وہ تھی نا چاچا؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔ ''حامد! وہ بڑی خوب صورت تھی... اور اس کے اندر کی خوب صورتی باہر سے بڑھ کر تھی۔ اللہ نے اسے بڑا سوہنا دل دیا تھا۔''

ہم دیر تک اس کی باتیں کرتے رہے، آنسو بہاتے

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

عید کی خوشیوں کے ہمراہ اکتوبر 2009ء کا شمارہ

ہر لحظہ بدلتی زندگی کی ہنگامہ آرائیاں اور مستقبل کے دلآویز خواب لیے **انجم انصار** اور **عالیہ بخاری** کے سلسلے وار ناول

ماضی کے آئینے میں جھلملاتے عکس کو وقت کی دبیز تہیں بھی منعکس ہونے سے روک نہیں سکتیں، اسی انداز میں **عطیہ عمر** کا مکمل ناول

مادی دنیا کی ضرورتوں سے قطع نظر ایک آواز ہماری صداقت و سچائی کو ہمارے سامنے بے نقاب کرتی ہے کچھ اسی تناظر میں **قیصرہ حیات** کا ناول

زندگی جن باتوں سے عبارت ہے ان میں ایک جذبہ محبت ہے۔ محبت کبھی کبھی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بھی روشناس کراتی ہے..... محبت کے جذبے سے گندھی **نگہت سیما** کی تحریر

افسانے

صائمہ اکرم، ثمرہ بخاری، رضوانہ پرنس، شمیم فضل خالق، گیتی آرا، نسرین صبا، مدیحہ عدنان، شمائلہ خیر احمد

اور **عالیہ حرا** کی دلچسپ تحریریں

آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

فون: 5895313 فیکس: 5802551

www.pkdigest.com

رہے۔ پتا ہی نہیں چلا، کب سہ پہر ہوئی اور کب شام ہوگئی۔۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میں تو حامد کو کھانا بھی نہیں پوچھ سکا۔ کھانا تیار پڑا تھا، میں نے اسی وقت لگوا لیا۔ ابھی تک کسی کو پتا نہیں چلا تھا کہ حویلی میں اترنے والا مہمان دراصل کون ہے۔ وہ اس حویلی کا اصل مالک تھا۔

رات کو بھی ہم دیر تک بلقیس کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے حامد سے پوچھا۔ ''کیا اسے جاگیر کی خبر تھی کہ یہاں کیا ہورہا ہے؟''

''ہاں چاچا خاور! کبھی کبھی نانا کے ذریعے انہیں یہاں کی خبر ملتی رہتی تھی۔ نانا کو کسی اور بندے کے ذریعے یہاں کے حالات کا پتا چلتا تھا۔ وہ جاگیر کی بہتری کے بارے میں جان کر مطمئن ہوتی تھیں لیکن وہ بھی کرید کر نہیں پوچھتی تھیں کہ کون کیا کررہا ہے۔ وہ جیسے ماضی کی ہر چیز سے دور رہنا چاہتی تھیں۔ کبھی نانا بتانا بھی چاہتے تو وہ کہہ دیتیں۔ ''رہنے دیں ابا جی۔''

...بات کرتے ہوئے حامد کی پیشانی پر چمک سی نمودار ہوجاتی تھی اور وہ تھوڑا سا آگے کو جھک جاتا تھا۔ وہی ماں والا انداز۔ میں اس کو مبہوت نظروں سے دیکھتا رہا۔ چوڑے شانے، روشن آنکھیں، لمبا قد... وہ ایک بھرپور مرد تھا۔ میں کمزور پڑ رہا تھا۔ اس جاگیر کو اب ایسے ہی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں چاچا خاور؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے چونک کر کہا اور دل ہی دل میں دعا کی کہ وہ ہر نظر بد سے بچا رہے۔

وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''چاچا خاور! ایک بات کہنا چاہتا ہوں، پر ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ کو بری نہ لگے۔''

''تمہاری کوئی بات مجھے کبھی بری نہیں لگ سکتی۔'' میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''میں نے آپ کو ہمیشہ چاچا کہا ہے لیکن میرے دل نے آپ کو ہمیشہ باپ کہا ہے اور باپ کی طرح ہی سمجھا ہے۔ اور سچ بھی ہے کہ مجھے باپ والی محبت اور توجہ ہمیشہ آپ ہی سے ملی۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ میں آپ کو چاچا کے بجائے اسی نام سے پکاروں، جس نام سے میرا دل پکارتا ہے؟''

میں نے کچھ دیر گم صم رہنے کے بعد کہا۔ ''نہیں حامد! یہ ممکن نہیں ہے۔ اور اگر ممکن ہوتا تو شاید تمہاری ماں کو بھی یہاں سے نہ جانا پڑتا۔ یہ بڑا اکھڑ معاشرہ ہے حامد۔ اور جتنا کھڑ ہے اتنا ہی کینہ پرور بھی ہے۔ یہ کچھ بھی بھولتا نہیں ہے... لیکن... میں تمہیں ایک اور نام بتا سکتا ہوں۔ اگر تم کبھی بھی اس نام سے پکارو گے تو مجھے اچھا لگے گا اور تمہیں بھی بہت اچھا لگے گا۔''

''کس نام سے؟''

''تم خود سوچو۔''

اس نے چند لمحے غور کیا پھر اس کی آنکھوں سے تازہ آنسو پھوٹے اور چہرے پر سرخی لہرا گئی۔ ''ماسٹر چاچا!'' اس نے کہا اور بے ساختہ مجھ سے لپٹ گیا۔

...وہ دن کے اندر ہی میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ مجھے لگا کہ میرے کندھوں سے ہزاروں من وزنی بوجھ اتر گیا ہے اور میری کمر جو جھکتی جارہی تھی پھر سیدھی ہورہی ہے یا شاید میں پھر جوان ہورہا تھا۔ جوان کڑیل بیٹا، جب بوڑھے باپ کے کندھے سے کندھا ملاتا ہے تو غالباً ہر باپ اسی طرح محسوس کرتا ہے۔

آدھی رات کے سناٹے میں میرا سر سجدے میں جھک گیا اور تادیر جھکا رہا۔ میں نے کہا۔ ''یا رب! میں گناہ گار، کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں۔ تو نے مجھے سرخرو کیا ہے۔ تو نے مجھے کسی کی محبت میں سرخرو کیا ہے اور ثابت قدم رکھا ہے۔ آج جبکہ ایک عمر بیت گئی ہے... زندگی کی شام ہوگئی ہے۔ میں سینہ تان کر کہہ سکتا ہوں کہ ہاں، میں نے محبت کی اور میری محبت ہوس نہیں تھی اور نہ ہی عارضی تھی۔ اس کا آغاز جیسے بھی الٹے سیدھے طریقے سے ہوا لیکن اس کے اندر سمندروں کی گہرائی اور پہاڑوں کی استقامت تھی۔ اور تو بھی یہ سب جانتا ہے میرے مالک... اور یہ تو ہی ہے جس نے مجھ جیسے کمزور بندے کو محبت کی لاج رکھنے کی ہمت عطا فرمائی۔ اور یہی نہیں میرے مالک! تو نے میرے امتحان کے آخر میں میرے ناتواں بڑھاپے کو ایک محبت کرنے والے بلند ہمت بیٹے کا سہارا بھی دیا ہے۔ میں کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں...''

ان رقت آمیز لمحوں میں، میں نے تہِ دل سے محسوس کیا کہ میں بے اولاد نہیں ہوں اور نہ ہی میں بے نشان مروں گا۔ جو ایسا کہتے ہیں وہ غلط کہتے ہیں۔

اسی روز سہ پہر تک میں نے منادی کرادی اور مساجد میں بھی اعلان کرادیا... علاقے کے ہر کس و ناکس کو خبر ہوگئی کہ والی جی کا جانشین حامد اد باپ جاگیر میں واپس آگیا ہے۔

اگلے روز صبح سویرے، بذریعہ جیپ میں حامد کے ساتھ ملتان روانہ ہورہا تھا۔ ملتان... جہاں کے ایک نواحی قبرستان میں، کیکر اور بیری کے گھنے پیڑوں کے نیچے بلقیس ابدی نیند سو رہی تھی۔ وہ وہاں میرا انتظار کررہی تھی۔

پل

محمد عفان

ہر شخص اپنی مخصوص فطرت، ذات کے اتار چڑھاؤ، اپنی خوشی غمی اور سکوت و کلام رکھتا ہے ...... سچا اور کھرا آدمی اپنے عہد اور گرد و پیش کے ماحول سے کسی صورت لاتعلق نہیں رہ سکتا. ایک ایسے ہی محنت کش آدمی کی روداد حیات ...... جو اپنے ہر عمل اور قول و فعل میں ایک منفرد حیثیت رکھتا تھا.

فکری، سماجی اور معاشرتی حوالوں کی عکاس ایک تعمیری سوچ کی غماز تحریر

اس دور تک پھیلی سنہری زمین میں گندم کی فصل لہلہا رہی تھی اور اس کے سنہرے گوشے اس زمین کو سنہرے رنگ سے جگمگا رہے تھے۔ بابا جلال نے فخر سے اپنی زمین کو دیکھا۔ اتنی اچھی فصل اور اتنی شاندار گندم کسی کی زمین پر نہیں تھی۔ ایک ہفتے بعد گندم کی کٹائی شروع ہونے والی تھی۔ شمال مشرقی ترکی میں بحیرہ اسود سے کچھ دور ایپار نامی اس گاؤں میں وہ سادہ ترک رہتے تھے جن کے آبا و اجداد نے یورپ اور ایشیا کے بڑے حصے کو فتح کر ڈالا تھا اور جنہوں نے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ اب وہ سلطنت قصہ پارینہ بن چکی ہے لیکن آج سے ایک سو دس سال پہلے بھی یہ سلطنت اپنے آخری دموں پر ہونے کے باوجود پوری شان و شوکت سے قائم تھی۔ اس کا رقبہ موجودہ ترکی سے دس گنا بڑا تھا اور یہ تین براعظموں تک پھیلی ہوئی تھی۔

بابا جلال کو ورثے میں ملنے والی زمین زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس کے بھائیوں نے زیادہ اچھی زمین ہتھیا لی تھی اور

اسے بنجر اور بے کار زمین دے دی تھی مگر اس نے اس بات پر جھگڑا نہیں کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس زمین کے پیچھے کیا جھگڑنا جو آخر میں سکڑ کر دو گز رہ جاتی ہے۔ دنیاوی زندگی کے بارے میں وہ بہت مثبت طرزِ عمل رکھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر مسئلہ حل کرنے کے لیے ہوتا ہے اور ہر مصیبت سے انسان سیکھتا ہے۔

اس لیے اس نے زمین کے مسئلے پر اپنے بھائیوں سے الجھنے سے گریز کیا جنہوں نے آبائی زمین کا اچھا حصہ خود لے لیا تھا۔ وہ صبر شکر کے ساتھ اپنی بیوی عطیہ کے ہمراہ اس زمین پر محنت و مشقت کرنے لگا۔ ان دنوں اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور دونوں میاں بیوی جوان تھے۔ اس لیے انہوں نے بھرپور محنت کر کے کچھ ہی عرصے میں اپنی زمین کو قابلِ کاشت بنا لیا تھا۔ زمین بنجر بھی تھی۔ اسے زرخیز بنانے کے لیے بابا جلال نے چند جانور پال لیے تھے جن کے گوبر سے بننے والی کھاد وہ زمین میں دبا دیتا تھا۔ اگرچہ یہ بہت مشکل کام تھا مگر اس کا نتیجہ شاندار نکلا تھا۔ چند سال بعد وہی بنجر زمین اتنی اچھی پیداوار دینے لگی تھی کہ اس کے بھائی اس پر رشک کرنے لگے۔ ان سب کی زمین سے جتنی فصل اٹھتی تھی، بابا جلال اکیلے اپنی زمین سے اس سے زیادہ فصل اٹھاتا تھا۔

پھر اس کے بچے ہوئے اور وہ بڑے ہو کر مدرسے میں جانے لگے۔ سولہ سال کی عمر میں اس کا بڑا بیٹا انور مدرسے سے فارغ ہو کر اس کے ساتھ زمین پر کام کرنے لگا تھا۔ مگر اس کی خواہش تھی کہ وہ سرکاری نوکری کرے۔ بابا جلال نے اس سے کہا۔ ”میرے بیٹے! بے شک سرکاری نوکری میں بہت مزے ہیں لیکن جو مزہ اپنی زمین پر کام کرنے کا ہے، وہ دنیا کی کسی اعلیٰ سے اعلیٰ نوکری میں بھی نہیں ملتا۔“

انور دیکھ چکا تھا جو رعب و دبدبہ سرکاری ملازمین کا ہوتا تھا، وہ بڑے سے بڑے زمیندار کا بھی نہیں ہوتا تھا۔ حکومت کا معمولی سا اہلکار گاؤں میں آجاتا تھا تو سب اس کے آگے بچھ جاتے تھے۔ اس کی خاطر تواضع اور آؤ بھگت میں کوئی کمی نہیں رہنے دیتے تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے سامنے یا اس کے کسی فیصلے پر چوں بھی کرے۔ انور نے مدرسے کے زمانے میں ہی سوچ لیا تھا کہ وہ سرکاری نوکری کرے گا اور ممکن ہوا تو فوج میں بھرتی ہو جائے گا۔ اس زمانے میں ترک فوج میں بھرتی ہونا بہت عزت کی بات سمجھی جاتی تھی اور ہر کسی کو فوج میں لیا بھی نہیں جاتا تھا۔ انور کو پتا چلا کہ فوج میں جانے کے لیے اعلیٰ خاندان سے ہونا لازمی ہے اور وہ ایک غریب دیہاتی کا بیٹا ہے تو وہ بہت مایوس ہوا۔ بابا جلال نے اسے تسلی دی۔

”تم اپنی زمین پر کام کر سکتے ہو۔ یہ تم سے کبھی تمہارا حسب نسب نہیں پوچھے گی۔ یہ صرف محنت کرنے والے ہاتھ کو پہچانتی ہے اور اپنا خزانہ اسے بخش دیتی ہے۔“

انور کو اپنے باپ کی یہ باتیں زیادہ سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ وہ زمین پر کام کرے۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا دل لگ گیا اور اس نے زمین پر دلجمعی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصے بعد جلال نے اس کی شادی کر دی اور ایک سال بعد وہ خود بھی باپ بن گیا۔ ایک ایک کر کے اس کے سارے بچوں کی شادیاں ہوتی چلی گئیں۔ ان کے بھی بچے ہو گئے تھے۔ اب بابا جلال صحیح معنوں میں بابا کہلانے کا مستحق ہو گیا تھا۔

یہ چھوٹا سا گاؤں ملک کے ایک دور دراز گوشے میں تھا جہاں جدید ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ پختہ سڑکیں بہت کم تھیں اور ریل گاؤں سے پچاس میل کے فاصلے سے گزرتی تھی۔ یہاں رہنے والے لوگ گاؤں سے باہر بہت کم گئے تھے اور ان میں سے بہت کم لوگوں نے کوئی بڑا شہر دیکھا تھا۔ زندگی بہت سادہ تھی۔ سادہ سے مکانات، سادہ سے لباس اور سادہ خوراک۔ ان کی زندگی میں بیرونی دنیا کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔

بہار کا موسم پورے جوبن پر تھا اور گندم کی فصل پک کر تیار تھی۔ بس چند دن بعد اس کی کٹائی شروع ہو جاتی۔ جب فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے اور اس کے اترنے کا وقت آتا ہے تو کسان کو اس وقت جو خوشی ہوتی، وہ بیان سے باہر ہے۔ اسے بجا طور پر کوئی کسان ہی محسوس کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر یہ فصل کسی وجہ سے برباد ہو جائے تو جیسا دکھ کسان کو ہوتا ہے اس کی شدت کو بھی کوئی کسان ہی محسوس کر سکتا ہے۔

بابا جلال خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس نے اور اس کے بیٹوں نے دن رات جو محنت کی، اس کے پھل کا وقت آ گیا تھا۔ وہ اس وقت اپنی فصل کا معائنہ کر رہا تھا۔ اچانک ہی جنوب مغرب کی جانب سے دھول سی اڑتی دکھائی دی۔ اس نے تشویش سے اس دھول کو دیکھا۔ مطلع صاف اور موسم اچھا تھا اس لیے اسے آندھی بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بڑا قافلہ حرکت کر رہا ہے اور قافلے کا رخ گاؤں کی زمینوں کی طرف تھا۔ جلال نے اپنے بیٹوں انور اور ہادی کو بلایا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا قافلہ ہے جو ہماری زمینوں کی طرف آ رہا ہے۔“

”اگر آ رہا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ انور نے ادب سے کہا۔ بابا جلال نے اسے خفگی سے دیکھا۔

”اگر یہ اتنا بڑا قافلہ ہے تو اس سے ہماری کھڑی فصل خراب ہو سکتی ہے۔“

اس بات نے سب کو پریشان کر دیا۔ گاؤں والے جمع ہو کر اس طرف بڑھے۔ وہ اس قافلے کے قریب پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ فوج کی ایک بہت بڑی رجمنٹ مارچ کرتی ہوئی ان کے علاقے میں داخل ہونے والی تھی۔ گاؤں والوں نے ان کا راستہ روک لیا اور بابا جلال گاؤں والوں کی طرف سے فوج کے کمانڈر سے بات کرنے گیا۔ اس قسم کے معاملات میں اسے ہی آگے رکھا جاتا تھا۔ بابا جلال نے کمانڈر سے کہا۔

”جناب! آپ کی فوج ہمارے علاقے کی طرف جا رہی ہے اور اس کی وجہ سے ہماری کھڑی فصلیں تباہ ہو جائیں گی۔“

”ہم آرمینیا جا رہے ہیں اور ہم صرف اسی علاقے سے گزر سکتے ہیں۔“ فوج کے سربراہ نے جلال کو بتایا۔ ”اگر ہمارے گزرنے سے تمہاری فصل برباد ہوتی ہے تو یہ مجبوری ہے۔“

”جناب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ بابا جلال پریشان ہو گیا۔ ”یہ فصل ہمارا سب کچھ ہے، اگر یہ خراب ہوئی تو ہم برباد ہو جائیں گے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ فاقوں کا شکار ہو جائیں گے اور خوشحال لوگ غریب بن جائیں گے۔“

فوج کا سربراہ ایک کرنل تھا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ”بابا! مجھے احساس ہے کہ فوج کی وجہ سے تم لوگوں کو مشکل ہو گی لیکن مجبوری ہے۔ یہ ملت و ملک کی بقا کا سوال ہے۔ ہماری فوج آرمینیا میں محاصرے میں ہے اور اگر ہم نے بروقت اس کی مدد نہیں کی تو اس میں سے اکثر لوگ مارے جائیں گے یا وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے اور ترکی کو ذلت آمیز شکست ہوگی۔ اس لیے ہمارا راستہ مت روکو۔“

”مگر ہماری فصل...“

”میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ تمہاری فصل کو ہونے والے نقصان کی مالیت تمہیں دلوا دوں گا۔“ کرنل نے اس کی بات کاٹی۔

بابا جلال سمجھ گیا تھا کہ کرنل نہیں مانے گا۔ فوج کا اپنا اصول ہوتا ہے، اس کے لیے اپنا مشن سب سے قیمتی ہوتا ہے اس لیے فوج نے مارچ جاری رکھا اور بلادریغ ان کی تیار فصل کو روندتے ہوئے گزرنے لگی۔ بابا جلال اور گاؤں کے دوسرے لوگ اپنی محنتوں کی محنت برباد ہوتے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے جو کمزور دل کے تھے، وہ رونے لگے اور بعض نوجوان جوش میں آگے مگر بڑے بوڑھوں نے انہیں باز رکھا۔ فوج سے ٹکر لینا کسی صورت مناسب نہیں تھا اور پھر یہ ان کی اپنی فوج تھی جو ملک کے دفاع کے لیے جا رہی تھی اس لیے وہ صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔

فوج بڑی تعداد میں تھی۔ اس میں ہزاروں گھڑسوار سپاہی اور بے شمار بیل گاڑیاں تھیں جن میں توپیں، گولہ بارود اور رسد کا سامان لدا ہوا تھا۔ جب یہ قافلہ ان کی زمینوں سے گزرا تو اس نے تقریباً ساری ہی فصل برباد کر دی تھی۔ چند گھنٹوں کے بعد وہاں سوائے تباہ شدہ فصل کے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ گاؤں والے اپنا صدمہ بھول کر یہ تخمینہ لگانے لگے تھے کہ انہیں کتنا نقصان ہوا تھا۔ جب انہوں نے یہ تخمینہ لگا لیا تو فوج کے کرنل کے دیے پروانے کے ساتھ اسے حکومت کے مقامی گورنر کے دفتر میں جمع کرا دیا۔ وہاں کچھ ضروری کارروائیوں کے بعد انہیں معاوضہ مل گیا۔ اگرچہ یہ معاوضہ ان کی تباہ ہونے والی فصل کی مالیت کے برابر نہیں تھا مگر پھر بھی وہ مکمل تباہی سے بچ گئے تھے۔ اس سال گاؤں میں فصل پکنے اور کاٹنے کا تہوار بھی نہیں منایا گیا تھا۔

ان کے لیے ایک پریشان کن خبر اور بھی تھی کہ اب آرمینیا میں جنگ زور پکڑ رہی تھی۔ ترکی کی سلطنت ایشیائے کوچک میں اپنے مقبوضات برقرار رکھنے کے لیے وہاں باقاعدگی سے فوج اور رسد بھیجتی... اور ظاہر ہے، فوج اور رسد ان کے علاقے سے ہو کر گزرتی۔ ان کی فصلیں مستقبل میں بھی خطرے سے دوچار رہتیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ آرمینیا جانے کے لیے اس پورے خطے میں یہی ایک راستہ تھا۔ اس علاقے کے شمال میں ایک پہاڑی ندی تھی۔ اس ندی سے ان کے علاقے کو پانی ملتا تھا۔ یہ ندی انہیں شمال کے لٹیروں سے محفوظ بھی رکھتی تھی۔ اس لیے اس پر آج تک کبھی کوئی پل نہیں بنایا گیا تھا۔ جب سے فصلوں کی بربادی کا واقعہ ہوا تھا، بابا جلال مستقل غور و فکر میں تھا۔ ان دنوں وہ کسی سے بات بھی کم کرتا تھا اور کبھی کبھی وہ اپنا تھیلا سنبھال کر کہیں چلا جاتا تھا۔ ایک بار گاؤں کے ایک آدمی نے اسے ندی کے پار سے تیر کر آتے دیکھا۔ لوگ حیران تھے کہ بابا جلال کس چکر میں ہے۔ پھر ایک دن بابا جلال نے اپنے گاؤں والوں سے کہا۔ ”ہمیں اس ندی پر پل بنا دینا چاہیے۔“

www.pkdigest.com

گاؤں والے حیران رہ گئے۔ ان میں سے بیشتر لوگوں کا ردِعمل ایسا تھا کہ جیسے بابا جلال سٹھیا گیا ہو۔ باقی بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ بابا جلال نے یہ بات کیوں کی تھی۔ انہوں نے اس سے کہا۔ ”یہ پل کیوں بنائیں؟ اس سے تو شمال کے لٹیرے ہمارے علاقے میں گھس آئیں گے۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔“ بابا جلال نے انہیں یقین دلایا۔ ”بلکہ اس پل کے بننے سے ہمارا علاقہ اور فصلیں محفوظ ہو جائیں گی۔“

گاؤں والے سمجھنے سے قاصر تھے کہ ندی پر پل بننے سے وہ کس طرح محفوظ ہو جائیں گے؟ بابا جلال اور گاؤں کے دوسرے بڑوں کے درمیان بہت بحث ہوئی مگر کوئی دوسرے فریق کو قائل نہیں کر سکا تھا تب بابا جلال نے اعلان کیا کہ وہ اس ندی پر پل بنا کر رہے گا اور کسی نے اس کا ساتھ نہیں دیا تو وہ اکیلا ہی یہ کام کرے گا۔ سب بابا جلال کا مذاق اڑانے لگے۔ جو اسے اب تک عقل مند سمجھتے تھے، وہ بھی اسے فاترالعقل قرار دینے لگے۔ مگر بابا جلال نے کسی کی پروا نہیں کی۔ اس نے ندی کا جائزہ لیا اور ایک موزوں مقام پر پل بنانے کی تیاری شروع کر دی۔

بابا جلال نے اس سے پہلے کبھی کوئی پل نہیں بنایا تھا مگر اس نے اپنا لکڑی کا گھر خود بنایا تھا۔ اس لیے اسے اچھی طرح پتا تھا کہ لکڑی کی مدد سے کوئی چیز کس طرح تیار ہوتی ہے۔ چونکہ گاؤں کے کسی بھی فرد نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے اس نے اپنے بیٹوں سے مدد طلب کی۔ انور اور ہادی نے اس سے کہا۔

”بابا! اگرچہ ہم بھی اس پل کی تعمیر کے اتنے ہی مخالف ہیں جتنے گاؤں کے دوسرے لوگ ہیں لیکن آپ کا حکم ہے تو ہم اس کام میں ضرور حصہ لیں گے۔“

”میرے بچوں... تم اس پر کبھی پچھتاؤ گے نہیں کیونکہ جو کام سب کی بھلائی کے لیے کیا جاتا ہے، اللہ اس میں برکت ڈال دیتا ہے۔ اس میں بہ ظاہر نقصان بھی ہو، تب بھی فائدہ ہوتا ہے۔“ بابا جلال نے ان سے کہا۔ اس طرح بابا جلال نے بیٹوں کے ساتھ ندی پر پل بنانے کا کام شروع کر دیا۔

اس پہاڑی ندی پر پل بنانا آسان کام نہیں تھا۔ اس کا پاٹ موسم سرما میں بھی کافی چوڑا ہوتا تھا۔ گرمیوں میں یہ پھیل کر مزید چوڑا ہو جاتا تھا۔ پانی کا بہاؤ پورے سال بہت تیز رہتا تھا اس لیے پل اتنا ہی بڑا اور مضبوط بنانا ضروری تھا۔

پل کے لیے انہیں لکڑی کے بڑے شہتیر درکار تھے۔ اس کے ساتھ بڑی مقدار میں کیلیں اور دوسرا سامان بھی چاہیے تھا۔ بابا جلال کے پاس گندم کی فصل کے نقصان کے عوض ملنے والی رقم تھی۔ اس نے اسی سے سامان خریدا اور پل کی تعمیر شروع کر دی۔ پل بنانے کا تجربہ ان باپ بیٹوں میں سے کسی کو نہیں تھا اس لیے شروع میں کچھ دشواری پیش آئی مگر رفتہ رفتہ وہ مشکلات پر قابو پاتے چلے گئے۔ پل بنانے میں وقت لگ رہا تھا کیونکہ کام کرنے والے وہ تین ہی تھے اور کام بہت بڑا تھا۔ اس کے باوجود بابا جلال کو امید تھی کہ وہ سرما کے دوران میں پل تیار کر لیں گے۔ اس کے بعد وہ اپنی زمین پر کام کر سکتے تھے۔ گندم کے بعد دوسروں نے تو مزید فصلیں لگا لی تھیں مگر بابا جلال کی زمین ایسے ہی پڑی تھی اور اس پر کوئی فصل نہیں لگی تھی۔ اس وجہ سے ان کے گھر میں کچھ مالی تنگی ہونے لگی۔ پھر بھی بابا جلال اور اس کے بیٹوں نے پل کی تعمیر کا کام نہیں چھوڑا۔

سرما کے آغاز میں جب سب لوگ اپنی زمینوں پر گندم کی بوائی کر رہے تھے، بابا جلال اور اس کے بیٹے پل کی تعمیر میں لگے رہے۔ بعض لوگوں نے بابا جلال کو سمجھایا کہ وہ پل کی تعمیر میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی زمین کاشت کرے ورنہ آنے والے دنوں میں اسے فاقے بھی کرنے پڑ سکتے ہیں۔ مگر بابا جلال نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ”میرے لیے اس پل کی تعمیر سب سے اہم ہے کیونکہ اس کی تعمیر سے ہمارا مستقبل وابستہ ہے۔“

گاؤں والوں نے کچھ زور دیا مگر جب بابا جلال اپنی بات پر اڑا رہا تو انہوں نے اسے خبطی سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اب سارا گاؤں تو زمین پر گندم کاشت کرنے لگا تھا اور بابا جلال اپنے بیٹوں کے ساتھ پل تعمیر کر رہا تھا۔ اسے یہ فکر بھی نہیں تھی کہ اگر اس نے اپنی زمین پر گندم کاشت نہ کی تو آنے والے سال میں اس کے گھرانے کو فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حقیقت یہ تھی کہ بابا جلال کا گھرانا ابھی بھی تنگی ترشی سے گزارہ کر رہا تھا کیونکہ گندم کے عوض سرکار سے ملنے والی رقم تو اس نے پل کی تعمیر پر خرچ کر دی تھی۔ بس اس کے پاس کچھ جانور اور کچھ مرغیاں تھیں۔ ان کے دودھ اور انڈوں کی فروخت سے گزارہ چل رہا تھا۔

اب بابا جلال کے پاس اتنی رقم نہیں رہی تھی کہ وہ پل کی تعمیر کے لیے لکڑی خرید سکتا اس لیے وہ اور اس کے بیٹے جنگل سے لکڑی کاٹ کر لانے لگے۔ اس طرح کام کی رفتار سست ہو گئی مگر ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ سرما کی آمد ہوئی اور اس کے ساتھ ہی گاؤں والے اپنی سرگرمیاں ترک کر کے اپنے گھروں میں رہنے لگے۔ ان دنوں شمال کی طرف سے یخ بستہ ہوائیں چلتی تھیں اور لوگوں کا گھروں سے نکلنا دشوار ہو جاتا تھا۔ اس لیے بس وہی گھر سے نکلتے تھے جنہیں کوئی مجبوری ہوتی تھی۔ مگر اس سرما کے دوران میں بھی بابا جلال اپنے بیٹوں کے ہمراہ پل کی تعمیر میں مصروف رہا تھا۔

پل اب تعمیر کے آخری مراحل میں تھا۔ اس کا ڈھانچا مکمل ہو چکا تھا اور اب صرف درمیانی تختوں کو لگانے کا کام رہ گیا تھا۔ اس کے لیے وہ تینوں لکڑی چیر کر موزوں تختے بنا رہے تھے۔ نئے سال کے شروع میں اچانک ہی بادل گھر کر آئے اور برف باری اور اس کے ساتھ یخ بستہ برسات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایسے میں بابا جلال کو مجبوراً کام روکنا پڑا مگر جیسے ہی برف باری اور بارش رکی، وہ پھر سے کام میں لگ گیا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ موسم بہار آنے سے پہلے پل مکمل ہو جائے۔

اب تک گاؤں والے پل کی تعمیر کو بابا جلال کی دیوانگی سمجھ رہے تھے۔ شروع میں انہیں یقین تھا کہ پل نہیں بنے گا اور بابا جلال خود ہی تنگ آ کر اسے چھوڑ دے گا مگر اب پل اپنی تکمیل کے آخری مرحلے میں تھا تو گاؤں والوں کو ایک خیال ستانے لگا تھا کہ اس پل کے بن جانے سے شمال کے لٹیرے ان کے علاقے میں آ کر لوٹ مار کر سکتے تھے۔ اب تک وہ محفوظ تھے مگر یہ پل بن جانے سے وہ غیر محفوظ ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے بابا جلال سے مطالبہ کیا کہ یہ پل توڑ دیا جائے۔

”یہ پل ہماری بقا کے لیے ضروری ہے۔“ بابا جلال نے اعتراض کرنے والوں کو جواب دیا۔ ”یہ بات تم اس موسم بہار میں اچھی طرح جان جاؤ گے۔“

”وہ کیسے؟“ ایک گاؤں والے نے پوچھا۔

”میں اس کا جواب ابھی نہیں دے سکتا... آنے والے وقت میں تمہیں اس کا جواب خود مل جائے گا۔“

بابا جلال نے اعتراض کرنے والوں کا اعتراض رد کر کے پل کی تعمیر کا کام جاری رکھا۔ ایک دن وہ کام سے فارغ ہو کر گھر آیا تو اسے بخار ہو گیا۔ اگلے دن یہ بخار اتنا بڑھ گیا کہ وہ کام پر نہیں جا سکا لیکن اس نے اپنے بیٹوں کو بھیج دیا تھا کہ وہ پل کو مکمل کریں اور اب اس معاملے میں کوئی تاخیر نہ کریں۔ بابا جلال کو غیر حاضر پا کر گاؤں والوں نے اس کے بیٹوں سے بات کی۔

”تم لوگ اس بے مقصد پل کی تعمیر روک دو۔“

انور نے جواب دیا۔ ”ہم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ہمارے باپ کا حکم ہے۔“

”اور ہم اپنے باپ کا حکم ضرور مانیں گے۔“ ہادی نے بھی بھائی کی تائید کی۔ دونوں بھائی پل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب بس چند دن کا کام رہ گیا تھا۔ اس کے بعد پل استعمال کے لیے تیار تھا۔ گاؤں والے پل کی ساخت دیکھ کر حیران تھے۔ یہ بہت چوڑا اور مضبوط پل تھا جسے بابا جلال نے اپنے دو بیٹوں کے ساتھ مل کر تیار کیا تھا۔ یہ اتنا چوڑا تھا کہ اس پر سے بڑی سے بڑی اور بھاری سے بھاری گاڑی گزر سکتی تھی۔ یہ شاہ کار تھا مگر گاؤں والے اب بھی فکر مند تھے کہ اس پل سے صرف لٹیرے ہی اس طرف آ سکتے تھے۔ گاؤں والوں کا ندی کے دوسری طرف کوئی کام نہیں تھا اور نہ ہی ان میں سے کوئی ندی پار جاتا تھا۔ اس لیے وہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ بابا جلال نے یہ پل کیوں بنایا تھا؟ اگر اسے ندی کے دوسری طرف کوئی کام مل گیا تھا تو اس نے انہیں کیوں نہیں بتایا؟

اس بار موسم بہار وقت سے ذرا پہلے ہی آ گیا تھا اور گرمی نے گندم کو پکا دیا تھا۔ اس لیے گاؤں والے پل کو بھول کر اپنی پک جانے والی گندم کی کٹائی کی فکر میں لگ گئے تھے۔ ساتھ ہی انہیں یہ اندیشہ بھی ستانے لگا تھا کہ کہیں پچھلے سال کی طرح اس بار بھی کوئی قومی قافلہ ان کی فصل کو روندتا ہوا نہ گزر جائے۔ اس بار بارشیں خوب ہونے سے فصل پچھلے سال کے مقابلے میں کہیں زیادہ شان دار ہوئی تھی۔ سوائے بابا جلال کی زمین کے ہر جگہ سنہری ہو جانے والی گندم لہلہا رہی تھی۔

بابا جلال ایک بار بیمار کیا ہوا، اس کی طبیعت سنبھل کر نہیں دے رہی تھی۔ بخار بار بار ہو جاتا تھا اور وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ بغیر سہارے کے گھر سے باہر بھی نہیں آ سکتا تھا۔ جب بہار اپنے عروج پر آئی تو بابا جلال کبھی کبھی گھر کے باہر آ بیٹھتا تھا۔ آنے جانے والوں سے سلام دعا کر لیتا تھا۔ لوگ اس سے اب بھی پوچھتے تھے کہ اس نے پل کیوں بنایا؟ اور وہ انہیں یہی جواب دیتا کہ ایک وقت آئے گا کہ وہ اس پل کی افادیت جان جائیں گے۔ مگر لوگ اسے دیوانہ سمجھتے تھے... جس نے اس پل کی خاطر اپنی صحت تباہ کر لی تھی اور اپنی زمین بھی کاشت نہیں کی تھی۔

”تم کیا جانو... میں نے اپنی ایک فصل کا نقصان کر کے اپنے آنے والے سالوں کی فصلیں محفوظ کر لی ہیں۔“ بابا جلال اعتراض کرنے والوں سے کہتا۔ مگر اس کے لڑکے پریشان تھے۔ ان کے پاس گزارے کے لیے کچھ نہیں تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں قرض لینا پڑے گا یا اپنی زمین

www.pkdigest.com

فروخت کرنا پڑے گی۔ یہاں روزگار محدود تھا۔ اس لیے انور اور ہادی نے اپنی زمین پر سبزی لگانے کا سوچا۔ اس میں خرچ کم آتا اور فصل بھی جلد تیار ہو جاتی۔ انہیں آنے والی گندم کی فصل تک سہارا مل جاتا اس لیے وہ زمین کی تیاری میں لگ گئے۔

بابا جلال کی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی تھی مگر کمزوری ابھی پوری طرح دور نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ ابھی کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بجائے انور اور ہادی کام کر رہے تھے۔ بابا جلال عام طور سے سارا دن گھر کے باہر بیٹھا مغرب کی طرف دیکھتا رہتا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ پھر ایک دن مغرب کی سمت سے دھول اڑتی نظر آئی۔ جیسے ہی بابا جلال نے یہ دھند دیکھی، اس نے شور مچا کر سب کو اکٹھا کر لیا تھا۔

''وہ دیکھو... سرکاری فوج پھر آ گئی ہے۔''

گاؤں والے پریشان ہو گئے۔ ابھی تو وہ پچھلے سال کی فصل کی تباہی نہیں بھولے تھے اور فوج ایک بار پھر ان کی فصل تباہ کرنے آ گئی تھی۔ مگر ساتھ ہی وہ جانتے تھے کہ وہ فوج کو نہیں روک سکیں گے۔ بابا جلال نے گاؤں والوں سے کہا۔

''میرے ساتھ چلو... اس بار ہم انہیں اپنی فصل برباد کرنے نہیں دیں گے۔'' وہ بہت جوش میں تھا حالانکہ اس بار زمین پر اس کی فصل بھی نہیں تھی۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' ایک آدمی نے مایوسی سے کہا۔ ''فوج بہر حال اسی جگہ سے گزرے گی اور اس کے گزرنے سے ہماری فصل بھی تباہ ہوگی۔ ہم انہیں نہیں روک سکتے۔''

''تم لوگ چلو تو... ہم ان سے بات کرتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی راستہ نکل آئے۔'' بابا جلال نے اصرار کیا تو وہ اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان سب کے دل میں ایک موہوم سی امید تھی کہ ہو سکتا ہے اس بار ان کی فصل بچ جائے۔ وہ سب ایک وفد کی صورت میں فوجی قافلے کے سامنے پہنچے اور بابا جلال نے فوج کے کمانڈر سے بات کرنے کا مطالبہ کیا۔ اتفاق سے اس بار بھی وہی کرنل کمانڈر تھا۔ اس نے کسی قدر ناراضی سے بابا جلال سے کہا۔

''تم ہمیں کیوں روک رہے ہو... کیا تمہیں پچھلی بار معاوضہ نہیں ملا تھا؟''

''جناب عالی! ہمیں معاوضہ تو مل گیا تھا مگر وہ ہماری محنت کا بدل تو نہیں تھا۔'' بابا جلال نے کہا۔

''تب تم کیا چاہتے ہو؟ ہمیں اس جگہ سے گزرنا تو ہے۔''

''جناب عالی! اگر کوئی ایسا حل نکل آئے کہ آپ یہاں سے گزر جائیں اور ہماری فصلوں کو بھی نقصان نہ ہو۔''

''اگر ایسا ہو جائے تو اچھا ہے۔ حکومت بھی معاوضے کی ادائیگی سے بچ جائے گی۔'' کرنل راضی ہو گیا۔

تب بابا جلال کرنل کو اس پل تک لے گیا۔ اس نے کرنل سے کہا۔ ''جناب عالی! آپ کی فوج نے اصل میں اس ندی کے پار جانا ہوتا ہے اس کے لیے آپ ہمارے علاقے سے گزرتے ہیں لیکن اب میں نے اور میرے دو بیٹوں نے مل کر فوج کے لیے یہ پل بنایا ہے۔ آپ کی فوج اس کی مدد سے بہ آسانی ندی کے دوسری طرف جا سکتی ہے۔''

کرنل نے پل کا معائنہ کیا اور پھر ندی کے پار دیکھا۔ ''ہاں، اس پل کی مدد سے ہم کم وقت میں اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔''

بابا جلال خوش ہو گیا۔ ''تب آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ اس پل کو استعمال کریں اور ہماری فصلوں کو برباد ہونے سے بچالیں۔''

کرنل نے بابا جلال کی طرف دیکھا۔ ''تم نے بتایا ہے کہ تم نے اس پل کو اپنے دو بیٹوں کی مدد سے بنایا ہے۔ کیا گاؤں والوں نے تمہاری کوئی مدد نہیں کی تھی؟''

''نہیں جناب... کیونکہ وہ اس پل کی افادیت نہیں سمجھ سکے تھے اور اسے گاؤں کے لیے خطرہ سمجھتے تھے کیونکہ شمال سے لٹیرے آ کر گاؤں پر حملہ کر سکتے ہیں۔''

''اب شمال سے کوئی نہیں آئے گا۔ ہم نے لٹیروں کو مار کر یہاں سے بہت دور بھگا دیا ہے۔'' کرنل نے فخر سے کہا۔ ''بابا جلال! میں حکومت کی طرف سے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے اپنی محنت سے ہمارے لیے ایک سہولت پیدا کی... اور میں مقامی گورنر کے نام ایک سفارشی رقعہ دوں گا کہ تمہیں اتنی رقم دی جائے جو اس علاقے میں فصل برباد ہونے کی صورت میں دی جاتی۔''

کرنل نے اسے ایک رقعہ لکھ دیا اور اس کے بعد اس کی ساری فوج پل کے اوپر سے ندی عبور کر کے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ بابا جلال نے رقعہ دکھا کر مقامی گورنر کے دفتر سے اتنی بڑی رقم حاصل کر لی جو اس سے پہلے سارے گاؤں والوں نے حاصل کی تھی اور وہ اب گاؤں کا امیر ترین آدمی بن گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ندی کے پار زمین کا ایک بہت بڑا حصہ اسے حکومت کی طرف سے بطور انعام دیا گیا تھا اور اسے اس سارے علاقے کا حاکم بنا دیا گیا تھا۔ بابا جلال کی مثبت سوچ کا خدا نے اسے بھرپور انعام دیا تھا۔

★

اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے ہر قدم اٹھا لینے والے ایک کم ہمت آدمی کا قصہ

راستوں کا تعین ہماری زندگی کے لیے ازحد ضروری ہے ...... مستقل مزاجی اس کے حصول کا ایک ذریعہ ہے ...... لیکن بسا اوقات یہی مستقل مزاجی ہمیں ایسے راستوں پر بھٹکا دیتی ہے جہاں سے منزل دور ہی نہیں، ناممکن بن جاتی ہے

فیصلہ

احمد صغیر صدیقی

ایلیٹ بنڈر اندھیرے میں ڈوبے ہوئے سپلائی روم میں کونے میں اکڑوں بیٹھا ہوا تھا... اپنے ہاتھ میں دبے لانبے پھل والے چاقو کو سنبھالے ہوئے۔

باہر... مین کاریڈور میں اسپتال کی سب زیں گنڈمڈ ہو رہی تھیں۔ لاؤڈ اسپیکرز، مریضوں کو لے جانے والی پہیے دار کرسیوں کی آوازیں، ادھر سے گزرتی نرسوں کی ہنسی تی صدائیں، کسی اکیلے گزرتے آدمی کے پیروں کی چاپیں۔

عجلت میں چرائی ہوئی اسپتال کی وردی میں بنڈر بھی اس بڑے سے اسپتال کا کوئی سرجن نظر آ رہا تھا۔

اس کے سر پر زرد و سبز رنگ کی ٹوپی اور اسی قسم کے لباس نے اس کے لباس کو چھپا رکھا تھا اور سرجن کے ماسک نے اس کے نقوش پر پردہ ڈال رکھا تھا۔

شاید شفٹ بدل رہی ہے۔ اس نے سوچا۔ اسے شفٹ کی تبدیلی تک انتظار کرنا تھا۔ اس وقت اسپتال میں خاصی ہلچل ہوتی تھی۔ ایسے میں کوئی توجہ نہ دیتا...

سیاہ چاقو کا پھل تیز تھا۔ اندھیرے میں یہ چاقو اسے اپنے ہاتھ میں کسی بھاری شکاری پرندے کے لانبے نکیلے ناخن جیسا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ مسکرایا۔ اس نے اپنی ریڈیم واچ پر نگاہ ڈالی۔ بس اب تھوڑی دیر کی بات اور تھی۔

گنجے ہوتے سر اور دبلے جسم والا بنڈر دیکھنے میں کسی طرح خطرناک نہ تھا۔ حقیقتاً وہ ایک مسکین سا آدمی تھا۔ کسی بینک کے کلرک جیسا... مگر وہ کسی بینک میں نہیں بلکہ ایک ہارڈ ویئر اسٹور میں کلرکی کرتا تھا۔ اندھیرے میں بیٹھے ہوئے بنڈر کے دماغ میں ان واقعات کا سلسلہ ابھر رہا تھا جن کی وجہ سے وہ اس جگہ اس حالت میں نظر آ رہا تھا۔ یہ وہ ہارڈ ویئر اسٹور تھا... جہاں وہ کوئی بیس سال سے ملازمت کر رہا تھا۔ بیس سال... یہ اسٹور لیو بن فورڈ سینئر کی ملکیت تھا جو ایک شفیق مزاج کا بوڑھا آدمی تھا اور جو اچھے اور محنتی کارکنوں کی قدر کرنا جانتا تھا۔ ایلیٹ ابتدا ہی سے یہاں ملازم تھا اور پوری وفاداری اور تندہی سے کام کرتا تھا۔ دس سال تک سب کچھ ہموار انداز سے چل رہا تھا۔ دس سال بعد ایلیٹ کو بن فورڈ ہارڈ ویئر کا منیجر بنا دیا گیا تھا۔ اس کی تنخواہ بڑھ گئی تھی اور اب وہ ایک بنگلے میں رہ رہا تھا۔ مسٹر بن فورڈ اس کے کام سے بہت خوش تھا۔ ایلیٹ بنڈر ہر لحاظ سے ایک کامیاب، مطمئن

اور آسودہ زندگی گزار رہا تھا۔

مگر یہ اسی وقت تک رہا جب تک بن فورڈ کا بیٹا وہاں نہیں آتا تھا۔ پھر بن فورڈ کے بیٹے بن فورڈ جونیئر نے اسٹور میں آنا شروع کر دیا۔ وہ ہر ہفتے کو اسکول کے بعد سے وہاں آجاتا تھا... کاروبار کو سمجھنے اور سیکھنے کے لیے۔ وہ ابھی نوعمر تھا اور اس کی شخصیت میں کوئی ختی نہیں پیدا ہوئی تھی مگر اس کی آنکھوں میں حاسدانہ چمک ضرور ابھر چکی تھی۔ وہ کسی گدھ کی طرح لگتا تھا... لاش کا منتظر۔ ایلیٹ نے طے کیا تھا کہ وہ اس پر بھروسا نہیں کرے گا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بن فورڈ جونیئر تعطیلات میں بھی اسٹور آنے لگا۔ اس کا وجود اسٹور کے سارے ملازمین کے لیے پریشانی کا باعث بن رہا تھا۔ خصوصاً ایلیٹ کے لیے۔ ایلیٹ سیاست، فراست اور بہترین رویے کی تکنیکوں سے بھی اس لڑکے کی بدخصلتی کو جیت نہیں سکا۔ بن فورڈ جونیئر خود کو خاصا لائق فائق سمجھتا تھا۔ اسے ہنڈر کی حاکمیت بھی زہر لگتی تھی اور وہ اس کی ہر تجویز رد کرتا رہتا تھا۔

مگر ایلیٹ بہت صابر فطرت کا آدمی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نوجوانی میں اس قسم کی حرکتیں عام ہوتی ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لڑکا تھوڑا بڑا ہو کر سدھر جائے گا۔ بس اسی خیال سے اس نے اپنے مالک بن فورڈ سینئر سے اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا... اچھا ہوتا کہ میں نے اسے بتا دیا ہوتا...!

مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ نتیجتاً اسٹور کے حالات خراب ہوتے رہے۔ ایلیٹ اور بن فورڈ جونیئر میں نفرت بڑھ رہی تھی اور وہاں کے سارے ملازمین نے بھی یہ بات نوٹ کر لی تھی مگر بن فورڈ سینئر اس سے غافل تھا کیونکہ وہ اب اسٹور میں بہت کم آتا تھا اور زیادہ تر اپنے گھر کے گارڈن میں مصروف رہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ حالات میں ایلیٹ کو یہ سب برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ تو صرف اس لیے خود پر قابو رکھے ہوئے تھا کہ ایک بار بن فورڈ سینئر نے اسے بتایا تھا کہ وہ شہر میں ایک اور ہارڈ ویئر اسٹور کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کی نہ صرف وہ نگرانی اس کے سپرد کرنے والا ہے بلکہ وہ بزنس میں اسے اپنا پارٹنر بھی بنانے والا ہے۔ بوڑھے مالک نے یہ بھی کہا تھا کہ اس سلسلے میں کاغذات تیار ہو رہے ہیں اور جونہی اس کا اٹارنی واپس آیا... جو کسی ضروری کام سے بہاماز گیا ہوا تھا... یہ کام شروع کر دیا جائے گا۔

وقت بہت تیزی سے کٹ گیا تھا۔ بن فورڈ جونیئر نے کالج کی تعلیم مکمل کر لی۔ اس کی شادی بھی ہو گئی۔ اس کی بیوی امید سے بھی ہو گئی۔ ایلیٹ کا خیال تھا کہ بزنس پارٹنر ہونے کی وجہ سے اس کے اور بن فورڈ جونیئر کے تعلقات یقینی طور پر بہتر ہو جائیں گے۔

مگر یہ اندازے درست نہ نکل سکے۔ اسی ویک اینڈ پر ایلیٹ نے اپنی بیوی کو بن فورڈ کے منصوبے سے آگاہ کیا تھا۔ اسی روز اسے ایک فون ملا۔ فون بن فورڈ سینئر کی بیوی کا تھا۔ اس بے چاری کی حالت بہت خستہ تھی۔ روتے ہوئے اس نے مطلع کیا کہ اس کا شوہر ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گیا ہے۔ یہ گویا گھنٹا بھر پہلے کی بات تھی۔ ایلیٹ کو واقعی صدمہ ہوا تھا... بلکہ شدید صدمہ۔ اسے لگا جیسے وہ خود یتیم ہو گیا ہو۔ اس وقت وہ بوڑھے کی موت سے اس قدر غم زدہ تھا کہ اس نے آگے درپیش آنے والی صورت حال پر غور بھی نہیں کیا۔

ظاہر ہے ایلیٹ نے اسٹور بند کر دیا... کفن دفن تک کے لیے۔ اس نے اس کے بیٹے سے رابطے کی کئی کوششیں کیں مگر فضول۔ پھر جب جنازے پر اس کے بیٹے کو دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ بن فورڈ جونیئر نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔

پھر جس روز اسٹور کھلا، اس روز آفس میں پہنچتے ہی اس نے دیکھا کہ نیا مالک اس کے کمرے میں اس کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ ایلیٹ کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اسے اس کی توقع تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کا سیٹ چھن جائے گی اور اس کی تنزلی ہوگی۔ تاہم جس طرح یہ لڑکا اس کے ساتھ پیش آیا وہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔

"گڈ مارننگ... ہنڈر! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔" بن فورڈ جونیئر نے کہا۔

"اچھا!"

"میرے پاس تمہارے لیے ایک بُری خبر ہے۔" اس نے زہریلے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیسی بری خبر...؟" ایلیٹ نے پوچھا۔

"خاصی بُری... میں تمہیں نوکری سے نکال رہا ہوں۔ تم اپنی چیزیں یہاں سے فوراً نکال لو اور آئندہ میں تمہیں یہاں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔"

"کیا؟" ایلیٹ کی آواز میں شدید غم و غصے کے باعث لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ "تم مجھے نکال رہے ہو؟"

"ہاں۔ میں نے یہی کہا ہے۔" بن فورڈ جونیئر مسکرایا۔

شاید اس شخص کی خبیث مسکراہٹ تھی یا وہ برسوں کا جمع شدہ کینہ جو سطح پر ابھر آیا تھا۔ جس نے اس کے دل میں اس کمینے نوجوان کے لیے نفرتیں بھر دی تھیں۔ اس لیے اسے یہ شخص دنیا کا سب سے گندہ اور بے حد قابلِ نفرت شخص محسوس

ہوا تھا۔

اور یہی اس معاملے کا نقطۂ آغاز تھا۔

بعد میں جہاں کہیں بھی ایلیٹ نے نوکری کی درخواست دی تھی اور تجربے کے ضمن میں بن فورڈ کے اسٹور کا حوالہ دیا تھا وہاں سے اسے کورا جواب ملا تھا۔ ایک جگہ سے اسے معلوم ہوا کہ بن فورڈ... اسٹور کے مالک کی جانب سے جو جواب انہیں ملا ہے، وہ اس قدر بُرا ہے کہ وہ اسے ہرگز نہیں رکھ سکتے... گویا بن فورڈ جونیئر نے نہ صرف اسے نوکری سے نکالا تھا بلکہ وہ اس کے مستقبل کو بھی تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

مجبوراً ایلیٹ نے ایک مل میں معمولی قسم کی نوکری کرلی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دشواریوں میں پھنستا چلا گیا۔ اس پر قرضہ بھی چڑھ گیا۔ اسے اپنا مکان بھی بیچنا پڑا۔ اس کی کار بھی بک گئی۔ اس کی بیوی بھی اس سے ناخوش رہنے لگی۔

وہ تقریباً ڈوب رہا تھا۔ تبھی اس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ وہ اس طرح اکیلا نہیں ڈوبے گا۔ کسی کو ساتھ لے کر ڈوبے گا۔ اب بن فورڈ جونیئر کو حساب دینا ہی ہوگا۔ پھر وہ اپنی تمام تر اذیت ناک سوچوں کے ساتھ انتقام کے بھنور میں اتر گیا۔

اس پاگل پن میں تیزی اس وقت پیدا ہوئی جب اسے اطلاع ملی کہ بن فورڈ جونیئر کے ہاں ایک لڑکے کی پیدائش ہوئی تھی۔

اس نے تب بن فورڈ کے اسٹور سے لایا ہوا وہ چاقو نکال لیا جس کا پھل لانبا بھی تھا اور بہت تیز بھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ابھری۔ بن فورڈ کا چاقو... بن فورڈ... یہ ایک اچھا خدائی انتقام تھا۔

اس نے کیب لی اور اسپتال پہنچ گیا۔ اس نے لفٹ پکڑی اور میٹرنٹی وارڈ پر اترا۔ وہ عجلت سے آگے بڑھا۔ وہاں اس نے موقعے کا انتظار کیا اور جب اس نے دیکھا کہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ تیزی سے یہاں کے سپلائی روم میں گھس گیا۔ وہیں سے اس نے سرجن کا لباس نکالا اور اسے اپنے کپڑوں کے اوپر پہن لیا۔

...اور اب وقت آگیا تھا۔

اس چھوٹے سے اندھیرے کمرے کے باہر گہما گہمی سی پیدا ہو رہی تھی۔ ایلیٹ تیار ہو گیا۔ اس نے اپنا چاقو سرجن کے لبادے میں چھپالیا۔ دروازہ کھولا اور کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر کاریڈور میں چلتے پھرتے لوگوں میں شامل ہو گیا۔ کاریڈور میں بہت سی وردی پوش نرسیں اور ملازمین ادھر اُدھر آجا رہے تھے۔

ہاں... یہ بہترین موقع تھا۔

اس نے ہال کو پار کیا۔ نئی ماؤں کے کمرے کے پاس سے گزرا اور اس نرسری کی طرف چلا جس میں گلاس والی کھڑکیاں تھیں۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کا منہ خشک ہو رہا تھا مگر یہ خوف کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اپنی فتح کی قربت کے باعث تھا۔ ’وہ مجھے نہیں پکڑ سکتے۔‘

اعتماد کے ساتھ بڑھ کر اس نے نرسری کا دروازہ کھولا جہاں ایک نرس ایک میز کے پیچھے بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔

’’کہیے۔‘‘ نرس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے ایک بھرپور مکا اس نرس کے چہرے پر رسید کیا۔ وہ بلا آواز نکالے ڈھیر ہو گئی۔ اسے دیکھے بغیر وہ آگے بڑھا اور اس روشن کمرے میں پہنچ گیا جہاں چھوٹے چھوٹے پلاسٹک کے باکس قطاروں میں سجے ہوئے تھے۔ یہاں کوئی تیس عدد نومولود بچے رکھے ہوئے تھے اور ایلیٹ جانتا تھا کہ اسے عجلت سے اپنا مسئلہ حل کرنا ہوگا۔

ہر بچے کی کلائی میں ایک بریسلیٹ بندھا ہوا تھا۔ بن فورڈ کے بچے کو تلاش کرنا مشکل نہ تھا کیونکہ بریسلیٹ پر باپ کا نام لکھا ہوتا تھا۔ کم از کم اس کا خیال یہی تھا۔ جس قدر عجلت سے ہوسکا اس نے سب سے قریبی بچے کی ننھی سی کلائی تھام کر اوپر اٹھائی اور اس کے بریسلیٹ پر لکھے نمبر اور ناموں کو دیکھنے کی کوشش کی۔ ’میرے خدا... یہ... یہ تو کوئی کوڈ ہے۔ اس پر تو کوئی نام نہیں۔‘

اسے دروازے کے ادھر سے کسی تحریک کا احساس ہوا۔ بہت ہی کم وقت تھا۔ ’مجھے فوراً کچھ کرنا ہوگا۔‘ اس نے نظر اٹھائی تو گلاس ونڈو میں اسے اپنا عکس دکھائی دیا... اور اس کے پیچھے اسے اسٹاف کے کئی لوگوں کی آنکھیں اپنی طرف نگراں نظر آئیں۔ ان سب کے چہروں پر خوف پھیلا ہوا تھا۔

اس نے دیکھا کہ اس نے اپنے ہاتھ میں وہ لانبے پھل والا چاقو دبا رکھا ہے اور یہ سبھی کو نظر آرہا تھا۔ اب سراسیمہ ہونے کی ضرورت نہیں... سوچو... سوچو۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اس نے سامنے رکھے باکسز کی جانب دیکھا... اور پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اب اسے کیا کرنا ہوگا۔

بس یہی ایک طریقہ تھا جس کے ذریعے اسے یقین ہو سکتا تھا۔ وہ پہلے باکس پر جھکا۔ اس کے ہاتھ کا چاقو اوپر سے نیچے آیا...

ان کی کُل تعداد تیس سے زیادہ نہ تھی۔ یہ کچھ زیادہ وقت لینے والا کام نہ تھا۔

پہلا رنگ

عبرت سرائے دہر میں ہر روز ایک حادثہ رونما ہوتا ہے ..... ایسا حادثہ جو زندگی کو موت سے دور کر دیتا ہے ..... ایسا حادثہ جو زندگی سے ہمکنار کر دیتا ہے ..... دائروں میں سفر کرتی ایک پیچ در پیچ الجھاتی ..... جھلساتی ..... دھوپ چھاؤں سے ملاتی ..... جدا کرتی داستان

خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو
ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے
خواب تو روشنی ہیں

دنیا گول ہے

احمد اقبال

وقت گزرتا ہے تو اپنے پیچھے تبدیلیوں کے عمل کی واضح نشانیاں چھوڑ جاتا ہے۔

گزشتہ وقتوں کا ہر لمحہ بالکل نامعلوم طریقے سے اس کے وجود کی شناخت کو بدلنے کے عمل میں مسلسل مصروف رہا تھا لیکن اسے پتا ہی نہ چلا تھا کہ وہ کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ اس کی صورت کے نقوش سے اس کے جسم کی ظاہری ساخت تک ان چودہ برسوں میں کتنی تبدیلیاں آچکی ہیں، اس کا اندازہ وہ خود بھی نہ کر پایا۔

جیل سپرنٹنڈنٹ برا آدمی نہیں تھا۔ کم سے کم اس کے حق میں اس نے کوئی برائی نہیں کی۔ اکبر کا رویہ جیل میں اچھا

تھا... اس کی کسی سے لڑائی نہیں ہوئی... احتجاج اور ہنگامہ تو دور کی بات ہے، اس نے کبھی شکایت تک نہیں کی۔ نہ کسی کے خراب رویے کی... نہ زیادتی کی... وہ خاموش رہتا تھا۔ کسی کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا تھا۔ بہت پوچھا جائے تو کہہ دیتا تھا کہ بھائی ہم سب دنیا میں اپنے اپنے اعمال کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ سب نے جان لیا تھا کہ وہ کون ہے۔ اس سے ہمدردی تو کسی کو کیا ہوتی... رفتہ رفتہ اپنے رویے سے اس نے ایک احترام کا جذبہ پیدا کر لیا تھا۔ سب جان گئے تھے کہ وہ پیشہ ور مجرم نہیں... ایک معزز آدمی تھا جسے گردشِ حالات نے یہاں پہنچا دیا تھا۔

جیل سپرنٹنڈنٹ نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”راجا اکبر! مبارک ہو۔ آج تمہاری رہائی کا دن ہے... اب تم کیا کرو گے؟“

اکبر نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھایا۔ ”جو اس کا حکم ہوگا۔“

”باہر کی دنیا بہت بدل گئی ہے راجا اکبر... کیا تمہیں اندازہ ہے کہ خود تم کتنے بدل گئے ہو؟“ اس نے ایک پرانا رجسٹر کھولا۔ ”دیکھو... یہ تم ہو... جب یہاں آئے تھے۔“

اکبر نے اپنے سامنے ایک تیس سال کے پُرعزم ہینڈسم نوجوان کا کلین شیو چہرہ دیکھا جسے آج وہ خود بھی دیکھتا تو پہچان نہ پاتا۔ اب اس کے چہرے پر گھنی سفید ڈاڑھی تھی۔ اس کے ماتھے اور رخساروں پر جھریاں وقت کے بے رحم ہاتھوں کی خراشیں بن گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی پُراعتماد چمک کی جگہ اداسی اور مایوسی نے لے لی تھی۔

”تم اور تم سے پہلے تمہارے والد نیو خورشید جیولری ایمپوریم کے مالک تھے؟“

اکبر نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ ”آپ جانتے ہیں؟“

”ہم... میرا مطلب ہے میرے والد اور ان کے والد... خورشید جیولری ایمپوریم کے پرانے خریدار تھے... خاندانی قسم کے...“

”سب پرانی باتیں ہو گئیں سر۔“ اس نے ایک آہ بھری۔

جیلر نے کھڑے ہو کے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”آئی وش یو سکسیس اگین... لو، یہ ایک ہزار روپے ہیں... رکھ لو... کام آئیں گے۔“

”تھینک یو سر...“ وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

جیل کا بلند و بالا آہنی دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ اس بار اکبر کو آزاد دنیا میں جانے کا راستہ دینے کے لیے... چودہ سال پہلے یہ دروازہ اس کے پیچھے بند ہوا تھا تو باہر کی دنیا واقعی کچھ اور تھی... آج وہ خود بھی اسے پہچاننے سے قاصر تھا۔

وہ بے یقینی اور خوف سے مڑ مڑ کے دیکھتا ہوا اس دروازے سے دور بھاگتا گیا... جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں تقدیر کا بے رحم ہاتھ اسے واپس نہ کھینچ لے۔ باہر کی دنیا میں اس کے آس پاس تیز تیز قدموں سے آتے جاتے، رکشا سے بس اور سائیکل سے کار تک ہر قسم کی سواری میں گزرنے والے ہزاروں انسان اسے یا اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ بات اسے بڑی عجیب لگی۔ جیل کے اندر ہر نگاہ پہچانتی تھی کہ وہ قیدی نمبر تین سو گیارہ ہے جو اغوا برائے تاوان کے جرم میں سزا کاٹ رہا ہے۔

اس نے اپنے لیے معمولی قیمت کا نیا شلوار قمیص خریدا کیونکہ جو لباس اس نے پہن رکھا تھا، وہ وہی تھا جو چودہ سال قبل جیل جاتے وقت اس کے جسم پر تھا... جوتے ٹھیک تھے... ایک ہیئر ڈریسر سے بال اور ڈاڑھی کے بے ترتیب بالوں کی تراش خراش کے بعد اس نے خود کو ایک بدلا ہوا انسان محسوس کیا اور پہلی بار آزادی کی خوشی اس کے لبوں پر مسکراہٹ بن کے نمودار ہوئی۔

ابھی تک اس نے صرف چائے کا ایک کپ پیا تھا... اب دوپہر ہو رہی تھی۔ اس کے پیٹ میں بھوک سے مروڑ سا اٹھا۔ اچھا کھانا کھانے کی خواہش پر اب اس کا اختیار تھا۔ ایک ہوٹل کے رش سے اس نے اندازہ کیا کہ یہاں کھانا اچھا ہوگا۔ اس نے کڑاہی گوشت کا آرڈر دیا۔

”چکن یا مٹن باباجی؟“ ویٹر نے بے صبری سے پوچھا۔

اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا... باباجی... کیا واقعی وہ چوالیس سال کی عمر میں اتنا بوڑھا نظر آتا ہے... ”چکن!“ اس نے جواب کے منتظر ویٹر سے کہا جو سولہ سترہ سال کا تو عمر لڑکا تھا۔ اس کے لیے وہ باباجی ہی تھا مگر اس میں زیادہ قصور اس کی بالشت بھر لمبی ڈاڑھی کا تھا جس کے زیادہ تر بال سفید ہو چکے تھے۔

ایک اور ہیئر ڈریسر سے کلین شیو بنوانے کے بعد وہ دکان سے باہر آیا تو اس نے اپنے وجود میں یقین اور توانائی کا نیا جذبہ بیدار ہوتا محسوس کیا۔ اڈیالہ جیل سے اس نے صدر بازار تک پیدل مارچ کیا تھا۔ اس کی نظریں اس دنیا کی تبدیلی کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں جو چودہ سال میں رونما ہو چکی تھیں۔ نئی دنیا کے پہلے نظارے نے اسے حیران کر دیا تھا لیکن اب وہ آج کی نئی دنیا میں ایڈجسٹ ہو رہا تھا۔

صدر سے وہ بس میں سوار ہو کے اسلام آباد آ گیا۔

مری روڈ کی گہما گہمی اور ٹریفک کے رش نے اسے پھر حیران کیا۔ وہاں بڑے بڑے پلازا بن گئے تھے اور دکانوں کی چمک دمک اور شان و شوکت پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس کی نظر نے پھر بھی ”نیو پٹیالہ جیولری ایمپوریم“ کو دیکھ لیا۔ اسے نظرانداز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ میلوڈی پر اتر گیا جہاں سے بلیو ایریا نزدیک تھا۔ ”نیو پٹیالہ فیشن جیولرز“ کو دیکھ کے اکبر کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ جیولری شاپ کے اندر ہر طرف آئینوں میں سیکڑوں روشنیوں کے عکس تھے۔ دروازے پر جدید اسلحے سے لیس دو وردی پوش سیکیورٹی گارڈز مستعد کھڑے تھے۔ ایک دربان اپنے معزز خریداروں کے لیے دروازہ کھولنے پر مامور تھا۔ سامنے لمبی لمبی نئی کاروں کی پوری قطار کھڑی تھی۔ مؤدب ڈرائیور ہر آنے جانے والے مالک کے لیے دروازہ پکڑے کھڑے تھے۔ ان میں زیادہ تر بڑے گھر کی بیگمات تھیں جو اپنے لباس، ہیئر اسٹائل اور انداز سے اپر کلاس کی نمائندگی کرتی تھیں۔

وہاں زیادہ دیر رکنا اسے مشکوک بنا دیتا۔ وہ آگے چل دیا مگر یہ پورا نقشہ اکبر کی نظر میں یوں اتر آیا تھا جیسے کیمرے کے لینس سے فلم پر تصویر۔ ایک وقت تھا کہ اسی دکان پر ”نیو خورشید جیولری ایمپوریم“ کا ایسا ہی بورڈ اپنی شان و شوکت سے نصب تھا اور اس کا باپ اس کا مالک تھا مگر وقت نے دغا کیا تھا اور وہ... راجا اکبر... جو اس کا مالک ہوتا، جیل میں چودہ سال گزار کے ایک عام آدمی کی طرح اس کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ وہ نہ اتنی استطاعت رکھتا تھا اور نہ ہمت کہ اندر قدم بھی رکھ سکے۔

وہ اپنے اندازے سے اتر گیا ورنہ اس کے لیے کسی بھی جگہ کو پہچاننا دشوار تھا۔ چوک سے ذرا آگے وہ دائیں ہاتھ پر مڑ کے چلتا گیا۔ یہاں ایک پوری کمرشل مارکیٹ وجود میں آ چکی تھی لیکن اندر کے راستے اس کے جانے پہچانے تھے۔ اسے اپنا پرانا گھر پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اب یہ ایک جدید طرز کی عالی شان کوٹھی تھی۔ نئے مالکوں نے فرنٹ ایلیویشن بدل کے اور ایک منزل کا اضافہ کر کے اسے بالکل بدل دیا تھا لیکن آس پاس بہت سے گھر بالکل بھی نہیں بدلے تھے۔ کوٹھی کے سامنے ایک بالکل نئے ماڈل کی ہنڈا سوک کھڑی تھی۔ شوفر بونٹ کا سہارا لیے سگریٹ پی رہا تھا۔ اندر سے فیشن ماڈل ٹائپ کی ایک لڑکی برآمد ہوئی۔ شوفر نے سگریٹ پھینک کے دروازہ کھولا۔ موبائل فون پر کسی سے مصروفِ گفتگو لڑکی اندر بیٹھ گئی... کار خاموشی سے آگے

بڑی بات

خطِ منجمد شمالی میں ایک بھٹکے ہوئے یورپین سیاح کو جب ایک عورت نظر آئی تو اس کی ہوس جاگ اٹھی مگر جب عورت نے ایک رات کے لیے دو ہزار ڈالر مانگے تو سیاح حیران رہ گیا۔ اس نے کہا۔ ”اتنی بڑی رقم!“ عورت نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے یہ رقم بڑی معلوم ہو رہی ہے مگر یہ بھی تو سوچیے کہ یہاں رات بہت بڑی، پورے چھ مہینے کی ہوتی ہے۔“

بڑھ گئی۔

اکبر نے مزید رکنا مناسب نہ سمجھا۔ وقت جو گزر گیا تھا، صرف اس کی یاد میں رہ گیا تھا۔ اس کے تصور میں صرف اذیت تھی۔ سوال جو مسلسل اس کا تعاقب کرتا چلا آ رہا تھا... جیل کے آخری ایام سے... یہ تھا کہ اب وہ کہاں جائے... بلاشبہ اس شہر میں اس کے آشنا... دوست... خاندانی تعلق دار... سب ہی تھے لیکن اس میں ہی ہمت نہ تھی کہ کسی کے سامنے جا سکے... اور پھر سوال ایک دن یا ایک رات کا نہیں... مستقبل کا تھا۔

وہ ایک پارک میں بیٹھ کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھتا رہا۔ درد کی ایک لہر نے اسے تڑپا دیا۔ معلوم نہیں اس کے اپنے بچے اب کہاں ہوں گے؟ وہ بھی اتنے ہی بڑے تھے... ایسے ہی شوخ و شریر اور بھولے بھالے... اب وہ جوان ہوں گے... بفرضِ محال وہ ان کو تلاش کر لے... جب بھی وہ اس کو کہاں پہچانیں گے۔

اور شبنم... نام تو ماں باپ نے اس کا لالہ رخ رکھا تھا لیکن اس کی صورت میں پاکستان کی نامور اداکارہ شبنم سے اتنی مشابہت تھی کہ اکبر نے روزِ اول سے اس کو شبنم کہنا شروع کر دیا تھا۔ شادی سے پہلے وہ شبنم کا ایسا پرستار تھا کہ اس نے اپنے کمرے کی دیواروں پر... الماری کے پٹوں پر اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر اس کے ان گنت فلمی پوسٹر چپکا رکھے تھے جن میں ایک قدِ آدم پوسٹر یوں لگتا تھا جیسے شبنم سامنے آ کھڑی ہوئی ہو۔ اس نے اپنی نئی نویلی دلہن کو آئینے کے مقابل کر کے کہا تھا۔ ”بتاؤ کون زیادہ حسین ہے... تم یا شبنم... دیکھنے میں تو اس کی جڑواں بہن لگتی ہو...“ لیکن اس دن کے بعد اکبر نے خود ہی شبنم کی ہر تصویر اپنے کمرے سے ہٹا دی تھی کہ اب خود شبنم آ گئی ہے تو اس کی تصویر کی ضرورت ہی کیا ہے۔

اکبر کو اپنے لیے ایک ہی جائے پناہ نظر آئی تھی۔ یہ

دینہ میں اس کا آبائی گھر تھا جہاں سے اس کے باپ راجا اصغر پروپرائٹر نیو خورشید جیولری ایمپوریم نے اپنی زندگی کا سفر شروع کیا۔ اس نے لاکھوں نہیں کروڑوں کمائے تھے اور گنوائے تھے۔ لیکن یہ گھر آج بھی تیسری نسل کے ملکیت کے دعوے کی صداقت کے سامنے سر جھکانے کے لیے چشم براہ ہوگا۔

شام ہوتے ہی اکبر نے فیض آباد سے لاہور جانے والی ایک بس پکڑلی۔ وہ بس کے آخری کونے میں دبک کے بیٹھ گیا اور باہر دیکھتا رہا جہاں سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔ جو گاؤں تھے، وہ قصبے ہو گئے تھے۔ قصبوں نے شہروں جیسا روپ اختیار کرلیا تھا اور شہر تمام سمتوں سے دور دور تک پھیل گئے تھے۔ سڑکیں زیادہ چوڑی اور خوب آباد ہو گئی تھیں۔

آہستہ آہستہ سکون... آزادی اور تحفظ کے ایک انوکھے احساس نے اس کی پلکوں پر نیند کو یوں اتارا جیسے یہ بس نہیں اس کی ماں کی گود ہے جو اسے نرمی سے آہستہ آہستہ ہلکورے دے رہی ہے۔ اکبر علی نے اس کا ممتا کے نور سے بھری ہوئی مسکراہٹ والا چہرہ اپنے بہت قریب دیکھا اور اس کے وجود کی نرمی... حرارت اور مہک کو اسی طرح محسوس کیا جیسے چالیس سال پہلے محسوس کرتا تھا۔

پھر کسی نے اسے بڑی بے رحمی سے جھنجوڑا۔ ”اوئے تیں سو گیا رہ... تیری ماں کی... اٹھ...“ ایک لات اور ایک گالی... پھر ایک بید... وہ ہڑبڑا کے جاگا۔

لیکن یہ بس کنڈیکٹر تھا۔ ”کہاں اترنا تھا تو نے... سویا پڑا ہے۔ ٹکٹ دکھا اپنا؟“

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ”دینہ... گزر گیا؟“

کنڈیکٹر نے برہمی سے کہا۔ ”اور کیا بس کھڑی رہتی تیرے لیے... استاد بس روک کے... بندہ گراتا ہے۔“

مسافر زیرلب مسکرا رہے تھے۔ وہ خاموشی سے کسی کی طرف دیکھے بغیر بس سے اتر گیا جو رکی بھی نہ تھی کہ پھر چل پڑی۔ وہ سنبھل کے سڑک کے کنارے سے دور ہوا ورنہ پیچھے سے آنے والی بس اسے چپٹا کرتی گزر جاتی۔ آہستہ آہستہ اس نے واپس چلنا شروع کیا۔ اپنے اندازے کے مطابق اسے چار پانچ کلومیٹر واپس جانا تھا۔ اس کے آس پاس تاحد نگاہ پھیلی ہوئی زمین آج بھی ویسی ہی تھی۔ پتھریلی اور بنجر... جھاڑیوں والی... بارش کے کٹاؤ سے اونچے نیچے ٹیلوں کی شکل اختیار کر لینے والی۔

دینہ جو ایک قصبہ بھی نہیں گاؤں تھا، اب شہر جیسی چہل پہل رکھتا تھا۔ جی ٹی روڈ پر دونوں طرف سے آنے والی ہر قسم کی گاڑیاں تیز روشنیوں کی چکا چوند پیدا کرتی تیزی سے گزر رہی تھیں۔ اس نے بڑی احتیاط سے سڑک عبور کی اور بازار کی رونق کو حیرانی سے دیکھتا چلتا گیا... بینک... پیٹرول پمپ... بڑے بڑے اسٹور... ریسٹورنٹ... یہ سب پہلے کہاں تھے۔ سڑک کے کنارے لاتعداد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ویگن، کاریں، سوزوکیاں۔

اس نے کچھ پرانی نشانیوں کی مدد سے وہ گلی تلاش کرلی جس میں اس کا آبائی گھر تھا۔ گلی اب چھوٹی سی پختہ سڑک بن گئی تھی جس میں دونوں طرف سے گاڑی آجاتی تھی تو راہ گیروں کو دیوار سے لگ کے راستہ دینا پڑتا تھا۔ آخری بار وہ اپنے باپ کے ساتھ یہاں کب آیا تھا؟ اس نے ذہن پر زور دیا... شاید اپنے جیل جانے سے بھی چھ آٹھ سال پہلے۔

بائیس چوبیس سال بعد بھی اس کے ذہن میں اپنے آبائی گھر کا مبہم سا تصور تھا... اسے یقین تھا کہ اندھیرے میں بھی وہ اس کو پہچان لے گا لیکن کافی آگے نکل جانے کے بعد اسے لوٹنا پڑا... اس گھر کا دروازہ یقیناً آس پاس ہونے والی نئی تعمیرات میں گم ہو گیا تھا۔

اس گھر کی چابی طفیل نائی کے پاس رہتی تھی۔ وہ اکبر کے باپ اصغر کا لنگوٹیا تھا۔ دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھے تھے۔ آخری بار جب اکبر اپنے باپ کے ساتھ آیا تھا تو طفیل انہیں اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہ اب طفیل ہیئر ڈریسر ہو گیا تھا لیکن دوستوں کے درمیان خلوص اور بے تکلفی کے رشتے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ طفیل نے اسے ایک واقعہ یاد دلایا تھا۔

”یاد ہے ایک مرتبہ پی ٹی میں تو میرے ساتھ کھڑا تھا... پی ٹی ماسٹر نے کہا آگے جھک جاؤ... اور تو جھکا تو پیچھے سے تیری نیکر پھٹ گئی... اور میں نے...“

اصغر نے کہا تھا۔ ”اویار کچھ لحاظ کر... میرا بیٹا ساتھ ہے۔“

یہ بات یاد کر کے اکبر کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے گلی میں کھل جانے والی بہت سی دکانوں کو دیکھا۔ ان میں نیو ماڈرن اسٹائل ہیئر ڈریسنگ سیلون، ایک خاصی بڑی اور قیمتی دکھتی دکان تھی۔ اندر ایک لائن میں آٹھ گھومنے والی کرسیاں اور پوری دیوار کے برابر آئینہ نصب تھا۔ آٹھ کاریگر مصروف تھے... دو گاہک انتظار میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

وہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے بھاری بھرکم شخص کے سامنے چلا گیا۔ ”یہ چاچا طفیل کا سیلون ہے؟“

وہ شخص چونکا اور اسے گھورنے لگا۔ ”تم کون ہو؟“

اکبر مسکرایا۔ ”میں ان کے دوست راجا اصغر کا بیٹا ہوں... اکبر۔“

”اکبر؟“ اس نے پُرجوش انداز میں ہاتھ ملایا۔ ”یار پہچانا نہیں مجھے... میں منظور ہوں، چاچا طفیل کا سب سے چھوٹا بیٹا... آؤ بیٹھو۔“

اکبر اس کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”چاچا کا کیا حال ہے... اور تمہارے دوسرے بھائی؟“

”ابا جی تو گزر گئے، چھ سال پہلے... بڑا بھائی امریکا چلا گیا تھا، اس کی لاٹری نکل آئی تھی۔ بعد میں اس نے دوسرے بھائی کو بھی بلا لیا۔ بس میں رہ گیا۔ اب یہ سیلون چلا رہا ہوں۔ تم سناؤ، آج ادھر کیسے آگئے... تم تو بہت بڑے آدمی بن گئے ہو... چائے پیو گے؟“

اکبر کے انکار سے پہلے ہی اس نے کسی سے چائے کے لیے کہہ دیا۔ اکبر نے کہا۔ ”منظور بھائی... مجھے اپنے پرانے گھر کی چابی چاہیے۔“

”چابی؟ ہاں رکھی تو ہوگی کہیں... ابا جی کے بعد اماں سنبھال کے رکھتی تھیں۔ ابھی گھر چلتے ہیں۔ ہم نے بہت خیال رکھا کہ تمہارے گھر پر کوئی قبضہ نہ کر لے... گھر کیا ہے بس زمین ہے اور زمین کی اب یہاں بڑی ویلیو ہے... میرا تو مشورہ ہے اب اس سے جان چھڑاؤ... تم نے کون سا لوٹ کے یہاں رہنے کے لیے آنا ہے... دس بیس سال میں کوئی چکر لگا جاتا ہے۔“

اکبر نے کہا۔ ”تمہارے خیال میں اس کی مجھے کیا قیمت مل جائے گی؟“

”چار پانچ لاکھ تو کوئی بھی کھڑے کھڑے دے سکتا ہے... ایک کنال سے اوپر ہی ہے...“

”کوئی گاہک ہے تمہاری نظر میں... جو فوراً ادائیگی کر دے۔“

منظور کی آنکھوں میں لالچ کی چمک پیدا ہوئی۔ ”بھائی اکبر... تمہارے اور میرے ابا جگری تھے... بھائیوں سے زیادہ۔ آج تم بہت بڑے آدمی بن گئے ہو اور ہم وہی ہیں... ذات کے نائی... لیکن تم نے مجھے بھائی کہا ابھی... تمہارا دل بہت بڑا ہے... لو چائے پیو... پھر گھر چل کے کھانا کھاتے ہیں۔“

اکبر نے کہا۔ ”یہ جگہ تم لینا چاہتے ہو تو بتاؤ؟“

منظور دم بخود رہ گیا۔ ”تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ تمہارے لیے چار پانچ لاکھ کیا ہیں... چاہو تو کسی کو مفت بھی دے سکتے ہو... مگر میں ایسے نہیں لوں گا... بس مجھے دو دن کی مہلت دو... ابھی تم تو ہو نا یہاں؟“

”ابھی میں نے کچھ طے نہیں کیا ہے منظور۔“

منظور کچھ مایوس ہوا۔ ”ہاں... جلدی کیا ہے... جب تک یہاں ہو، میرے گھر میں رہو... تمہارا اپنا گھر ہے وہ بھی۔“

”میں اپنے ہی گھر میں رہوں گا۔“

”اس گھر میں... کیسے رہو گے؟“ منظور کا منہ کھلا رہ گیا۔

رات دس بجے اکبر نے اپنے آبائی گھر کے بیرونی دروازے کا پرانا زنگ خوردہ قفل بڑی مشکل سے کھولا۔ اندر کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ کھلے ویران صحن میں آج بھی پرانی چارپائیاں پڑی تھیں... ان کی بان کو بارش اور دھوپ کھا گئی تھی۔ خالی فریم میں کہیں کہیں سیاہ بان کے ٹکڑے لٹک رہے تھے۔ آخری بار اس نے اپنے باپ کے ساتھ دیکھا تھا تو دائیں طرف کے حصے میں ایک چھپر کے نیچے دو بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ اب وہ چھپر ہی نہیں تھا۔

اس نے آگے بڑھ کے کمرے کی کنڈی میں پڑا ہوا قفل کھولا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اکبر نے ایک موم بتی روشن کی تو کمرے کا پورا منظر اس کے سامنے آگیا۔ ایک چارپائی پر برسوں سے لپٹے ہوئے بستر کا رنگ مٹی جیسا ہو رہا تھا۔ میلی، پلستر اکھڑی دیواروں پر گوشوں میں اور چھت پر مکڑیوں کے جالے جھول رہے تھے۔

درمیان کے بغیر پٹ والے دروازے سے دوسرے کمرے کا دھندلا سا منظر دکھائی دیتا تھا۔ اس میں پرانے برتن بکھرے پڑے تھے۔ اکبر نے موم بتی کو دیوار کی ایک طاق میں نصب کیا اور پوری احتیاط سے لپٹا ہوا بستر آہستہ آہستہ کھولا۔ اس کا اپنا سایہ مقابل کی دیوار پر حرکت کرتے ہوئے لرز رہا تھا... وہ آہستہ سے بستر پر لیٹ گیا۔

اسے یوں لگا جیسے وہ اپنے کسی پچھلے جنم میں پہنچ گیا ہے۔ یہ تین نسلوں کا سفر تھا جو پھر اپنے نقطۂ آغاز پر پہنچ کے ختم ہوا تھا... دنیا گول ہے... کوئی چلتا رہے اور خوش گمانی میں رہے کہ وہ آگے بڑھ رہا ہے مگر سفر اسے پھر وہیں پہنچا دیتا ہے جہاں سے وہ چلا تھا۔

صرف وقت آگے بڑھتا ہے۔ اس کے باپ راجا اصغر نے اسی جگہ سے ایک نئی زندگی کے لیے رخت سفر باندھا تھا۔ وہ کیا تھا؟ انتظام دستِ غیب؟ نوشتۂ تقدیر... اتفاق یا حادثہ؟ جس نے اسے خورشید عباسی تک پہنچا دیا تھا!

☆☆☆

راجا اصغر کا مزاج شروع سے مختلف تھا۔ اس کے دونوں بھائی آباواجداد کے وقت کا حصہ تھے اور آنکھیں بند کیے روایت کی لکیر پر چلنے کو عین سعادت مندی سمجھتے تھے۔ روایتی طور پر انہیں قاعدہ پڑھنے کے لیے ملا جی کے مدرسے

www.pkdigest.com

بھیجا گیا تو وہاں وہ دوسرے سب بچوں کی طرح ہل ہل کے عربی کی آیات کو رٹتے رہے اور ملاجی کے غیر انسانی رویے اور تشدد کو بھی برداشت کرتے رہے۔

اصغر نے جیسے تیسے پہلا قاعدہ ختم کیا۔ بعض اوقات وہ اپنی ذہنی تیز رفتاری میں مولوی صاحب سے آگے پڑھنے لگتا تھا تو اسے مار پڑتی تھی۔ عجلت کار شیطان... وہ اس کے دونوں کان اپنے بڑے بڑے ہاتھوں میں پکڑ کے ایسے کھینچتے کہ وہ درد سے تڑپنے لگتا... اسے یقین ہو جاتا تھا کہ اس کے کان مولوی صاحب کے ہاتھوں میں رہ جائیں گے اور وہ تمام عمر بغیر کانوں والا آدمی کہلائے گا۔ اس ڈر سے اصغر مولوی صاحب کے پیچھے چلتا رہا لیکن اس نے عربی کو ایک زبان کے طور پر پڑھنے کا طریقہ سمجھ لیا تھا۔ دوسرا سپارہ پڑھنے کے لیے اس نے مولوی صاحب کے پاس جانے سے صاف انکار کر دیا۔ ''وہ میں خود پڑھ سکتا ہوں۔''

اس کا باپ اور تیسرے سپارے تک پہنچ جانے والا اس کا بھائی دم بخود رہ گئے۔ اس نے اپنے دعوے کو سچ ثابت کر دکھایا تو باپ نے جوتی اتار کے اس کے سر کو نشانہ بنا لیا۔ ''غلط سلط پڑھ کے گناہ گار ہو گا شیطان کی اولاد... ہماری عاقبت ہی خراب کرے گا۔''

ماں نے اسے بچایا کیونکہ وہ مسلسل شور کر رہا تھا کہ میں غلط نہیں پڑھ رہا تھا... یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور انوکھا کیس تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب کو بلایا گیا۔ وہ سخت غیظ و غضب کے عالم میں نمودار ہوئے اور اصغر کو موقع بھی دیا کہ وہ انہیں دوسرے سپارے کا کچھ حصہ پڑھ کے سنائے... یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسی وقت صوبے دار محمد جنت کسی کام سے آ گیا۔ وہ اپنی رجمنٹ کی مسجد میں پیش امام تھا چنانچہ معززین میں شمار ہوتا تھا۔ ابھی اصغر کی جوتا کاری شروع ہی ہوئی تھی... اصغر چلانے لگا۔ ''میں نے غلط نہیں پڑھا تھا... آپ مجھے کیوں مار رہے ہو؟''

صوبے دار کے سوال پر مولوی صاحب نے غصے میں پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''یہ گناہ گار لعنتی شیطان... کہتا ہے میں سارا قرآن پڑھ سکتا ہوں۔ ابھی میں نے اسے ایک پارہ پڑھایا ہے۔''

صوبے دار نے فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''ذرا میں بھی تو سنوں... ہاں اصغر... مجھے پڑھ کے دکھا...''

اصغر نے دوبارہ شروع کیا۔ صوبے دار غور سے سنتا رہا اور اصغر کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو دیکھتا رہا۔ ایک دو جگہ مولوی صاحب اچھلے کہ تلفظ غلط ہے مگر صوبے دار نے روک دیا۔ اصغر نے پورا پارہ ختم کر لیا۔

''اس نے تو ٹھیک پڑھا ہے... ایک آدھ غلطی اس عمر میں قابلِ معافی ہے... کسی سے بھی ہو جاتی ہے۔''

اصغر نے ساتویں... پھر گیارہویں اور پھر ستائیسویں پارے کی چند آیات بھی اسی طرح سنا دیں... یہ گویا RANDOM لغت تھی۔ صوبے دار صاحب نے اصغر کے دعوے کو درست قرار دیا اور مولوی صاحب اپنے دل میں صوبے دار صاحب کے خلاف ایک اور عناد کا سبب لیے غصے میں واک آؤٹ کر گئے... سارے گاؤں میں اصغر کی دھوم مچ گئی۔

اصغر نے دوسرا کارنامہ اسکول میں انجام دیا۔ اس کے دونوں بڑے بھائی دس سال میں رو پیٹ کر پرائمری تک پہنچے تھے۔ میٹرک کی منزل کا راستہ ان کے بس کی بات ہی نہ تھی اور جب باپ نے بھی اعلیٰ تعلیم کو غیر ضروری قرار دے دیا تو ان کی جان چھوٹ گئی۔ وہ گاؤں کی گلیوں میں ڈنڈے بجانے لگے اور ان تمام خوش فعلیوں میں مصروف ہو گئے جو ان کی عمر کے نوجوان کرتے تھے۔ جب یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ ان پر جوانی ٹوٹ پڑی ہے اور ان طفلانہ حرکات میں جنسی سرگرمیاں بڑھنے لگی ہیں تو انہیں یوں سدھارا جاتا تھا کہ فوراً کسی چاچے ماے کی چودہ پندرہ سال کی لڑکی ان سے بیاہ دی جاتی تھی کہ لو... اب دوسروں کی جان چھوڑ دو... ایک وقت آیا جب اصغر کے بڑے بھائیوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

اصغر نے پڑھائی میں ایسا نام پیدا کیا کہ میٹرک میں اس کی فرسٹ ڈویژن آئی اور گرد و نواح میں اسکول کا نام روشن ہو گیا۔ جب اصغر نے کالج میں داخلہ لینے اور شہر جانے کی بات کی تو اس کی وکالت کے لیے ہیڈ ماسٹر صاحب بہ نفسِ نفیس اصغر کے گھر تشریف لائے مگر اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔

اصغر کا باپ تعلیم برائے تعلیم یا تعلیم کی افادیت کے فلسفے کو تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ ''جناب ہیڈ ماسٹر صاحب! اپنی ضد سے اس نے میٹرک تو کر لیا... اب یہ شہر جانے کی اور کالج میں پڑھنے کی بات کرتا ہے۔''

ہیڈ ماسٹر صاحب نے حصولِ علم کے لیے چین جانے والی حدیث کو استعمال کیا۔ ''شہر کون سا دور ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے جی... مگر اتنا پڑھ کے یہ کیا کرے گا... اسے کون سی نوکری کرنی ہے... ماشاء اللہ سے اپنی زمین ہے۔''

اصغر نے کہا۔ ''ابا! مجھے بیلوں کے پیچھے چلتے ہوئے ساری عمر نہیں گزارنی تمہاری طرح...''

ان آخری الفاظ پر باپ نے مشتعل ہو کر جوتی اٹھالی۔ ''پھر کیا کرے گا تو؟ پٹواری لگے گا؟ لاٹ صاحب بن جائے گا؟''

''میں فلموں میں جاؤں گا... یا مری میں اپنا ہوٹل کھولوں گا... مجھے اس گاؤں میں رہنا ہی نہیں۔'' اصغر نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پیچھے پناہ لی۔

باپ نے اٹھائی ہوئی جوتی اس پر کھینچ ماری جو نشانہ خطا ہونے سے ہیڈ ماسٹر صاحب کے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے برہم ہو کر اٹھنے سے پہلے ہی اصغر جائے واردات سے فرار ہو چکا تھا۔

اصغر لوٹ کے گھر نہیں گیا... وہ بس میں بیٹھ کے سیدھا لاہور پہنچ گیا۔ یہ بات تو وہ طے کر چکا تھا کہ اسے اپنی تعلیم کو جاری رکھنا ہے۔ وہ بچپن سے پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننے کی بات سنتا چلا آیا تھا لیکن لاہور پہنچ کے اس کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئیں... مثلاً یہ کہ فرسٹ ڈویژن والے اچھے کالجوں میں داخلے کے لیے مارے مارے پھر رہے تھے۔

دوسرا مسئلہ اخراجات کا تھا۔ اسے کسی نہ کسی کالج میں داخلہ ضرور مل جاتا لیکن پہلا مسئلہ داخلے کے اخراجات کا تھا۔ ہر ماہ فیس کی ادائیگی کا مسئلہ اس کے بعد آتا تھا... اگر وہ دن میں کام کرتا تو پڑھتا کیسے اور کوئی رات بھر کا کام تلاش کر لیتا تو کالج کیا سونے کے لیے جاتا؟ اس نے اپنی غربت کو وجہ بنا کے فیس معاف کرانے کی ناکام کوشش بھی کی۔ خود کو یتیم اور لاوارث ظاہر کرنے کا جھوٹ بھی بولا... اسے کہا گیا کہ اتنا ہی شوق ہے تو پرائیویٹ امتحان دو... ساتھ ساتھ کام بھی چلتا رہے گا۔

چھ مہینے تک اس نے بہت دھکے کھائے اور مزدوری سے بھیک مانگنے تک سارے کام کر کے دیکھ لیے۔ واپس گھر لوٹ جانا اس کے مسائل کا آسان حل تھا لیکن وہ بھی ضد کا ایسا پکا تھا کہ کامیاب ہوئے بغیر کسی کو منہ دکھانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس تمام عرصے میں ایک اور حقیقت کھل کے سامنے آنے سے اس کے لیے کامیابی کا مفہوم ہی بدل گیا... اس نے دیکھ لیا تھا کہ پڑھ لکھ کے کوئی بڑا آدمی نہیں بنتا... بڑے آدمی سمجھے جانے والوں کی ڈگری کوئی نہیں پوچھتا... بڑے نام جو اخباروں کی زینت بنتے تھے، سیاست دانوں کے تھے... ایکٹرز اور کرکٹرز کے تھے... صنعت کاروں اور تاجروں کے تھے... یہاں تک کہ بدمعاشوں اور ڈاکوؤں کے تھے۔

ابھی وہ طے نہیں کر پایا تھا کہ پیسا کمانے کے لیے اسے کیا کرنا ہے کہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اسے لکشمی چوک کے ایک ایسے ہوٹل میں ویٹر کی نوکری مل گئی جہاں فلمی شخصیات کا آنا جانا تھا۔ ان میں ہر قسم کے لوگ تھے... کچھ اصلی تو کچھ جعلی... ان میں ایسے بھی تھے جو کسی شوقین مزاج دولت مند کو فلمی دنیا کے جلوؤں کی جھلک دکھا کے پھانس لاتے تھے اور اسے کنگال کر کے چھوڑ دیتے تھے۔ ان میں کچھ موسمی پرندے بھی ہوتے تھے... وہ زمیندار جو گندم، چاول یا کپاس کی اچھی فصل سے مالا مال ہو جاتے تھے تو رنگین طبع انہیں مشغل میلے کے لیے لاہور کا رخ کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ تاڑنے والے انہیں شاہی محلے سے گھیر کر فلمی دنیا میں لے آتے تھے کہ بادشاہو... وہ جگہ آپ کے شایانِ شان نہیں... حسن کے جلوے لوٹنے ہیں تو فلمی دنیا میں آؤ اور فلم بنا کے دیکھو... یہ جو بڑی سپر اسٹار بنی پھرتی ہیں... ریما اور میرا جیسی... یہ خود آپ کے گرد منڈلائیں گی۔

اصغر بہت دن سے ایک ایسے ہی فلمی پروجیکٹ کے سلسلے میں ہونے والی ہر میٹنگ میں شریک تھا۔ سب کے درمیان بیٹھنے کی اس کی اوقات نہ تھی مگر اسے دو دو منٹ بعد طلب کیا جاتا تھا... اوئے اصغر چائے لا... کبھی فلمساز تو کبھی ڈائریکٹر... نغمہ نگار... موسیقار... کوئی نہ کوئی آتا ہی رہتا تھا اور اسٹوری تو سارا دن ڈسکس ہوتی تھی۔ ایک کے بعد ایک... نئی سے نئی سچویشن... سرمایہ لگانے والے کے درباری نت نئے لوگوں کو لاتے رہتے تھے اور ان کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے تھے۔

نو وارد فلمساز کا فیصلہ فائنل ہوتا تھا۔ فلم کے نام سے کہانی کے مرکزی خیال تک... ڈائریکٹر... موسیقار اور نغمہ نگار سب کا انتخاب کیا جا چکا تھا... اب بحث صرف کاسٹ کو فائنل کرنے کی ہو رہی تھی۔ ایک گروپ اپنا فیصلہ مسلط کرانے میں کامیاب رہا تھا کہ یہ لاکھوں کا معاوضہ مانگنے والی ریما یا میرا اور شان یا سعود جیسے ہیرو کسی فلم کی کامیابی کی ضمانت نہیں بن سکتے... ایسا ہوتا تو انڈسٹری کا یہ حال کیوں ہوتا... فلم میں نئے چہرے متعارف کرانے میں فائدہ ہے... اس معاملے میں بھارت کی ان گنت مثالیں تھیں... فلمساز کا مشیرِ خصوصی بن کے اس کا اعتماد حاصل کر لینے والا ایک شاطر شخص تھا۔ اس نے چودھری صاحب کو یقین دلا دیا کہ اسے الٹے سیدھے مشورے دینے والے سب چور ہیں۔ وہ کسی کی باتوں میں نہ آئیں ورنہ نقصان اٹھائیں گے... اس کی شخصیت اور بات کرنے کا انداز اتنا متاثر کن تھا کہ چودھری نے باقی سب کو فارغ کر دیا۔

فلمی دنیا میں چانس حاصل کرنے کی خواہش مند لڑکیوں

کی کمی نہ تھی... ان کی اکثریت زیادہ سے زیادہ ایکسٹرا بنتی تھی ورنہ کسی بالا خانے کی زینت... اصغر نے دیکھا کہ ہیروئن کے طور پر جس لڑکی کا انتخاب کیا گیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ انتہائی خوب صورت ہے اور بالکل نوعمر ہے... اس کا تعلق بھی ایک معزز گھرانے سے تھا اور وہ باہر تعلیم حاصل کر رہی تھی۔

فلمساز کے مشیرِ خاص نے ایک دن غیر متوقع طور پر اچانک اصغر کو آلیا... اس نے کہا۔ ”ایک ہفتے سے چودھری صاحب اس کا جائزہ لے رہے تھے اور ان کی نظر میں تم پر چانس لیا جا سکتا ہے کیونکہ تم میں وہ تمام خوبیاں نظر آ رہی ہیں جو کسی ہیرو میں ہونی چاہئیں لیکن چودھری صاحب میرے مشورے کے بغیر کچھ بھی نہیں کرتے... مجھے بتاؤ کہ ایک پنجابی فلم میں لیڈ رول کرو گے؟“

اصغر کے ہاتھ پاؤں خوشی سے پھول گئے۔ ”لیڈ رول... یعنی ہیرو!“

”ہاں... بس یہ سمجھو کہ قسمت کی دیوی تم پر مہربان نہ ہوتی تو تم یہاں ویٹر نہ ہوتے اور ویٹر نہ ہوتے تو ہماری نظر میں نہ آتے۔“

قصۂ مختصر اس نے اصغر کو یقین دلا دیا کہ اس کے لیے مستقبل میں عزت، شہرت، دولت کے راستے کھولنے والا وہی ہے... اس پہلی فلم کا معاوضہ شاید اسے بہت کم لگے مگر یہ نقطۂ آغاز ہے... بعد میں لاکھوں بھی وہی کمائے گا... اسے جو ایک لاکھ ملیں گے، اس کا نصف وہ ایمان داری اور خاموشی سے اس کے حوالے کر دے گا ورنہ شوٹنگ کے درمیان بھی اسے فلم سے نکالنا کوئی مشکل نہیں... چودھری صاحب اس کے سوا کسی کی نہیں مانتے۔

یوں اصغر نے ویٹر سے ہیرو بننے کا اعزاز حاصل کیا۔ ظاہر ہے یہ سب فراڈ تھا... شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے ہی نئی لڑکی بھاگ گئی جسے بطور ہیروئن متعارف کرایا جا رہا تھا... شاید اس نے شکاریوں کی نیت بھانپ لی یا ایک تلخ تجربے کے بعد اس نے خاموشی سے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے ولایت لوٹ جانے میں ہی عافیت دیکھی۔ اس کی جگہ دوسری لڑکی پھنس گئی... فلم کا آغاز بڑی دھوم دھام سے ہوا... تین ہفتے میں اس کی صرف ایک ریل مکمل ہوئی... پھر چودھری صاحب کی جیب خالی ہوئی اور اس نے اندازہ کر لیا کہ اس رفتار سے پیسا خرچ ہوگا تو فلم مکمل کرنے کے لیے اسے اپنی ساری زمینیں بیچنا پڑ جائیں گی... یہ تماشا وہاں ہر روز ہوتا تھا... دیکھتے دیکھتے سارے گدھ اڑ گئے... فلمساز کی دولت چند چالاک اور عیار لوگوں میں تقسیم ہو گئی... باقی سب ”جھٹے دے کھوتی اوتھے آن کھلوتی“ کے مصداق وہیں پہنچ گئے جہاں سے آئے تھے۔

لیکن اس ناکام تجربے نے اصغر کو فلمی دنیا میں اپنا راستہ بنانے کی دیوانگی عطا کر دی۔ وہ صورت شکل کا اچھا تھا اور دیہات کا پروردہ ہونے کی وجہ سے اس کی صحت بھی اچھی تھی۔ وہ ہیرو نظر آتا تھا لیکن اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ وہ فلمی ہیروئن بننے کے شوق میں گھر سے نکلنے والی لڑکیوں کو بہ آسانی پھانس سکتا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے اس کی محبت کے جال میں گرفتار ہو جاتی تھیں۔ ایسی لڑکیوں کو وہ آگے پاس کر دیتا تھا اور پھر اس سے غرض نہیں رکھتا تھا کہ ان کا کیا انجام ہوا... اس طرح وہ پیشہ ور شکاریوں کے ساتھ خود بھی ایک شکاری بن گیا۔ اسے ہیرو کا چانس تو کیا ملتا... تھوڑا بہت پیسا ملتا رہا جس سے اس نے فلمی دنیا میں اپنا وجود برقرار رکھا اور اسے چھوٹے موٹے رول بھی ملتے رہے... لیکن پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس نے سمجھ لیا کہ یہاں وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے اور دوسروں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔

پھر ایک ایسا فلمی اتفاق پیش آیا جس نے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا... کچھ عرصہ وہ ایک مشہور اداکارہ کا ”باڈی گارڈ“ رہا تھا اور اس کی سفارش سے ایک مشہور ہدایت کار نے اسے اپنی فلم میں... جو بعد میں سپرہٹ ثابت ہوئی... ایک اہم رول دے دیا۔

www.pkdigest.com

لوکیشن پر پہنچنے کے لیے اسے مری پہنچنا تھا۔ وہ پنڈی سے بس میں سوار ہوا تو کسی نے ہاتھ کی صفائی دکھائی اور اس کی جیب کاٹ لی۔ بس کنڈیکٹر نے اسے آدھے راستے میں اتار دیا۔ مرتا کیا نہ کرتا... اصغر پیدل ہی روانہ ہو گیا اور جب کسی پرائیویٹ یا کمرشل گاڑی نے اسے لفٹ نہیں دی تو اسے یقین آ گیا کہ اب وہ شوٹنگ کے لیے وقت پر نہیں پہنچ سکتا۔ ڈائریکٹر بہت سخت تھا۔ وہ اس کی ایک نہیں سنے گا اور یہ رول کسی اور کو مل جائے گا... اس کا کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم!

اچانک ایک اندھا موڑ کاٹتے ہوئے اس نے ایک عجیب منظر دیکھا... سڑک کے کنارے پہاڑ کے دامن سے لگی ہوئی دو کاریں کھڑی تھیں۔ ایک سفید مہران کار تھی اور دوسری بڑی کرولا... دو افراد مہران کار چلانے والی لڑکی کو کھینچ کر اپنی کرولا میں ڈالنا چاہتے تھے۔ لڑکی مزاحمت کر رہی تھی لیکن مدد کے لیے نہیں پکار سکتی تھی کیونکہ اغوا کرنے والوں میں سے ایک کا ہاتھ اس کے منہ پر تھا۔

اصغر نے جو کیا وہ ایک فطری ردِعمل تھا... اس نے چلّا

کے کہا۔ ”اوئے! یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اور لڑکی کو بچانے دوڑا۔ اغوا کی کوشش کرنے والے پرکلاس کے نوجوان جانتے تھے کہ ان کے پاس مہلت بہت کم ہے۔ کوئی گاڑی کسی بھی لمحے کسی طرف سے بھی نمودار ہو سکتی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ دیکھنے والا اس منظر سے نظر چرا کے گزر جائے۔

ان میں سے ایک نے غرا کے کہا۔ ”چلو دفع ہو جاؤ ادھر سے۔“ دوسرے نے کہا۔ ”آئی وِل شوٹ یو!“ لیکن ان کی توجہ ہٹ جانے کا فائدہ لڑکی نے اٹھایا... اس نے سر جھٹکا اور اپنے منہ پر سے ہاتھ ہٹانے میں کامیاب رہی... اس نے چلّا کے کہا۔ ”مجھے بچاؤ... پلیز... یہ مجھے اغوا کر رہے ہیں... بچاؤ...“

اپنے مقابل دو مسلح افراد دیکھ کے اصغر نے فلمی اسٹائل کی فائٹ کو لاحاصل سمجھا اور وہ اسلحہ استعمال کیا جو قدرت نے فراہم کر رکھا تھا... اس نے ایک پتھر اٹھا کے نشانہ لیا اور اس کے سر پر دے مارا جو اسے شوٹ کرنے کی دھمکی دے چکا تھا۔

اصغر نے بچپن میں گلی ڈنڈا بہت کھیلا تھا۔ گیند اور ٹھیکریوں کا گیم ”پٹھو گرم“ کھیلا تھا۔ پتھر مار کے درخت سے پھل گرائے تھے اور گلہریوں کو شکار کیا تھا... اس کا نشانہ پکا تھا... پتھر ایک نوجوان کے سر پر لگا تو اس کا اثر توپ کے گولے جیسا ہوا کیونکہ لڑکا نازک مزاج سا تھا... وہ چیخ مار کے گر گیا۔ دوسرے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے... اس نے لڑکی کو چھوڑا اور اپنے ساتھی کو کھینچ کے گاڑی میں ڈالا... گاڑی پہلے سے اسٹارٹ تھی... ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ کرولا سمیت فرار ہو گئے۔

لڑکی فوراً گاڑی میں جا بیٹھی تھی لیکن اس کی حالت یہ تھی کہ رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ خوف سے لرز رہی تھی۔ اس کے ہاتھ اتنے کانپ رہے تھے کہ وہ اگنیشن سوئچ میں چابی گھمانے سے بھی قاصر تھی۔

اصغر نے کہا۔ ”آرام سے بیٹھی رہو ابھی... گاڑی چلاؤ گی تو مرو گی... یا ایکسیڈنٹ کرو گی یا...“

لڑکی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”تھینک... یو... تم... گاڑی چلا سکتے ہو...؟“

اصغر نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”جلدی مت کرو... کچھ نہیں ہوا... اللہ نے بچا لیا تمہیں... گاڑی میں پانی ہے؟“

لڑکی تھوڑی سی کوشش کر کے ساتھ والی سیٹ پر کھسک گئی۔ پھر اس نے پیچھے سے پانی کی بوتل اٹھائی اور دو گھونٹ پانی پیا... اس کا پورا وجود ابھی تک لرز رہا تھا۔

اصغر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ”ہم ابھی انہیں پکڑ لیں گے... میں نے گاڑی کا نمبر دیکھ لیا تھا۔“

”نہیں... جانے دو انہیں... تم انہیں کبھی نہیں پکڑ سکتے۔“

اس کی بات ٹھیک تھی... ایک مہران جیسی چھوٹی کار کرولا جیسی بڑی گاڑی کو کیسے پکڑ سکتی تھی؟ خصوصاً ان حالات میں کہ وہ خوف زدہ مجرم اس میں فرار ہو رہے ہوں... اسے وہ اندھا دھند دوڑا رہے ہوں گے اور نہ جانے کتنی دور نکل گئے ہوں گے۔

ان کے پاس سے گاڑیاں مسلسل گزرنے لگی تھیں۔ وہ مشکل سے پانچ منٹ کا وقفہ تھا جب سڑک خالی دیکھ کے دو نوجوانوں کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ وہ شریف زادے یقیناً نہیں تھے، چنانچہ لڑکی کا یہ خوف بھی جائز تھا کہ پیچھا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں... اول تو ان کے خلاف جرم کا ثبوت کوئی نہیں تھا اور اصغر کی گواہی اسے مصیبت میں ڈال سکتی تھی۔ وہ واپس پنڈی کی طرف جا رہے تھے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کسی کرپٹ بیوروکریٹ یا کسی بدعنوان پولیس افسر کی بگڑی ہوئی اولاد ہوں۔

اس نے لڑکی سے پوچھا۔ ”یہ نوجوان کون تھے... تمہارے پیچھے کیسے لگ گئے؟“

لڑکی نے سر پیچھے لگا کے ایک گہری سانس لی۔ ”مجھے نہیں معلوم... میں نے پہلے کبھی انہیں نہیں دیکھا۔“

”تم اکیلی جا رہی تھیں... یہاں کیوں رکی تھیں؟ گاڑی خراب ہو گئی تھی؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہ گاڑی خراب ہوئی تھی اور نہ میں اکیلی تھی... گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا... اچانک اسے... حاجت محسوس ہوئی... وہ گاڑی روک کے نیچے اتر گیا۔ بولا میں دو منٹ میں آتا ہوں... لیکن... اس بات کو کافی دیر ہو گئی۔“ اس نے اپنی کلائی پر بندھی نازک سی سنہری گھڑی کو دیکھا۔ ”میرا خیال ہے... آدھا گھنٹا...“

”آدھا گھنٹا؟“ اصغر نے کہا۔ ”وہ پیشاب کرنے گیا تھا؟“

لڑکی نے اقرار میں سر ہلا دیا اور ہاتھ سے سمت کا اشارہ کیا۔

اصغر نے کہا۔ ”تم دروازے اندر سے لاک کرو... میں دیکھ کے آتا ہوں... اور دیکھو... میرے واپس آنے تک باہر مت نکلنا... اور نہ گاڑی خود ڈرائیو کرنا... تمہاری حالت ہرگز ایسی نہیں ہے... یہ خودکشی کے مترادف ہوگا... تمہیں جہاں بھی جانا ہے... میں چھوڑ دوں گا۔“

لڑکی نے صرف سر ہلایا لیکن اظہارِ تشکر کے جذبات اس کی آنکھوں سے عیاں تھے۔ وہ بائیس چوبیس سال کی لڑکی

تھی۔ حسین اور فیشن ایبل... اس کا لباس اور اس کے اطوار ظاہر کرتے تھے کہ وہ کسی بڑے گھر کی لڑکی ہے۔

اصغر کا خیال تھا کہ ڈرائیور اسے اوپر ہی سے نظر آجائے گا... صرف پیشاب کرنے کے لیے بہت نیچے وادی کی گہرائی میں کوئی نہیں اترتا اور نہ اس کام میں اتنی دیر لگ سکتی ہے... اس نے پانچ دس منٹ اِدھر اُدھر دیکھا اور متعدد امکانات پر غور کیا... کہیں اس کی طبیعت خراب نہ ہوگئی ہو... اسے سانپ نے نہ ڈس لیا ہو... وہ توازن بگڑنے سے نیچے نہ لڑھک گیا ہو... یہ سب بہت دور کے امکانات تھے لیکن ایسی کوئی بات ہوتی، تب بھی ڈرائیور اسے کہیں پڑا ہوا نظر آجاتا۔ درختوں کی کثرت کے باعث یہ ناممکن تھا کہ وہ سیکڑوں فٹ کی گہرائی تک لڑھکتا چلا گیا ہو۔

دس منٹ بعد اصغر لوٹ آیا۔ اس کے اندر کی کوئی آواز بتا رہی تھی کہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہے... اس کا یہ خیال سڑک پر دوبارہ نمودار ہونے کے بعد غلط ثابت ہوا کہ لڑکی اتنی دیر میں گاڑی لے کر نکل گئی ہوگی... شریفانہ رویے کے باوجود اصغر اس کے لیے ایک اجنبی ہی تھا اور سانپ کا کاٹا تو رسی سے بھی ڈرتا ہے۔

لیکن لڑکی اسی طرح ڈری سہمی دروازے اندر سے لاک کیے بیٹھی تھی۔ اصغر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تمہارا وہ شوفر تو مجھے کہیں نظر نہیں آیا... میں نے ہر طرف دیکھ لیا... اس کے اتنی دیر لگانے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔“

اس نے اپنی خوف سے بھری ہوئی آنکھیں اٹھا کے اصغر کو دیکھا۔ ”پھر... کیا کروں میں؟“

اصغر دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ”دیکھو... خود میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ وہ تمہیں اتنی دیر کے لیے اکیلا چھوڑ کے کیوں گیا... کیا وہ پرانا ملازم تھا؟“

لڑکی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اسے ابھی ایک مہینے پہلے رکھا گیا تھا۔“

”آئی سی۔“ اصغر نے کہا۔ ”میرا خیال ہے خاتون... اسے آنا ہوگا تو وہ بعد میں آجائے گا... آپ اس کا یہاں کب تک انتظار کریں گی۔ آپ چلیں... میں آپ کو گھر چھوڑ دیتا ہوں۔“

اصغر نے کار اسٹارٹ کی تو لڑکی نے کہا۔ ”آئی ایم سوری... ابھی تک میں نے آپ کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔“

”مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“ اصغر نے مختصراً کہا۔

اس کا ارادہ ہرگز اس فلمی اتفاق کے سلسلے کو فلمی انداز میں آگے بڑھانے کا نہیں تھا۔ اس کا شوٹنگ شیڈول تو پہلے ہی غتر بود ہوگیا تھا اور اس کے ساتھ ہی دو ہزار... اس کا فلمی مستقبل اور اس کے لاحاصل جدوجہد میں گزارے ہوئے چار سال سب ڈوب گئے تھے۔ اب مقررہ وقت کے کئی گھنٹے بعد وہ لوکیشن پر پہنچ بھی جاتا تو سوائے بے عزتی کے اسے کیا ملتا... اور فیصلہ تو وہ پہلے ہی کرچکا تھا کہ لعنت اس پیشے پر جس میں اب تک ذلت کے سوا اس نے کچھ بھی نہیں کمایا... بس یہ آخری چانس اتفاق سے مل گیا تھا...

لیکن قدرت نے آج اس کے نصیب میں ایک نیکی لکھ دی تھی۔ اسے وہ کسی صورت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ واپسی کے سفر میں دو سوال مسلسل اس کے دماغ میں تھے۔ اس خیال کی دہشت رہی کہ خدانخواستہ وہ دونوں بدمعاش اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتے تو اس معصوم لڑکی کا کیا حشر کرتے اور اس کے والدین پر کیسی قیامت ٹوٹتی؟ خدا کے ہر کام میں کیا خدائی مصلحت ہے جس نے سیکنڈز کے حساب سے ہر حادثہ ترتیب دیا۔ اس کی جیب کا کٹنا اور بس سے اس کا وہاں اتارا جانا اور پھر کسی گاڑی میں لفٹ نہ ملنا اور اس کا پیدل چلتے ہوئے ٹھیک وقت پر لڑکی کی مدد کے لیے پہنچ جانا... کیا یہ سب اتفاق تھا؟

دوسرا خیال اسے ڈرائیور کا تھا کہ وہ کیسے غائب ہوگیا؟ جو کام دو منٹ کا تھا (اگر فرض کرلیا جائے کہ اس کی برداشت سے باہر ہوگیا تھا) تو پون گھنٹے تک اس کا لوٹ کر نہ آنا چہ معنی دارد؟... وہ یقیناً اس مجرمانہ سازش کا ایک کردار تھا۔ ابھی وہ نیا تھا... اس کے بارے میں کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا کردار کیسا تھا... شاید اسے تصدیق اور تفتیش کے بغیر رکھ لیا گیا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے کے راستے میں اصغر نے ایک بار بھی لڑکی کی طرف غلط نظر سے نہیں دیکھا۔ اس نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا نام نہیں پوچھا اور اپنا تعارف نہیں کرایا۔ وہ سنجیدگی سے نیکی کر دریا میں ڈال کی تھیوری پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے نیکی کے طمانیت دینے والے احساس کو کسی غلط خیال سے آلودہ بھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔

لڑکی اسے پتا بتاتی گئی اور کار بالآخر بلند دیواروں والے ایک پرانے محل نما مکان کے گیٹ میں داخل ہوگئی جسے ہارن کی آواز پر کسی چوکیدار نے کھولا تھا... لڑکی کار رکتے ہی اتر کے دوڑتی ہوئی اندر چلی گئی... وہ اتر کے چند سیکنڈ رکا اور پھر واپس ہولیا۔ اس نے چوکیدار کو صرف اتنا بتایا کہ گاڑی کی چابی سوئچ میں لگی ہوئی ہے۔

وہ مشکل سے سو قدم گیا ہوگا کہ گیٹ کیپر دوڑتا ہوا اس کی طرف آیا... ”صاحب جی!“

اس نے پلٹ کے دیکھا اور رک گیا۔ ”کیا بات ہے؟“

گیٹ کیپر نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔ ”وہ... آپ کو بڑے صاحب نے بلایا ہے... سردار صاحب۔“

وہ واپس چل پڑا۔ ایک ادھیڑ عمر کا صحت مند شخص گیٹ پر اسے ریسیو کرنے کھڑا تھا۔ ”آپ بھی کمال کرتے ہیں... یہاں تک آکے مجھ سے ملے بغیر جارہے ہیں... نائلہ نے بتایا کہ آپ نے کس طرح اسے اغوا ہونے سے بچایا... آپ نے کتنا بڑا احسان کیا مجھ پر۔“

”سردار صاحب! مجھے شرمندہ نہ کریں... میں اسی سے بچنے کے لیے چپ چاپ نکل گیا تھا۔“

سردار اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ”یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تم میرے محسن ہو... بیٹھو... نائلہ نے کہا کہ اسے آپ کا نام تک معلوم نہیں... میں نے کہا کہ کیسی لڑکی ہو تم... خیر، اس کا قصور نہیں... وہ بہت نروس ہے۔“

سردار اختر حسین محکمہ ریونیو کے ایک بہت بڑے افسر تھے۔ نائلہ ان کی تین میں سے آخری بیٹی تھی۔ اس سے بڑی بیاہ کے جاچکی تھیں۔ وہ بی اے کے آخری سال میں تھی لیکن اپنی بہنوں کے برعکس اسے پڑھنے کا شوق تھا اور وہ ایم اے، پی ایچ ڈی وغیرہ کرنے کی باتیں کرتی تھی۔

جب چائے آئی تو نائلہ بھی آگئی۔ اس نے منہ دھو کے لباس بدل لیا تھا۔ ہلکا سا میک اپ کرکے اس کا حسن قیامت آفریں ہوگیا تھا۔ وہ اب بھی کچھ نروس تھی... اس کے ساتھ نائلہ کی ماں تھی جسے دیکھ کے کہنا مشکل تھا کہ وہ نائلہ کی ماں ہے یا بڑی بہن... احسان مندی کے جذبے کا اظہار اس نے بھی کیا اور اصغر نے اسے بھی روک دیا۔

”بس اب اور کچھ نہ کہیں... جو ہونا تھا ہوگیا۔ اللہ کا شکر ادا کریں اور بس...“ وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم اتنی جلدی میں کیوں ہو... کیا تمہیں کہیں پہنچنا تھا؟“ سردار صاحب نے پوچھا۔

وہ پھر بیٹھ گیا۔ ”پہنچنا تھا... تین گھنٹے پہلے... اس کا اب کیا ذکر...“

”اچھا پھر بیٹھو... تم نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں کہ کرتے کیا ہو؟“ نائلہ کی ماں ایسے ہینڈسم لڑکے سے ہی نہیں اس کے کردار سے بھی متاثر ہوئی تھی۔ خود نائلہ حیران تھی کہ یہ کیسا نوجوان ہے جس نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اس کا نام تک نہیں پوچھا اور بھاگنا چاہتا ہے۔

سردار صاحب کے سوال کے جواب میں اس نے صاف بتا دیا کہ پچھلے چار سال سے وہ فلمی دنیا میں جھک مار رہا تھا لیکن آج وہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ آئندہ کے لیے اس نے ابھی کچھ طے نہیں کیا... وہ دلچسپی اور حیرانی سے سنتے رہے۔

اچانک نائلہ کی ماں نے کہا۔ ”سنو جی... وہ بدمعاش ڈرائیور تو اب آئے گا نہیں... رپورٹ میں اس کا نام بھی لکھوانا ہے۔“

”ہمیں کوئی رپورٹ کسی کے خلاف نہیں لکھوانی۔“ نائلہ نے ماں سے کہا اور باپ نے سر ہلا کے اس کی تائید کی۔

”تو اگر اصغر چاہے...“

سردار صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔ ”کیسی باتیں کرتی ہو... اس کے لیے کچھ کرتے ہیں... جب اس نے ہماری بیٹی کی زندگی بچائی ہے۔“

”سردار صاحب! آپ کا بہت شکریہ۔“ اصغر پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”بیٹھو...“ انہوں نے حکم دیا اور اندر چلے گئے۔ وہ کچھ دیر بعد آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

”آخر کیا سوچا ہے تم نے اپنے فیوچر کے بارے میں اصغر... کیا کروگے؟“ سردار صاحب نے سوال کیا۔

”اب سوچوں گا جناب... کچھ نہ کچھ کرلوں گا... اللہ بڑا کارساز ہے... کوئی نوکری مل جائے گی۔“

انہوں نے سر ہلایا۔ ”ایک نوکری ہے... کروگے؟“

”کہاں سر... مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے کسی کام کا... چار سال ضرور ضائع کیے ہیں۔“

”وہ کام ہے ذمے داری کا... انہیں ایک ایمان دار آدمی کی تلاش ہے اور یہ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم سچے مضبوط کردار کے آدمی ہو... میں تمہاری ضمانت دینے کے لیے تیار ہوں۔“

اصغر نے نظر اٹھا کے نائلہ کو دیکھا تو اس نے کہا۔ ”کوئی زبردستی نہیں ہے... آپ چاہیں تو بعد میں چھوڑ دیں... ڈیڈی کے اچھے تعلقات ہیں۔“

اصغر کو لگا کہ نائلہ چاہتی ہے وہ انکار نہ کرے۔

”آپ بتائیے... کام کیا کرنا ہوگا؟“

”یہاں ہمارے ایک دوست ہیں... خورشید عباسی... ان کی خورشید جیولری ایمپوریم یہاں کی سب سے قدیم اور بڑی شاپ ہے۔“

”لیکن سر... مجھے جیولری کا کچھ پتا نہیں... کوئی تجربہ نہیں۔“

سردار صاحب مسکرائے۔ ”یہ ضروری بھی نہیں... ان کا کیشیر کچھ غبن کرکے بھاگ گیا ہے... خیر، جائے گا کہاں...

www.pkdigest.com

پکڑا جائے گا۔ انہیں ایک بھروسے کے ایمان دار آدمی کی ضرورت ہے... تمہیں صرف کاؤنٹر پر بیٹھ کے کیش وصول کرنا ہے اور رسید جاری کرنی ہے... اکاؤنٹ لکھنا آتا ہے؟''

''جی نہیں۔''

''خیر... کوئی مشکل نہیں... سیکھ لوگے۔ تنخواہ ملے گی دس ہزار ہر مہینے۔ خورشید صاحب آدمی کی قدر کرتے ہیں... بعد میں بڑھا دیں گے۔''

اصغر نے محسوس کیا کہ نائلہ نے اسے خفیف سا اشارہ دیا ہے کہ وہ ہاں کر دے... یا شاید اس کا وہم تھا۔

اصغر نے ہاں کر دی۔ ''رسک آپ لے رہے ہیں سر! آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے... کہ میں نے سچ کہا یا جھوٹ!''

''اس کی فکر تم مت کرو... میں نے دیکھ لیا ہے... میں کہہ دوں خورشید سے کہ میں ایک بھروسے کا آدمی بھیج رہا ہوں؟''

''میں آپ کے بھروسے پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا سر۔'' اصغر نے کہا۔ اس کے نزدیک دس ہزار بہت بڑی رقم تھی... وہ بے روزگاری کے اور خواری کے بعد اس آفر کو ٹھکرا نہیں سکتا تھا۔

''او کے... تم ابھی چلے جاؤ۔'' سردار صاحب نے کہا۔ ''اور یہ رکھو اپنے پاس۔'' انہوں نے لفافہ آگے بڑھایا۔

''یہ کیا ہے سر؟'' اصغر پیچھے ہٹ گیا۔

''اس میں دس ہزار ہیں... شکرانے کے طور پر میری طرف سے۔''

''یہ میں نہیں لے سکتا۔''

''پاگل مت بنو... تنخواہ تمہیں ایڈوانس نہیں ملے گی... جب تک کیسے گزارہ کرو گے؟'' سردار صاحب نے زبردستی لفافہ اسے تھما دیا۔

اصغر یہ بھی قبول نہ کرتا لیکن ایک بار پھر پیچھے سے نائلہ کی آنکھوں نے اسے ایک مبہم... کسی کو نظر نہ آنے والا اور محسوس نہ ہونے والا لیکن پھر بھی واضح اشارہ دیا اور اصغر اسے اپنی خوش فہمی قرار دے کر نہ ٹال سکا بعد کے واقعات نے ثابت کیا... یہ نہ اس کی غلط فہمی تھی اور نہ خود فریبی... نائلہ کو واقعی یہ ناکام ہیرو اپنی ادائے بے نیازی و بے رخی کے اظہار کے باوجود متاثر کر چکا تھا۔ اگر وہ اس کی توقع کے مطابق نائلہ سے فری ہوتا یا اس ملاقات کو اگلی ملاقات کی سیڑھی کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کرتا تو اس کا اثر الٹا ہوتا... وہ تو چلا گیا تھا... اس کا نام پوچھے بغیر اور اپنا نام بتائے بغیر... نائلہ حیران تھی کہ اس جیسے وجیہہ اور ہینڈسم نوجوان کو فلم والوں نے

گھاس کیوں نہیں ڈالی؟ کیا وہ کسی وحید مراد یا ندیم سے کم تھا...؟ قصوروار اصغر کی قسمت تھی یا فلم انڈسٹری... اصل بات یہ تھی کہ نائلہ نے زندگی کی فلم میں اسے اپنا ہیرو مان لیا تھا اور بطور ہیروئن خود کو اس کے مقابل دیکھ رہی تھی۔

ان کی زندگی کی یہ فلم سپر ڈوپر ہٹ گئی... اصغر نے پوری محنت اور ایمان داری سے کام کیا اور سردار صاحب نے جب اسے اپنا داماد بنایا تو بڑے فخر کے ساتھ... اپنی ذہانت، محنت اور ایمان داری کی بدولت اصغر نے خورشید جیولری میں جنرل منیجر جیسی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس نے صرف اکاؤنٹس بکس لکھنا ہی نہیں سیکھا تھا بلکہ جیولری کے بزنس کے تمام اسرار و رموز سمجھ لیے تھے۔

ان چار سالوں میں جب وہ فلموں میں کامیابی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، وہ ایک بار بھی لوٹ کے گھر نہیں گیا تھا۔ اسے ضد تھی کہ اب وہ اسی وقت گھر والوں کو منہ دکھائے گا جب وحید مراد کی طرح اس کے نام کا ڈنکا بج رہا ہوگا اور وہ اپنی چم چم کرتی لمبی کار میں کسی چھم چھم کرتی شعلہ سامان ہیروئن کے ہمراہ اپنے گھر کے سامنے اترے گا تو وہاں پہلے سے اس کی ایک جھلک دیکھنے والوں کا... آٹوگراف مانگنے والوں کا اور فلمی صحافیوں کا ہجوم ہوگا اور تب اس کے ماں باپ کو اندازہ ہوگا کہ ان کے دو بیگا چلانے والے جاہل بیٹوں کے مقابلے میں اصغر کیا تھا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ... نہ یہ خواب پورا ہوا، نہ کسی نے اس کی خبر لی اور نہ وہ بے عزتی کے ڈر سے ایک بار بھی گھر گیا اور نہ اسے کسی کی اور نہ کسی کو اس کی خیر خبر ملی۔ اس نے سردار صاحب کو بتا دیا تھا کہ اس کے ماں باپ مر چکے ہیں اور اس کے کچھ دور دراز کے عزیز و پند میں ہوں گے مگر اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں، چنانچہ اس کی شادی میں فلمی دنیا کے چند ایسے لوگ ہی شریک ہوں گے جنہوں نے واقعی اس کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی... نائلہ کی خواہش تھی کہ وہ چند فلمی ستاروں کو بھی لائے تاکہ شادی کی چمک دمک بڑھے۔ امید نہ ہوتے ہوئے بھی اصغر نے کوشش کی اور اسے بڑی حیرانی ہوئی جب وہ آگئے... اسے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اس کے سسر محترم کے نام کا کرشمہ تھا جو بورڈ آف ریونیو کے اعلیٰ عہدے دار تھے۔

شادی کے سات سال بعد تک اصغر اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں کی کوشش سے بالآخر اکبر پیدا ہوا لیکن ڈاکٹروں نے اسی وقت اصغر کو بتا دیا کہ نائلہ میں کوئی نقص نہیں۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے... لیکن

خود اس کی اپنی پیداواری صلاحیت کم ہے... ظاہر ہے، اصغر نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اسے ایک بیٹا دیا، وہ کرم کرے گا تو بیٹی بھی مل جائے گی۔

اکبر کی پیدائش کے دو سال بعد اصغر کو ماں باپ کی یاد آئی۔ شاید اسے احساس ہوا کہ جتنی محبت وہ آج اکبر سے کرتا ہے اتنی ہی اس کے ماں باپ نے بھی اس سے کی ہوگی اور اس کی پیدائش پر وہ اتنے ہی خوش بھی ہوں گے... اس خیال کے بعد اس پر جیسے یادِ ماضی کا دورہ سا پڑ گیا۔

ایک دن وہ لاہور کا کہہ کے نائلہ کے ساتھ روانہ ہوا لیکن اس نے راستے میں کار کو پنڈ میں اپنے گھر کی طرف موڑ لیا۔ پنڈ اس وقت بھی کافی بدل چکا تھا۔ اصغر نے بلا کسی خوف کے اپنے جھوٹ کا اعتراف کر لیا اور نائلہ کو بتا دیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ نائلہ کو تھوڑا سا رنج تو ہوا مگر اس نے صرف اتنا کہا کہ تم کم سے کم مجھے ہی بتا دیتے۔

اصغر اپنے آبائی گھر کے سامنے اس شان سے تو نہیں اترا جیسے اس نے کبھی سوچا تھا لیکن کسی حد تک یہ خواہش پوری ہوگئی تھی کہ اس کے پاس شان دار چم چم کرتی کار بھی تھی اور لڑکی بھی... جنہیں دیکھ کر پرانے گاؤں کے لوگوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں تو اصغر کو ایک پُرغرور کامیابی کی مسرت نے مغلوب کر لیا۔

گھر کا نقشہ وہی تھا... اس نے کھلے صحن میں قدم رکھا تو ایک چارپائی پر کوئی بوڑھا بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ کافی فاصلے پر وہی دو کمرے تھے اور ایک عورت زمین پر پھسکڑا مارے دھواں دیتے اپلوں پر روٹیاں تھوپ رہی تھی... بڈھا اصغر کا بڑا بھائی تھا اور وہ عورت اس کی بھابی!

جب حیرانی، ناراضی اور گلے شکوے تمام ہوئے تو دوسری چارپائی پر بیٹھے ہوئے اصغر نے نائلہ کو اپنے افراد خانہ سے متعارف کرایا۔ اس کی بھابی چند منٹ کے لیے میلے دوپٹے سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی اٹھی اور اپنے دیور دیورانی کی شکلیں دیکھ کر چلی گئی۔ نائلہ کے لیے اس گھر کا اپنے شوہر کے ماضی سے رشتہ جوڑنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اصغر کی شخصیت کا خمیر اس مٹی اور اس ماحول سے اٹھا ہوگا۔

اصغر کو یہ جان کے رنج ہوا کہ اس کے ماں باپ نہیں رہے تھے۔ اس نے اجازت طلب اور معذرت آمیز نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ڈارلنگ... آئی ول بی رائٹ بیک ان فائیو منٹس۔''

اس کا بڑا بھائی پہلے عمر میں اس سے اتنا بڑا نہیں تھا جتنا اب نظر آ رہا تھا۔ وہ اصغر سے چھ سال بڑا تھا لیکن آج اس کے باپ کی عمر کا لگ رہا تھا۔ ظاہر ہے، یہ سب یک وقت تنگی حالات... محنت مشقت کی زندگی، ناقص غذا... غیر صحت مند ماحول اور ایسے ہی تمام اسباب کا نتیجہ تھا۔ وہ پریشان حال اور چڑچڑا ہو گیا تھا... وہ اصغر کو مسلسل برا بھلا کہتا رہا کہ اس نے ماں باپ کو بھلا دیا۔ اب قبروں پر فاتحہ پڑھنے بھی کیوں آیا ہے... اصغر نے طے کر لیا تھا کہ وہ کسی بات کا برا نہیں مانے گا، چنانچہ وہ سنتا رہا۔

بہت سی کچی قبروں کے درمیان بڑے بھائی کی نشان دہی پر اصغر نے دو قبروں پر فاتحہ پڑھی اور احساس جرم سے خوف آیا۔ اصغر کے بڑے بھائی کے لیے اب جلن یا حسد کا اظہار بے معنی تھا۔ چھوٹا بھائی اس سے بہت آگے نکل گیا تھا پھر بھی اس نے اصغر کی بیوی کی بے حیائی کے انداز پر طعن طنز کی اور یہ بھی کہا کہ شہر جا کے تجھے بیاہ کے لیے یہی بچھڑی ملی تھی۔

اصغر واپس پہنچا تو نائلہ سخت پریشان تھی۔ صحن میں بندھی بھینسوں کی وجہ سے وہاں بدبو کے علاوہ مچھر بہت تھے جو اکبر کو بھی کاٹ رہے تھے اور وہ مسلسل رو رہا تھا۔ اس ماحول میں نائلہ کا دم گھٹ رہا تھا اور وہ فوراً یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن اصغر کی بھابی نے رات کے کھانے کا بندوبست کر لیا تھا... شہر میں اس وقت وہ چائے پیتے تھے مگر اخلاقاً انہیں غروب آفتاب کے بعد ہی نمک مرچ کے ساتھ ابالے ہوئے ساگ کے ساتھ وہ روٹیاں کھانی پڑیں جن میں اپلوں کے دھوئیں کی بو تھی۔

اچانک اصغر کو یاد آیا کہ اس کا ایک بھائی اور بھی تھا۔ ارشد کے سوال پر بڑے بھائی نے اداسی سے کہا۔ ''تجھے یاد ہے؟ میں تو اس کی بات ہی کرنا نہیں چاہتا تھا۔''

''مگر کیوں...؟''

بڑا بھائی کچھ دیر زمین کو دیکھتا رہا۔ ''ارشد کا قتل ہو گیا تھا۔''

دور سے اس کی بیوی نے چلّا کے کہا۔ ''جانے دے... اسے کسی کے مرنے جینے سے کیا۔ دیکھ اس کی بیوی کتنا شور کر رہی ہے... وہ جانا چاہتی ہے۔''

اصغر فوراً اٹھا اور اس نے نائلہ کو اپنی کار کی چابی دی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم جاؤ... چاہو تو واپس چلی جاؤ۔''

''میں واپس جاؤں گی۔'' نائلہ نے چابی لے لی۔ ''تم کتنے دن رہو گے یہاں؟''

''کتنے دن... ڈارلنگ! میں صبح آ جاؤں گا... یوسی... مجھے یہ سب معلوم نہیں تھا۔''

''اسی لیے کہا تھا میں نے... تمہیں دو چار دن تو رہنا چاہیے۔''

''تم واقعی ناراض نہیں ہو؟''

وہ مسکرائی۔ ''جب واپس آؤ گے تو بتاؤں گی۔''

اصغر نے نائلہ کے جانے کے بعد بہت اداسی محسوس کیا۔ وہ پھر بھائی کے پاس آبیٹھا... آنسو جو اس کی آنکھوں میں رکے ہوئے تھے، بہ نکلے... وہ بھائی کی گالیاں سنتا رہا اور اس سے معافی مانگتا رہا۔ اس کی بھابی قطعی لاتعلقی سے اس جذباتی سین کو دیکھتی رہی... پھر وہ سونے چلی گئی۔

اصغر نے کہا۔ ''ارشد کو کس نے قتل کیا تھا بھائی؟''

بھائی نے آہ بھری۔ ''یہ تو پتا نہیں۔''

''کیا مطلب... کسی عورت کا چکر تھا یا... زمین کا... یہ کب کی بات ہے؟''

بھائی نے حقے کا کش لے کر سوچا۔ ''چار سال ہو جائیں گے اس رمضان میں... شہر سے کچھ لڑکے اور لڑکیاں آئے تھے... سب جوان اور بے حیا... اللہ معاف کرے... شرم اور غیرت نام کی ان میں کوئی چیز ہی نہیں تھی... آپس میں ایسے رہتے تھے جیسے میاں بیوی بھی یہاں نہیں رہتے... اور کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ کون کس کا میاں اور کون کس کی بیوی...''

اصغر نے بات کاٹی۔ ''کس سلسلے میں آئے تھے وہ؟''

''شہر میں کوئی اسکول ہے... وہاں بُت بنانا سکھاتے ہیں... توبہ توبہ... مسلمانوں کے ملک میں یہ بھی ہوتا ہے... اور وہ تصویریں بناتے تھے۔''

''کسی آرٹس اسکول یا اکیڈمی کے ہوں گے۔''

''وہ ادھر جہلم کے کسی افسر کے مہمان تھے ورنہ انہیں یہاں کون رہنے دیتا۔ وہ ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے تھے... دن رات... کبھی روہتاس کے قلعے میں... کبھی ادھر منگلا ڈیم پر... وہ انہی میں ایک لڑکی کے ساتھ تھی ہو گیا تھا... اسی کے ساتھ ساتھ پھرتا تھا... نام بھی عجیب تھا اس کا، مجھے یاد نہیں۔ وہ تصویریں بناتی تھی۔ لکڑی کا ایک تختہ تھا تین ٹانگوں والا... اتنا بھاری تھا کہ وہ خود اٹھا کے نہیں پھر سکتی تھی۔ اس نے ارشد کو سو روپے روز پر رکھ لیا۔ بات سو روپے کی نہیں تھی۔ ارشد کو پاگل کر دیا تھا اس نے... وہ پتلون پہنتی تھی... اور اوپر بنیان جیسی کوئی چیز... قمیص پہنتی تھی تو ایسی کہ...''

''تم نے دیکھا تھا اسے بھائی؟''

''ہاں... وہ ساری ایسی تھیں... یہاں سب دیکھتے تھے اور تھو تھو کرتے تھے... تجھے پتا ہے، ارشد بھی تیرے جیسا ہی تھا۔ اس نے خود مجھے بتایا کہ ایک رات وہ روہتاس کے قلعے میں رہے... ایک رات کسی جنگل میں... اس کے بعد منگلا ڈیم کی طرف چلے گئے۔''

''بھائی! ارشد کا قتل اس نے کیا... یا اس کی وجہ سے ہوا؟''

''اسی کی وجہ سے سمجھ لے۔'' وہ کچھ دیر سوچ کے بولا۔ ''اس لڑکی نے ارشد سے کہا... توبہ توبہ... مجھے تو بتاتے ہوئے بھی حیا آتی ہے... اس نے کہا کہ مجھے گاؤں کی ایک لڑکی چاہیے... ماڈل... ماڈل ہی کہتے ہیں نا اسے... ایک ہزار دوں گی... اس تصویر کے... ایک تصویر فصل کاٹتے ہوئے... ایک کنوئیں سے پانی نکالتے ہوئے... ایک دودھ دوہتے ہوئے... لڑکی جوان ہو... اور صحت مند... بھرے ہوئے جسم والی... ارشد نے کہا کہ معلوم کر کے بتاؤں گا... پتا نہیں اس کے دماغ میں کیا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی کہا... یہاں لوگ تصویر بنانے کو حرام سمجھتے ہیں... لیکن اب وہ پہلا گاؤں نہیں رہا... تو نے دیکھا ہو گا... آبادی کتنی بڑھ گئی ہے... میں نے ارشد سے کہا کہ ایک ہزار کے لیے کون اپنی بیٹی کو اجازت دے گا... لیکن اصغر! زمانہ بڑا بدل گیا ہے... بے حیائی بڑھتی جا رہی ہے... لالچ بہت ہو گیا ہے... کوئی لڑکی مان گئی... ارشد نے کہا کہ وہ ایک تصویر کے دو ہزار لے گی... اس کا جھنجی باپ راضی ہو گیا تھا... پھر مشکل یہ ہوئی کہ ایک تصویر گھنٹے میں پوری ہوتی تھی... اس کا باپ بھی موجود رہتا تھا اور دو ہزار جیب میں ڈالے بغیر جاتا نہیں تھا۔''

''کون تھا وہ؟''

''مجھے نہیں معلوم... ارشد سے پوچھا تو اس نے کہا کہ تو نہیں جانتا... وہ مزارع ہے... ادھر میانوالی کی طرف سے آیا ہے۔ خرابی اس دن ہوئی جب اس تصویریں بنانے والی لڑکی نے کہا کہ مجھے ایک ننگی تصویر بنانی ہے... لڑکی گھر کے آنگن میں کھڑی نہا رہی ہو... سامنے پانی کی بالٹی ہو اور اس کا ہاتھ اوپر اٹھا ہوا ہو... اس میں سے پانی لڑکی کے جسم پر گر رہا ہو... میں نے ارشد کو بہت گالیاں دیں مگر وہ ہنستا رہا کہ بھائی تمہیں کیا پتا پیسے کی طاقت کا... دس ہزار ملیں گے ایک تصویر کے... اور یہی لڑکی تصویر بنوائے گی... تم شرط لگا لو... اس نے مجھے ایک اور عجیب بات بتائی... خود ہی بتا دی... میں تو حیران رہ گیا... تجھے یاد ہے، ادھر قبرستان کے پیچھے ایک بستی ہے... پانی کا نالا... اس میں اوپر سے پانی آتا ہے؟''

''ہاں... دریائے کہار سے۔''

''وہاں عورتیں شروع سے کپڑے دھونے اور نہانے جاتی ہیں... کوئی مرد ادھر نہیں جاتا... دو طرف اونچی چٹانیں ہیں... ارشد اس تصویر بنانے والی لڑکی کے ساتھ چٹان پر چھپ کے بیٹھ گیا اور وہ تصویر بناتی رہی... توبہ توبہ... میرا تو دماغ خراب ہو گیا۔ میں نے اسے گالیاں دیں کہ یہ گاؤں کی بہو بیٹیاں ہیں... کسی نے تصویر دیکھ لی تو کیا ہو گا... وہ بولا کہ تصویر تو گئی شہر... سچی بات ہے کہ میں تو ارشد کی طرف سے فکرمند ہو گیا... لیکن دو دن بعد میں نے پوچھا تو وہ ہنسنے لگا... بولا کہ بھائی... تو نے کبھی دس ہزار کے نوٹ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہیں... چھو کر دیکھے ہیں؟ پھر اس نے جیب سے ڈھیروں نوٹ نکالے... ہزار پانچ سو والے... بولا یہ تجھے مل سکتے ہیں... میں نے کہا کہ وہ کیسے؟ کہنے لگا کہ جس لڑکی نے پہلے اپنی تصویریں بنوائی تھیں... فصل کاٹتے ہوئے اور کنوئیں سے پانی کا ڈول کھینچتے ہوئے... وہ مان گئی ہے لیکن اس نے کہا ہے کہ میرے باپ کو پتا نہ چلے... اور رقم میرے ہاتھ میں آنی چاہیے... اس سے پہلے جو ہزار روپے والی تصویریں بنی تھیں، ان کا سارا پیسا لڑکی کے باپ نے وصول کیا تھا... پانچ تصویروں کے پانچ ہزار... یہ اس سے دگنی رقم تھی... مجھے تو یقین نہیں آیا... میں نے ارشد سے کہا کہ تو پاگل ہو گیا ہے... جا کے اس کے باپ کو بتا ورنہ میں بتاتا ہوں... ارشد نے کہا کہ چھوڑ بھائی... آج تصویر بن جائے گی... اس کا باپ مزدوری کرتا ہے... سارا دن باہر رہتا ہے... کل تصویر شہر چلی جائے گی... وہاں کوئی نمائش ہونے والی ہے... بعد میں ولایت بھی جائے گی... میں نے کہا کہ یہ لڑکی دس ہزار لے کر کیا کرے گی... ارشد بولا کہ شادی کرے گی اپنے یار سے... بھائی! مجھے اس سے کیا... جب وہ جانے لگا تو میں نے پوچھا کہ ابھی تو کہہ رہا تھا کہ یہ رقم مجھے مل سکتی ہے... وہ دروازے تک جا کے بولا کہ ہاں... اگر بھابی یہ تصویر بنوا لے... میں نے جوتا کھینچ کے مارا مگر وہ بھاگ گیا... بس اس کے بعد... میں نے اس کی لاش دیکھی۔''

اصغر چونکا۔ ''لاش... کہاں دیکھی؟''

''اسی مزدور کے گھر میں... وہ تین دن گھر نہیں آیا تو مجھے فکر ہوئی... میں نے ادھر اُدھر پوچھا تو پتا چلا کہ وہ لڑکے لڑکیاں چلے گئے... کسی کو پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آئے تھے اور کہاں گئے... کوئی کہتا تھا لاہور گئے، کوئی کراچی... پھر ایک جاننے والا مل گیا... کہنے لگا کہ تو کہاں پھر رہا ہے... ادھر تیرے بھائی ارشد کی لاش لٹکی ہوئی ہے... میں نے اس کے ساتھ جا کے دیکھا تو عجیب سین تھا۔''

اصغر نے کچھ دیر انتظار کیا۔ ''کسی نے پھانسی دے دی تھی اسے؟''

''نہیں... یہی تو عجیب بات ہے... ایک تو ارشد نے تیری طرح کوٹ پتلون پہنا ہوا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اس تصویر بنانے والی لڑکی کے ساتھ شہر جانے کی تیاری کر چکا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ لڑکی اس سے محبت کرنے لگی ہے اور اب وہ شہر جائے گی تو میں بھی ساتھ ہی جاؤں گا۔ وہاں ہم شادی کریں گے۔ میں نے سمجھایا تھا کہ پاگل... ایسی لڑکیاں شادی کہاں کرتی ہیں جن کے خصم امیر ہوتے ہوں اور پھر تیرے ساتھ...... ارشد کو کسی نے گلا گھونٹ کے مارا تھا۔ یہ بعد میں سرکاری اسپتال والوں نے لاش دیتے وقت بتایا۔ لیکن مارنے کے بعد اسے ایسے لٹکا دیا تھا جیسے شہر والے اپنے کپڑے الماری میں لٹکاتے ہیں۔''

''ہینگر سے؟ مگر ہینگر تو پلاسٹک یا لکڑی کے ہوتے ہیں، وہ کسی لاش کا وزن نہیں سہار سکتے۔''

''یہی تو عجیب بات ہے۔ وہ لوہے کا ہینگر تھا یا اسی جیسی کوئی چیز تھی۔ معلوم نہیں کہاں استعمال ہوتی تھی۔ ارشد کپڑوں سمیت اس میں جھول رہا تھا۔''

''پولیس نے کچھ معلوم نہیں کیا... تجھ سے کچھ نہیں پوچھا؟''

''پوچھا تھا۔ میں نے وہی بتایا جو ارشد نے مجھے بتایا تھا۔ اس پر تھانے دار نے مجھے حوالات میں ڈال دیا۔ پھر ساری رات میری چھترول کی اور کہا کہ خبردار جو یہ بات کسی کے سامنے کہی۔ وہ سارے ایس پی صاحب کے مہمان تھے۔ ان کو اوپر سے کسی نے کہا تھا کہ ان لڑکے لڑکیوں کی رہائش کا بندوبست کرنا ہے۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں کسی کے سامنے زبان نہیں کھولوں گا تو تھانے دار نے مجھے سمجھایا کہ تیرا بھائی لالچ میں مارا گیا۔ اس بات کا پکا ثبوت یا گواہ تو کوئی نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جب وہ لڑکی ننگی تصویر بنوانے پر راضی ہو گئی۔ نہاتے ہوئے تو ارشد نے تصویر بنانے والی سے کہا کہ وہ بیس مانگ رہی ہے۔ شاید اس سے پہلے بھی اس نے ڈنڈی ماری ہو گی، پر سودا کر کے لڑکی کے باپ کو ایک دیتا ہو گا۔ یہ بات لڑکی کو پتا چل گئی اور اس نے اپنے یار کو بتا دی جس کے ساتھ اس نے بھاگ کے شادی کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ادھر تصویر بنانے والی لڑکی پیسے دے کر گئی، ادھر وہ پہنچ گیا۔ سارے پیسے ارشد کی جیب میں تھے۔ لڑکی نے اور اس کے آشنا نے مل کر ارشد کو مارا اور گھر میں لٹکا کے بھاگ گئے۔ اس نے بتایا کہ وہ ہینگر نہیں تھا... جو اسٹیل کا فرنیچر بناتے ہیں، ان کے پاس ایسی چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ کسی لوہے

www.pkdigest.com

کی کرسی کا ٹوٹا ہوا بازو تھا۔ خیر، مجھے کیا۔ میرا تو بھائی گیا۔ تھانے میں جوتے پڑے وہ الگ۔“

”اور اس لڑکی کا باپ؟“

”اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ شاید وہ گھر آیا تو اس نے دیکھا کہ بیٹی غائب ہے اور گھر میں ایک لاش جھول رہی ہے۔ کیا پتا لڑکی کوئی پیغام چھوڑ گئی ہو کہ میں جا رہی ہوں اور واپس نہیں آؤں گی۔ پھر وہ کس کے انتظار میں وہاں رکتا؟ وہ بھی بھاگ گیا۔ معلوم نہیں کہاں سے آیا تھا اور کون تھا۔“

اصغر سمجھ گیا کہ پولیس نے ایس پی کی وجہ سے معاملے کو دبا دیا تھا۔ ارشد کے قتل کا سراغ لگانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی ورنہ معلوم کیا جاسکتا تھا کہ وہ کون سے آرٹس اسکول کے طلبا وطالبات تھے۔ ارشد کو کس لڑکی نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس نے جس لڑکی کی تصویر بنائی وہ کون تھی اور اس کے مزدور باپ نے اگر کوئی گھر کرائے پر لیا تھا تو کیا نام پتا لکھوایا تھا۔ مگر ایس پی کے مہمان بھی عام گھروں کے لڑکے لڑکیاں نہیں تھے۔ وہ ایسے دولت مند گھرانوں کے چشم وچراغ تھے جو سنگ تراشی اور مصوری جیسے مشاغل افورڈ کرسکتے تھے اور شوق پر ہزاروں لٹا سکتے تھے۔

دونوں بھائی صحن میں لیٹے رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ بڑے بھائی نے بتایا کہ ان کا باپ پہلے گیا۔ اس کا ہاضمہ خراب رہنے لگا تھا۔ مقامی حکیم نے کہا کہ جگر خراب ہے۔ جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ اس نے لاہور بھیج دیا۔ دو ہفتے بعد پتا چلا کہ جگر کا سرطان ہے۔ تین مہینے بعد وہ مر گیا۔ ماں کو دمہ تھا۔ سال بھر بعد وہ بھی چل بسی۔ زمین وہ خود ہی کاشت کرتا ہے لیکن اس سے اب محنت نہیں ہوتی۔

اصغر نے پوچھا۔ ”بھائی! تیرے بچے کتنے ہیں؟“

”دو تیرے سامنے ہوگئے تھے۔ دونوں لڑکے تھے۔ آج بارہ بارہ سال کے ہوتے۔ جڑواں تھے۔ چار پانچ سال بعد میرے ساتھ کام کرتے۔ ایک کشتی میں نہاتے ہوئے ڈوب گیا۔ ادھر بارش ہوئی تھی... ایک دم باڑھ آگئی، اسے تیرنا نہیں آتا تھا... دوسرا ہمارے ساتھ لاہور گیا تھا... داتا صاحب کے عرس میں۔ بھیڑ میں کہیں بچھڑ گیا۔ ہم تین دن ادھر پڑے رہے۔ وہ نہیں ملا۔ ایک بندے نے کہا کہ بابو وہ اب نہیں ملے گا۔ اغوا کار ایسے ہی بچے اٹھاتے ہیں گاؤں دیہات سے آنے والوں کے۔ انہیں دبئی بھیج دیتے ہیں جہاں اونٹ ریس ہوتی ہے۔ چھوٹے بچوں کو اونٹ سے باندھ کر دوڑاتے ہیں تو بچے خوف سے چیختے چلاتے ہیں...

یہی دیکھنے والوں کی تفریح ہوتی ہے۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے اصغر... میرا مطلب ہے معصوم بچوں کی چیخوں کو سن کے کسی کا دل خوش ہوسکتا ہے؟“

اصغر نے آہ بھری۔ ”ہوتا ہے بھائی... میں نے بھی سنا ہے اور اس کے لیے چھوٹے بچے ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔ بعض خوف سے مر جاتے ہیں... بعض گر کے کچلے جاتے ہیں۔“

”ہم ادھر منت ماننے گئے تھے۔ مجھے ایک بیٹی کی بڑی آرزو تھی۔ تجھے پتا ہے، ہم بھی تین بھائی تھے۔ جانتے ہی نہیں تھے بہن کیا ہوتی ہے۔ اسی کے لیے گئے تھے۔ بیٹا گنوا کے لوٹ آئے۔ بیٹی ہوئی بعد میں مگر وہ چند گھنٹے ہی زندہ رہی... حالانکہ دائی پرانی تھی۔ اس نے کہا کہ اللہ کی مرضی کے آگے بندہ کیا کرسکتا ہے۔ بس اس کے بعد کچھ نہیں ہوا۔ میرے سالے زمین پر نظر رکھے بیٹھے ہیں۔ پٹواری کہتا ہے تمہارا بہنوئی مرے گا تو زمین خود تمہیں مل جائے گی۔ مجھے ڈر ہے اصغر کہ کہیں وہ مجھے ٹھکانے نہ لگا دیں۔“

”کیا انہیں معلوم نہیں کہ ایک وارث میں بھی ہوں؟“

”سب سمجھتے ہیں تو مر گیا اور زندہ ہے تو لوٹ کے نہیں آئے گا۔ ارشد کی موت کے بعد ایک میں ہوں۔“

”تو کیا چاہتا ہے بھائی؟“

”میں... اصغر! تو مجھے بھی شہر بلا لے...“

اصغر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”شہر آکے تو کیا کرے گا؟ مزدوری تجھ سے ہوگی نہیں۔ کیا سڑکوں پر بھیک مانگے گا؟“

بڑے بھائی کو صدمہ ہوا۔ ”اتنا پیسا ہے تیرے پاس۔“

”نہیں بھائی... میرے آسرے پہ نہ رہنا۔ خود میں کسی کے آسرے پر نہیں رہا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ تو ساری زمین میرے نام کردے اور میں تجھے اتنا پیسا دے دوں کہ تیرے باقی دن آرام سے گزر جائیں۔ تو یہاں کوئی دکان کھول لے پرچون کی۔“

بڑے بھائی نے لالچ دینے والی یہ تجویز مان لی۔

”میں پتا کروں گا زمین کا کیا بھاؤ ہے۔“

”دیکھ... مجھ سے بھاؤ کرے گا تو سمجھ لے آدھی ویسے ہی گنوا دے گا جو میرا حصہ ہے۔ اپنے سالوں اور پٹواری سے نمٹنا تیرے بس کی بات نہیں... میں تجھے اچھی قیمت دوں گا۔ سارے معاملات مجھ پر چھوڑ دے۔“

بڑے بھائی نے کہا۔ ”یہ تو ہے۔“

صبح دونوں بھائی گھومتے پھرے اور پرانی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔ کہاں کیا تھا... کون تھا جواب نہیں ہے۔ مقصد لوگوں کو بتانا تھا کہ زمین کا ایک اور اصل وارث لوٹ آیا

ہے اور وہ بڑی چیز ہے۔ اس کی کار نے پٹواری کو بھی دم بخود کردیا۔ جب اس نے بتایا کہ بورڈ آف ریونیو کے فلاں افسر کا داماد ہے تو وہ دست بستہ اسے سر کہتا رہا۔

اصغر کے سسر کے ایک اشارے پر پٹواری بہ قلم خود حاضر ہوا اور بہ قلم خود ساری کاغذی کارروائی مکمل کرلی گئی۔ زمین کی ملکیت اصغر کے نام پر ہوگئی اور اصغر نے بڑے بھائی کو اصل سے آدھی قیمت دے کر اس پر احسان کیا۔ یہ بھی اس کی توقع سے اتنی زیادہ تھی کہ وہ دولت مند ہوگیا۔ اس نے اپنا آبائی گھر اصغر کے حوالے کیا اور خود لاہور چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اتنا پیسا ہو تو ویلج میں دکان کھولنے کا کیا فائدہ۔ وہ لاہور میں بزنس کرے گا اور اصغر کی طرح دولت مند ہوجائے گا۔ دکان کھولنے سے پہلے وہ شادی دفتر والوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس نے بیوی سے کہا کہ اب وہ اس کے لیے اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی تو اسے دوسری شادی کا حق حاصل ہے۔ اس کی دوسری شادی تو ہوئی نہیں، پہلی بیوی اسے چھوڑ کے واپس اپنے گھر لوٹ گئی۔ اصغر کو بعد میں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

اصغر کے سسر نے حقیقتِ حال معلوم ہونے کے بعد اپنے داماد سے کچھ نہیں کہا۔ اب پوچھنے کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ تاہم اس نے زمین اپنے داماد کے نام کرادی اور متعلقہ حکام کو بھی سمجھا دیا کہ اسے لاوارث جان کے ریکارڈ میں ہیرا پھیری نہ کریں۔ ظاہر ہے، اس کے بعد زمین برسوں لاوارث پڑی رہی لیکن محفوظ رہی۔

ملک کے سیاسی حالات ابتری کی طرف جا رہے تھے۔ سارے ملک میں ایوب خان کی حکومت کے خلاف مظاہرے جاری تھے۔ لوگ ”بنیادی جمہوریت“ نہیں جمہوریت مانگ رہے تھے لیکن ایوب خان نے الیکشن کرانے کے بجائے اقتدار یحییٰ خان کے حوالے کردیا۔ اس نے ایک کام یہ کیا کہ کرپشن اور بدعنوانی کے نام پر سول سروس کے تین سو تین اعلیٰ افسران کو فارغ کردیا۔ ظاہر ہے، اس قسم کی تمام برطرفیاں یا تقرریاں سیاسی بنیادوں پر ہی ہوتی ہیں۔ اس فہرست میں سردار صاحب کا نام بھی آگیا۔

اصغر یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے سسر نے کبھی رشوت نہیں لی... یہ الزام ہوتا تو اس کا بہت پہلے خانہ خراب کردیا جاتا۔ اصل بات یہ تھی کہ دو سال پہلے اس نے ایک وزیر اور سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے رکن قومی اسمبلی کے بیٹے کو نائلہ کا رشتہ دینے سے انکار کردیا تھا۔ وجہ صرف اس کے بیٹے کا کردار تھا جو کسی سے مخفی نہیں تھا۔ اس کی عیاشی کے قصے

عام تھے۔ دو بار وہ شادی کر کے ترک کرچکا تھا کیونکہ اس کی بیوی کہلانے کی دعوے دار فلمی دنیا سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں سے ایک اسٹیج ڈانسر تھی۔ دونوں اسکینڈل طاقت اور پیسے سے دبا دیے گئے۔ بیان بازی کا مقصد ہی وزیر زادے کو بلیک میل کر کے زیادہ سے زیادہ پیسا وصول کرنا تھا۔ سال بھر بعد وہ ڈانسر دوبارہ اس کے ساتھ دیکھی جانے لگی۔ اخبارات نے ایک تصویر شائع کردی جس میں وہ شراب کا بھرا ہوا گلاس سر پر رکھے اپنی سابقہ ڈانسر بیوی کے ساتھ ٹھمکا لگا رہا تھا۔ اس اخبار کے مالک پر آفت آگئی اور وہ فوٹو گرافر غائب ہوگیا۔ چھ ماہ بعد وہ لڑکی اپنے فلیٹ میں مردہ پائی گئی۔

ظاہر ہے اس پس منظر کے ساتھ کون باپ اپنی بیٹی کی زندگی کو جہنم بنا سکتا تھا۔ بعد میں نائلہ نے خود اصغر کو بتایا کہ اس نے اپنے باپ کو دھمکی دے دی تھی کہ یہ رشتہ منظور کیا گیا تو وہ خودکشی کرلے گی لیکن باپ بھی اس کا دشمن تو نہیں تھا۔ اس نے تمام دباؤ، خطرات اور دھمکیوں کا سامنا کیا اور وزیر سے وہی کہہ دیا جو ساری خرابی کا سبب بنا۔ اگر وہ سیاست سے کام لیتا تو معاملے کو کچھ عرصے کے لیے ٹال دیتا اور مختلف بہانوں سے وقت گزارتا رہتا کہ لڑکی ابھی پڑھ رہی ہے... وہ پہلے ایم اے کرنا چاہتی ہے... یا اسے اپنے چچا کے پاس باہر بھیج دیتا۔ مگر اس نے جذبات میں وزیر کے منہ پر کہہ دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو کنوئیں میں دھکا دے سکتا ہے لیکن اس کے بیٹے کے نکاح میں نہیں دے سکتا۔

سردار صاحب کے خلاف افسر شاہی کو استعمال کیا گیا اور بدعنوانی کے مقدمات کھڑے کردیے گئے۔ اس کا بینک اکاؤنٹ منجمد ہوگیا۔ ضمانت پر رہائی کے لیے اسے ہائی کورٹ جانا پڑا اور مقدمات کی پیروی کے لیے اسلام آباد اور لاہور کے درمیان بھاگتا پھرا اور پے وکیلوں کی فیسوں نے اس کا دیوالیا نکال دیا۔ اس کا ساری عمر کا اندوختہ نکل گیا یہاں تک کہ اس کی کوٹھی اور کار تک بک گئی۔ اس کے باوجود ایک مقدمے میں اسے تین سال کی جیل ہوگئی۔ اس دوران نائلہ کی ماں مر گئی اور کچھ عرصے کے لیے اصغر کو بھی روپوشی اختیار کرنی پڑی۔ وہ نائلہ جس کی وجہ سے اس خاندان پر عذاب نازل ہوا تھا اسی کی بیوی تھی۔

”خورشید جیولری ایمپوریم“ کے مالک خورشید عباسی پرانے وقتوں کے وضع دار آدمی تھے۔ ان کے آبا و اجداد تقسیم ہند اور راولپنڈی کے پاکستان کا شہر بننے سے پہلے بھی یہی کام کر رہے تھے۔ صرافہ بازار میں ان کی چھوٹی سی دکان تھی جو بڑھتے بڑھتے راولپنڈی کی سب سے بڑی اور مشہور دکان بن

www.pkdigest.com

گئی تھی۔ اس ترقی کے بہت سے اسباب تھے۔ اس میں سرفہرست ان کی ایمان داری تھی اور اچھے رویے سے انہوں نے خاندانی خریداروں کا وسیع حلقہ پیدا کرلیا تھا جو کہیں اور جانا پسند ہی نہیں کرتے تھے۔

ایسے ہی لوگوں میں سردار صاحب بھی شامل تھے چنانچہ جب انہوں نے اصغر کی سفارش کی تو خورشید عباسی نے اسے ملازم رکھ لیا حالانکہ وہ کاروباری تجربے کے اعتبار سے صفر تھا۔ بعد میں اصغر نے ثابت کیا کہ یہ فیصلہ غلط نہیں تھا لیکن سردار صاحب پر بُرا وقت آیا تو وہ کچھ نہ کرسکے۔ وہ سیاسی لوگ بہرحال نہیں تھے اور انہیں اپنا کاروباری مفاد عزیز تھا۔

اصغر اچانک غیر حاضر ہوگیا تو انہوں نے چند دن انتظار کیا... کہ شاید وہ بیمار ہو... پھر اس کے گھر ایک آدمی بھیجا مگر گھر بند تھا۔ ایک ہفتے بعد اصغر نے کہیں سے فون کرکے اپنی روپوشی کی وجہ بتائی۔

خورشید عباسی نے کہا۔ ”ایسے تم کب تک غیر حاضر رہو گے؟“

”دیکھیے... میں نے جب سے ملازمت شروع کی، آج تک صرف اپنی شادی کے لیے ایک ہفتے کی چھٹی کی تھی۔ اگر میں سامنے آیا تو سردار صاحب کا داماد ہونے کے جرم میں مجھے بھی پکڑ لیا جائے گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں بزنس مین ہوں۔ مجھے دکان چلانی ہے... کیا تمہاری جگہ میں خود بیٹھ جاؤں؟“

”عباسی صاحب! آپ کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے ہیں... سرکاری افسر، جنرل اور وزیروں کی بیگمات آپ کے خریداروں میں شامل ہیں۔ آپ ان سے کہیے...“

”کیسی باتیں کرتے ہو؟ سردار صاحب کے قانونی معاملات کا فیصلہ عدالت کرسکتی ہے۔“

”آپ کم سے کم میرے لیے تو کوشش کرسکتے ہیں۔“

”کوشش کرسکتا ہوں... وعدہ نہیں۔“ عباسی صاحب نے کہا اور فون رکھ دیا۔

عباسی صاحب نے جھوٹا وعدہ نہیں کیا تھا۔ یہ انہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ایک جنرل کی چہیتی بیوی نے اپنے شوہر کو مجبور کردیا کہ باپ کے جرم کی سزا بیٹی کو نہ ملے۔ اصغر گرفتاری سے بچ گیا لیکن عباسی صاحب نے اسے دوبارہ ملازمت پر رکھنے سے صاف انکار کردیا۔ انہوں نے کہا کہ اصغر دو مہینے غیر حاضر رہا ہے۔ انہوں نے اس کی جگہ ایک بی کام نوجوان کو رکھ لیا ہے... اور دوسری بات یہ کہ اس کی وجہ سے وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ تاہم وضع داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے اصغر کو دو ماہ کی پوری تنخواہ کے ساتھ ایک لاکھ کا اعلیٰ کارکردگی کا بونس بھی دیا... اس شرط پر کہ وہ کسی سے بھی اس کا ذکر نہیں کرے گا۔ اصغر ان کی مجبوری کو سمجھتا تھا... نام انہی کا تھا مگر عملی طور پر کاروبار ان کے دو جوان بیٹوں کے ہاتھ میں تھا اور وہ وضع داری کا روگ پالنے کے قائل نہیں تھے۔ کاروبار کا اخلاقیات سے کیا تعلق؟ دنیا میں ایسا نہیں تھا مگر پاکستان میں یہی اصول چلتا تھا۔

بے روزگاری اصغر کے لیے ایک چیلنج بن گئی۔ اس نے ایک مہینا انتظار کیا کہ سسر کی وجہ سے اس پر نازل ہونے والی آفت واقعی ٹل گئی ہے یا نہیں۔ اس کے پاس دو ماہ کی تنخواہ اور ایک لاکھ کے بونس کے علاوہ اپنا بھی اندوختہ تھا چنانچہ فوری طور پر گزارے کا مسئلہ نہیں تھا۔

اس کی بیوی نے اسے بڑا سہارا دیا۔ وہ اسے تسلی دیتی رہی کہ گھبرانے کی بات نہیں۔ بندہ ایک در بند کرتا ہے تو اللہ سو در کھولتا ہے۔

”یہ تم کون سی نئی بات بتا رہی ہو مجھے۔“ وہ چڑ کے بولا۔

”تم خود اپنا بزنس کیوں شروع نہیں کرتے؟“

”کون سا بزنس؟“

”وہی... جس کا تمہارے پاس اتنا تجربہ ہے۔“ نائلہ نے کہا۔

اصغر تلخی سے ہنسا۔ ”سونے کا بزنس... پاگل لڑکی... کچھ اور کہتیں تو بات تھی۔ جو سرمایہ میرے پاس ہے اس سے میں صرف پان سگریٹ کا کھوکھا لگا سکتا ہوں... ٹھیلے پر پانی بیچ سکتا ہوں... اس کے لیے بھی پولیس کو دانے دینے پڑتے ہیں۔“

نائلہ نے کہا۔ ”آخر تمہاری وہ زمین کس دن کام آئے گی؟“

اصغر ایک دم اٹھ بیٹھا۔ ”زمین...؟ واقعی، زمین کو تو میں بھولا ہوا تھا۔ اگر جگہ کا بندوبست ہوجائے تو مارکیٹ میں میری گڈول بہت ہے۔“

اصغر کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ منگلا ڈیم کی تعمیر کے بعد وہ زمین سونا اگلنے لگی ہے اور سونے کا بھاؤ چڑھتی ہے۔ اس نے ایک مہینے میں ساری زمین بیچ دی۔ اس سے حاصل ہونے والی رقم اصغر کی توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ سرمایہ فراہم ہوتے ہی اس کا دماغ مستعد ہوگیا۔ اس نے روم میں وہی کیا جو رومن کرتے ہیں۔ خورشید عباسی کے بیٹوں کی طرح اس نے بھی یہی اصول سامنے رکھا کہ کاروبار کا اخلاقیات سے کیا واسطہ؟ اس کی تجربہ کار اور دوربیں آنکھوں نے دیکھ لیا تھا کہ آنے والے وقتوں میں جائز اور ناجائز کا فرق مٹ جائے گا۔ دھن صرف دھن ہوگا... نہ کالا نہ سفید!

اس نے اسلام آباد کے بلیو ایریا کو منتخب کیا اور جانتے بوجھتے اپنی دکان کا نام ”نیو خورشید جیولری ایمپوریم“ رکھنے کا فیصلہ کرلیا لیکن اس کے افتتاح سے ایک مہینے پہلے اس نے ایک وکیل کے مشورے سے اپنی بیوی نائلہ کا نام بدل کے خورشید کردیا۔ قانونی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس نے تین بڑے اخبارات میں یہ اشتہار نمایاں طور پر اطلاع عام کے عنوان سے شائع کردیا کہ میں نائلہ اصغر زوجہ راجا اصغر نے اپنا نام بدل کے خورشید اصغر کرلیا ہے چنانچہ مجھے اسی نام سے پکارا جائے اور متعلقہ دستاویزات میں بھی یہی لکھا جائے۔

اسی وکیل کے مشورے سے اس نے دوسرا قانونی قدم یہ اٹھایا کہ اپنی دکان کے نام کو رجسٹرڈ کرالیا۔ حالات خود بخود اس کے لیے سازگار ہوتے چلے گئے۔ اس نے یکم رمضان کو سائن بورڈ لگا کے روشنیوں کی چمک دمک میں ”نیو خورشید جیولری ایمپوریم“ کا افتتاح اپنی بیوی سے کرایا اور اس کی رنگین تصاویر اگلے روز صبح کے اخبارات میں شائع کرائیں۔

جب اسلام آباد کے نام سے ملک کا نیا دارالخلافہ بنایا گیا تھا تو کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہاں آبادی اتنی تیزی سے پھیلے گی۔ دیکھتے دیکھتے ایک نیا شہر وجود میں آگیا جسے کچھ لوگوں نے کلرکوں اور بابوؤں کا شہر کہا مگر یہاں بڑے خریداروں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آچکا تھا جس میں بیوروکریٹ... اراکین سینیٹ و اسمبلی... وزرا اور ملٹری بیوروکریسی کے ساتھ فارن ڈپلومیٹس شامل تھے۔

یہ دولت مندوں کی وہ کلاس تھی جو ملکی وسائل تک دسترس رکھتی تھی، عوامی خزانے کو اپنا سمجھتی تھی۔ رشوت، غبن، ٹیکس چوری اور سرکار سے قرض لے کر واپس نہ کرنے میں کوئی اخلاقی خرابی نہیں دیکھتی تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ حکومت میں سارے چور تھے لیکن اصغر کو اندازہ ہورہا تھا کہ لاقانونیت بڑھ رہی ہے اور احتساب کا عمل کمزور پڑنے سے کرپشن کا ناسور سوسائٹی کی اپر کلاس میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس کا یہ اندازہ غلط نہ تھا کہ مستقبل میں یہی اس کے سب سے بڑے خریدار ہوں گے۔

اصغر کے پرانے مالکوں نے دکان کے افتتاح ہی سے اس کی بدنیتی بھانپ لی تھی۔ خورشید عباسی کا اس کے خلاف کوئی قانونی یا غیر قانونی قدم اٹھانے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو سمجھانا چاہا کہ اصغر کے ان ہتھکنڈوں سے ہماری ایک صدی کی گڈول ختم نہیں ہوسکتی اور لوگ اندھے نہیں ہیں کہ اصل اور نقل کے فرق کو نظرانداز کردیں۔

لیکن نئے زمانے کے بیٹوں نے اس کی ایک نہ سنی تاہم انہوں نے بہتر سمجھا کہ پہلے اصغر سے بات کرلی جائے۔ وہ سیدھے اس کی دکان کے عقب میں بنے ہوئے چھوٹے سے آفس میں پہنچ گئے۔ اصغر نے ان کی نیت کو بھانپنے کے باوجود ان کا استقبال خوش دلی سے کیا اور ان سے چائے کے لیے پوچھا۔

”ہم یہاں چائے پینے نہیں، تم سے یہ کہنے آئے ہیں کہ تم اپنی دکان کا نام بدل دو۔“

”نام بدل دوں... وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ یہ ہمارا نام ہے جس سے تم فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔“ دوسرے نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم نمک حرام ہو۔“

”دیکھو... نمک اگر میں نے کھایا ہے تو حق نمک بھی ادا کیا ہے۔ میں نے دن رات محنت کی اور کبھی ایک پیسے کا غبن نہیں کیا۔ رہی نام بدلنے کی بات تو یہ ناممکن ہے کیونکہ یہ نام کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہے اور نہ کسی نے اپنے نام کو رجسٹرڈ کرا رکھا ہے۔“

”تم ہمارے پرانے گاہکوں کو دھوکا دے رہے ہو۔“

”یہ غلط ہے... نہ گاہک اندھے ہیں اور نہ بے وقوف!“

”تم ہمارے ڈیزائن بھی کاپی کررہے ہو۔“ بڑے نے برہمی سے کہا۔

”تمہارے ڈیزائن کون سے اپنے تھے... نہ تم نے کسی ڈیزائن کا پیٹنٹ اپنے نام سے لے رکھا تھا... سب کی طرح تم بھی باہر کے کیٹلاگ سے ڈیزائن لیتے تھے اور پاکستان میں سب یہی کرتے ہیں... کیا جوتے بنانے والے... کیا فرنیچر بنانے والے... اور کیا ڈریس ڈیزائنر۔“

بڑے نے چیخ کے کہا۔ ”نام تو تمہیں بدلنا ہی پڑے گا۔“

اصغر نے کہا۔ ”زیادہ گرمی دکھانے کی ضرورت نہیں... میں نے اپنی دکان کے نام میں نیو کا اضافہ کیا، اس سے یہ پرانا نہیں رہا... آئی بات سمجھ میں؟ نہیں آئی تو جو کرنا ہے کرلو... لیکن آئندہ یہاں آکے مجھ سے اس لہجے میں بات کی تو میں وہ سب احترام بھول جاؤں گا جو تمہارے باپ کی وجہ سے تھا... میں تمہیں بدمعاشی کرنے اور دھمکیاں دینے کے الزام میں پولیس کے حوالے کردوں گا... ناؤ گیٹ آؤٹ۔“

www.pkdigest.com

اس طرح کاروباری رقابت بڑھ کے دشمنی میں بدل گئی اور ایک قانونی جنگ شروع ہوگئی۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے کے خلاف رپورٹ لکھوائی گئی۔ پرانے مالکوں نے اس کے خلاف دھوکا دہی اور جعلسازی کا الزام عائد کیا تو اصغر کی طرف سے رپورٹ لکھوائی گئی کہ خورشید عباسی کے بیٹوں کی طرف سے مجھے دھمکیاں دی جارہی ہیں۔ اس لاحاصل جنگ میں اگر کسی کا فائدہ ہوا تو پولیس کا یا وکیلوں کا...

راجا اصغر کی قانونی پوزیشن مضبوط تھی۔ اس نے عدالت میں ثبوت پیش کر دیا کہ وہ ''نیو خورشید جیولری ایمپوریم'' کا نام رجسٹرڈ کراچکا ہے اور خورشید اس کی بیوی کا نام ہے۔ ثبوت کے طور پر اس نے اخبارات کے تراشے عدالت میں پیش کر دیے۔ عدالت نے دونوں کے کیس خارج کر دیے۔ یہ پرانے پرتے کی فتح تھی لیکن اس کا زیادہ نقصان خورشید عباسی کو ہوا۔

اس کی دو اہم وجوہات اور بھی تھیں۔ اصغر نے کاروباری حکمت عملی میں ایک جارحانہ انداز اختیار کیا... اس نے اصل خورشید جیولری ایمپوریم کے پرانے گاہک توڑے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کے پاس اپنی گڈول بنانے کے لیے سو پچاس سال کی مہلت نہیں تھی۔ پرانے گاہکوں میں سے اکثر اسے جانتے تھے... اس نے اسلام آباد کے گاہکوں سے براہ راست ان کے گھروں پر رابطہ کیا... اپنے رنگین تصویروں والے کیٹلاگ بنوائے اور ہوم سروس شروع کی۔ وہ جانتا تھا کہ اصل خریدار بیگمات ہیں... اس نے خوشامد کو عورت کی کمزوری سمجھتے ہوئے پورا فائدہ اٹھایا... بیگم صاحبہ! آپ صرف حکم کریں... آپ کو دکان تک آنے کی زحمت کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے... ہم سارے ڈیزائنز لے کر خود حاضر ہوں گے... پیسوں کی کوئی بات نہیں... آجائیں گے... ہونا کیا اعتبار سے بڑھ کر ہے؟ اس طرح وہ بعض اوقات بیگمات کو ضرورت سے زیادہ زیورات فروخت کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

پھر اس نے اخبار میں بڑے بڑے رنگین اشتہار دیے اور دس فیصد ملاوٹ کر کے بیس فیصد ڈسکاؤنٹ اسکیم بھی شروع کی اور کم آمدنی والوں کو اقساط پر زیورات فراہم کیے۔ دکان دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی رہی مگر اس کی ایک اور اہم وجہ نئی نسل کا خالصتاً کاروباری رویہ تھا۔ وہ خاندانی تعلقات یا وضع داری کے چکر میں نہیں پڑتے تھے۔ اصغر نے ان سے کہا کہ اس نے زیورات کی ڈیزائننگ اور ماڈرن جیولری میں لندن اور جنیوا سے کورس کیے ہیں تو انہوں نے مان لیا اور اسے اپنے لیے وجہ افتخار بنا لیا۔ ان کی جدید فیشن کو آنکھ بند کر کے اختیار کرنے والی بہو بیٹیاں ہر جگہ بڑے فخر سے بیان کرتی پھرتی تھیں کہ ان کی جیولری بلیو ایریا کے نیو خورشید جیولری ایمپوریم کی ہے... مری روڈ کی ٹریفک اور پھر شہر کے اژدحام میں کون جائے؟

اصغر نے اسلام آباد کے سیکٹر ایف سیون میں ایک عالی شان محل نما گھر تعمیر کر لیا تھا۔ اس کے پاس دو گاڑیاں تھیں... ایک سفارت کار سے حاصل کی ہوئی تقریباً بالکل نئی مرسیڈیز اس کے استعمال میں رہتی تھی... دوسری گاڑی نائلہ کے شوق کے مطابق ہر سال بدلی جاتی تھی۔ ان کا بیٹا اکبر اسلام آباد کے ایک بہت اچھے اسکول میں پڑھ رہا تھا اور نائلہ خود اسے چھوڑنے اور پھر اسکول سے لانے جاتی تھی۔

نائلہ کے لیے دولت مندی کوئی انوکھا تجربہ نہیں تھا۔ اس کا بچپن باپ کے گھر میں ایسے ہی گزرا تھا اور سوائے چند ماہ کے اس نے غریبی یا پریشانی کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ اب شوہر کی آمدنی نے اسے اپر کلاس میں لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا چنانچہ اس نے اپنی سوشل ایکٹیویٹی کا دائرہ بڑھایا۔ وہ کبھی کبھار اسلام آباد کلب بھی چلی جاتی تھی لیکن اسے وہاں آنے والی بیورو کریٹس کی بیگمات کے رویے میں ایک عجیب سی رعونت آمیز دوری محسوس ہوتی تھی۔

کلاس کمپلیکس ان بیگمات کو احساس کمتری یا برتری میں مبتلا رکھتا تھا۔ گریڈ سترہ کے افسر کی بیگم گریڈ بائیس والے کی بیگم کے سامنے اتنی ہی باادب باملاحظہ ہوشیار رہتی تھی جتنا اس کا شوہر اپنے باس کے سامنے رہتا ہوگا۔ گریڈ بائیس والے کی بیوی بیس اکیس گریڈ سے نیچے والے کی بیوی کو زیادہ منہ نہیں لگاتی تھی۔ نائلہ کے لیے تو ان سب کے رویے میں واضح پیغام تھا کہ تمہارے پاس پیسا ہم سے زیادہ ہو، تب بھی تم ہو وہی ایک سنار کی بیوی... پیسا تو منشیات فروشوں اور ڈاکوؤں کے پاس بھی بہت ہوتا ہے... تم خود کو طبقۂ اشراف میں شامل سمجھنے کی خوش فہمی سے دور ہی رہو تو اچھا ہے۔

اب نائلہ نے این جی اوز کی طرف رجوع کیا۔ اپنے مالی وسائل کی وجہ سے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ خواتین کے حقوق کے لیے اور ان پر ہونے والے مظالم کے خلاف ہر محاذ پر لڑنے والی ایک این جی او کی سربراہ اس کی دوست بن گئی۔ اس کے میڈیا سے بڑے اچھے مراسم تھے۔ ان کی ہر ایکٹیویٹی کی رپورٹ اخبارات میں شہ سرخی اور بڑی بڑی رنگین تصاویر کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ ان کے سیمینارز بڑے بڑے

www.pkdigest.com

ہوٹلوں میں ہوتے تھے اور ان میں نامور سیاسی و سماجی شخصیات کو مدعو کیا جاتا تھا۔

نائلہ دیکھ رہی تھی کہ آہستہ آہستہ اس کی شہرت اور ناموری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ سماجی سرگرمیوں کا یہ سلسلہ بالآخر سیاسی بازار کی طرف لے جاتا تھا... نائلہ کی تیکنی نے بے تکلفی کے مراحل طے کرنے کے بعد نائلہ کو رازداری سے مستقبل کی منصوبہ بندی کے سارے اسرار و رموز سمجھا دیے تھے کہ پاکستان میں سیاست پیسے والوں کا کھیل ہے... تم دیکھنا، ایک دن وزارت کا قلمدان تمہارے پاس ہوگا۔

اصغر سب سمجھتا تھا لیکن اس نے بیوی کے اس شوق یا کھیل کو جاری رہنے دیا۔ پیسا برباد کر کے وہ اپنا وقت ہنسی خوشی گزار رہی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے... لیکن قسمت کیا کھیل کھیلنا چاہتی ہے اس کا کسی کو بھی اندازہ نہ تھا... ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

ایک دوپہر کے بعد نائلہ اپنی گاڑی میں اکبر کو لینے اسکول گئی اور لوٹ کے گھر نہیں آئی... اصغر کو یہ بات رات کو اپنے گھر واپس پہنچنے کے بعد معلوم ہوئی... اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ نائلہ کئی بار شام کو باہر جاتی تو اسے واپسی میں دیر بھی ہو جاتی تھی لیکن ایک تو اصغر کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس کے ساتھ ہے... دوسرے وہ اکبر کو اپنے ساتھ نہیں لے جاتی تھی... اسکول سے براہِ راست اسے یونیفارم میں اور بستے کے ساتھ لے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی پورے زور سے بجنے لگی تھی۔ اس کی چھٹی حس اسے یقین دلا رہی تھی کہ نائلہ اور اکبر کسی حادثے کا شکار ہوئے ہیں... اپنا دماغ پُرسکون رکھتے ہوئے اس نے گھر کے ملازموں سے پوچھا۔ ان سب نے ایک ہی بات کہی کہ بیگم صاحبہ معمول کے مطابق گاڑی لے کر اکبر کو لینے اسکول گئی تھیں لیکن واپس نہیں آئیں۔

اصغر نے فون سامنے رکھ کے نائلہ کی ایک ایک سہیلی اور اپنے جاننے والوں سے پوچھنا شروع کیا۔ ان سب کا جواب ایک ہی تھا کہ ہم نے آج نہ نائلہ کو دیکھا، نہ اکبر کو... آدھی رات کے وقت اسکول والوں سے پوچھا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اکبر آج اسکول آیا تھا یا نہیں... وہ ڈرائیور کے ساتھ نکلا اور باری باری اس نے اسلام آباد کے اور پھر راولپنڈی کے تمام اسپتالوں کو چیک کیا۔ وہ ہر جگہ ایمرجنسی وارڈ میں گیا اور پھر مردہ خانوں میں... اس کا بیٹا اور بیوی کہیں نہیں تھے۔

صبح ہوتے ہی وہ اپنے علاقے کے پولیس اسٹیشن پہنچا اور ڈیوٹی افسر کو ساری صورتِ حال سمجھائی۔ ”دوسرے تھانوں سے معلوم کرو کہ کہیں کسی حادثے کی رپورٹ ہے جس میں گولڈن کلر کی ایک ہنڈا سوک تباہ ہوئی ہو۔“

نیم خوابیدہ ڈیوٹی افسر نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ ”آپ مجھے حکم دے رہے ہو؟“

اصغر نے دھڑلے سے میز پر مکا مارا۔ ”ہاں... حکم دے رہا ہوں کیونکہ تم پبلک سرونٹ ہو... میرے ملازم ہو... ابھی میں تمہارے اعلیٰ افسران کو جگانا نہیں چاہتا... لیکن تم ان کے حکم کے بغیر نہیں چلتے تو میں انتظار کر لیتا ہوں... تم اتنی دیر میں اپنا سامان باندھ لو۔“

ڈیوٹی افسر ڈر گیا... اصغر کے لہجے سے... اس کی دھمکی سے... اس کی گاڑی سے... اس نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا اور بڑی مستعدی اور عاجزی سے اِدھر اُدھر فون گھمانے لگا۔ آدھے گھنٹے میں نیگیٹو رپورٹ آگئی۔ ایسی کوئی گاڑی کسی حادثے کا شکار نہیں ہوئی... نہ اسلام آباد میں نہ پنڈی میں...

اصغر نے صبح ہونے تک انتظار کیا... پھر وہ اپنے ایک جاننے والے ایس پی کے گھر جا پہنچا جس کی بیوی بھی نائلہ کے ساتھ ایک این جی او میں سوشل سروس کرتی تھی... اس کا شوہر ایک مہذب آدمی تھا۔

ایس پی نے اصغر کو تسلی دے کر بٹھایا اور چائے پلائی۔ اصغر نے کہا۔ ”سر! مجھے شک ہے کہ انہیں اغوا کر لیا گیا ہے۔“

”بدقسمتی سے... میں آپ کے خیال کی تائید کرنے پر مجبور ہوں... کیا آپ کی کسی سے دشمنی کا سلسلہ ہے؟“

اصغر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کسی سے بھی نہیں۔“

”پھر آپ یوں کریں... رسمی انداز میں ایک رپورٹ لکھوا دیں اور انتظار کریں...“

”کس کا... ان کی واپسی کا؟“

”نہیں... یہ میرے خیال میں اغوا برائے تاوان کا کیس ہے۔ آپ کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اغوا کرنے والے کال کریں گے۔“ ایس پی نے انگلی پر گنواتے ہوئے کہا۔ ”وہ کہیں گے کہ ہماری اگلی کال کا انتظار کرو... پھر وہ آپ کی فیملی سے بات کروائیں گے... اس کے بعد وہ کہیں گے کہ اس معاملے میں پولیس کی مدد لی تو آپ کو صرف اپنی فیملی کی لاشیں ملیں گی... اور آخری بات یہ ہوگی کہ اتنی رقم کا انتظام کر لو۔“

اصغر کا اندازہ بھی یہی تھا۔ ”پھر... میں کیا کروں؟“

”ہر صورت میں... یہ فیصلہ صرف آپ کا ہوگا... آپ

پولیس کی مدد چاہتے ہیں، تب بھی اور نہیں چاہتے، تب بھی۔“

اصغر اس کی صورت دیکھتا رہا۔ ”میری جگہ آپ ہوتے تو کیا کرتے؟“

”میں صبح صبح جھوٹ بولنا نہیں چاہتا... اس لیے بھی کہ آپ میرے پاس ذاتی تعلق کی بنا پر آئے ہیں... میں پولیس کی مدد کا رسک کبھی نہ لیتا۔“

واقعات بالکل اسی ترتیب سے پیش آئے۔ اگلے دن اصغر کو اغوا کرنے والوں نے فون کیا... کال اس کے سیل فون پر ریسیو ہوئی تھی اور اصغر نے وہ نمبر بھی نوٹ کر لیا جس سے کال کی گئی تھی۔ فون کرنے والا آواز بنا کے بول رہا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ تمہاری بیوی اور بچہ ہماری تحویل میں ہیں اور فون بند کر دیا۔

اصغر کے لیے کھانے پینے، سونے کے نظام کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ وقت اس کے لیے ایک مسلسل انتظار تھا۔ زندہ رہنے کے لیے وہ کھا پی لیتا تھا مگر سوتا تھا تو بار بار چونک کے اٹھ جاتا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ فون کی گھنٹی بج رہی ہے جو اس کے تکیے کے قریب کان کے ساتھ ہوتا تھا مگر دیکھنے پر کوئی کال نہیں ہوئی تھی۔ دوسری کال آدھی رات کو موصول ہوئی۔ اس مرتبہ نمبر کچھ اور تھا۔ ایس پی نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ سم بدل بدل کے فون کریں گے۔

اغوا کرنے والوں نے کسی کی براہِ راست بات نہیں کرائی... اس نے نائلہ کی آواز سنوائی... وہ اکبر سے بات کر رہی تھی۔ اکبر نے کہا۔ ”ماما... ہم کب گھر جائیں گے؟“

نائلہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بہت جلد بیٹا۔“

”ماما... یہ کون سی جگہ ہے؟“ اکبر بولا۔

”مجھے نہیں معلوم بیٹا... تم اب سو جاؤ۔“

”آپ رو کیوں رہی ہو ماما؟“

”نہیں... میں کہاں رو رہی ہوں۔“

”مجھے یہاں نیند نہیں آتی ماما... فرش بہت سخت ہے... مجھے گرمی بھی لگ رہی ہے۔“

”کوشش کرو... نیند آ جائے گی۔“

”مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے ماما... یہ لوگ ہمیں کھانے کو کیوں نہیں دیتے... کون ہیں یہ لوگ؟“

اس کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی۔ بالواسطہ طور پر سنائی جانے والی آوازوں سے اصغر نے اندازہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ پورا منظر دیکھ لیا تھا کہ نائلہ اور اکبر کے ساتھ قید میں کیا سلوک ہو رہا ہے... وہ صبح تک دیوانہ وار اپنے کمرے میں پھرتا رہا۔ صبح وہ پھر ایس پی کے گھر گیا۔

اس نے کہا۔ ”حوصلے سے کام لو... اپنے ذہن اور اعصاب پر قابو رکھو... پتا نہیں کتنا عرصہ وہ تمہیں اذیت دیں گے۔“

”انہیں جو چاہیے وہ مانگ کیوں نہیں لیتے؟“

”یہ پروفیشنل لوگ لگتے ہیں۔ وہ تمہیں آزمائیں گے کہ تم انہیں دھوکا تو نہیں دے رہے ہو... کوئی رسک لو گے تو نقصان میں رہو گے۔“

”آخر میں کیا کروں؟“

”ایک تو طے کر لو... پولیس سے مدد لینی ہے یا نہیں... نہیں لینی تو پھر نہ مجھ سے ملنے کی ضرورت ہے، نہ کسی سے بات کرنے کی... ہو سکتا ہے، وہ تمہیں دیکھ رہے ہوں... دوسرے... اچھی خاصی بڑی رقم کا انتظام کر لو... کم سے کم بھی پچاس لاکھ کا...“

”پچاس لاکھ...؟“

”وہ تم سے پانچ کروڑ بھی مانگ سکتے ہیں... پھر سودا ہوگا... اس کے لیے وہ تمہاری قوتِ برداشت آزمائیں گے... نائلہ یا اکبر کو ایسی اذیت دیں گے کہ وہ چیخ چیخ کے خود تم سے کہیں گے کہ پیسے دے دو اور ہمیں بچا لو... کیا پیسا ہماری جان سے زیادہ ہے... ہمت رکھنا... وہ پانچ کروڑ کے دو بھی کر سکتے ہیں... عقل کا استعمال سب سے ضروری ہے... پیسا اور بیوی بچوں کی جان بچانے کے لیے۔“

ایک عالمِ وحشت میں اصغر نے اپنے اثاثوں کا تخمینہ کیا... اس کی دکان تمام سونے کے ذخائر کے ساتھ اس کا سب سے بڑا اثاثہ تھی۔ اپنی گڈ ول سمیت اس کے ایک کروڑ مل سکتے تھے... اس کا گھر بھی شاید اتنی ہی مالیت کا ہوگا لیکن اسے کھڑے کھڑے دونوں کا سودا کرنا پڑا تو پچاس لاکھ کا نقصان یقینی ہے... ایک دن کے نوٹس پر ڈیڑھ کروڑ اس کے ہاتھ پر رکھنے والا کوئی انویسٹر ہی ہو سکتا تھا جو قانونی کارروائی کی پروا بھی نہ کرے... پوری قیمت وصول کرنے کے لیے اسے چھ مہینے یا سال انتظار کرنا پڑتا۔ نہ جانے کتنے اشتہارات دیے اور کتنے بروکرز سے کہنے کے بعد کوئی گاہک آتا جو اس کی ڈیمانڈ اور مارکیٹ کے مطابق قیمت ادا کر دیتا... قانونی کارروائی کا سلسلہ اس کے بعد شروع ہوتا۔

اسے رقم فوری درکار تھی۔ اپنی ساری پراپرٹی کو کسی بینک کے پاس گروی رکھ کے بھی اسے پوری رقم نہ ملتی... بینکوں کا اپنا طریقِ کار ہے۔ وہ رہن رکھے جانے والے اثاثوں کی مالیت کا تعین کراتے ہیں اور بہت فیاضی دکھائیں تو پچھتر فیصد کے برابر رقم دے دیتے ہیں لیکن تخمینہ لگوانے

سے رقم وصول کرنے تک ضابطے کی کارروائی بھی مہینا لے لیتی ہے۔

وہ جلدی میں تھا بلکہ افراتفری میں تھا۔ تاوان طلب کرنے والوں کا فون کسی بھی وقت آسکتا تھا اور اس وقت پیسا اس کے ہاتھ میں ہونا ضروری تھا۔ پراپرٹی میں کوٹھی کا معاملہ مشکل نہیں تھا۔ اسے خریدنے والے بہت تھے۔ اصل مسئلہ جیولری شاپ کا تھا... ایک صورت یہ تھی کہ وہ سونا کسی سنار کو بیچ دیتا اور پھر خالی دکان میں کوئی جوتے بیچے یا مٹھائی... گاہک پہلے سے زیادہ ہو جاتے... لیکن سنار کی دکان کو گڈول کے ساتھ کوئی سنار ہی لے سکتا تھا۔

راولپنڈی اور اسلام آباد کے سناروں میں سے کوئی بھی اتنا بڑا بزنس کھڑے دم خریدنے کے لیے تیار نہ ہوا... انہیں اصغر کی عجلت کے پیچھے دال میں کچھ کالا نظر آتا تھا۔ جب اس سے پوچھا جاتا تھا تو وہ بھڑک اٹھتا تھا۔ ''تم آم کھانے سے غرض رکھو... پیڑ کیوں گنتے ہو... میری چیز ہے... میں بیچ رہا ہوں... وجہ کچھ بھی ہو۔'' نتیجہ یہ کہ وہ انکار کر دیتے تھے۔ نہ کوئی اس کی مجبوری کو سمجھ سکتا تھا نہ وہ سمجھا سکتا تھا۔

سارا دن کی خواری کے بعد اسے رات سے خوف آنے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج رات ان کا مطالبہ سامنے آئے گا... ابھی تک تو اس کے پاس مشکل سے پچاس لاکھ تھے جو بینک میں پڑے تھے۔ تاوان میں وہ اس کی دکان اور مکان کہاں قبول کریں گے... آخر وہ کیا کرے... کس کے پاس جائے... کس سے مانگے... ایک آسرا یہ تھا کہ شاید وہ پچاس لاکھ ہی مانگیں... ایک کروڑ بھی مانگے تو وہ گاڑیاں بیچ دے گا... دکان کا مال بیچ دے گا... رہنے کو جگہ اور بزنس کے لیے ٹھکانا ہوگا تو سب پھر بن جائے گا۔

لیکن اس رات تاوان طلب کرنے والوں نے دو کروڑ طلب کیے۔ ''ہم تمہیں تین دن دیتے ہیں... پھر بات کریں گے۔''

''سنو...'' وہ چلّایا۔ ''مجھ پر رحم کرو... کچھ رعایت کرو... میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست تین دن میں نہیں کر سکتا۔''

دوسری طرف سے ایک ولن ٹائپ فلمی قہقہہ سنائی دیا۔ ''نہیں کر سکتے تو پھر ایچ ایٹ کے قبرستان میں اپنی بیوی بچے کے لیے جگہ لے لو۔'' اس کا چیختا چلّانا... فریاد اور رحم کی اپیل کرنا کسی نے سنا ہی نہیں۔

اپنے دکھ میں وہ اکیلا تھا۔ اس کے سارے رشتے کاروباری تھے۔ اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ اس نے بڑی شدت سے خواہش محسوس کی کہ کاش کوئی ہوتا جس کے کندھے پر سر رکھ کے وہ رو سکتا۔ ماں باپ... چچا تایا...

ماموں... اس کا دوسرا بیٹا ہوتا جو اس کا سہارا بن کے ساتھ رہتا... اور کوئی نہیں تو اس کے دونوں بڑے بھائیوں میں سے کوئی ہوتا جو اسے گلے لگا کے تسلی دیتے... نہ رو اصغر... اللہ کرے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔

گھر کے نوکر چاکر اس کے غصے اور اس کی دیوانگی کے مظاہرے پر دم بخود تھے۔ اس کے سارے معمولات الٹ پلٹ ہو گئے تھے۔ نہ وہ وقت پر سو رہا تھا نہ کھانا کھا رہا تھا۔ اس کے موڈ کا کچھ پتا نہیں ہوتا اور معمولات کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا... اس نے عجب طریقے سے گھر کے سارے فون کاٹ دیے تھے... گیٹ کیپر کو ہدایت دے دی تھی کہ نہ کوئی اندر آئے گا اور نہ اندر سے باہر جائے گا... کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ بیگم صاحب یا ان کے بچے کے بارے میں سوال کر سکتا کہ وہ کہاں ہیں؟

اصغر نے ایک اور دن... پھر ایک اور دن لاحاصل تگ و دو میں صرف کر دیا... پھر اچانک اس پر وحی کی طرح ایک انوکھے خیال کا نزول ہوا۔ خورشید عباسی... بس... وہ ایک وضع دار آدمی ہے... اگر وہ ان کے سامنے گڑگڑائے... ان کے پاؤں پکڑے... تو وہ اسے ضرور دو کروڑ دے دیں گے... شاید اس کی دکان سے ہی دو کروڑ مل جائیں گے... اگر وہ بورڈ پر سے مجھے کے الفاظ مٹا دیں گے تو اسلام آباد میں ان کی ایک بھی جمائی برانچ ہو جائے گی جس کا منافع اب ان کی پنڈی والی دکان سے دگنا تھا۔ کاروباری طور پر یہ ان کے لیے بہت فائدہ مند سودا ہوگا... برانچ کھولنے اور اس مقام تک لانے میں برسوں لگتے ہیں... انہیں ایک چیک کاٹنے میں کتنی دیر لگے گی؟

وہ خورشید جیولری ایمپوریم میں پہنچ گیا... کچھ پرانے لوگوں نے اسے پہچانا اور حیران بھی ہوئے مگر وہ سیدھا عقبی حصے میں مالکان کے آفس کی طرف بڑھا۔ ایک گارڈ نے اسے روکا اور اس کی راہنمائی کی۔ ''مالکان اب اوپر بیٹھتے ہیں... کیا کام ہے آپ کو؟''

''مجھے خورشید عباسی صاحب سے ملنا ہے... ان سے کہو... اصغر آیا ہے۔''

''خورشید عباسی؟'' گارڈ نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ''ان سے ملنے کے لیے تو آپ کو بہت اوپر جانا پڑے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''ان کے انتقال کو چار سال ہو گئے۔''

اصغر کو ناامیدی کا پہلا جھٹکا لگا۔ ''اچھا... ان کے بیٹے تو ہوں گے... قیصر اور شہریار۔''

''مالک صرف شہریار ہیں... قیصر صاحب تو دو سال ہوئے باہر چلے گئے۔ وہ اب امریکا میں رہتے ہیں۔ آپ بیٹھیے، میں مالک کو بتاتا ہوں۔''

اسے انتظار میں دو گھنٹے منیجر کے کمرے میں گزارنے پڑے۔ منیجر نے اخلاقاً بھی اس سے ایک کپ چائے کا نہیں پوچھا۔ بالآخر شہریار نے اسے طلب کیا۔

''آیئے آیئے... بڑی خوش نصیبی ہے ہماری... آپ جیسے بڑے لوگ تشریف لائے۔'' اس کا ایک ایک لفظ تلخی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''شہریار صاحب! میں ایک ضرورت کے تحت حاضر ہوا ہوں۔''

''اللہ خیر... ہم جیسے چھوٹے لوگ...''

''شہریار... طنز مت کرو... پرانی باتیں پرانی ہوئیں... میں تم سے معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں۔''

''کیا صرف معافی کے الفاظ سے احسان فراموشی کا وہ زخم مندمل ہو سکتا ہے جو مرتے دم تک میرے والد کے دل میں تھا... اتنے برسوں بعد کوئی ضرورت تمہیں یہاں لائی ہے تو تم معافی کی بات کرتے ہو؟'' وہ بھڑک اٹھا۔

اصغر کی آنکھوں میں احساسِ ذلت کے آنسو آگئے۔ ''آپ مجھے جوتے مار لیں... مگر اس کے بعد میری بات سن لیں... پلیز...''

شہریار کا دل کچھ پسیجا۔ ''او کے... بولو کیا بات ہے؟''

اصغر کی پوری بات اس نے بے دلی سے سنی اور پھر بے رخی سے انکار کر دیا۔ ''اب تم مجھے وہ کاروبار دو کروڑ کیا دو روپے میں بھی دو تو میں اس پر تھوکتا ہوں۔'' اس نے گھنٹی بجائی۔

گارڈ نمودار ہوا تو اس نے کہا کہ اصغر صاحب کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔ انکار کی توقع کی جا سکتی تھی... ایسی ذلت کی نہیں... اصغر باہر آیا تو پہلے سے زیادہ بدحال تھا۔ ذلت کے تھپیڑوں سے اس کا وہی حال تھا جو کسی عزت دار شخص کا تھانے کے کمرۂ تفتیش میں کسی قصور کے بغیر ایک رات گزارنے کے بعد ہوتا ہے۔

وہ اپنی گاڑی میں خالی الذہن بیٹھا رہا۔ حل تلاش کرنے کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے بھٹکتے وہ پھر ایک بند گلی میں جا پہنچا تھا جہاں اس کے سامنے دیوار تھی... تین دن سے اس نے نائلہ کی اور اکبر کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ صرف ان کی مختلف اذیت ناک حالتوں کا تصور کیا تھا۔ وہ کسی کوٹھری میں بند ہیں... ان کے ہاتھوں پیروں میں زنجیریں ہیں۔ انہیں کھانے کو وہ مل رہا ہے جو جیل میں مجرموں کو بھی نہیں ملتا۔

گالیاں... تذلیل اور مار پیٹ... دھمکیاں اور جسمانی عذاب الگ... نائلہ اب بھی کسی بے غیرت اور حیوان نما انسان کی نفسانی خواہشات کی بھینٹ چڑھ سکتی ہے... اصغر کو مجبور کرنے کے لیے وہ اسے بیوی بچوں کے چیخنے اور اذیت سے چلّانے کی آوازیں سنوائیں گے... اغوا کرنے والے تاوان وصول کرنے کے لیے یہی تکنیک استعمال کرتے ہیں۔

ڈرائیور نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''سر! اب کہاں جانا ہے؟''

''کہاں جانا ہے!'' اصغر نے بے خیالی میں اس کے الفاظ دہرائے۔ ''کچھ پتا نہیں کس کو کہاں جانا ہے؟''

خلا میں اپنے مدار سے بھٹک جانے والے سیارے کی طرح اس کی زندگی کا سفر بے سمت ہو گیا تھا۔ وہ کیا کرے... کہاں جائے؟ اسے اپنے ہی گھر جاتے ہوئے خوف آتا تھا۔ وہ گھر اس کے لیے ایک عقوبت خانہ ہو گیا تھا جہاں ہر وقت یادوں کے عفریت اپنے نکیلے خونی پنجوں سے اس کو نوچتے تھے۔ اندھیرے میں یا آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے سامنے دو خون آلود لاشیں آجاتی تھیں۔ بے لباس اور ننگی ہوئی... لو، اب ہمیں اپنی دولت سے آبرومندی کا کفن پہنا دو... ہماری زندگی کی قیمت تو تم ادا نہ کر سکے... تم سے زیادہ مفلس کون ہو گا...؟ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھتا تھا۔

اس رات پھر ایک نئے نمبر سے فون آیا۔ کسی نے کہا۔ ''رقم کا بندوبست کیا؟''

وہ ہکلایا۔ ''ہاں... ہاں... میں کر رہا ہوں... ہو جائے گا... دیکھو، مجھے تھوڑی سی مہلت دو۔''

اچانک اس کی بیوی کی چیخ سنائی دی۔ ''نہیں... خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو... ابھی نہیں... میں مر جاؤں گی۔''

''نائلہ...'' اصغر چلّایا۔

پس منظر میں دوسری دھاڑیں مار کے روتی ہوئی آواز ابھری۔ ''میری ماما کو چھوڑ دو۔'' پھر ایک کتا خونخوار انداز میں بھونکا اور اکبر نے چیخ ماری۔

اصغر نے چیخ کے کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو... میں نے وعدہ کیا ہے۔''

''صرف وعدہ... ابھی تم نے مہلت مانگی ہے... کتنی مہلت چاہیے تمہیں؟ بولو... اس مہلت میں وہ سب ہوتا رہے گا جو اس وقت ہو رہا ہے... کیا تم دیکھنا چاہو گے؟''

پس منظر میں نائلہ مسلسل رحم کی فریاد کر رہی تھی۔ معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا... اس کی چیخوں سے اصغر کا دل پھٹ رہا تھا... بیٹا سب دیکھ رہا تھا مگر بے بس تھا۔ اس کی

www.pkdigest.com

ماں ان درندوں کے لیے صرف ایک عورت تھی... معلوم نہیں یہ ریکارڈ شدہ آوازوں کا کھیل تھا یا حقیقی۔

اصغر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا... ''اچھا... صرف ایک دن... کل کا دن... میں کچھ کرلوں گا... مگر دیکھو، یہ سب مت کرو... جو تم نائلہ کے ساتھ کر رہے ہو... میں تمہیں منہ مانگے پیسے دے رہا ہوں۔''

جواب میں اسے گالیاں سننے کو ملیں۔ ''ہم جانتے ہیں تُو کتنا ذلیل ہے... کیسا چکر باز ہے... ہم تیری رگ رگ سے واقف ہیں... ہمیں معلوم ہے کہ اس مقام تک تو کیسے پہنچا... ہم تجھ پر اعتبار کرسکتے ہیں...؟''

''اگر تم سب جانتے ہو... تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ میں نے پولیس سے مدد نہیں لی... اپنے وعدے کے مطابق... تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ آج سارا دن میں رقم حاصل کرنے کے لیے کہاں کہاں گیا۔''

''ہم سب دیکھ رہے ہیں... اس وقت بھی... جب تو ہمارے سامنے نہیں ہوتا، تب بھی ہماری نظر میں ہوتا ہے۔'' فون بند ہوگیا۔

وہ سوچتا رہا... آخر یہ کون لوگ ہیں... اس کی تو کسی سے بھی دشمنی نہیں تھی۔ وہ اس کے بارے میں سب کچھ کیسے جانتے ہیں؟ کیا انہوں نے نائلہ سے پوچھا ہوگا؟ کیا یہ اس کا دشمن نادیدہ رقیب ہوسکتا ہے؟ وہ وزیر زادہ جس کو نائلہ کے باپ نے کہہ دیا تھا کہ اس کو دینے سے بہتر ہے وہ اپنی بیٹی کو کنوئیں میں دھکا دے دے۔ وہ کسی وزیر کا بیٹا تھا۔ اب اسے نام یاد نہیں آرہا تھا... لیکن وہ کوئی پٹھان تھا... پٹھان اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتے... خواہ عمر گزر جائے مگر موقع ملنے پر انتقام ضرور لیتے ہیں... لیکن پٹھان بے غیرت بھی نہیں ہوتے کہ باپ کا بدلہ بیٹی سے لیں... بیٹی کا بدلہ اس کے شوہر سے لیں... عورت کو بے آبرو کریں۔

نہیں... یہ صرف پیشہ ور لوگ ہیں... پیسے کے لیے اغوا کرنے والے... ایسے ہتھکنڈے وہی استعمال کرتے ہیں۔ نائلہ کا وہ ناکام خواہش مند تو ویسے ہی بہت دولت مند تھا... اور اتنے برسوں کے بعد... یہ بڑے بے رحم اور بے ضمیر لوگ تھے۔ نہ وہ کوئی مہلت دینے کو تیار تھے اور نہ کوئی رعایت دینے کے قائل تھے... آخر وہ کھڑے کھڑے دو کروڑ کا بندوبست کہاں سے کرے... کل کی طرح آج کا دن بھی گزر جائے گا۔

اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کب صبح ہوگئی۔ زندگی میں وہ کبھی رات بھر جاگا تھا تو تفریح یا عیاشی کے لیے... اس کے کانوں میں اذان فجر کی آواز آئی... اسے یوں لگا جیسے یہ آواز وہ پہلی بار سن رہا ہے۔ دن میں پانچ بار دنیا کی ہر مسجد سے بلند ہونے والی یہ آواز اس نے ایک مرتبہ ناوقت بھی سنی تھی... رات کے دو بجے... جب کسی نماز کا وقت نہ تھا جس کے لیے کوئی مؤذن پکارتا... یہ اس کے کانوں میں پہنچنے والی پہلی آواز تھی... خود اس کے باپ نے اس کے کانوں میں اذان دی تھی۔

آج اس آواز نے اصغر کو کھینچ لیا۔ یہ آواز دنیا کی سب سے بڑی عدالت سے جاری ہونے والے سمن کی طرح آئی۔ اس نے وضو کیا اور دست بستہ حاضر ہوگیا... گارڈ نے اسے گھر سے جاتے دیکھا اور اس کے پیچھے آیا۔ اصغر نے اسے روک دیا۔

اسے بڑی حیرانی اور ندامت ہوئی کہ مسجد جو اس کے گھر کے اتنے قریب تھی، اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ گھر کے پورچ میں ہی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاتا تھا اور شوفر گاڑی نکال کے نہ جانے کدھر سے لے جاتا تھا... یا شاید وہ کوئی فائل دیکھنے لگتا تھا... کسی کاروباری مسئلے پر سوچ بچار میں غرق ہوجاتا تھا۔

جماعت ختم ہوگئی۔ وہاں سب اس کے لیے اور وہ سب کے لیے اجنبی تھا۔ ممکن ہے کوئی اسے صورت سے پہچانتا ہو... ایک ایک کرکے نمازی نکل گئے... وہ دوزانو بیٹھا رہا اور مسجد کے وسیع و بلند گنبد اور اس کی اندرونی آرائش کو دیکھتا رہا... پتا نہیں کب اسے نیند نے آلیا۔ شاید یہ سکون کا نیا احساس تھا جو اس کے حواس پر غالب آگیا... وہ وہیں لڑھک کر سوگیا۔ یہ صرف چند منٹ کی بات تھی لیکن اس دوران اصغر نے ایک آواز سنی... بہت واضح...

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو سفید ڈاڑھی والا ایک چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا۔ ''تم نماز کے لیے آئے تھے... اب گھر جاؤ... مسجد سونے کی جگہ نہیں ہوتی۔'' پیش امام نے نرمی سے کہا۔

''میں... معافی چاہتا ہوں... کئی راتوں کا جاگا ہوا تھا۔'' اصغر نے شرمندگی سے کہا۔ ''پریشانیوں کی وجہ سے۔''

''اللہ تمہاری پریشانیاں دور کرے۔'' انہوں نے کہا۔

اصغر مسجد سے باہر آگیا مگر چند منٹ کی نیند کے دوران سنائی دینے والی آواز اسے بھولی نہیں تھی۔ وہ حیران تھا کہ اب تک یہ خیال اسے کیوں نہیں آیا تھا... اس نے اپنی طرف سے سارے امکانات پر غور کرلیا تھا... لیکن ایک راستہ اور بھی تھا... اس کی طرف اصغر کا دھیان جا ہی نہیں سکا تھا۔

گھر پہنچتے ہی اس نے شوفر کو طلب کیا اور گاڑی میں بیٹھ کے کہا۔ ''پٹیالہ فیشن جیولرز کی طرف چلو۔''

پٹیالہ فیشن جیولرز والے پنڈی میں خورشید جیولری ایمپوریم کے سب سے بڑے کاروباری حریف تھے جو ترقی کرکے ان کے برابر آنا ضرور چاہتے تھے مگر آنہیں سکے تھے۔ ان کے درمیان ایک غیر اعلانیہ سرد جنگ ہمیشہ جاری رہی، چنانچہ جب اصغر کی وجہ سے خورشید جیولری ایمپوریم والوں کے کاروبار کو نقصان ہوا اور ان کا بزنس آدھا رہ گیا تو اس پر سب سے زیادہ خوشیاں منانے والے پٹیالہ فیشن جیولرز والے ہی تھے۔ گزشتہ دس بارہ برسوں میں خورشید جیولری ایمپوریم والوں کے بعد والی نسل نے سارا نقصان پورا کرلیا تھا... نئے نوجوان مالکان نے پرانے وقتوں کی وضع داری اور ایمان داری وغیرہ کو آؤٹ آف ڈیٹ قرار دیتے ہوئے آج کے جارحانہ کاروباری انداز اختیار کرلیے تھے۔ ان کے نزدیک غلط یا ناجائز کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ تمام چور راستوں سے سونا اسمگل بھی کرتے تھے... چوری کا مال بھی خریدتے تھے... ملاوٹ بھی کرتے تھے اور کم بھی تولتے تھے... دنیا کے بازاروں میں سب ایسا ہی کر رہے تھے... وہ کیا پاگل ہیں کہ اپنی ڈفلی الگ بجائیں۔ جس حمام میں سب ننگے ہوں وہاں کپڑے کا تار نے والے کا کیا کام... جس کو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

خلاف توقع پٹیالہ فیشن جیولرز والوں نے اصغر کو خوش آمدید کہا۔ دشمن کا دشمن بھی دوست ہوتا ہے... ان کے اخلاق میں یہی فلسفہ کارفرما تھا... ان کو ایک ایڈوانٹیج یہ حاصل تھا کہ تجربہ کار... جہاں دیدہ اور دور اندیش والد ابھی تک بیٹوں کے کاروبار کے نگراں تھے۔ انہوں نے اصغر کی بات بڑے تحمل سے سنی اور ایک دم محسوس کرلیا کہ قدرت نے انہیں خورشید جیولری ایمپوریم والوں سے ایک جست میں اتنا آگے نکل جانے کا موقع فراہم کیا ہے کہ وہ سو سال لگے رہیں پھر بھی ان کے برابر کبھی نہیں آسکتے... وہ تو احمق ہیں ورنہ لکشمی پہلے ان کے آنگن میں اتری تھی۔

پٹیالہ فیشن جیولرز نے اسے یقین دلایا کہ صرف ایک گھنٹے کے نوٹس پر اسے دو کروڑ فراہم کردیے جائیں گے۔ ''لیکن کچھ پتا تو چلے کہ آپ پر ایسی کیا آفت آگئی ہے؟''

اصغر جیسے ڈھے گیا۔ ''ابھی چھوڑیں سر... بس آپ نے میرا مسئلہ حل کردیا... آپ کا احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ آپ چاہیں تو ابھی دکان اور مکان کا قبضہ لے لیں... مجھ سے جو تحریر لکھوانی ہے لکھوالیں۔''

''تحریر ہم ضرور لکھوائیں گے اصغر صاحب... رہ گئی قبضے کی بات تو قبضہ ہم پہلے دکان کا لیں گے... ادائیگی کے وقت۔''

''کیا ادائیگی ابھی ہوسکتی ہے؟''

''بالکل ہوسکتی ہے... دو گھنٹے تو وکیل لکھت پڑھت میں بھی لے گا... اس کے بعد میں آپ کے ساتھ چلوں گا اور دکان مع مال لے لوں گا... آج ہی آپ کا بورڈ اتر جائے گا... اس کی جگہ بینر لگا دیا جائے گا... ''پٹیالہ فیشن جیولرز کا افتتاح!'' پھر اسی ہفتے میں ہمارا سائن بورڈ لگ جائے گا اور پراپرٹی منتقلی کی کارروائی بھی ہوجائے گی۔''

''اور مکان...؟''

''اصغر صاحب... اتنا لحاظ ہے ہماری آنکھوں میں... اور عزت ہے دل میں... مکان آپ کا ہے... آپ رہیں... جب تک چاہیں... بس ایک کرایہ نامہ پر دستخط کردیں... کرایہ کچھ نہیں... بس رسمی کارروائی ہے۔''

اصغر کے لیے یہ ناقابل یقین تھا جب دو کروڑ روپے سے بھرا ہوا ٹین کا پرانا زنگ خوردہ صندوق اس کی گاڑی کی ڈکی میں رکھوا دیا گیا... وکیل نے جہاں اس سے کہا اصغر نے دستخط کردیے... پھر پٹیالہ فیشن جیولرز کے مالک اور چند ملازم خود اس کے ساتھ گئے اور اصغر نے اپنی دکان کی چابیاں ان کے حوالے کردیں... وہ اس وقت تک وہاں موجود رہا جب تک مزدوروں نے سیڑھی لگا کے ''خورشید جیولری ایمپوریم'' کا مضبوطی سے لگا ہوا بورڈ ہتھوڑے اور کلہاڑیوں سے ٹکڑے ٹکڑے کرکے نیچے نہیں گرا دیا... نہ جانے کیوں وہ اپنی بربادی کا یہ تماشا دیکھنے کے لیے کھڑا رہا... اس کے دیکھتے دیکھتے پرانے بورڈ کی جگہ کپڑے کے ایک بینر نے لے لی جس پر لکھا ہوا تھا... ''عنقریب اسلام آباد برانچ کا شاندار افتتاح پٹیالہ فیشن جیولرز!'' وقت کی ایک کروٹ سے وہ سب اس کا نہیں رہا تھا جسے وہ اپنا سمجھتا تھا۔

وہ رات کو بے چین مگر پُراعتماد تھا... اس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ اس نے ثابت کردیا تھا کہ رشتوں کی قیمت املاک سے بہت زیادہ ہوتی ہے... اس نے اپنی دنیا کو اجڑنے سے بچا لیا تھا۔ وہ پُراعتماد تھا کہ زندگی ابھی تمام نہیں ہوئی... وہ نائلہ اور اکبر کے لیے ایک اور گھر کھڑا کردے گا... شاید اس سے بھی اچھا... اور اس سے بھی بڑا بزنس کرلے گا... ایک لمحے کے لیے بھی اسے خیال نہیں آیا تھا کہ نائلہ کیا ہے... ایک عورت ہی تو ہے... جتنا اس کے پاس ہے اس سے وہ نائلہ سے لاکھ درجہ حسین اور پُرکشش عورت کے ساتھ زندگی

www.pkdigest.com

کے سفر کا آغاز کر سکتا ہے جو اکبر کی جگہ اسے دوسرا اکبر دے سکتی ہے... نائلہ تو اس کی اہل نہیں رہی تھی مگر ایک نئی عورت شاید اسے دو تین یا چار بیٹے بھی دے دیتی... بیٹی کا باپ بھی بنا دیتی جس کی اسے ہمیشہ حسرت رہی۔

اس نے دیکھا تھا کہ دنیا اسی طرح چلتی رہتی ہے۔ وہ جن کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا تھا کہ ایک نہ رہا تو دوسرا نہ جی پائے گا... نہ صرف زندہ رہے بلکہ مرنے والے کو ایسے بھول گئے جیسے وہ کبھی ان کی زندگی کا حصہ ہی نہیں تھا... انہوں نے اپنے گھر پھر آباد کر لیے... دوسری شادی کر لی... کبھی مرد نے تو کبھی عورت نے... باپوں نے اپنے اکلوتے جوان بیٹوں کو قبر میں اتارا اور بڑھاپے کا سہارا گنوانے کے باوجود بڑھاپا گزارا... آدمی بڑی سخت جان چیز ہے اور زندگی سے محبت وہ بھی کرتا ہے جو گوشت کا لوتھڑا ہے اور کسی فٹ پاتھ پر لوگوں کے قدموں میں ایک سکہ مانگنے کے لیے ٹھوکریں کھا رہا ہے۔

لیکن اس نے اپنا سب کچھ دے دیا تھا... اپنے جذبات کی دنیا کو بچا لیا تھا... نائلہ کا بدل اس کے نزدیک کچھ بھی نہیں تھا اور اکبر اس کے وجود کا حصہ تھا... مانگنے والے اگر اس سے مال کے ساتھ جان بھی طلب کرتے تو اسے منظور ہوتا۔

فون کی گھنٹی بجی تو وہ چلتے چلتے رک گیا۔ ”یس...“

”لگتا ہے تم نے پیسوں کا بندوبست کر لیا ہے...“ دوسری طرف سے کسی نے کہا۔ ”دو کروڑ پورے ہیں؟“

”ہاں... بولو مجھے کہاں آنا ہوگا؟“

”پشاور روڈ پر سیدھے آؤ... سنگ جانی کے قریب ایک پہاڑی پر کسی گورے کی یادگار بنی ہوئی ہے۔“

”ہاں... ایک ستون ہے۔“

”گاڑی کو پہاڑی کی اوٹ میں چھوڑو... پیدل اوپر آؤ... ابھی!“

”رقم کا صندوق بہت بھاری ہے... میں اٹھا کر پہاڑی پر نہیں چڑھ سکتا... مجھ پر اعتبار کرو... رقم نیچے آ کے لے لو۔“

”اچھا... پھر تم خالی ہاتھ اوپر آ جاؤ... باکس ڈکی میں اور ڈکی کھلی چھوڑ دو... تمہاری بیوی بچہ اوپر ہی ہوں گے۔“

”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ... میرے ساتھ دھوکا نہیں ہوگا؟“

”اور تم کیا ضمانت دو گے؟“ وہ ہنسا۔ ”کوئی رسک نہ ہم لیں گے اور نہ تم لوگے... کیونکہ ہمیں تمہاری بیوی بچہ نہیں، دو کروڑ چاہئیں... اور تمہیں دو کروڑ نہیں... اپنی بیوی بچہ چاہئیں... اس لیے دیر مت کرو۔“

آدھی رات کے وقت وہاں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ بیر ودھائی تک رکے بغیر گیا... اس کے بعد سڑک پھر خالی تھی۔ ٹھیک پینتالیس منٹ میں اس نے روشن آسمان کے پس منظر میں وہ پہاڑی دیکھ لی جس پر یادگاری ستون صاف نظر آ رہا تھا۔

اس کے بعد جو بھی ہوا، اصغر کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ابھی اس نے گاڑی روک کے ڈکی کھولی ہی تھی کہ دوسری گاڑی اس کے پیچھے آ رکی۔ اصغر باہر نکلا تو اس نے پیچھے والی گاڑی سے ایک شخص کو نکلتے دیکھا... وہ بہت نروس تھا۔

وہ سیدھا اصغر کی طرف آیا۔ ”اپنی گاڑی کی چابی دو۔“

اندھیرا ہونے کے باوجود اصغر نے اسے پہچان لیا اور اس کی نظریں آنے والے کے چہرے پر جم کے رہ گئیں... ”چابی گاڑی میں لگی ہوئی ہے۔“

وہ اصغر کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ”تمہاری بیوی بچہ پیچھے والی گاڑی میں ہیں۔“

اصغر پیچھے کی طرف دوڑا... فائرنگ اسی وقت شروع ہوئی۔ اصغر کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس کے نہ چاہنے کے باوجود پولیس ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے... کچھ نائلہ کی عقل کا قصور تھا جسے اپنے ایس پی شوہر پر بڑا بھروسا تھا۔

اکبر نے سب دیکھا تھا... وہ چھوٹا تھا لیکن اتنا چھوٹا بھی نہیں کہ خونی واقعے کو بھول جاتا جس میں اس کی نظروں کے سامنے اس کے باپ کو پہلی گولی لگی تھی۔ وہ پیچھے والی کار میں دم سادھے بیٹھا تھا۔ چار دن میں اس نے بلا چوں و چرا حکم کی تعمیل کرنا سیکھ لیا تھا... اسے خوب اندازہ تھا کہ حکم عدولی کا نتیجہ کیا نکلتا ہے... پھر ماما نے بھی اسے یہی تاکید کی تھی۔

لیکن جب اس کی ماں دیوانہ وار چیخ مار کے اور دروازہ کھول کے باہر نکلی اور شوہر کی طرف بھاگی تو وہ بھی چپ بیٹھا نہ رہ سکا... وہ بھی چھلانگ لگا کر اپنی ماں کے ساتھ دوڑا... یہ منظر بیس برسوں کی گرد میں پڑے رہنے سے بھی پرانا نہیں ہوا تھا... اکبر وہ سب کچھ آج بھی اسی طرح دیکھ سکتا تھا اور محسوس کر سکتا تھا... جیسے یہ بیس برس پہلے کا نہیں، بیس دن پہلے کا واقعہ ہو۔

اس کے کان تاریک رات اور سنسان سڑک پر گونجنے والے دھماکے سن سکتے تھے۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ سڑک کے کنارے ایک شخص کس طرح تڑپ رہا ہے... یہ اس کا باپ تھا... وہ اسے پکار رہا تھا... اکبر... اکبر میری بات سنو... وہ

اپنی ماں کے پیچھے تھا... اچانک اس کی ماں ایک جھٹکے سے منہ کے بل گری... گولی اس کی پشت میں لگی تھی... اس کا شوہر مشکل سے چار فٹ دور تھا۔

ماں پیچھے دوڑنے والے اکبر کی راہ میں حائل ہوئی تو وہ بھی ماں کے اوپر گرا اور اس وقت اکبر نے خون کو دیکھا... سونگھا... اور محسوس کیا... یہ اس کی ماں کا خون تھا... وہ خون جو کبھی دودھ بن کے اکبر کے وجود میں زندگی اور توانائی بن کے اتر تا رہا تھا۔

اور اس وقت جب اکبر ماں کے اوپر تھا... اس طرح کہ اس کا اگلا آدھا دھڑ آگے اپنے باپ کے نزدیک تھا... پیچھے اس کی ماں بری طرح ہل رہی تھی... اسے دھکیل رہی تھی کہ وہ چھپ جائے... بھاگ جائے... اکبر نے صرف دو فٹ کے فاصلے سے اپنے باپ کی آواز سنی... اس نے ایک نام لیا... اکبر... تو نے سنا... اس نے نام پھر دہرایا... اکبر چیخ رہا تھا... دھاڑیں مار کے رو رہا تھا... پھر ایک گولی نے اسے بھی خاموش کر دیا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک اسپتال میں تھا۔ اس کے سرہانے کی طرف ایک پولیس مین رائفل کو دونوں ہاتھوں میں دبائے اور سر جھکائے اونگھ رہا تھا۔ اس کے آس پاس دیگر بیڈز پر اسی جیسے زخمی مریض پڑے تھے۔ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شعبۂ حادثات کا وارڈ ہے... اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی لیکن ڈاکٹروں کی کوشش اور بروقت طبی امداد ملنے سے اس کی زندگی بچ گئی تھی۔

اس دوران اسے سب معلوم ہو گیا تھا۔ پولیس آپریشن ناکام ہو گیا تھا۔ اس کے باپ سے دو کروڑ وصول کرنے والے نکل گئے تھے... یا مال کی برابر تقسیم کے معاہدے پر عمل درآمد کے نتیجے میں نکال دیے گئے تھے... اس کے ماں باپ نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا... شاید ان کے لیے بچ جانے کے امکانات چھوڑے ہی نہیں گئے تھے... خود اکبر اس لیے بچ گیا تھا کہ اسے نشانہ بنانے والوں نے اسے مردہ سمجھ لیا تھا۔ مزید یہ کہ پشاور کی طرف سے ایک گاڑی نمودار ہو گئی تھی۔ قاتل دونوں گاڑیاں اور دو کروڑ لے کر مخالف سمت میں فرار ہو گئے تھے۔ پولیس نے بعد میں تفتیش سے یہ معلوم کیا کہ اغوا برائے تاوان کے مجرم علاقہ غیر سے تعلق رکھتے تھے اور وہ دونوں گاڑیوں سمیت ادھر ہی روپوش ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مقتولین کا تعاقب جس گاڑی میں کیا تھا، وہ چند گھنٹے قبل ہی چوری ہوئی تھی اور اس کی رپورٹ تھانے میں موجود تھی۔

لیکن اکبر کے حافظے میں ایک نام تھا اور ایک صورت کا

ہر شمارہ خاص شمارہ

سچی کہانیوں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ اکتوبر 2009 کی ایک جھلک

سلطانہ

آدھی دنیا پر حکمرانی کرنے والی ملکہ کی سرگزشت

آستیرا

فاتح عالم کے دل کو فتح کر لینے والی کی روداد

بابل و نینوا

ایک گمشدہ شہر کی داستان

قسمت کا کھیل

ایک دوشیزہ کی درد بھری داستان

ایک سوال

آنکھوں میں آنسو بھر دینے والی کتھا

اور دیگر سلسلے

فلمی الف لیلہ، سراب اور 16 سے زائد دلچسپ معلوماتی دلوں کو چھو لینے والی سچ بیانیاں، سچی داستانیں

آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 5895313 فیکس: 5802551

دھندلا سا تصور موجود تھا۔ وہ اکبر کے باپ سے بات کر رہا تھا۔ اکبر اور اس کی ماں کو وہی اس جگہ تک لایا تھا۔ اکبر نے قید میں اس کی صورت نہیں دیکھی تھی لیکن اس کی آواز سنی تھی۔ سنگ جانی تک اکبر کی اور اس کی ماں کی آنکھوں پر پٹی تھی۔ جب گاڑی رکی تو اس نے کہا تھا۔ ''ان کو چھوڑ دو۔'' اور اس وقت ایک ہاتھ نے ان کو آزاد کیا تھا اور ان کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی بھی اتاری تھی... وہ اک حکم کے غلام کا ہاتھ تھا مگر حکم دینے والے کی آواز اکبر کے حافظے میں محفوظ تھی۔ اس کی صورت کا ہلکا سا عکس محفوظ تھا اور ایک نام محفوظ تھا۔

ابھی وہ پوری طرح صحت یاب بھی نہیں ہوا تھا کہ تفتیش کرنے والوں نے اس سے سوال جواب کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ان کے سوالات ہر روز وہی ہوتے تھے۔ اکبر نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ ہر سوال کا جواب ایک ہی دے گا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔''

پہلے ایک مہربان صورت نوجوان ڈاکٹر نے موقع پا کے اس سے کہا۔ ''اکبر! اس سے زیادہ مت بولنا۔'' پھر ایک رات ڈیوٹی پر مامور عمر رسیدہ لائس نائک نے اسے جگایا۔ وہ ڈیوٹی دینے والوں میں سب سے مہربان اور نیک دل شخص تھا جو اکثر اپنے گھر سے اس کے لیے کچھ نہ کچھ بنوا کے بھی لے آتا تھا۔

''پتر! اکبر! اٹھ... دھیان سے میری بات سن... تُو چل سکتا ہے؟''

اکبر نے سر ہلایا۔ ''ہاں... آج میں خود باتھ روم گیا تھا۔''

''شاباش... ہمت کر... دیکھ میں تیرے لیے کپڑے لایا ہوں۔''

''کپڑے؟'' اکبر نے حیرانی سے کہا۔

''چپ... آہستہ...'' اس نے منہ پر انگلی رکھی۔ ''یہ کپڑے لے کر باتھ روم میں جا... کپڑے بدل اور اسپتال سے نکل جا۔''

اکبر ہونّقا رہ گیا۔ ''اسپتال سے بھاگ جاؤں؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''دیکھو... مجھے پتا ہے اس مجرمانہ غفلت کی سزا مجھے ملے گی... میں برطرف کر دیا جاؤں گا لیکن یہ مجھے منظور ہے... مجھے اب کس کے لیے نوکری کرنی ہے... کس کے لیے جینا ہے... بیٹے گئے بہوؤں کے ساتھ... بیٹیاں لے گئے داماد۔'' پھر وہ چونکا۔ ''میں بھی کیسا بے وقوف ہوں... وقت ضائع کر رہا ہوں... جا پتر... کہیں بھی چلا جا... چھپ جا۔''

''مگر کیوں چاچا...؟''

''اوئے بے وقوفا... سوال مت کر... یہاں تجھے مار دیں گے... یہاں کیا باہر بھی مار دیں گے... تیرا کوئی عزیز جاننے والا نہیں ہے... بڑی اچھی بات ہے... ورنہ تو پھر پکڑا جاتا... اب بے شک اس شہر سے چلا جا... روپوش ہو جا۔''

اکبر نے اس کی بات سمجھ لی اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا... اسے ہمیشہ افسوس رہا کہ بعد میں وہ اس نیک دل لانس نائک کے احسان کا قرض نہ اتار سکا۔ یہ بھی معلوم نہ کر سکا کہ بعد میں اس پر کیا بیتی۔ صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھ لینے کے باوجود اس نے ایک بے وقوفی کی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی ماں کی اسی سہیلی کے گھر جا پہنچا جس کا شوہر ایک اعلیٰ پولیس افسر تھا۔ اکبر کا خیال تھا کہ شاید دنیا میں اس سے زیادہ مخلص اور ہمدرد کوئی نہیں اور وہاں وہ محفوظ ہوگا۔

وہ اکبر کو دیکھ کے گھبرا گئی۔ ''تم یہاں... اندر آ جاؤ... تمہیں کسی نے یہاں آتے دیکھا تو نہیں؟''

اکبر نے نفی میں سر ہلا دیا اور اسے بتا دیا کہ وہ اسپتال سے فرار ہو کے یہاں کیوں آیا ہے۔

''تم یہاں نہیں رہ سکتے اکبر... تمہیں یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا... ایسا نہ ہو کہ تمہارے ساتھ میں بھی مصیبت میں پڑ جاؤں... خیر... تم یوں کرو... میں تمہیں ایک ایڈریس دے رہی ہوں... وہاں چلے جاؤ... میرا نام لینا... تمہیں اس گھر میں جگہ مل جائے گی... لیکن دیکھو... دوبارہ یہاں مت آنا... نہ مجھے فون کرنا... میرا نام تک تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہیے۔''

اس نے اکبر کو دس ہزار روپے دے دیے... روتے ہوئے اکبر کا ماتھا چوما اور اسے رخصت کر دیا۔ ''کاش! میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی... تمہاری ماں کے لیے تو کچھ نہ کر سکی... مرتے وقت وہ مجھے بھی قصوروار سمجھتی ہوگی مگر میرا اللہ گواہ ہے... میں مجبور تھی... اتنی ہی جتنی آج ہوں۔''

اس وقت اکبر کو وہ دس ہزار کی رقم دس لاکھ کے برابر لگی حالانکہ صرف ایک مہینے پہلے دس لاکھ بھی اس کے لیے دس روپے کے برابر تھے۔ جو کچھ اس کے باپ کا تھا، اسی کا تھا۔ وہ اس گھر سے نکلا اور خود کو چھپاتا ہوا اس پتے کی تلاش میں روانہ ہو گیا جو اس کی مٹھی میں تھا۔ وہ راولپنڈی سے گوجر خان کی طرف سوہاوہ کے علاقے میں ایک گھر تھا۔ اس میں ایک بے اولاد جوڑا رہتا تھا۔ ادھیڑ عمر کو پہنچ جانے کے باوجود خدا نے اولاد نہیں دی تو انہوں نے صبر شکر کے ساتھ اسی کو اپنی تقدیر سمجھ کے صبر کر لیا تھا۔ شوہر نے پرچون کی چھوٹی سی دکان

کھول رکھی تھی۔ اس کی بیوی کئی سال قبل ایس پی کی بیوی کے پاس گھریلو ملازمہ کی حیثیت سے کام کر چکی تھی۔

انہوں نے اکبر کی ساری روداد بڑے دکھ کے ساتھ سنی اور اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔ ملنے جلنے والوں سے اس نے کہا کہ ایک دوست کا بیٹا ہے۔ دوست حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ یہ اب میرے ساتھ ہی رہے گا۔ اکبر وہی دوائیں کھاتا رہا جو اسے اسپتال میں دی جا رہی تھیں۔ اس کا زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو رہا تھا۔ گولی کے زخم کی وجہ سے وہ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے سے ڈرتا تھا۔

ایک مہینا بیس دن بعد اکبر دکان پر بیٹھنے لگا۔ پھر وہ منڈی جانے لگا۔ قریب ترین شہر راولپنڈی تھا۔ اس کے لیے اپنے دشمن کو تلاش کرنا مشکل نہیں تھا لیکن وہ محتاط تھا۔ ابھی اس کے پہچانے جانے کا خطرہ تھا۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ اس کے جوان ہونے تک ملک کے حالات میں بڑی تبدیلی آ گئی۔ دو ٹکڑے ہو جانے والے ملک میں ایک بار پھر مارشل لا آیا۔ پھر جمہوریت بحال ہوئی۔ اکبر سب سے بے تعلق اپنے دشمن کو تلاش کرتا رہا۔

بالآخر اکبر نے اس کا سراغ لگا لیا۔ اس کا بیٹا اسلام آباد کے ایک بڑا نام رکھنے والے اسکول میں پڑھتا تھا۔ اسے چھٹی کے وقت اسکول سے لانے کے لیے خود اس کی بیوی ہی کار ڈرائیو کر کے جاتی تھی۔ اکبر تین دن موقعے کی تلاش میں رہا۔ چوتھے دن وہ دیر سے آئی۔ وہ اندر گئی اور کچھ دیر بعد اپنے بچے کے ساتھ باہر آئی۔ اس کے پیچھے اسکول کا گیٹ بند ہو گیا۔ سڑک پر آگے پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔ عورت نے پیچھے کا گیٹ کھولا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اکبر کسی دشواری کے بغیر پیچھے سوار ہو گیا۔

عورت نے ایک دم پلٹ کے دیکھا۔ ''کون ہو تم؟''

اکبر نے ریوالور نکال لیا۔ ''چلو... کوئی چالاکی دکھانے سے پہلے یہ سمجھ لینا کہ تمہارے بیٹے کی زندگی میرے ہاتھ میں ہے۔''

عورت ہکلائی۔ ''م... میں وہی کروں گی... جو تم کہو گے لیکن بچے کو کچھ مت کہنا۔''

اکبر نے پورے معاملے کو پیشہ ور اغوا کاروں کے انداز میں ڈیل کیا تھا۔ وہ لہجہ بدل بدل کے بات کرتا رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کے دشمن نے فوراً ہتھیار ڈال دیے تھے۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ جس شخص کو انتقام کے جنون نے پاگل کر دیا ہو، اس سے رعایت کی توقع فضول ہے اور وہ نقد کروڑوں دینے پر تیار ہو گیا۔ ''مجھے کہاں آنا ہوگا؟''

بیرونِ ملک مقیم قارئین
جاسوسی - سسپنس
پاکیزہ - سرگزشت
کے
سالانہ خریدار
بن کر بذریعہ رجسٹرڈ ائیر میل
اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کریں
ایشیا یورپ اور افریقہ کے لیے فی ڈائجسٹ
زرِ سالانہ 4000 روپے یا 65 امریکی ڈالر
امریکا آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے لیے فی ڈائجسٹ
زرِ سالانہ 5000 روپے یا 80 امریکی ڈالر
اپنے ڈرافٹ اور منی آرڈر ادارے کے نام درج ذیل پتے پر ارسال کریں۔ یہ کراچی میں قابلِ ادائیگی ہونا ضروری ہیں۔ بیرونِ شہر ادائیگی کی صورت میں کوریئر چارجز اور بینک کمیشن کے 500 روپے اور بیرونِ ملک ادائیگی والے ڈرافٹ وغیرہ پر اس مد میں 20 امریکی ڈالر کا اضافہ کریں۔
رابطہ
ثمر عباس: 0301-2454188
بدرالدین سرکولیشن منیجر
فون نمبر 5802552,5804200(21)(92)
فیکس نمبر 5802551 (21)(92)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C PHASE II EXTENSION,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
KARACHI 75500,
E-MAIL :JDPGROUP@HOTMAIL.COM

اکبر نے کہا۔ ’’پشاور روڈ پر سیدھے چلتے جاؤ... ٹیکسلا کی طرف... پھر تمہیں ایک پہاڑی سی نظر آئے گی... سنگ جانی کے قریب... اس کے اوپر کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار بنی ہوئی ہے۔‘‘

’’وہ میں نے دیکھی ہے۔‘‘

’’تمہاری بیوی بچہ تمہیں وہیں مل جائیں گے... اگر تم اکیلے نہیں آؤ گے... پولیس تمہارے ساتھ ہوئی تو مجھے پتا چل جائے گا... پھر تم ان کی لاشیں ہی لے جاؤ گے۔‘‘

’’میری بیوی بچے کی زندگی کے مقابلے میں دو کروڑ کی کوئی حیثیت نہیں ہے... یہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں... میں نے اس معاملے میں پولیس کو بالکل نہیں ڈالا... تم مطمئن رہو... میں اکیلا ہی آؤں گا۔‘‘

اکبر بہت پُرسکون تھا۔ آٹھ سال بعد بالآخر وہ حساب برابر کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ آج تاریخ بھی وہی تھی، جگہ بھی وہی تھی اور وہی سب ہونے والا تھا جو پہلے اس کے ساتھ ہوا تھا۔ ایسا ہوتا ہے... کردار بدل جاتے ہیں... تاریخ خود کو دہراتی ہے۔

اسے کچھ حیرانی تھی کہ دو کروڑ روپے اس کے دشمن نے اتنے مختصر نوٹس پر کیسے جمع کر لیے؟ اس کے باپ کے لیے تو چوبیس گھنٹے بھی کم پڑے تھے۔ وہ چار دن تک خوار پھرا تھا... خیر... زمانہ تیز رفتار ہے... کیا پتا اس نے لاکر میں رقم محفوظ کر لی ہو۔

گاڑی کو اس نے پہاڑی کی اوٹ میں چھپا دیا تھا اور خود یادگاری ستون کے ساتھ بیٹھا سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں سے وہ راولپنڈی اور پشاور کی طرف سے آنے والے ٹریفک پر نظر رکھ سکتا تھا مگر خود نظر میں نہیں آ سکتا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی بھی سڑک تک محدود رہتی تھی۔

وہ عورت اس کے سامنے اپنے بچے کو گود میں لیے مسلسل رو رہی تھی۔ ’’آخر تم یہ سب کیوں کر رہے ہو بھائی؟‘‘

وہ ایک دم پلٹا۔ ’’مت کہو مجھے بھائی... تم صرف میرے دشمن کی بیوی ہو... میرا تم سے صرف انتقام کا رشتہ ہے۔‘‘

’’آخر کس بات کا انتقام لے رہے ہو تم؟ کیا جرم کیا تھا میرے شوہر نے؟‘‘

’’وہی جو آج میں کر رہا ہوں... اس نے دو کروڑ وصول کرنے کے لیے مجھے اور میری ماں کو اغوا کر لیا تھا۔‘‘

’’میرا شوہر... ایک بزنس مین ہے... کوئی اغوا کار نہیں۔‘‘

وہ چلایا۔ ’’میں جانتا ہوں... اس نے میرے باپ کو اس بات کی سزا دی تھی کہ وہ کاروبار میں اس کا طاقتور حریف بن گیا تھا۔ وہ اسے تباہ کرنا چاہتا تھا مگر دو کروڑ لے کے بھی اس نے میرے سامنے میری ماں کو اور میرے باپ کو مار دیا... میرے پاس کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ میں نے اپنی زندگی خیراتی اداروں اور یتیم خانوں میں گزاری... اب یہی تمہارے بیٹے کے ساتھ ہو گا... وہ بھی یتیم خانے میں پلے گا... اس کا دوسرا جنم ایک یتیم اور لاوارث کی حیثیت سے ہو گا... جیسے میرا ہوا تھا... میں خود اسے یتیم خانے میں داخل کراؤں گا۔‘‘

’’خدا کے لیے رحم کرو...‘‘

’’کیوں رحم کروں؟ کیا مجھ پر رحم کیا گیا تھا؟ یہ تو قصاص ہے... آنکھ کے بدلے آنکھ... جان کے بدلے جان۔‘‘

اس نے گھڑی دیکھی... اسے تو قبل از وقت پہنچ جانا چاہیے تھا۔ گھڑی کی روشن سوئیاں بتا رہی تھیں کہ وقتِ مقررہ سے پندرہ منٹ زیادہ گزر چکے ہیں۔ اکبر نے پھر سم بدلی اور اسے فون کیا۔ ’’تم کہاں ہو؟‘‘

جواب میں اس کا قہقہہ سن کے وہ اچھل پڑا۔ ’’احمق آدمی... تم کیا واقعی میرا انتظار کر رہے ہو؟‘‘

اکبر نے اسپیکر آن کر دیا۔ ’’کیا تم نہیں آؤ گے؟‘‘

’’تم نے مجھے اپنے باپ کی طرح پاگل سمجھا ہے۔ دو کروڑ دوں گا میں تمہیں؟ ایک عورت کے لیے اور اس کے بچے کے لیے... مانا کہ وہ میرا ہی بچہ ہے... مگر دو کروڑ...! پاگل کے بچے... ایسا گھاٹے کا سودا کرنے والا تمہارا باپ تھا... میں نہیں ہوں... میں دوسری شادی کر لوں گا... بچے اور ہو جائیں گے... لیکن تیرے باپ کی طرح میں اپنا کاروبار تباہ نہیں کروں گا جو میرے باپ نے ایک صدی میں کھڑا کیا ہے۔‘‘

اکبر نے کہا۔ ’’تمہیں اپنے بیوی بچوں سے محبت نہیں ہے؟‘‘

’’محبت تو آدمی کو پالتو کتے سے بھی ہوتی ہے... اپنی کار سے... اپنے گھر سے... ماں باپ سے... سب سے ہوتی ہے مگر کیا ان کے لیے وہ خود کو تباہ کر لیتا ہے... ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے... زیادہ سے زیادہ... اس کے بعد صفر ہو جاتی ہے... آدمی صبر کر لیتا ہے کہ وہ میرے نصیب میں نہیں تھی... مگر کیا پتا کل اس سے بہتر مل جائے۔‘‘

’’تم... تم محبت کو... چیز شمار کرتے ہو۔ بیوی بچوں کو مالیت کے اعتبار سے دیکھتے ہو؟‘‘ اکبر چلایا مگر فون بند ہو گیا تھا۔

عورت اب زار و قطار رو رہی تھی۔ اس نے سب کچھ سنا تھا اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس محبت کی جو وہ اپنے شوہر سے کرتی تھی یا سمجھتی تھی کہ شوہر اس سے کرتا ہے... قیمت دو کروڑ نہیں تھی... کاش... کاش! وہ بتا دیتا کہ کتنی تھی... ایک کروڑ... پچاس لاکھ، دس لاکھ...

خاموشی کا ایک بھیانک وقفہ آیا جس میں وہ بے قدر ہو جانے والی ایک عورت کے رونے کی آواز سنتا رہا۔ وہ آنسو دیکھتا رہا جو وہ اپنی ذلت پر بہا رہی تھی۔ اکبر کے لیے ایک بار پھر فیصلے کی گھڑی آ گئی تھی۔

بالآخر عورت چلائی۔ ’’اب کیا دیکھ رہے ہو... مار کیوں نہیں دیتے ہمیں... اب میں خود ہی زندہ نہیں رہنا چاہتی۔‘‘

اکبر نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’نہیں... وہ زندگی لے کر مجھے کیا ملے گا جس کی کسی کو ضرورت نہیں... میرے باپ نے تو اپنی بیوی سے محبت کی اور مجھ سے محبت کی منہ مانگی قیمت ادا کی تھی... اور اس کے لیے تباہ ہو گیا تھا۔ تمہیں مار کے مجھے کیا ملے گا... میرا دشمن تو پھر بھی زندہ رہے گا... جاؤ، بی بی! اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو... جہاں چاہو جاؤ۔‘‘ اس نے گاڑی کی چابی آگے بڑھا دی۔

اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ ’’اور کہاں جا سکتی ہوں میں؟ میں اپنی ذلت کی مجبوری کو دیکھوں... یا اس بچے کی آنے والی زندگی کی مجبوری اور دولت کو؟‘‘

وہ اسے آہستہ آہستہ بچے کو سنبھالے نیچے اترتا دیکھتا رہا۔ اسے اس عورت پر ترس آیا... وہ جانتی تھی کہ اس کی قیمت کیا ہے... جس محبت پر اسے ناز تھا... جسے وہ انمول سمجھتی تھی... اس کی قیمت صفر تھی۔ یہ جان کے بھی وہ چپ رہے گی... زندگی سے سمجھوتا کرے گی۔ یہ ظاہر کر کے عمر گزار دے گی کہ اس کو کچھ نہیں معلوم... اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔

اکبر نے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ پھر اندھیرے میں روشنی کی دو لکیروں نے گھوم کر ایک نصف دائرہ بنایا۔ گاڑی سڑک پر اتری اور واپس راولپنڈی کی طرف بھاگنے لگی۔ اندھیرے میں اس کی ٹیل لائٹس بھی گم ہو گئیں۔

وہ شکست خوردہ اور شرمسار سا اٹھا اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ اچانک اندھیرے میں سے سائے نمودار ہوئے اور پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ اغوا برائے تاوان کے جرم کی سزا موت ورنہ کم سے کم عمر قید تھی۔

☆☆☆

کسی نے باہر کا دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کیا۔ ’’بھائی اکبر! کیا سو رہے ہو ابھی تک؟‘‘

اس نے اندر سے کہا۔ ’’آیا بھائی آیا۔‘‘

اس نے کنڈی کھولی تو منظور اندر آ گیا۔ ’’ہوتا ہے بھائی... اپنے گھر کی چھت اور ماں کی گود برابر ہوتی ہے۔ آدمی سکون سے سوتا ہے۔‘‘

اکبر اسے کیا بتاتا کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے... چلتا رہا ہے۔ اس کی عمرِ گزشتہ کا ہر لمحہ ایک قدم تھا جسے شمار کرتا وہ نقطۂ آغاز پر پہنچ گیا ہے۔ دنیا واقعی گول ہے... آدمی جہاں سے چلتا ہے پھر وہیں پہنچ جاتا ہے۔

منظور اندر آیا۔ ’’کمال ہے اکبر بھائی... اس دھول مٹی میں تم نے رات گزار دی۔ اپنا گھر حاضر تھا۔ خیر، اب چلو... تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔‘‘

’’خوش خبری؟‘‘ وہ تلخی سے مسکرایا۔ ’’وہ کیا ہوتی ہے؟‘‘

’’چلو پہلے گھر چل کے نہا دھو لو... ناشتا کر لو... خوش خبری یہ ہے کہ تمہارے اس گھر کے لیے ایک گاہک مل گیا ہے... وہ آج ہی نقد ادائیگی کر دے گا... اور گاہک کو تلاش کرنے کہیں جانا بھی نہیں پڑا۔‘‘ وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسا۔

’’کیا مطلب؟‘‘

منظور نے اسے کھینچا۔ ’’یار! گاہک تمہارے سامنے کھڑا ہے... تمہارا بھائی... میں یہ جگہ لے رہا ہوں۔‘‘

اکبر نے آہستہ سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ ’’معاف کرنا منظور بھائی... میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔‘‘

منظور کی شکل اتر گئی۔ ’’کیا مطلب؟‘‘

’’میں یہ جگہ نہیں بیچوں گا... میں اپنے باپ کے ساتھ ساری زندگی چلتا رہا... تقدیر مجھے کہاں لے آئی... واپس اسی گھر میں... دنیا گول ہے نا... یہ ثابت ہو گیا۔‘‘ وہ ہنسا۔

’’مگر... تم یہاں... کیا کرو گے... کیسے رہو گے؟‘‘

’’اسی طرح جیسے میرا باپ رہتا تھا... اور اس سے پہلے اس کا باپ... آخر وہ بھی تو کچھ کرتے ہی ہوں گے زندہ رہنے کے لیے۔‘‘

وہ منظور کو جاتا دیکھتا رہا اور پھر ہنس پڑا۔ اس نے دروازے کو کنڈی لگائی اور بازار کی طرف چل پڑا۔ اسے چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔

www.pkdigest.com

تلاش گمشدہ

کے زبیر

تیمور اور شامی کی جوڑی اب کسی تعارف کی محتاج نہیں ..... ان کی زندگی شرارتوں، شوخیوں ..... اندیشوں اور اندوہناک حادثوں کا امتزاج ہے ..... نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ایسے واقعات کا حصہ بن جاتے ہیں جن سے ان کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

تلاش و جستجو سے شروع ہو کے قتل پہ ختم ہونے والی واردات کا ماجرا

شامی کمرے میں چیزیں الٹ پلٹ رہا تھا جیسے اسے کسی سوئی کی تلاش ہو کیونکہ وہ ایسی چیزیں بھی اٹھا کر دیکھ رہا تھا جن کے نیچے صرف سوئی ہی ہو سکتی تھی۔ تیمور اسے غور سے دیکھ رہا تھا اور تقریباً پچھلے آدھے گھنٹے سے دیکھ رہا تھا۔ آخر اس کا ضمیر جواب دے گیا اور اس نے معصومانہ لہجے میں شامی سے پوچھا۔ ''کیا تم اپنی عقل یا ضمیر تلاش کر رہے ہو؟''

شامی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ اس سے تیمور نے اندازہ لگایا کہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ اس نے پھر کہا۔ ''اگر تجھے مطلوبہ چیز نہیں مل رہی ہے تو تو شرلاک ہومز میتھڈ استعمال کر سکتا ہے۔''

''وہ کیا ہوتا ہے؟'' شامی نے پوچھا۔

''ہوا یوں کہ ایک بار شرلاک ہومز کا گھوڑا یا گدھا کھو گیا۔ وہ اسے مروجہ طریقے سے تلاش نہ کر سکا لہٰذا اس نے سوچا کہ وہ اگر گھوڑا یا گدھا ہوتا تو کہاں جاتا۔ لہٰذا وہ وہیں گیا اور اپنے گھوڑے کو پا لیا۔''

''کہاں گیا تھا؟''

''قصے میں اس کی وضاحت نہیں تھی۔'' تیمور نے سر کھجایا۔ ''مگر تو اپنی گمشدہ چیز کے لیے اسی طرح سوچ سکتا ہے۔''

''ڈائری خود سے کہیں نہیں جا سکتی ہے۔'' شامی جھنجھلا گیا۔

''آئی سی... تو جناب کی ڈائری نہیں مل رہی ہے۔'' تیمور نے معنی خیز انداز میں آنکھیں گھمائیں۔ ''یہ وہی ڈائری تو نہیں جس میں جناب نے اپنی تمام محبوباؤں کی تفصیل مع تصاویر رکھی ہے؟''

''وہی ہے اور اب وہ نہیں مل رہی ہے۔'' شامی مایوسی سے بولا۔ ''اب تو بتا بھلا ڈائری کہیں جا سکتی ہے؟''

''میں نے شرلاک ہومز میتھڈ میں ذرا سی ترمیم کی ہے۔ اس کے مطابق اگر آپ کی کوئی چیز آپ کو نہیں مل رہی ہے تو اس کا امکان ہے کہ وہ چیز اس شخص کے پاس ہو جس کے پاس آپ ہرگز اس چیز کو دیکھنا نہیں چاہتے۔''

شامی کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے تیمور کی طرف دیکھا۔ ''تیرا مطلب ہے کہ ڈائری دادا حضور کے پاس ہو سکتی ہے؟''

''ممکن ہے۔ مگر جناب نے اسے اتنی بے پروائی سے کیوں رکھا تھا؟''

''یار! میں پرسوں رات ماضی کی یادیں تازہ کر رہا تھا۔'' شامی نے سرد آہ بھری۔ ''اور بدقسمتی سے ڈائری واپس اندر رکھنا بھول گیا۔''

''تب تو اسے یہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''نہیں ہو سکتی، اب تو بالکل بھی نہیں ہو سکتی ہے۔'' شامی نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ''تیرے منحوس منہ سے کوئی بات نکلے اور پوری نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''بے شک، میری زبان تیرے معاملے میں کچھ کالی ہے۔ درحقیقت یہ پیش گوئی بھی ہو سکتی ہے۔'' تیمور نے اعتراف کیا۔ ''امکان ہے کہ ڈائری دادا جان کے پاس پہنچ چکی ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیسے پہنچی؟''

''وہ میں پچھلے دنوں فارغ تھا اس لیے ان کی لائبریری سے کچھ کتابیں لے آیا تھا۔''

''تو اور کتاب...'' تیمور نے غور کیا۔ ''دادا جان کے لائبریرین نظام دین کو ہارٹ اٹیک نہیں ہوا؟''

''سوچا تو میں نے بھی یہی تھا جب میں نے اس سے لائبریری کی چابی مانگی تھی۔ مگر وہ بدبخت بچ ہی گیا ورنہ صورت سے تو لگ رہا تھا کہ اب تب میں گزرنے والا ہے۔''

''کیا ڈائری ان کتابوں میں شامل ہو کر لائبریری پہنچ چکی ہے؟'' تیمور نے اگلا سوال کیا۔

''لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔''

''تب یہ نظام دین کی سازش ہو سکتی ہے۔ کیا کتابیں لینے وہ خود آیا تھا؟'' تیمور نے سوال نمبر تین کیا۔

''نہیں، اپنی کم بختی کو میں نے خود آواز دی تھی۔ میں کل شام باہر جا رہا تھا کہ اس نے کسی سود خور افغان کی طرح مجھ سے کتابوں کا مطالبہ کر دیا۔''

''پڑوسی ملک جانے کی کیا ضرورت ہے... مثال دینے کے لیے اپنا فولاد خان موجود ہے۔''

''میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ میرے کمرے سے اٹھا لے اور خود باہر چلا گیا۔ اگر میں ذرا سی زحمت کر لیتا تو اس مصیبت سے بچ سکتا تھا۔'' شامی نے خود کو کوسا اور پھر سے کمرے کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ ''تیمور! اب کیا ہو گا؟''

''یہ تو دادا جان ہی بتا سکتے ہیں۔ جب وہ تیری ڈائری دیکھ لیں گے تو تجھے خود معلوم ہو جائے گا۔''

شامی نے اسے خوں خوار نظروں سے دیکھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے؟''

''اگر تو کوئی دعا وغیرہ کرنا چاہتا ہے تو میں آمین کہنے کے لیے حاضر ہوں۔'' تیمور نے پورے خلوص سے کہا۔

''وہ میں تیری نماز جنازہ پر کہوں گا۔'' شامی جھنجھلا کر بولا۔

''حالانکہ امکان تو اس بات کا ہے کہ...'' تیمور نے جان کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

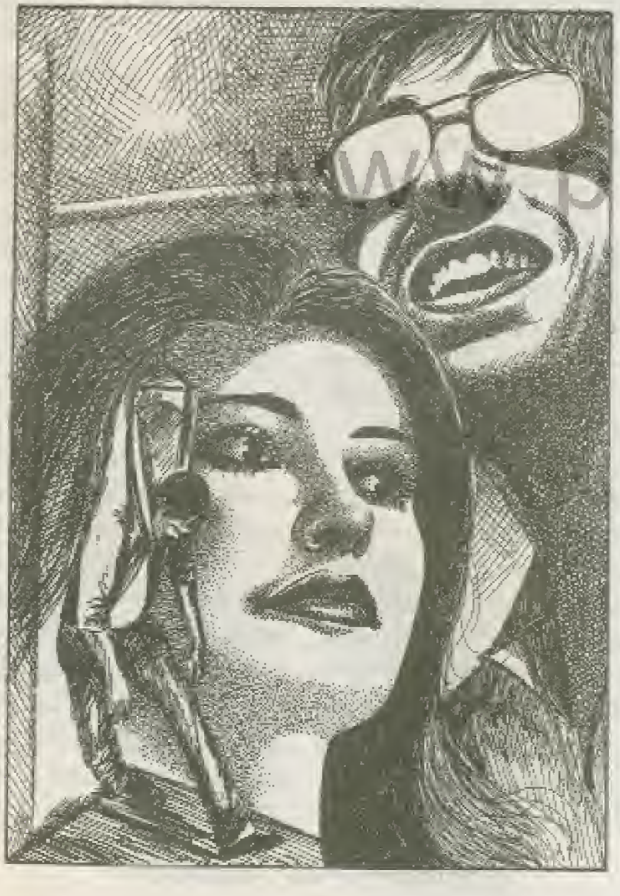

www.pkdigest.com

شامی پر رقت طاری ہوگئی۔ ”میرے ساتھ وفات سے بھی زیادہ برا ہوسکتا ہے۔“

”یعنی تیری رخصتی بہ طرف چمن پور؟“

”تیمورا کچھ کر۔“ شامی نے اس امکان پر بلبلا کر کہا۔ ”میں مر جاؤں گا اگر دادا جان نے مجھے چمن پور بھیجا تو...“

”یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ چمن پور جانے سے بہتر ہے تُو بہادری سے موت کو گلے لگا لے۔“

”وہ کیسے؟“

”تو ابھی جا کر دادا جان سے مطالبہ کر کہ تیری ڈائری غلطی سے کتابوں میں آگئی ہے، اسے واپس کر دیا جائے۔“

”یہ تو مشورہ دے رہا ہے یا میرے مرنے کا سامان کر رہا ہے؟ اگر دادا حضور نے ابھی تک ڈائری نہیں دیکھی ہے تو وہ اسے ضرور ملاحظہ فرمائیں گے۔“

”اور اس کے بعد آپ چمن پور جائیں گے۔“

”اس سے پہلے آپ میرے ہاتھوں فوت ہو جائیں گے۔“ شامی نے اگلا مصرع دیا۔

”خدا وہ دن نہ دکھائے جب آپ جیل جائیں اور خاندان کے نام کو بٹا لگائیں۔“

”یہ شعر و شاعری بند کر اور میرے مسئلے کا کوئی حل نکال۔“ شامی نے فریاد کی۔

”ممکن ہے دادا جان اب تک ڈائری ملاحظہ فرما چکے ہوں۔“ تیمور نے ایک تاریک امکان کی طرف اشارہ کیا۔

”اگر دادا حضور نے ڈائری دیکھ لی ہوتی تو میں اسے تلاش کرنے کی زحمت نہ کر رہا ہوتا۔“

”درست... تو اس وقت چمن پور کی طرف عازم سفر ہوتا۔“ تیمور نے اس کی تائید کی اور شامی کا موڈ بگڑنے سے پہلے بولا۔ ”ویسے تیرا کیا خیال ہے، ڈائری کہاں ہوگی؟“

”میرا خیال ہے کہ نظام دین نے بھی ابھی ڈائری نہیں دیکھی ہے ورنہ وہ اسے دادا حضور کو پیش کر چکا ہوتا۔ ڈائری لائبریری میں ہے۔ اسے وہاں سے نکالنا ہے اس سے پہلے کہ وہ دادا حضور کے حضور جا پہنچے۔“

”مشکل ہے... تُو جانتا ہے دادا جان اپنی لائبریری کی حفاظت کے لیے اسے مقفل رکھتے ہیں اور اس کی چابی نظام دین کے پاس ہوتی ہے۔“ تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تالا بھی بہت مضبوط قسم کا ہے۔“

ایک بار نواب صاحب کی لائبریری سے کچھ بہت قیمتی مخطوطات غائب ہوگئے تھے اور نواب صاحب کو شبہ تھا کہ ان کی گمشدگی میں شامی اور تیمور کی بے پروائی کو دخل تھا کیونکہ ان دنوں نواب صاحب کسی کام سے انگلینڈ تشریف لے گئے تھے اور مخطوطات ان کی غیر موجودگی میں غائب ہوئے تھے۔ اس کے بعد سے وہ اپنی لائبریری کو مقفل رکھنے لگے تھے۔ جب لائبریری بند ہوتی تو اس کی چابی نظام دین کے پاس ہوتی تھی۔ اگر کسی کو کوئی کتاب درکار ہوتی تھی تو کتاب خود نظام دین اندر سے نکال کر لاتا تھا اور جس کو دیتا تھا، اس کے پڑھنے کے بعد خود اندر رکھتا تھا کیونکہ نواب صاحب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔

نظام دین نے شامی کو بھی چابی نہیں دی تھی، اس نے مطلوبہ کتابیں خود شامی کو لا کر دیں اور جب ان کو واپس مانگا تو شامی نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری اور اسے اپنے کمرے سے کتابیں اٹھانے کا کہہ دیا۔ اب یہ نہ جانے نظام دین سے انجانے میں ہوا تھا یا اس کی شرارت تھی، اس نے کتابوں کے ساتھ ڈائری بھی اٹھالی تھی۔ اب شامی اس سے اپنی ڈائری مانگتا تو لازمی طور پر وہ ڈائری دیکھ لیتا اور اس کے بعد وہ اسے نواب صاحب کی خدمت میں پیش کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتا۔ اس لیے اس سے کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”یار! ہم تالا کسی اور طریقے سے نہیں کھول سکتے؟“ شامی نے پُر امید لہجے میں کہا۔ ”جیسا کہ فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔“

”ہم میں سے کوئی بھی قفل شکن نہیں ہے۔“ تیمور نے اسے یاد دلایا۔ ”اور نہ تو فلمی ہیرو ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا ہم کسی قفل کھولنے والے کی خدمات بھی حاصل نہیں کر سکتے؟“ شامی نے ایک اور خیال پیش کیا۔

تیمور نے غور کیا تو اسے شامی کی یہ تجویز قابل عمل محسوس ہوئی۔ بے شمار لوگ اپنے گھروں میں کسی تالے کی چابی گم کر بیٹھتے ہیں اور پھر قفل ساز کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ مگر اس میں خطرہ تھا۔ اگر نواب صاحب یا نظام دین میں سے کوئی عین موقع پر وہاں آجاتا اور ان کو قفل کھلواتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا یا بعد میں کوئی ملازم ایسے ہی ان کے سامنے بک دیتا تو وہ مشکل میں پڑ جاتے اور عین ممکن تھا کہ ڈائری کا معاملہ پیچھے چلا جاتا اور ان پر کوئی اور الزام آجاتا۔

”تجویز تو اچھی ہے مگر یہ کام ہوگا کیسے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”ہم کسی قفل کھولنے والے کو لے آئیں گے اور اس سے قفل کھلوا لیں گے۔“ شامی نے یوں کہا جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔

”اور کسی نے دیکھ لیا تو؟“

”کچھ تم بھی سوچ لو۔“ شامی نے یہ ذمے داری اس کے سر ڈال دی۔

”معاف کرنا، اس ڈرٹی میں میرے نہیں تمہارے کرتوت ہیں اس لیے جو کرنا ہے تم خود کرو گے۔ میں کسی بھی مرحلے پر تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔“ تیمور نے صاف انکار کر دیا۔

”تیمورا تو میرا بھائی نہیں ہے۔“ شامی نے فریاد کی۔

”بھائی ہونا میری مجبوری ہے اس لیے اس بات کا حوالہ نہ دیا کر۔“ تیمور نے کہا۔ ”ظاہر ہے بوقتِ پیدائش مجھ سے کزن کا انتخاب نہیں پوچھا گیا تھا۔“

شامی چڑ گیا۔ ”تو کیا سمجھتا ہے میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا؟“

”کیوں نہیں۔“ تیمور نے خلوص سے کہا۔ ”تُو نے اب تک جتنے عشق کیے ہیں اکیلے ہی کیے ہیں اور وہ سب اس ڈائری میں درج ہیں۔“

”تیمور! سوچ لے، تجھے بھی کام پڑ سکتا ہے۔“ شامی نے دھمکی دی۔

”تم بھی صاف انکار کر دینا۔“ تیمور نے فراخ دلی سے کہا اور اس کے کمرے سے نکل گیا۔ اس کے موبائل پر کال آرہی تھی اور موبائل وائبریٹ پر تھا۔ باہر نکل کر اس نے کال ریسیو کی۔

”تیمور! میں شمائلہ بات کر رہی ہوں۔ تم مجھ سے باہر مل سکتے ہو؟“

شمائلہ یونیورسٹی میں پچھلے سمسٹر میں آئی تھی اور اس نے آتے ہی دھوم مچا دی تھی۔ سیاہ آنکھوں اور سیاہ ہی بالوں والی شمائلہ بہت جاذبِ نظر نقوش رکھتی تھی اور اوپر سے اس کا متناسب ترین بدن جسے وہ ہمیشہ کسی جدید فیشن کے سوٹ سے نمایاں رکھتی تھی۔ ایک جدید اسپورٹس ماڈل کی کار میں یونیورسٹی آتی تھی اور حسن میں تغافل کے ساتھ جرأت بھی تھی۔ گویا ہر لحاظ سے خود مکمل تھی۔ یونیورسٹی کے نوّے فی صد لڑکے اس کے دیوانے تھے اور باقی دس فیصد کی نظر کمزور تھی یا وہ پہلے ہی کسی کی زلف کے اسیر تھے۔

تیمور خود بھی اس کے چکر میں تھا مگر اپنے نوابانہ رکھ رکھاؤ کا بھرم بھی قائم رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شمائلہ اس سے ذرا بات کر لیا کرتی تھی۔ ایک دو بار اس کے ساتھ یونیورسٹی کے کینٹین بھی آئی تھی۔ مگر یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے تیمور سے باہر ملنے کو کہا تھا۔ اندر سے تیمور خوشی سے اچھل پڑا مگر اس نے سرسری انداز میں کہا۔

”کیوں، خیریت... کوئی مسئلہ ہے کیا؟“

شمائلہ کا باپ بیوروکریٹ تھا اور اس کے بارے میں مشہور تھا کہ مالِ حرام اس کی گھٹی میں پڑا ہے کیونکہ اس کا باپ بھی ایک ملک کھاؤ قسم کا بیوروکریٹ تھا۔ اسی نے شمائلہ کے باپ کی تربیت کی تھی اور اس نے اس تربیت کی لاج اس طرح رکھی تھی کہ وہ اسے کمانے اور کھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ شمائلہ کے لیے اول تو کوئی مسئلہ ہونا نہیں چاہیے تھا اور اگر بدقسمتی سے کوئی مسئلہ اس کی طرف رخ کر بھی لیتا تو اس کے باپ کا ایک اشارہ اس کے خاتمے کے لیے کافی تھا۔

”ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“

”مسئلہ اور تمہیں؟“ تیمور بے یقینی سے ہنسا۔

”ہاں، کیا میں انسان نہیں ہوں جسے کوئی مسئلہ ہو سکے۔“ وہ چڑ گئی۔

”ارے نہیں... میرا تو خیال ہے کہ مسئلہ نام کی کوئی چیز تمہارے پاس سے بھی نہیں گزرتی ہوگی۔“

”وہ گزر کر میری زندگی میں داخل ہو چکا ہے۔“ شمائلہ بولی۔ ”یہ بتاؤ کہ تم آرہے ہو یا نہیں؟“

”میں آرہا ہوں، کہاں ملو گی؟“ تیمور نے اپنی مسرت دباتے ہوئے کہا۔ شمائلہ نے جواب میں ایک اوپن ایئر ریستوران کا نام لیا۔

”یہاں آجاؤ۔“

عطاء الحق قاسمی کی تصنیف ”وصیت نامے“ سے انتخاب

چراغ دین صحافی کا اظہار وصیت

پیارے بیٹے! تم نے اپنے ہفت روزہ ”گز بڑ“ کے علاوہ قومی روزنامے ”فساد“ میں بھی کالم لکھنا شروع کر دیا ہے، یہ میری دیرینہ آرزو تھی جو پوری ہوئی ہے، میں چاہتا تھا کہ تم کچھ پورے سے باہر بھی آؤ اور علاقے کے چھوٹے موٹے افسروں کے علاوہ اکابرین حکومت کی نظروں میں بھی اپنا ٹیلنٹ ثابت کرو۔ بیٹے اس کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت کے خلاف ڈٹ کر لکھو مگر ہمیشہ حکومت سے پوچھ کر لکھو کیونکہ صرف حکومت کو پتا ہوتا ہے کہ صحت مند تنقید کیا ہوتی ہے اور غیر صحت مند تنقید کسے کہتے ہیں؟ میں نے تمہیں فون پر کہا تھا کہ اس سلسلے میں کچھ ایجنسیوں سے بھی تم رابطہ کرو، تم نے سیمنٹ وغیرہ کی ایجنسیوں کے پھیرے لگانے شروع کر دیے، بیٹے تم تو بہت ذہین ہوتے تھے یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

"میں ابھی آتا ہوں۔"

تیمور تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے کی طرف لپکا، ابھی وہ تیار ہو رہا تھا کہ شامی کمرے میں آ گیا۔ اس نے مشکوک نظروں سے تیمور کی طرف دیکھا۔ "کہاں کی تیاری ہے... اور تیرے دانت کیوں نکلے پڑ رہے ہیں؟"

"شائلہ نے بلایا ہے۔" اس نے فخر سے کہا۔

شامی، شائلہ سے واقف تھا۔ اس نے شک سے کہا۔ "سچ... میں نے تو سنا ہے کہ وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی۔"

"لیکن مجھے ڈال رہی ہے۔" تیمور روانی میں کہہ گیا۔ "میرا مطلب ہے اس نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا ہے۔"

شامی نے سرد آہ بھری۔ "اور ہم پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا بھی نہیں۔"

"فکر مت کر تجھے بھی کوئی نہ کوئی پوچھ لے گا۔" تیمور باہر کی طرف لپکا۔ "پہلے تو سابقہ محبوباؤں کا ریکارڈ تو بازیاب کرا لے۔"

"میرے مسئلے کا کیا سوچا؟" شامی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"اس پر آ کر بات کروں گا۔" تیمور نے اسے ٹالا۔ اس نے گیراج سے نئی بی ایم ڈبلیو نکالی اور روانہ ہو گیا۔ بیس منٹ کے بعد وہ مطلوبہ ریستوران کے سامنے تھا۔ شائلہ اسے گارڈن میں داخل ہوتے ہی نظر آ گئی۔ وہ ایک دور کی میز پر موجود تھی۔ تیمور نے اس کے پاس جا کر کہا۔

"ہیلو! بہت پریشان لگ رہی ہو۔"

وہ چونکی۔ "تم آ گئے... تھینکس گاڈ... میں بہت پریشان ہوں۔"

"مسئلے پر بات کرنے سے پہلے کیوں نہ کچھ کھا لیا جائے۔" تیمور نے تجویز دی۔

"نہیں، اس عالم میں مجھ سے کچھ نہیں کھایا جائے گا۔ تم نے کچھ لینا ہے تو لے لو۔" اس نے انکار کیا۔

"نہیں مجھے بھی خاص خواہش نہیں ہے، تم مسئلہ بتاؤ۔"

"یہاں نہیں۔" اس نے چاروں طرف دیکھا۔ "کسی ایسی جگہ چلو جہاں کوئی ہماری بات سننے والا نہ ہو۔"

تیمور کو کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ اس کے لحاظ سے یہ اچھی بات تھی۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چلو ہم مارگلہ چلتے ہیں۔"

تیمور نے کار مارگلہ کے اوپر ایک تفریحی اسپاٹ پر روکی جہاں فی الحال کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں کار سے اتر آئے تھے۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں اردگرد کا منظر کم سے کم تیمور کو رومانی لگ رہا تھا مگر شائلہ کے چہرے پر چھائی پریشانی دیکھ کر اس نے مناسب سمجھا کہ پہلے اس کے مسئلے کی طرف توجہ دے۔ رومان کے لیے بہت وقت پڑا تھا۔

"ہاں اب کہو؟"

"تم بابر سے واقف ہو؟"

"بابر... کون بابر؟" تیمور نے ذہن پر زور دیا۔ "جو ایک سال پہلے یونیورسٹی میں تھا اور تمہارے آتے ہی وہ چلا گیا تھا۔"

"بالکل وہی۔" شائلہ نے تصدیق کی۔

تیمور ہچکچایا۔ "میں نے سنا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتا تھا۔"

"کرتا کیا تھا... ابھی کل تک میرا دیوانہ ہی تھا۔" شائلہ بے پروائی سے بولی۔ تیمور نے اس کے الفاظ پر غور کیا۔

"کل تک... یعنی آج نہیں ہے؟"

"ہاں کیونکہ وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔"

تیمور کو دھچکا لگا۔ شائلہ اسے اتنے عام سے انداز میں بتا رہی تھی۔ "بابر مر گیا ہے؟"

اس بار شائلہ ذرا تروس نظر آئی۔ "یہی تو مسئلہ ہے۔"

"یعنی بابر کا مرنا تمہارے لیے مسئلہ ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ہاں، وہ مر کر بھی میرے لیے مصیبت بنا ہوا ہے۔"

"اپنی زندگی میں بھی وہ تمہارے لیے مسئلہ تھا؟"

"ظاہر ہے جب کوئی کسی پروانے کی طرح آپ کے اردگرد منڈلاتا رہے تو مسئلہ تو ہوگا نا۔"

"او کے! میں سمجھ گیا۔ اب یہ بتاؤ کہ وہ مر کر کس طرح تمہارے لیے مسئلہ ہے؟"

"یہاں سے کچھ دور میرا ایک کاٹیج ہے۔ کبھی کبھی میرا اکیلے رہنے کو دل چاہتا ہے تو میں وہاں چلی جاتی ہوں۔"

"کیا ہم وہاں جا رہے ہیں؟" تیمور خوش ہو گیا۔

شائلہ نے سر ہلایا اور کار میں آ بیٹھی۔ وہ روانہ ہوئے۔ یہ ایک چھوٹی سی آبادی تھی مگر اوپری طبقے کے لیے ہی مخصوص تھی کیونکہ بڑے بڑے پلاٹ تھے جن میں چھوٹے چھوٹے کاٹیجز بنے تھے۔ شائلہ نے ایک کاٹیج کے سامنے کار رکوائی اور اتر کر گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولا۔ وہ اندر آئے۔ تیمور خاصی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ یونیورسٹی کی حسین ترین لڑکی اسے لے کر اپنے تنہا کاٹیج میں آئی تھی۔ وہ سنسنی محسوس کرنے میں حق بہ جانب تھا۔ شائلہ نے کاٹیج کا دروازہ کھولا اور وہ اندر آ گئے۔ یہ ایک چھوٹی سی اور خوب صورت سی نشست گاہ تھی۔ شائلہ اب بہت ہی پریشان لگ رہی تھی۔

"بابر تمہارا پیچھا کرتا تھا؟" تیمور نے پوچھا۔

"پیچھا۔" شائلہ پھٹ پڑی۔ "اس نے میری زندگی عذاب کر دی تھی۔ صبح شام مجھے کال کرتا تھا۔ دن رات میرے گھر کے چکر لگاتا تھا۔ میں نے کتنی بار اسے دھتکارا۔ کئی ایک بار تو اتنی بے عزتی کی کہ کوئی ذرا بھی غیرت مند ہوتا تو کہیں جا کر ڈوب مرتا۔ مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔"

"عاشقِ صادق تھا۔" تیمور نے سر ہلایا۔

"کیا... کون صادق؟"

"میرا مطلب ہے، واقعی ڈھیٹ تھا۔ بہرحال آگے کہو۔" تیمور خود بھی ایک صوفے پر ٹک گیا۔

"مجھے اس پر ترس بھی آتا تھا کیونکہ اس نے کبھی کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی۔ مجھے یہ خوف بھی تھا کہ بات پاپا کے علم میں آئی تو اس کی ہڈی پسلی بھی ایک ہو سکتی تھی۔"

"یعنی تمہیں اس سے ہمدردی بھی تھی؟"

"میں نے کہا نا کہ اس نے کبھی مجھ سے بدتمیزی نہیں کی تھی اور صورت سے بھی معصوم لگتا تھا اس لیے میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ برا ہو۔"

"صورت سے تو وہ واقعی معصوم لگتا تھا۔" تیمور نے تائید کی۔

"دو مہینے سے تو وہ بالکل پاگل ہو گیا تھا۔ اکثر ہماری کوٹھی کے آس پاس ہی منڈلاتا رہتا تھا۔ میں جب باہر نکلتی تھی اس کی بائک مستقل میری کار کے پیچھے رہا کرتی تھی۔ تم سوچ سکتے ہو کہ وہ میرے لیے کیسا عذاب بن گیا تھا۔"

"یہ تمہاری ہمت ہے جو تم نے اسے برداشت کر لیا اور اپنے پاپا کو بھی نہیں بتایا۔"

شائلہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "بس مجھے اس پر ترس آ جاتا تھا۔ بہرحال، اب تو معاملہ ہی ختم ہو چکا ہے۔ دو دن پہلے مجھے کسی نے کال کی اور کہا کہ میں بابر کی محبت قبول کر لوں ورنہ میں مشکل میں پڑ جاؤں گی۔"

"کس قسم کی مشکل میں؟" تیمور چونکا۔

"اس نے وضاحت نہیں کی تھی مگر اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سنجیدہ ہے۔"

"فون کس نمبر سے آیا تھا؟"

"میرے موبائل میں محفوظ ہے مگر یہ نمبر کسی کے نام پر نہیں ہے، میں اس کی تصدیق کر چکی ہوں۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد یہ ہوا کہ میں آج سو کر اٹھی تو مجھے اسی شخص کا فون آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں نے اس کی بات نہ مان کر بہت بڑی غلطی کی ہے اور میں ایک بڑی مصیبت میں پھنس چکی ہوں۔"

"تم نے اس سے اس بڑی مصیبت کے بارے میں پوچھا نہیں؟"

"پوچھا تھا... اس نے کہا کہ میں اپنے کاٹیج میں جا کر دیکھ لوں۔"

"لہٰذا تم سوچے سمجھے بغیر یہاں دوڑی آ گئیں؟"

"میں کوئی احمق لڑکی نہیں ہوں۔" اس نے خفگی سے کہا۔ "میں ایک گارڈ کے ساتھ آئی تھی اور اسے باہر روک کر اندر آئی تھی۔"

"یہاں تم نے کیا دیکھا؟"

شائلہ نے سرد آہ بھری۔ "جو میں نے دیکھا تھا، وہ تمہیں بھی دکھاتی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ اسے دوسرے کمرے میں لائی۔ دروازہ کھلتے ہی تیمور ٹھٹک گیا۔ کمرا کسی بھی قسم کے فرنیچر سے خالی تھا اور اس کے وسط میں چھت کے کنڈے سے ایک رسی میں کپڑے ٹانگنے والا ہینگر بندھا ہوا تھا اور اس ہینگر سے بابر یوں لٹک رہا تھا کہ اس کی بوسیدہ قمیص ہینگر میں پھنسی ہوئی تھی اور وہ اس کے سہارے لٹکا ہوا تھا۔ وہ بلاشبہ مر چکا تھا اور شاید اسے مرے ہوئے بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ شائلہ منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ تیمور نے بادلِ ناخواستہ لاش کا معائنہ کیا۔ اس پر بظاہر کسی زخم یا چوٹ کا نشان نہیں تھا اور نہ ہی ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی زہر وغیرہ کھانے سے اس کی موت ہوئی ہو۔ تیمور نے قریب سے دیکھا، اس کی گردن پر بھی کسی قسم کے نشانات نہیں تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بلاوجہ ہی مر گیا... یا اس کی قضا آ گئی تھی اور فرشتۂ اجل اسے لے گیا۔

"یہ کیسے مرا؟" تیمور نے شائلہ سے پوچھا۔

"مجھے کیا پتا، میں نے اسے اسی طرح یہاں دیکھا تھا اور اس کے پاس بھی نہیں گئی۔"

"دوسرا سوال یہ ہے کہ اسے جس نے بھی مارا یا یہ خود مرا، اسے کس نے یہاں لا کر لٹکایا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"آخر کسی کو تم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تمہیں کیوں بلاتی؟ پاپا سے نہ کہتی۔"

تیمور کے سارے رومانی جذبات اس لاش کو دیکھ کر سرد ہو گئے تھے۔ اس نے جتا کر کہا۔ "تب تم نے پاپا کو ہی کیوں نہیں بتا دیا؟"

www.pkdigest.com

"نہیں بتا سکتی۔" اس نے کہا۔ "پاپا ایک بائیس گریڈ کے افسر کے بیٹے سے میری شادی کرنا چاہ رہے ہیں اور میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔"

"یعنی اگر یہ بات تمہارے پاپا کے علم میں آ گئی تو وہ تمہیں مجبور کر سکتے ہیں اس شادی پر؟" تیمور نے غور کیا۔

"تم واقعی ذہین ہو۔" شائلہ کے لہجے میں طنز آ گیا۔

"اسی وجہ سے میں نے تم سے رابطہ کیا ہے۔"

تیمور نے ایک بار پھر لاش کا معائنہ کیا اور سر کھجا کر بولا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟ میں اس لاش کو کہیں ٹھکانے لگا دوں۔"

"پہلے سوچا میں نے بھی یہی تھا مگر اب اس کا فائدہ نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

جواب میں شائلہ نے اپنے پرس سے موبائل نکالا اور تیمور کو ملاحظے کے لیے پیش کر دیا۔ "ذرا یہ تصویریں دیکھو۔"

تیمور نے تصویریں دیکھیں۔ ان میں شائلہ لاش کے آس پاس نظر آ رہی ہے اور صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کسی نے اسے بلیک میل کرنے کا مکمل بندوبست کر لیا تھا۔ آج کل میڈیا کا دور ہے اور ایسی تصویریں کوئی بھی چینل بڑے شوق سے چلاتا اور ایک گھنٹے کے اندر سارا پاکستان شائلہ کو قاتل قرار دے دیتا۔ کسی نے باقاعدہ منصوبہ بنا کر اسے پھنسایا تھا۔ تصویریں لینے والے نے شاید موبائل ہی استعمال کیا تھا اور اسی کی مدد سے شائلہ کو یہ تصویریں بھیج دیں۔ شائلہ نے اس کی تصدیق کی تھی۔

"اب تم سمجھے کہ میں کیوں پاپا تک یہ معاملہ لے جانا نہیں چاہتی؟"

تیمور نے سر ہلایا۔ "پاپا تمہارے ساتھ اپنا مسئلہ بھی حل کر لیں گے۔ بائی دی وے بیوروکریٹ کے بیٹے میں کیا خرابی ہے؟"

"کوئی نہیں، بس وہ مجھے پسند نہیں ہے۔"

"اور دوسرا سوال کہ تم نے میرا ہی کیوں انتخاب کیا ہے؟"

شائلہ مسکرانے لگی۔ "تمہارے کارنامے میرے علم میں ہیں۔ تم اور شامی اتنے غیر معروف نہیں ہو۔"

"دیکھو مس شائلہ! میں تمہیں بتا دوں کہ میں نہ تو جیمز بونڈ ہوں اور نہ ہی کوئی روایتی جاسوس جو کسی لڑکی کے بہکاوے میں آ کر بلاوجہ کی مصیبت اپنے سر لے لیتا ہے۔ ارے... ارے یہ کیا کر رہی ہو؟" تیمور نے آخری جملہ بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا کیونکہ شائلہ اسے دھکیل کر باہر لے آئی اور اسے دیوار سے لگا کر خود جان بوجھ کر اس کے قریب آنے لگی۔ تیمور نے ہکلا کر کہا۔ "دیکھو اگر میں نے کوئی ایسا ویسا کام کیا تو تم میرے دادا جان کو بھی جانتی ہو۔ وہ مجھے بخشیں گے نہیں۔"

شائلہ مسکراتے ہوئے اس کے اور قریب ہوتی رہی۔ بالآخر تیمور کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "او کے او کے... جو تم چاہو۔ اب ذرا پیچھے ہٹ جاؤ۔"

شائلہ پیچھے ہو گئی۔ "شکر ہے تم مانے تو۔"

تیمور بھنا گیا۔ "ابھی ہوتا نا میری جگہ کوئی اور تو تمہیں یہ حرکت مہنگی پڑ جاتی۔"

وہ تیکھے انداز میں مسکرائی۔ "کوئی اور ہوتا تو کیا کر لیتا؟"

جواب میں تیمور نے ایک ایسی حرکت کی کہ شائلہ دنگ رہ گئی۔ پھر اس کا رنگ سرخ ہو گیا اور وہ غرائی۔ "بے ہودہ... بدتمیز۔"

اب تیمور مسکرایا اور بولا۔ "یہ کم سے کم ہوتا جو کوئی اور کرتا۔ اس سے آگے جانے کا میں نے کبھی سوچا نہیں۔"

شائلہ بری طرح کھسیائی ہوئی تھی۔ اس نے تیمور کے بازو پر مکا مارا۔

"اف اتنے سخت ہاتھ۔" وہ مصنوعی انداز میں کراہا۔ "کیا تم باکسنگ وغیرہ کرتی ہو؟"

"شکل سے تم کتنے شریف لگتے ہو۔" اس نے دوسرا مکا مارا۔

"اب تکے بازی بند کر کے اس لاش کا سوچو جو تمہارے گلے پڑ گئی ہے۔"

"تم سوچو، تمہیں کس لیے لائی ہوں؟"

تیمور نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اور میں پیشگی بھی لے چکا ہوں۔" پھر شائلہ کے تیور دیکھ کر جلدی سے بولا۔ "او کے او کے... اس بارے میں سوچتے ہیں۔"

تیمور اسے نشست گاہ میں چھوڑ کر دوبارہ کمرے میں آیا۔ اس نے دل کڑا کر کے بابر کی لاش کے جسم پر موجود لباس کا جائزہ لیا۔ اس کی پتلون کی جیب سے ایک پرس، ایک چابیوں کا گچھا اور ایک عدد موبائل فون نکلا تھا۔ پھر اسے خیال آیا۔ جس نے بھی شائلہ کی لاش کے ساتھ تصویریں لی تھیں، وہ یہیں کہیں موجود تھا۔ اس نے ارد گرد دیکھا اور اس کی نظر اوپر موجود روشن دان پر گئی۔ اس نے شائلہ سے موبائل لے کر تصویروں کا جائزہ لیا اور اسے یقین ہو گیا کہ تصویریں اسی روشن دان سے کھینچی گئی تھیں۔ وہ باہر آیا۔ اس نے روشن دان کو

باہر سے دیکھا۔ وہ زمین سے کوئی بارہ فٹ کی بلندی پر تھا۔ اس طرف ایک سیڑھی پڑی تھی اور زمین پر اس کے پایوں کے نشانات تھے۔ وہ واپس اندر آیا اور شائلہ سے پوچھا۔

"اس کاٹیج کی چابی اور کس کے پاس ہو سکتی ہے؟"

"کسی کے پاس نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" تیمور باہر نکلا اور اس کے ساتھ ایک مقامی مارکیٹ پہنچا۔ وہاں سے اس نے ایک قفل ساز کو لیا اور واپس شائلہ کے کاٹیج آیا۔ اس نے قفل ساز کو دونوں تالے دکھائے اور اس سے کہا۔

"انہیں کھول کر دیکھو کہ کسی نے ان کو چابی سے ہٹ کر کھولنے کی کوشش تو نہیں کی ہے۔"

قفل ساز نے دس منٹ میں دونوں تالے کھولے اور ان کا معائنہ کر کے بتایا۔ "نہیں جناب... دونوں تالے ان کی اپنی چابیوں یا ان کی بہت اچھی نقل سے کھولے گئے ہیں۔"

"شکریہ!" تیمور نے اسے کچھ رقم دی۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

"تم یہ کیا کرتے پھر رہے ہو؟" اس کے جاتے ہی شائلہ بولی۔

"میں جاننا چاہ رہا تھا کہ تالے کسی نے زبردستی کھولے ہیں... یا اصل چابی سے اس کی نقل بھی بنائی ہے تو یہ کام وہی کر سکتا ہے جو تمہارے آس پاس ہوتا ہو۔"

شائلہ سوچ میں پڑ گئی۔ "ایسا کون کر سکتا ہے؟"

"اس پر تمہیں غور کرنا چاہیے۔"

"یہ بھی تمہیں معلوم کرنا ہے۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔ "آخر میں نے تمہیں بلایا کیوں ہے؟"

"آؤ اس پر کہیں بیٹھ کر غور کرتے ہیں۔ دراصل جب تک میں کچھ کھا نہ لوں میرا دماغ صحیح طرح کام نہیں کرتا ہے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، میں کھاؤں گا اور تم میرا دماغ کھانا۔ کوئی لاش میری بھوک ختم نہیں کر سکتی۔"

شائلہ نے برا سا منہ بنایا مگر کچھ کہا نہیں۔ وہ کاٹیج بند کر کے روانہ ہو گئے تھے۔ ایک ریستوران کے سامنے تیمور نے گاڑی روکی اور وہ اندر چلے گئے۔

☆☆☆

شامی کو ہر اہم موقع پر فولاد خان یاد آتا تھا۔ خاص طور سے جب وہ کسی بحران میں ہو۔ اس وقت بھی وہ فولاد خان کے پاس تھا اور اپنے مطلب کی بات پر لانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ فولاد خان اسے یقین دلا رہا تھا کہ وہ مالی لحاظ سے بہت کمزور ہو چکا ہے۔ چنانچہ ان کے درمیان گفتگو کچھ اس طرح سے ہو رہی تھی۔ شامی نے کہا۔

"آج موسم بہت اچھا ہے۔"

"موسم اچھا اے پر ام خالی اے۔" فولاد خان نے سرد آہ بھری۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ کسی قفل ساز کو بلوا کر اپنے کمرے کا تالا ٹھیک کروا لوں۔"

"تالا ٹھیک کرانا چاہئی اے... پر ام کو اس کا ضرورت نہیں اے۔ ام بالکل خالی اے۔"

"فولاد خان! کیا تمہارا کوئی واقف کار ہے جو بند تالا کھول سکے۔"

"نہیں، ام نے کبھی کسی ایسے بندے سے واسطہ نہیں رکھا۔ تالا تو وہ رکھتا اے جس کے پاس پیسا او۔ ام بالکل خالی اے۔"

"تم عقل سے خالی ہو؟" شامی جھنجلا گیا۔ "میں تم سے پوچھ کچھ رہا ہوں اور تم جواب کچھ اور دے رہے ہو۔"

"تو آپ ام سے قرض مانگنے کا کوشش نہیں فرما رہا؟" فولاد خان نے شک سے کہا۔

"نہیں۔" شامی نے غرا کر کہا۔ "میں تم سے کسی تالے چابی بنانے والے کا پتا پوچھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔" فولاد خان نے اطمینان کی سانس لی۔

"تب ام دس تالے چابی والے کو جانتا اے۔ آپ کو کتنا چاہئی اے۔"

"کم سے کم ایک۔"

"اور زیادہ سے زیادہ؟"

"تب بھی ایک۔" شامی نے سر تھام لیا۔ "فولاد خان! تم کیا چیز ہو؟"

"ام چیز نہیں فولاد خان اے۔" اس نے برا مان کر کہا۔

"تم کوئی تالا کھول سکتے ہو؟" شامی نے سوچ کر پوچھا۔

"ام اپنا صندوق کا تالا کول سکتا اے۔" اس نے فخر سے بتایا۔

"میرا مطلب ہے کوئی ایسا تالا جس کی چابی نہ ہو۔"

"وہ بی ام نے اپنا صندوق کا کولا اے۔ اس کا چابی گم گیا۔ ام نے ڈنڈا لیا اور تالے پر مارا۔ تالا ٹوٹ گیا۔ اب ام دوسرا تالا لگاتا۔"

شامی کا صبر جواب دیتا جا رہا تھا، اس نے مصلحت بالائے طاق رکھ کر کہا۔ "فولاد خان! میں ایک قفل ساز کو

www.pkdigest.com

لے کر آؤں گا مگر اس کا اندراج تمہارے روزنامچے میں نہیں ہونا چاہیے۔''

شامی کا سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا۔ اگر وہ باہر سے کسی قفل کھولنے والے کو لے کر آتا تو اس کی آمد کا اندراج فولاد خان کے روزنامچے میں ہوتا اور نواب صاحب کی نظر اس پر پڑ سکتی تھی۔ اس کے بعد تفتیش کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا۔ شامی کو ایک جھوٹ چھپانے کے لیے دس جھوٹ بولنے پڑتے اور بالآخر وہ سب پکڑے جاتے۔ وہ فولاد خان کو راضی کرنے آیا تھا کہ وہ اپنے کھاتے میں قفل ساز کی آمد کا تذکرہ گول کر دے۔ مگر فولاد خان یہ سن کر ہی بدک گیا تھا۔

''شامی صیب! ام ایسا نہیں کر سکتا۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

''وہ کیوں؟''

''پچھلی بار ام نے آپ کا فرمانے پر ایسا کیا تا اور نواب صیب نے ام کو پکڑ لیا۔''

ہوا یوں تھا کہ فولاد خان نے شامی کی اپیل پر اس کی آمد کا وقت نہیں لکھا تھا اور جانے کا باقاعدگی سے لکھا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے فولاد خان کا روزنامچہ ملاحظہ فرماتے ہوئے یہ سقم پکڑ لیا اور شامی کے ساتھ فولاد خان کی بھی گوشمالی ہوئی تھی۔ بعد میں شامی نے بھناتے ہوئے اس سے کہا۔

''احمق! جب تم نے آنے کا نہیں لکھا تھا تو جانے کا کیوں لکھا؟''

''کیونکہ آپ نے صرف آنے کا لکھنے سے منع فرمایا تا۔'' فولاد خان نے خفگی سے کہا۔ ''ام کو پہلے منع کرنا تا۔''

''اتنی عقل تو تم میں بھی ہونی چاہیے کہ جب ایک آدمی باہر جاتا ہے تو واپس بھی آتا ہے۔''

''اچا۔'' فولاد خان نے اپنی ٹوپی کھجائی۔ ''ام نے یہ سوچا ای نئیں۔''

شامی نے سرد آہ بھری۔ ''قصور تمہارا نہیں ہے۔''

''یہ ای تو ام نے نواب صیب سے بولا۔ وہ فرماتا قصور امارا اے۔ ام بولا نئیں قصور نورجاں کا اے پر نواب صیب تو اور بی خفا ہو گیا۔''

اس وقت شامی اس کے پاس سے سر پیٹتا ہوا روانہ ہوا تھا۔ وہ سارے زمانے کو الو بنا سکتا تھا مگر فولاد خان سے نمٹنا اس کے بس سے باہر تھا۔ یہ اور بات تھی کہ آئے دن اس کا واسطہ اسی فولاد خان سے پڑتا تھا جیسا کہ ابھی پڑا ہوا تھا۔ شامی نے اسے سمجھایا۔ ''اس بار تم پہلے والی غلطی مت کرنا نہ آمد کا ذکر کرنا اور نہ جانے کا۔''

''کسی اور نے نواب صیب کو بتا دیا تب؟''

''نہیں بتائے گا۔'' شامی نے اسے یقین دلایا۔

''آپ فرض کرو کہ ادھر آپ اس بندے کو لاتے او، ادھر نواب صیب آ گیا تو ام کیا کرے گا؟''

''تم کہہ سکتے ہو کہ تم باتھ روم گئے تھے اور وہ تمہاری عدم موجودگی میں آیا تھا۔''

''ام نئیں کہہ سکتا۔'' فولاد خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نواب صیب نے کل حکم فرمایا اے کہ ام اگر گیٹ سے ہٹا تو اماری جگہ نورالدین گیٹ پر اوگا اور وہ لکے گا۔''

فولاد خان کسی صورت ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اور شامی کے پاس اس کے سوا کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی کہ راست اقدام اٹھائے۔ اب وہ خود جا کر کسی قفل ساز کو لے آتا اور اس سے لائبریری کا تالا کھلوا کر اپنی ڈائری حاصل کر لیتا، اس سے پہلے کہ دادا جان یا اقام دین کی اس پر نظر پڑتی۔ بعد میں یہ بات کھل بھی جاتی، تب بھی اس کی اتنی شامت نہیں آتی جتنی کہ ڈائری کے دادا جان کے ہاتھ لگ جانے کی صورت میں آ سکتی تھی۔ وہ روانہ ہونے والا تھا کہ موبائل پر تیمور کی کال آ گئی۔

''شامی تو کہاں ہے؟''

''جہنم میں۔'' اس نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

''انشاء اللہ... میرا مطلب ہے کہ اللہ نے چاہا تو... اگر نہیں چاہا تو تو کتنی ہی کوشش کر لے جہنم نہیں جا سکتا۔''

''بکواس نہ کر میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

''مجھے معلوم ہے جلد یا بہ دیر تیری چمن پور کی طرف روانگی ہے۔ اس لیے تو فوراً سے پیشتر اس ریسٹوران میں آ جا۔'' تیمور نے اسے ایک معروف ہوٹل کا بتایا۔

''وہ کیوں؟''

''آج تیرے اعزاز میں ایک شاندار ڈنر ہے اور اس میں شمائلہ بھی ہوگی۔''

''شمائلہ... تیری مس یونیورسٹی۔'' شامی نے شک سے کہا۔

''ہاں... وہی۔''

''اگر یہ بات غلط نکلی تو؟''

''تیری قسم۔''

''اور تیرے پاس اگر بل کی رقم نہ ہوئی تو؟'' شامی نے ایک اور زاویے سے غور کیا۔

''میرے دوست! ان میں سے کوئی چکر نہیں ہے تو آ جا۔''

شامی نے ماننے سے انکار کر دیا۔ ''نہیں بیٹے، کوئی چکر ہے ورنہ تو اور مجھے مس یونیورسٹی کے ساتھ ڈنر پر مدعو کرے۔''

''ایک چکر ہے تو... پر اس سے تیرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب بتا تو آ رہا ہے یا نہیں؟''

شام ہونے کو تھی اور کچھ دیر بعد اسے کوئی قفل ساز نہ ملتا اور معاملہ کل پر چلا جاتا۔ اس کے بعد پتا نہیں کہ اسے کل مہلت ملتی یا نہیں۔ مگر دوسری طرف شمائلہ تھی اور مفت کا ڈنر تھا اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ ڈائری بعد میں پہلے مس شمائلہ اور ڈنر۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس نے اندر جا کر کپڑے بدلے اور کیونکہ تیمور کار لے گیا تھا، اس لیے وہ اس کی بائک لے کر روانہ ہوا تھا۔

☆☆☆

تیمور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مسئلے کا کیا حل نکالے۔ آسان کام تو یہ تھا کہ وہ لاش پولیس کے سپرد کرتے اور پولیس خود شمائلہ کو مکھن میں سے بال کی طرح نکال دیتی کیونکہ اس کا باپ ایک توپ قسم کا بیوروکریٹ تھا۔ اس توپ کے سامنے آنے کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر شمائلہ اس کے لیے کسی صورت تیار نہیں تھی۔ اس نے تیمور سے کہا۔

''اگر تمہارے پاس بھی ایک حل ہے تو گئے کام سے۔''

''نہیں حل تو اور بھی ہیں۔'' تیمور نے اپنی ٹھوڑی کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے میں شامی کو بلا لوں۔''

''ہاں، تم دونوں مل کر اچھا حل نکال سکتے ہو۔'' شمائلہ خوش ہو گئی۔ تیمور نے شامی کو کال کی۔ اس نے آنے کی ہامی بھر لی تھی۔ مگر اس دوران میں شمائلہ کی کال آ گئی۔ اس کے باپ نے اسے فوری طور پر گھر آنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے منہ بنا کر موبائل بند کر دیا اور بولی۔ ''مجھے جانا ہوگا۔''

''کیوں؟''

''پاپا کے دوست کا منحوس بیٹا آج ڈنر پر ہمارے گھر انوائٹ ہے۔''

''تمہیں اس سے شادی پر اعتراض کیا ہے؟ آخر تمہیں اپنے طبقے کے کسی فرد سے شادی کرنی ہے۔ روایتی محبت کی کہانیاں ہماری فلموں کے ساتھ ہی دم توڑ گئی ہیں۔''

شمائلہ نے اور بھی برا سا منہ بنایا۔ ''میں خود اس قسم کی احمقانہ محبت پر یقین نہیں رکھتی ہوں جس میں دولت میں کھیلتی لڑکی اچانک ہی دو کمروں کے مکان میں نہایت مہارت سے برتن مانجھنے لگتی ہے۔ اور جہاں تک خرابی کا تعلق ہے، تم خود دیکھ لو۔ موصوف نے مجھے اپنی ایک تصویر بھیجی ہے۔ اس میں وہ کوئی پاپ گلوکار نظر آنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔'' شمائلہ نے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھایا۔

تیمور نے دیکھا، اسکرین پر ایک نوجوان مگر کسی قدر ہونق نظر آنے والا شخص اپنی بتیسی کی مکمل نمائش کر رہا تھا اور اس نے مرکری رنگ گلاسز لگا رکھے تھے۔ اگر وہ خوش شکل بھی تھا تو اس وقت نہیں لگ رہا تھا۔ تیمور نے موبائل واپس کیا اور اس کی تائید کی۔ ''یہ شخص کسی طرح تمہارے قابل نہیں ہے۔''

''اچھا۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ''اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

تیمور نے سرد آہ بھری۔ ''اپنے بارے میں میں کوئی خیال نہیں رکھ سکتا۔ میرے تمام جملہ حقوق دادا جان کے پاس محفوظ ہیں۔''

شمائلہ نے افسوس سے کہا۔ ''تم لوگ آج کے دور میں بھی سو سال پہلے کی طرح جی رہے ہو۔''

''ہاں تو کیا کرتا ہے آج کی طرح جی کر۔'' تیمور نے بے پروائی سے کہا۔ ''آدمی خود غلطی کرنے کے بجائے اپنے بزرگوں کو یہ موقع کیوں نہ دے۔''

شمائلہ نے غور کیا۔ ''بات تو تم نے ٹھیک کی۔''

''اس میں غلطی کو درست کرنے کا موقع زیادہ ہوتا ہے۔ اپنی کی ہوئی غلطی آدمی کے گلے پڑ جاتی ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''اسے عرفِ عام میں بیوی بھی کہتے ہیں۔''

''اوکے!'' وہ پرس اٹھاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ ''میں چلتی ہوں۔ اگر کوئی پروگریس ہو تو مجھے موبائل پر کال کر دینا۔''

اس کے جانے کے بعد تیمور نے سرد آہ بھری۔ ''کیا لڑکی ہے اور کس طرح بے وقوف بناتی ہے۔'' اس نے خود سے کہا۔

''وہ کہاں ہے؟'' پاس سے شامی کی آواز آئی تو وہ اچھل پڑا۔

''تو کب آیا؟''

''آج سے چوبیس سال پہلے۔'' وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''تیمور... تو نے مجھ سے بھی جھوٹ بولنا شروع کر دیا ہے۔''

''خدا کی قسم ابھی نہیں بولا تھا۔ کیا تجھے اس کرسی سے خوشبو کی لپیٹ نہیں آ رہی اور اس کے وجود کی گرمی جو وہ کرسی میں چھوڑ گئی ہوگی۔''

شامی اس کی بات سے زیادہ اس کے شاعرانہ لہجے سے قائل ہوا تھا۔ ''یعنی تو سچ کہہ رہا ہے۔ خیر، وہ کہاں گئی؟''

''اس کے باپ کا بلاوا آ گیا تھا۔''

www.pkdigest.com

''اس کا باپ کوئی سبزی فروش نہیں ہے جسے فکر ہو کہ لڑکی رات کے گھر سے باہر ہے۔'' شامی نے اسے یاد دلایا۔
اس پر تیمور نے اسے شمائلہ کے مسئلے سے آگاہ کیا کہ اس کا باپ اس کی شادی ایک بیوروکریٹ کے ہونق لڑکے سے کرنا چاہ رہا ہے۔
''تیرا اس مسئلے سے کیا تعلق ہے؟'' شامی نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ''کیا تو اس ہونق کی جگہ لینا چاہ رہا ہے؟''
''میرا اس مسئلے سے تو کوئی تعلق نہیں ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''البتہ اس نے ایک مسئلہ میرے سر مار دیا ہے۔''
''مسئلہ کیا ہے؟'' شامی نے مینیو کارڈ کا مطالعہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ''اور تو کیا کھلانے کا ارادہ رکھتا ہے؟''
''جو تو کھانا چاہے۔'' تیمور نے فراخ دلی سے کہا۔ ''لیکن اس کے بعد تجھے میری مدد کرنا ہوگی۔''
شامی نے سر ہلایا اور ہیڈ ویٹر کو بلا کر آرڈر نوٹ کرانے لگا۔ کھانے کے بعد وہ باہر آئے تو تیمور نے اپنی بائک دیکھ کر دانت پیسے۔ ''تو نے پھر میری بائک استعمال کی ہے۔''
''تو کیا کرتا... کار تو تم لے آئے تھے اور دادا جان کے حکم کے مطابق ایک وقت میں ایک سے زیادہ کار ہم دونوں کے زیر استعمال نہیں رہ سکتی۔''
تیمور نے اپنی ہارلے ڈیوڈسن بائک کا معائنہ کیا کہ اس پر کوئی خراش تو نہیں آئی ہے۔ اس نے کار کی چابی تیمور کو تھمائی اور اس سے بائک کی چابی لے لی۔ ''میرے پیچھے آ۔''
شامی نے شانے اچکائے۔ ''تیری مرضی۔''
وہ آگے پیچھے شمائلہ کے کاٹیج تک پہنچے۔ جب تیمور نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو اسے یاد آیا کہ اس نے شمائلہ سے کاٹیج کی چابی تو لی نہیں تھی۔ شامی نے اسے دیکھا۔ ''کیا بات ہے، یہ کس کا گھر ہے؟''
''شمائلہ کا اور چابی اس کے پاس رہ گئی ہے۔''
''اچھا۔'' شامی نے مایوسی سے کہا۔ ''وہ اندر نہیں ہے؟''
تیمور نے موبائل پر اس کو کال کرنا چاہی مگر اس کا نمبر بند تھا۔ دو تین بار کوشش کرنے کے بعد اس نے ہار مان لی۔ شامی اب بے تاب تھا۔ ''تیمور! بات کیا ہے؟ تو تھرڈ کلاس سسپنس پھیلانا بند کر دے ورنہ میں جا رہا ہوں۔''
مجبوراً تیمور نے اسے شارٹ ہینڈ میں ساری کہانی سنا ڈالی۔ شامی لاش کا سن کر اچھل پڑا۔ ''اندر لاش ہے؟''
''ہاں۔'' تیمور نے سر ہلایا۔ ''اور اب وہ چاہتی ہے کہ میں اس کا کوئی ایسا حل نکالوں جس میں اس کا باپ ملوث نہ ہو۔''
''تیمور! وہ تجھے بے وقوف بنا رہی ہے ورنہ اس طرح لاش پڑی ہو اور وہ اس بات کی تحقیق چاہتی ہے کہ اس کے پیچھے کون ہے... یہی کام اس کے باپ کے اشارے پر ایک تھانے دار ایک دن میں کر سکتا ہے۔''
''میں نے بتایا نا وہ اپنے باپ کو ملوث کرنا نہیں چاہتی ہے۔''
''نہ کرے... لیکن تو بھی کوئی شرلاک ہومز نہیں ہے۔''
''وہ تو ہے مگر یار... میں اس سے کہہ چکا ہوں کہ میں یہ کام کرنے کی کوشش کروں گا۔'' تیمور نے بے چارگی سے کہا۔ ''اور اب میں پیچھے ہٹ گیا تو سوچ اس کی نظر میں میری کیا عزت رہ جائے گی۔ میں یونیورسٹی میں اس سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر پاؤں گا۔''
''تو آنکھ ملائے بغیر بات کر لینا۔'' شامی نے اسے مشورہ دیا۔
''شامی! مذاق مت کر، میری مدد کر۔''
''فی الحال تو میں تجھے گھر لے جاؤں یہی تیری سب سے بڑی مدد ہو سکتی ہے۔ رات گھر میں گزارنا ہر لحاظ سے بہتر ہے بہ نسبت لاک اپ میں گزارنے کے۔''
''تو تو میری مدد نہیں کرے گا؟'' تیمور نے پوچھا۔
''میں اس قسم کے احمقانہ چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا۔'' شامی نے صاف انکار کر دیا۔
اچانک تیمور کو خیال آیا۔ ''سن... تجھے دادا جان کی لائبریری سے اپنی ڈائری چاہیے نا؟''
''ہاں، کیوں نہیں۔'' شامی کو اپنا مسئلہ یاد آ گیا۔
''تب میں تیری مدد کر سکتا ہوں۔''
''وہ کیسے؟''
''میں ایک قفل ساز کے بارے میں جانتا ہوں وہ آ کر لائبریری کا قفل کھول دے گا اور بند بھی کر دے گا۔''
''سچ... ابھی چلیں۔'' شامی نے خوش ہو کر کہا۔
''نہیں دوست... کام نکل جانے کے بعد ایفائے عہد کے معاملے میں تیرا ریکارڈ بھارت سے بھی زیادہ خراب ہے۔ اس لیے پہلے میرا کام اور اس کے بعد تیرا کام۔''
''مگر وہ چھوٹا سا کام ہے۔'' شامی نے فریاد کی۔
''جبکہ اس کام میں ایک لاش بھی شامل ہے۔''
''سنگینی کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ یعنی اگر میں اور تو ان چکروں میں پکڑے گئے تو دادا جان کا ردعمل یکساں ہوگا۔''
یہ سوچ کر ہی شامی پر رقت طاری ہونے لگی تھی۔ ''بلکہ... آسانی سے چھوٹ جائے گا۔ مجھے دادا حضور کسی صورت معاف نہیں کریں گے۔ اس لیے پہلے میرا کام۔''
''نہیں، پہلے میرا۔''
آخر طے ہوا کہ ٹاس کیا جائے اور شامی نے سکہ اچھالا اور بدقسمتی سے اس کے خلاف فیصلہ آیا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''لگتا ہے کہ میری قسمت اچھی نہیں ہے۔''
''قسمت کتنی بھی خراب ہو، آدمی کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔''
شامی بھنا گیا۔ ''تو یہ بات کہہ سکتا ہے کیونکہ تو نے چمن پور نہیں بلکہ انگلینڈ جانا ہے۔''
''میرے یار! سزا تو میرے لیے بھی ہے۔'' تیمور نے سرد آہ بھری۔ ''تجھے جانے کی صورت میں سزا مل سکتی ہے اور مجھے نہ جانے کی صورت میں مل رہی ہے۔''
وہ دونوں پھر بازار تک گئے اور خوش قسمتی سے قفل ساز مل گیا۔ وہ دکان بند کر کے گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تیمور نے اسے پھر چلنے کو کہا تو اس نے کوئی حجت نہیں کی کیونکہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے پاس گھر کی چابیاں تھیں اور اس نے معاوضہ بھی اچھا دیا تھا۔ شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ راستے میں تیمور نے اس سے کہا۔ ''دوست! اگر تم مستقل ہمارے ساتھ رہو تو کیا حرج ہے؟''
''ہم تمہیں سو روپے گھنٹا معاوضہ دیں گے اور جو کام کرائیں گے اس کا معاوضہ الگ سے ہوگا۔'' شامی نے بھی ٹانگ اڑائی۔ وہ دونوں کار میں آئے تھے۔
تیمور نے شامی کو گھورا۔ ''وہ دراصل... بیگم صاحبہ جاتے ہوئے غلطی سے چابیاں لے گئی ہیں اور اب میں آیا تو دروازے بند ہیں۔''

WWW.JBDPRESS.COM

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ	300/-
اندھیری رات کے مسافر	225/-
قیصر و کسریٰ	300/-
پاکستان سے دیار حرم تک	125/-
گمشدہ قافلے	300/-
داستان مجاہد	200/-
پردیسی درخت	275/-
قافلہ حجاز	300/-
خاک اور خون	300/-
معظم علی	275/-
سفید جزیرہ	150/-
کلیسا اور آگ	225/-
پورس کے ہاتھی	125/-
محمد بن قاسم	225/-
ثقافت کی تلاش	100/-
آخری چٹان	275/-
اور تلوار ٹوٹ گئی	300/-
شاہین	275/-
سو سال بعد	125/-
انسان اور دیوتا	225/-
یوسف بن تاشفین	225/-

جہانگیر بکس
• لاہور 042-7220875 • راولپنڈی 051-5539609 • ملتان 061-4781761 • فیصل آباد 041-2627568 • حیدر آباد 0300-3012131 • کراچی 021-2785086

"کوئی مسئلہ نہیں ہے صاحب لیکن پوری رات کے لیے کیوں صاحب؟" قفل ساز نے سوال کیا۔

"ممکن ہے ہمیں کچھ اور کام بھی پڑ جائے۔" شامی نے پھر کہا۔ اسے اپنے مسئلے کی پڑی تھی۔

"نہیں صاحب! میں پوری رات گھر سے باہر نہیں رہ سکتا۔ گھر والی کو کیا جواب دوں گا؟"

"عورت سے ڈرتے ہو۔" شامی نے اسے ملامت کی۔

"ڈرنا ہی پڑتا ہے ورنہ سارا محلہ سنتا ہے۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔ "نیک بخت کی زبان بہت لمبی ہے۔"

"اچھا ایسا کرو، یہ کام کر کے اپنا پتا سمجھا دینا۔ ہم تمہیں وہاں سے لے جائیں گے۔" تیمور نے تجویز پیش کی۔

"ٹھیک ہے صاحب لیکن جب گھر پر آؤ تو کام کا مت کہنا۔ پتا نہیں گھر والی کیا سمجھے کہ میں نے رات کو کون سا کام شروع کر دیا ہے۔"

وہ بے چارہ واقعی اپنی بیوی سے ڈرتا تھا۔ وہ کاٹیج پہنچے۔ خوش قسمتی سے یہ علاقہ اس قسم کا نہیں تھا کہ لوگ ایک دوسرے کے گھر آنے جانے والوں کی جاسوسی کرتے۔ قفل ساز نے پہلے باہر چھوٹے دروازے کا اور پھر اندر داخل ہونے والے دروازے کا قفل کھول دیا۔ تیمور نے اس سے پتا لے کر اور اسے اجرت دے کر رخصت کیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ شامی نے چاروں طرف دیکھا۔

"لاش کہاں ہے؟"

"وہ اس کمرے میں ہے۔" تیمور نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھول کر کہا۔ شامی نے اندر جھانکا اور پھر سوال کیا۔

"کہاں ہے؟"

تیمور نے اندر دیکھا اور چکرا گیا۔ لاش واقعی کمرے سے غائب تھی۔ نہ صرف لاش بلکہ چھت کے کنڈے سے منسلک رسّی بھی غائب تھی۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "میرا خیال ہے جس نے لاش لٹکائی تھی، اسی نے غائب بھی کر دی۔"

"مگر کیوں؟" شامی نے پوچھا۔

"اس کیوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے جاسوسی کافی ہو گئی ہے اور ہمیں اب گھر جانا چاہیے۔" شامی نے یاد دلایا۔ "دادا جان نے دس بجے کے بعد آنے کی صورت میں خصوصی انکوائری کی دھمکی دے رکھی ہے۔"

"ابھی نو بجے ہیں اور ہم پھر بھی کچھ جاسوسی کر سکتے ہیں۔"

"تو کرو۔" شامی صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ "جب کچھ پتا چل جائے تو مجھے بھی بتا دینا۔"

تیمور نے جیب سے بابر کا پرس اور موبائل نکالا۔ اس پر نمبر دیکھنے لگا۔ ایک پر پاپا لکھا تھا۔ تیمور نے وہ نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کسی مرد نے جواب دیا۔ "آپ بابر کے والد ہیں؟"

"ہاں، تم کون ہو۔ کیا بابر تمہارے پاس ہے؟" بابر کے باپ نے بے تابی سے پوچھا۔

"بابر کب سے گھر سے غائب ہے؟" تیمور نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

"کل رات اسے کوئی بلا کر لے گیا تھا اس کے بعد سے وہ گھر نہیں آیا ہے اور نہ کال ریسیو کر رہا ہے۔ بابر ٹھیک تو ہے نا؟" آدمی کے لہجے میں خدشات لرزنے لگے تھے۔

"مجھے اس بارے میں نہیں معلوم مجھے تو یہ موبائل ایک جگہ پڑا ملا ہے آپ مجھے اپنے گھر کا پتا سمجھا دیں تو میں دینے آ جاؤں۔" تیمور نے جواب دیا۔ اسے پہلی بار پتا چلا کہ موبائل کی بیل بند تھی اور وہ وائبریٹ پر تھا اس لیے اس پر جو کالز آ رہی تھیں تیمور کو ان کا پتا ہی نہیں چلا۔

بابر کے باپ نے مایوسی کے عالم میں اپنا پتا بتایا اور تیمور نے لائن کاٹ دی۔ اس نے افسوس سے شامی کی طرف دیکھا۔ "میں اس کے باپ کو بتانے کی ہمت نہیں کر سکا کہ اس کا بیٹا اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔"

"تجھے یقین ہے کہ تو نے اس کی لاش دیکھی تھی؟"

"مجھے سو فی صد یقین ہے۔" تیمور نے سر ہلایا۔

"ممکن ہے یہ کوئی فراڈ ہو؟"

"میں نے کہا نا وہ لاش ہی تھی۔" تیمور نے خفگی سے کہا اور موبائل پر مزید نمبر چیک کرنے لگا۔ اس نے خاص طور سے ان کمنگ کالز چیک کیں۔ ان میں سے دو کالز نامعلوم نمبروں سے آئی تھیں۔ یعنی ان کے ساتھ کوئی نام نہیں لکھا تھا۔ دوسرے نمبروں پر نام لکھے تھے۔ تیمور نے خاص طور سے وہ نمبر دیکھے جن سے اسے گزشتہ رات کال آئی تھی اور اتفاق سے یہی دونوں نامعلوم نمبرز تھے۔ اس نے شامی کو اپنی تفتیش سے آگاہ کیا۔ اس نے انگڑائی لی۔

"آج کے لیے اتنی جاسوسی کافی ہے۔ اب گھر چلیں؟"

"چل... ہو سکتا ہے کہ دادا جان نے تیری ڈاڑھی دریافت کر لی ہو اور اب شدت سے تیری واپسی کے منتظر ہوں۔"

"تو مجھے نہیں ڈرا سکتا۔" شامی نے دانت نکالے۔ "اس صورت میں ان کا فون آ چکا ہوتا۔"

تیمور کے خیال میں اتنی جاسوسی واقعی کافی تھی اس لیے وہ گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اب شامی کو اپنے مسئلے کی فکر کھائے جا رہی تھی اور اس نے تیمور سے کہا۔ "اس کو کب چلتے ہیں۔"

"اس وقت... تاکہ جس نے توجہ نہ بھی دی ہو وہ ضرور توجہ دے۔" تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ کام صبح کے وقت بہتر انداز میں ہو سکتا ہے۔"

"شکر ہے وہ آفت کی پرکالہ گڑیا نہیں ہے۔" شامی نے پھپھو شہناز کی بیٹی کا ذکر کیا۔ وہ بھی وقار ولا میں رہتی تھیں اور ان کی بیٹی گڑیا سے دونوں کی دوستی تھی اسی وجہ سے وہ ان کی ٹوہ میں رہا کرتی تھی۔ ان دنوں وہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے پھپھو کے ساتھ انگلینڈ گئی ہوئی تھی۔ وہ وقار ولا آئے تو ہر طرف خاموشی اور سکون پا کر شامی نے بھی سکون کا سانس لیا۔ شامی فوراً اپنے کمرے میں چلا گیا اور تیمور نے ثنا کلہ سے رابطے کی کوشش کی۔ اس بار رابطہ ہو گیا تھا۔

"تم نے فون کیوں بند کیا تھا؟"

"ہم پاپا کھانے کی میز پر موبائل کا استعمال پسند نہیں کرتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ بتاؤ کہ تم نے کیا کیا؟"

"میں نے تو کچھ نہیں کیا مگر اس نے ضرور کچھ کیا ہے جس نے بے چارے بابر کو وہاں لٹکایا تھا۔ اس نے اسے غائب کر دیا ہے۔"

"کیا لاش غائب ہے؟" ثنا کلہ نے اضطراب سے پوچھا۔

"میرا یہی مطلب ہے۔" تیمور بولا۔ "وہ کل رات سے اپنے گھر سے غائب ہے اور کوئی اسے گھر سے بلا کر لے گیا تھا۔"

"یہ بات تمہیں کس نے بتائی؟"

"بابر کے باپ نے۔"

تیمور! کوئی مجھے بدنام کرنے کی سازش کر رہا ہے۔"

"اور تمہاری بدقسمتی کہ اس کی سازش کامیاب ہوتی نظر آ رہی ہے۔"

"پلیز! کچھ کرو۔"

"فی الحال تو میں آرام کرنے جا رہا ہوں۔ خواب خرگوش کے دوران اگر تم کہیں خواب میں آ گئیں تو تم برا تو نہیں مناؤ گی۔"

"گڈ نائٹ!" ثنا کلہ نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

"دل"

تبدیلیٔ قلب کے آپریشن کے بعد سرجن صاحب نے مریض سے دریافت کیا۔ "اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟"

"ڈاکٹر صاحب! مجھے ایک کے بجائے دو دو دھڑکنیں سنائی دینے لگی ہیں۔" مریض نے شکایت کی۔

"اوہ...!" ڈاکٹر صاحب نے گھبرا کر اپنی کلائی کی طرف دیکھا۔ "میں بھی سوچ رہا تھا آخر میری گھڑی کہاں گئی..."

"زاویۂ نظر"

فٹ بال میچ کے بعد ایک ٹیم کے منیجر نے اپنے کھلاڑی سے کہا۔ "تم نے بہت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا۔"

کھلاڑی قدرے شرمندگی سے بولا۔ "سر! میرے خیال میں تو میں بہت برا کھیلا..."

"نہیں... تم نے دوسری ٹیم کے حق میں بہت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا۔" منیجر نے اپنے تبصرے کی وضاحت کی۔

"آمد"

سنیما کی اسکرین پر ایک المیہ منظر چل رہا تھا اور ایک صاحب کچھ زیادہ ہی آہ و بکا کر رہے تھے۔ جب وہ کسی طرح خاموش نہ ہوئے تو تماشائیوں نے منیجر کو بلوا بھیجا۔ منیجر نے اندھیرے میں آنکھیں سکیڑ کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آخر آپ آئے کہاں سے ہیں؟"

"بھائی... میں اوپر بالکونی سے گرا ہوں۔" ان صاحب نے بری طرح کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"سوال"

آنٹی: بیٹا! اگر تمہارے پاس کیک کے دو پیس بچے ہوں... ایک بڑا اور ایک چھوٹا... تو تم اپنے بھائی کو کون سا پیس دو گے؟

بچہ: آپ کون سے بھائی کی بات کر رہی ہیں؟ بڑے کی یا چھوٹے کی؟

شامی اور تیمور ناشتے سے فارغ ہوتے ہی بازار میں قفل ساز کی دکان جا پہنچے تھے جبکہ سارا بازار بند پڑا تھا۔

"یہاں تو ساری دکانیں بند ہیں۔"

"ہاں حالانکہ دکان والوں کو جناب کے استقبال کے لیے فوراً کے اپنی دکانیں کھول لینی چاہیے تھیں۔" تیمور نے طنز کیا۔ "میں نے چلتے ہوئے کیا کہا تھا؟"

"میرا خیال ہے اس کے گھر چلتے ہیں۔"

"یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا؟" تیمور خفگی سے بولا۔

"اب واپس جانا پڑے گا۔"

"کون سا پیدل جانا ہے۔" شامی نے دانت نکالے۔

مگر قفل ساز کے گھر پر ایک ایسی خبر سننے کو ملی کہ شامی کے دانت اندر چلے گئے۔ قفل ساز کو رات کسی وقت پولیس لے گئی تھی۔ وجہ معلوم نہیں تھی۔ اس کی بیوی واقعی زبان دراز تھی۔ ان کے سوال پر اس نے کسی گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح بجنا شروع کر دیا۔ ''اجی مجھے تو پہلے ہی اس مردودے پر شک تھا، اس کے کرتوت خراب تھے۔ راتوں کو گھر سے غائب رہتا تھا۔ نہ جانے کیا کیا گل کھلاتا تھا۔ اب سامنے آئے گا جب پولیس کے چھتر پڑیں گے۔ ویسے آپ لوگ اس مردودے سے ملنے کیوں آئے ہو؟''

تیمور نے فوری طور پر بات بنائی کہ انہیں اپنے گھر کے قفل بنوانے تھے اس لیے آئے تھے۔ باہر آتے ہی تیمور نے کہا۔

''اللہ کی پناہ... اس عورت کی زبان دیکھی، وہ بے چارہ صحیح رو رہا تھا۔''

''اور اب پولیس کی تحویل میں زیادہ سکون سے ہو گا۔'' شامی نے اس کی تائید کی۔

''بیٹا مجھے لگ رہا ہے یہ پولیس اسی چکر میں آئی تھی۔''

''تیرا مطلب ہے کہ لاش مل گئی ہے اور پولیس کو یہ بھی پتا چل گیا کہ لاش کہاں تھی اور اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس گھر کے دروازے اس قفل ساز نے کھولے تھے؟'' شامی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تیمور! ہماری پولیس تا قیامت اتنی تیز نہیں ہو سکتی ہے۔''

''احمق! اسے کوئی گائیڈ تو کر سکتا ہے۔''

''ہماری پولیس صرف اس سے گائیڈ ہوتی ہے۔'' شامی نے پیسا کمانے کا اشارہ کیا۔

''تو بھائی اسی طرح گائیڈ کیا ہو گا۔''

''اب کیا کریں۔'' شامی اچانک روہانسا نظر آنے لگا۔ ''ڈائری نہ ملی تو میرا کیا ہو گا؟''

''فکر نہ کر اس شہر میں کوئی ایک قفل ساز تو ہے نہیں۔ چل کسی اور کو دیکھتے ہیں۔''

بازار میں انہیں ایک اور قفل ساز مل گیا جو پہلے والے کے مقابلے میں شکل سے ہی مشکوک نظر آ رہا تھا۔ شامی نے تیمور کے کان میں کہا۔ ''یہ گیا تو سب دادا جان کو لازمی رپورٹ کریں گے۔''

لفظ رپورٹ پر قفل ساز کے کان کھڑے ہو گئے۔ ''لو جی، کیا پرچہ کاٹ دیا اس کا۔''

''نہیں۔'' تیمور چونکا۔ ''لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''لو جی سارے قفل ساز اس کی ضمانت کرانے گئے ہیں۔''

''تم کیوں نہیں گئے؟'' شامی نے پوچھا۔

''لو جی، دھندے کا ٹائم چھوڑ کر کون جاتا ہے۔''

''انہی سے کام نہیں کراتا۔'' شامی نے پھر تیمور کے کان میں کہا مگر قفل ساز نے سن لیا۔

''نہ کراؤ جی۔ اب کل آنا، آج تو کوئی دکان نہیں کھولے گا۔ پولیس نے ایسے ہی تو بندہ نہیں اٹھایا۔ ہو سکتا ہے کہ ضمانت کے لیے جانے والوں کو اپنی ضمانت کرانی پڑ جائے۔''

''تمہارے کان کچھ زیادہ ہی تیز ہیں۔'' تیمور نے اسے گھورا۔

''اوہ باؤ جاؤ، دماغ مت کھاؤ ایویں۔'' اس بار اس نے بدتمیزی سے کہا۔ ''آ جاتے ہیں۔''

شامی غصے میں اس کی طرف بڑھا مگر تیمور نے اسے کھینچ لیا۔ ''کس کے منہ لگ رہا ہے۔ کیچڑ میں پتھر مارنے والے کو چھینٹے ہی ملتے ہیں۔''

بازار سے نکلنے کے بعد تیمور نے کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ بابر کے گھر کا ایک چکر لگا لوں۔ اس کا موبائل بھی اس کے گھر والوں کو دینا ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں سے کچھ معلوم ہو جائے۔''

شامی نے اسے گھورا۔ ''ابھی تک جاسوسی کا کیڑا نہیں نکلا تیرے دماغ سے۔''

''یار! کیا حرج ہے، فارغ ہیں۔ مشغلہ سمجھ کر کام کر لیتے ہیں۔''

''مجھے تو ایسے مشغلے سے معاف رکھ جس میں پولیس کے بعد دادا جان کا غضب ناک منہ دیکھنا پڑے۔''

''چل یار۔'' تیمور نے کہا اور شامی کی سنے بغیر اسے گھسیٹ کر بابر کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں اس قسم کے کوئی آثار نہیں تھے کہ ان لوگوں کو بابر کی موت کا علم ہو گیا ہو۔ البتہ بیل بجانے پر اس کا باپ باہر آیا تو وہ بہت فکر مند لگ رہا تھا۔

''میں نے آپ کو کال کی تھی۔'' تیمور نے اپنا تعارف کرایا۔ ''مجھے بابر کا موبائل ملا تھا۔''

بابر کے باپ نے اسے غور سے دیکھا۔ ''برخوردار! کیا تم بابر کو جانتے ہو؟''

''جی، اصل میں مجھے مکان دیکھ کر یاد آیا۔ بابر میرے ساتھ ہی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ ایک سال پہلے اس نے اچانک ہی آنا چھوڑ دیا تھا۔''

''ہاں ایک مسئلہ ہو گیا تھا مگر اس کا ابھی تک پتا نہیں چلا ہے۔ ہم نے گمشدگی کی رپورٹ بھی کروا دی ہے۔''

''اوہ مجھے افسوس ہوا۔ میں ایک بار بابر کے ساتھ یہاں تک آیا تھا اس لیے مجھے یاد رہ گیا ورنہ جب میں نے آپ سے بات کی تھی تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ وہی بابر ہے۔''

تیمور کا مقصد بابر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس کا باپ اسے اندر لے جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے انہیں اندر آنے کو کہا تو تیمور مان گیا۔ شامی منہ بنائے ہوئے خاموش تھا۔ بابر کے باپ نے ان کے لیے نشست گاہ کھلوائی اور چائے کا پوچھا مگر تیمور نے انکار کر دیا۔ ''شکریہ انکل! آپ زحمت نہ کریں۔''

''اس میں زحمت کی کیا بات ہے؟'' اس نے کہا اور اندر چائے کا کہنے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی شامی نے تیمور سے کہا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''تم دیکھتے جاؤ۔''

''ہاں دیکھتے ہی دیکھتے کسی چکر میں پڑ گئے تو۔''

''یار! تم اپنی ننھی سی عقل اس قسم کے کاموں میں مت لگاؤ۔'' تیمور نے بے زاری سے جواب دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح ان لوگوں سے کام کی بات معلوم کرے اور شامی اس کا دماغ کھا رہا تھا۔ بابر کا باپ کچھ دیر بعد آیا تھا۔ اس نے یونیورسٹی کے حوالے سے حال احوال معلوم کیا پھر بولا۔

''بیٹے! مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا کہ آپ کب بابر کے ساتھ آئے تھے؟'' اس کے لہجے میں کسی قدر شک تھا۔

''انکل! اصل میں میں اس کے ساتھ آیا نہیں تھا بلکہ میں نے اسے گھر تک ڈراپ کیا تھا اور ہم کوئی بہت قریبی دوست نہیں تھے بس یونیورسٹی فیلو تھے۔ اس لیے جب اس نے یونیورسٹی چھوڑ دی تو ہمارے درمیان رابطہ نہیں رہا تھا۔ یہ تو کل میں ایک جگہ سے گزر رہا تھا کہ مجھے یہ موبائل مل گیا۔'' تیمور نے بابر کا موبائل اس کے باپ کی طرف بڑھا دیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس لڑکے کو گزشتہ ایک سال سے کیا ہوا ہے۔'' بابر کے باپ نے پریشانی سے کہا۔

''کیا وہ پہلے بھی اس طرح گھر سے غائب ہوا ہے؟''

''نہیں، غائب تو نہیں ہوا مگر وہ زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتا تھا اور گھر بھی رات گئے آتا تھا۔ مگر یہ پہلا موقع ہے کہ دو دن سے اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔''

''کیا آپ لوگوں کو کچھ اندازہ ہے کہ وہ کس کے ساتھ گیا تھا؟'' تیمور نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''یہی تو مسئلہ ہے ورنہ اب تک اس کا پتا نہیں چل گیا ہوتا۔ میری چھوٹی بیٹی کا کہنا ہے کہ پرسوں رات کو کوئی گیارہ بجے کے قریب کسی نے بابر کو باہر سے آواز دی اور وہ باہر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ اندر نہیں آیا۔''

''آپ کی صاحب زادی نے اس شخص کو دیکھا نہیں تھا جس نے بابر کو آواز دی تھی؟''

''نہیں میری بچی پردہ کرتی ہے اور اس وجہ سے اس نے باہر نہیں دیکھا مگر اس کا کہنا ہے کہ آواز سے بولنے والا کوئی لڑکا لگ رہا تھا۔ اس سے زیادہ ہمیں اس کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔''

''آپ نے کہا کہ پچھلے ایک سال میں بابر کو کچھ ہو گیا تھا۔ کیا آپ اس کی وضاحت کر سکتے ہیں؟''

''ہاں بیٹا کیوں نہیں۔'' بڑے میاں نے سرد آہ بھری۔ ''اس نے تعلیم چھوڑ دی تھی اور سارا دن آوارہ گردی کرتا تھا۔ مجھے کئی بار شبہ ہوا کہ وہ کسی لڑکی کے چکر میں پڑ گیا ہے مگر ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔''

''اس کے علاوہ کوئی اور بات، جیسے بری صحبت یا کوئی غلط کام کرتا ہو؟''

''نہیں نہیں۔'' بڑے میاں نے بے ساختہ کہا۔ ''میرا بیٹا ایسے کسی کام میں شامل نہیں تھا۔ وہ تو سگریٹ تک نہیں پیتا تھا اور نہ ہی میں نے اس کے دوستوں میں کسی برے آدمی کو دیکھا۔ اس کے شروع سے چند گنے چنے دوست چلے آ رہے ہیں مگر ایک سال سے وہ ان سے بھی بہت کم مل رہا تھا۔''

تیمور نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا اس نے گھر کے کسی فرد کے سامنے شادی کی خواہش ظاہر کی؟''

''مجھے اس کے بارے میں نہیں پتا۔'' بابر کے باپ نے کسی قدر بے دلی سے کہا۔ ''ویسے آپ اس معاملے میں اتنا تجسس کیوں کر رہے ہیں؟''

''اگر آپ کو برا لگا تو میں معذرت چاہوں گا اور یہ تو فطری بات ہے کہ میں بابر کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ اول وہ میرا دوست نہ سہی یونیورسٹی فیلو تھا۔ دوسرے اتفاق سے مجھے اس کا موبائل مل گیا اور تیسرے وہ پراسرار طور پر غائب ہے۔''

''آپ نے ٹھیک کہا۔''

''اور میں نے سوچا کہ ممکن ہے کہ میں آپ کی مدد کر سکوں۔ بعض اوقات جو بات ایک آدمی نہیں سمجھ پا رہا ہو، وہ دوسرے کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔''

"ٹھیک کہا آپ نے۔" بابر کے باپ نے پھر دہرایا۔

کچھ دیر میں چائے آگئی تھی۔ انہوں نے اس کے بعد اجازت طلب کی۔ بابر کے باپ نے کہا۔ "مجھے موبائل کے بارے میں پولیس کو بتانا پڑے گا۔ اگر انہوں نے مجھ سے آپ کے بارے میں پوچھا تو؟"

"کیوں نہیں انکل! یہ میرا کارڈ ہے۔ اس پر پتا اور فون نمبر دونوں ہیں۔ آپ بلا جھجک پولیس سے میرا ذکر کر سکتے ہیں۔" تیمور نے اپنا کارڈ دیا۔

"شکریہ۔"

باہر نکل کر شامی نے جلے بھنے انداز میں کہا۔ "اس سے تو بہتر تھا کہ آپ خود تھانے چلے جاتے۔"

"شامی! تو بار بار کیوں بھول جاتا ہے کہ ہم نواب زادے ہیں اور پولیس کی مجال نہیں ہے کہ ہمیں ٹیڑھی نظر سے دیکھ سکے۔" تیمور نے شاہانہ انداز میں کہا۔

"اس ملک کی پولیس کسی کو نہیں بخشتی۔" شامی بولا۔ "اس سے ایسے ڈرنا چاہیے جیسے آدمی پاگل کتے سے ڈرتا ہے۔"

"اچھا یار! بور نہ کر... یہ بتا کہ بابر کے متعلق تیرا کیا خیال ہے اسے کیا ہوا تھا؟"

"وہی جو سب کے ساتھ ہوتا ہے۔" شامی نے سرد آہ بھری۔ "عشق نے کس کو سنگاری ہے۔"

"تو نے ٹھیک کہا لیکن بعض لوگوں کو یہ نزلے زکام کی طرح بار بار ہو جاتا ہے۔" تیمور نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "میرا ابھی تک یہی اندازہ ہے کہ اسے شائلہ کے عشق نے نکما کر دیا تھا... مگر اسے کسی نے قتل کیوں کیا ہے؟"

"ممکن ہے اسے اس بیورو کریٹ کی اولاد نے قتل کر دیا ہو جو شائلہ سے شادی کرنے کے لیے مرا جا رہا ہے۔" شامی نے احمقانہ انداز میں کہا۔

تیمور نے اسے گھورا۔ "آج کل اس قسم کے عشاق نہیں پائے جاتے جو محبوبہ کو پانے کے لیے رقیب کو قتل کر دیتے ہیں۔ اس سے آسان راستے بھی ہیں۔"

"مثلاً؟" شامی نے پوچھا۔

"اس محبوب کو چھوڑ کر دوسرا محبوب تلاش کیا جائے جس پر کوئی اور عاشق نہ ہو۔"

"جیسا کہ تو کرتا ہے۔"

"تیرے کارنامے بھی کم نہیں ہیں اور اگر ڈائری دادا جان کو مل گئی تو یہ کارنامے منظر عام پر بھی آجائیں گے۔" تیمور نے جوابی طنز کیا۔

شامی نئے سرے سے فکر مند ہو گیا۔ "کیا آج بھی میرا مسئلہ حل نہیں ہوگا؟"

"مشکل ہے، تو نے خود دیکھ لیا ہے کہ سارے قفل ساز تھانے گئے ہیں اور جو مارکیٹ میں بیٹھا ہے وہ قفل ساز سے زیادہ قفل شکن لگتا ہے۔"

وہ بابر کے گھر سے نکل کر کار میں بیٹھ گئے تھے۔ تیمور نے کار اسٹارٹ کی تھی کہ اس کی نظر گلی کے کونے پر موجود پان سگریٹ کے کھوکھے پر پڑی۔ اس نے شامی سے کہا۔ "تو ذرا بیٹھ میں ابھی آیا۔"

"جلدی آنا۔" شامی بولا۔

تیمور نے پان والے سے ایک پان لگانے کو کہا اور پھر سرسری سے انداز میں پوچھا۔ "بڑی محنت کا کام ہے۔ رات کتنے بجے تک کھوکھا لگاتے ہو؟"

"گیارہ بارہ تو بج جاتے ہیں صاحب۔" وہ پھرتی سے پان پر کتھا چونا لگاتے ہوئے بولا۔ "آپ پہلی بار دکھائی دے رہے ہیں؟"

"اس کا مطلب ہے تمہاری یادداشت تیز ہے۔" تیمور نے تعریف کی تو وہ پھول گیا۔

"لو جی، صبح سے شام تک ادھر ہزار بندہ دیکھتے ہیں مجال ہے جو کسی ایک کو بھی بھول جائیں۔"

"یہ اچھا ہے، اس گلی والوں کو تم ایک اچھے محافظ مل گئے ہو۔" تیمور نے اسے اور چڑھایا۔

"ایک ایک بندے پر نظر رکھتا ہوں۔" اس نے فخر سے کہا۔

"پرسوں رات کوئی بارہ بجے کے قریب ایک آدمی بابر کے گھر آیا تھا۔" اس نے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

"جی آیا تھا۔" پان والے نے سادگی سے اعتراف کر لیا۔

"تم نے دیکھا تھا؟" تیمور نے اپنا جوش دباتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں دیکھا تھا... میں نے کہا نا ایک ایک بندہ دیکھتا ہوں۔ وہ سفید کار میں آیا تھا۔ اس نے بابر صاحب کے گھر کی بیل بجائی تھی اور کچھ دیر بعد بابر صاحب نکل کر اس کے ساتھ چلے گئے تھے اس کے بعد واپس کب آئے، مجھے نہیں معلوم۔ کچھ دیر بعد میں نے دکان بند کر دی تھی۔"

"آدمی کیسا تھا، میرا مطلب ہے دیکھنے میں کیسا لگتا تھا؟"

"دیکھنے میں کیسا لگتا تھا!" پان والا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "سچی بات ہے میں اس پر توجہ نہیں دے سکا

www.pkdigest.com

کچھ گاہک آ گئے تھے۔ میرا خیال ہے وہ جوان بندہ تھا اور
چینٹ شرٹ پہنی تھی۔ ہاں مگر اتنی رات کو بھی اس نے دھوپ
والا چشمہ لگا رکھا تھا۔"

"یہ تو آج کل فیشن ہے۔" شامی نے پہلی بار کہا۔ وہ
بھی کار سے اتر کر تیمور کے پیچھے آ گیا تھا۔

"صاحب جی! آپ لوگوں کا فیشن ہے۔ یہاں کوئی
ایسا کرے تو اس کا مذاق اڑتا ہے۔" پان والے نے کہا۔ وہ
بہت ہوشیار آدمی تھا، ان کے حلیے اور کار سے بھانپ گیا تھا
کہ وہ اونچی کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ "ویسے بات کیا ہے
جی؟ بابر صاحب ٹھیک تو ہیں... کل سے دکھائی بھی نہیں دیے
ورنہ زیادہ تر گھر سے باہر تھڑے پر بیٹھے رہتے تھے۔"

بابر کے گھر والوں نے شاید محلے میں اس بات کی
اطلاع نہیں کی تھی یا صرف چند لوگوں کو پتا تھا۔ اور ویسے بھی وہ
بے پروا لڑکا تھا اس لیے اس کی بھی کسی کو پروا نہیں تھی۔ تیمور
نے بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے پان لے کر ادائیگی کی اور
کار کی طرف آیا۔ شامی اس سے پہلے ہی واپس جا چکا تھا۔ وہ
کچھ بے تاب ہو رہا تھا پہلے کار سے اتر کر اس کے پاس آ گیا
اور پھر خود ہی واپس بھی چلا گیا تھا۔ تیمور نے پان ڈیش بورڈ پر
رکھے اور بیٹھنے لگا تھا کہ اسے ایک خیال آیا۔

"ایک منٹ... میں آیا۔" اس نے شامی سے کہا۔

"پہلے بھی تم ایک منٹ کا بول کر گئے تھے۔"

"اس بار صرف ایک بات پوچھنی ہے۔" تیمور نے
اسے تسلی دی اور پان والے کے پاس آیا۔ "یار! تم نے اس کار
کا نمبر دیکھا تھا؟"

"جی صاحب دیکھا تھا۔" اس نے بے پروائی سے
جواب دیا اور پان پر کتھا چونا لگاتا رہا۔

"تم بتا سکتے ہو؟" تیمور نے کہا تو وہ جواب دینے کے
بجائے خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔ تیمور نے گہری سانس
لے کر ایک سو کا نوٹ اس کے سامنے رکھ دیا اور جب اس نے
کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تو دوسرا نوٹ بھی رکھ دیا۔ "اس سے
زیادہ کی توقع مت رکھو۔"

اس بار پان والے نے دونوں نوٹ اٹھا کر اپنے بکس
میں ڈال دیے اور ایک کاغذ کی چٹ پر کچھ لکھ کر اس کی طرف
بڑھا دیا۔ تیمور نے دیکھا، کاغذ پر ایک نمبر لکھا تھا۔ اس نے
پان والے سے کہا۔ "اگر یہ ٹھیک نہیں ہوا تو میں پھر آؤں گا۔"

"مرضی آپ کی دس بار آؤ۔" اس نے رکھائی سے
جواب دیا اور تیمور دل ہی دل میں اس کی ہوشیاری کی داد دیتا
لوٹ آیا۔

"اب کیا کارنامہ انجام دیا جناب نے؟" شامی نے پوچھا۔

"بابر سے ملنے جو آدمی آیا تھا اس کی کار کا نمبر پان
والے نے نوٹ کر لیا تھا۔"

"یہ اسی طرح نوٹ کر کے نوٹ کماتا ہوگا۔" شامی
ہنسا۔ "میں پہلے ہی اس کی ہوشیاری بھانپ گیا تھا۔ ساری
اسٹوری سنا دی اور اصل بات گول کر گیا۔ مجھے سو فی صد
یقین ہے اس نے بابر کو لے جانے والے آدمی کا حلیہ بھی
دیکھا ہوگا۔"

"میں اس سے پوچھتا ہوں۔" تیمور کار سے اترنے لگا۔

"آرام سے بیٹھ۔" شامی نے اسے واپس کھینچ لیا۔
"پہلے اس نمبر کی تصدیق تو کر لے تیرے پاس لٹانے کے
لیے کیا بہت نوٹ آ گئے ہیں؟"

"کہاں یار! اس مہینے کا وظیفہ خاتمے کے قریب ہے۔
لگتا ہے فولاد خان سے رجوع کرنا پڑے گا۔" تیمور نے سرد آہ
بھری۔ "نہ جانے دادا جان ہمیں اتنا کم کیوں دیتے ہیں۔"

"بیٹے وہ ہماری تربیت کر رہے ہیں۔ جب یہ مال و
دولت ہمارے پاس آئے گا تو ہماری احتیاط سے خرچ کرنے
کی عادت پکی ہو چکی ہوگی اور بے پناہ دولت پا کر بھی ہم بے
دریغ نہیں لٹائیں گے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے کچھ نہ
کچھ چھوڑ کر جائیں گے۔"

"پہلے نوابوں والا کام نہیں کریں گے یعنی جو ملا اپنی
زندگی میں خرچ کر دو غلطی سے بھی وارثوں کے لیے کچھ نہ
چھوڑنا۔" تیمور نے اس کی تائید کی۔ "مگر دادا جان کی اس
پالیسی کی وجہ سے مہینے کا آخر بڑی مشکل سے گزرتا ہے۔"

"جھوٹ نہ بول، وہ جو انگلینڈ سے آتا ہے۔" شامی
نے ملامت کی۔

"وہ میں کسی برے وقت کے لیے سنبھال کر رکھتا
ہوں۔" تیمور نے کار ایک عمارت کے سامنے روکی۔ یہ
سرکاری عمارت تھی اور یہاں تیمور کا ایک دوست اعلیٰ افسر
تھا۔ اس کا تعلق ایک جدی پشتی جاگیردار گھرانے سے تھا اس
لیے وہ یونیورسٹی سے نکلتے ہی اس پوسٹ پر آ بیٹھا تھا۔ وہ اپنی
نوجوان سیکریٹری کو نزدیک سے کچھ ڈکٹیٹ کروا رہا تھا۔ تیمور
بے تکلفی سے بنا پوچھے اندر داخل ہوا تو اس کا منہ بگڑ گیا مگر
تیمور کو دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا۔

"نواب زادے! تم کہاں غائب تھے؟" وہ اٹھ کر
تیمور سے لپٹ گیا۔

"بیٹے! یہ مزے ہو رہے ہیں سرکاری خرچ پر۔" پیچھے
سے شامی نے کہا۔ "ادھر بھی توجہ دے۔"

وہ شامی سے بھی لپٹ گیا۔ "تو پکا حرامزادہ ہے۔
سوفی! یہ میرے بچپن کے فرینڈ ہیں ان کے لیے کچھ لے آؤ۔"
سوفی اپنے باس کی اس بے تکلفی پر دنگ تھی مگر وہ
خاموشی سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد تیمور نے
کہا۔ "بدمعاش تو نے سیکریٹری تو چن کر رکھی ہے۔"

"بس یار! اوپر والے کی دین ہے۔" محمود نے
انکساری سے کہا۔ "گپ شپ بعد میں ہوگی، پہلے یہ بتا کس
کام سے آیا ہے۔"

"تجھے کیسے پتا چلا؟"

"تیرا یار ہوں، تجھے نہیں جانوں گا تو کیا کسی اور کو
جانوں گا۔"

"یہ ایک کار کا نمبر ہے اس کے مالک کا نام اور پتا
معلوم کرنا ہے۔" تیمور نے اسے چٹ دی۔

"معاملہ کیا ہے؟" محمود نے فون اپنی طرف سرکایا اور
کسی کا نمبر ملایا۔ "باسط... میں بات کر رہا ہوں، ایک کار کا
نمبر نوٹ کرو۔ اس کے مالک کا نام اور پتا دس منٹ میں میری
میز پر ہونا چاہیے۔" محمود نے خالص افسرانہ انداز میں کہا۔
فون رکھ کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔ "ہاں، اب بتاؤ۔"

"یار! ایک یونیورسٹی فیلو تھا بابر۔ وہ پرسوں رات سے
گھر سے غائب ہے یا اسے کوئی آدمی بلا کر لے گیا تھا۔ وہ
آدمی اسی نمبر کی کار میں آیا تھا۔"

"تو نے یہ جاسوسی کا دھندا کب سے شروع کر دیا ہے؟"

"مہ رخوں کے لیے سیکھے ہیں مصوری۔" شامی نے
گنگنا کر کہا۔

"بکواس نہ کر۔" تیمور نے اسے گھورا۔

"یہ مہ رخ کہاں سے آ گئی درمیان میں... اور وہ تیری
یونیورسٹی کوئین کا کیا حال ہے؟"

"اسی کا تو چکر ہے۔" شامی نے پھر مداخلت کی۔
تیمور کا ارادہ تو نہیں تھا مگر شامی کی بکواس کے بعد اسے
بتانا پڑا۔ البتہ وہ شمائلہ کے کاٹیج میں لاش کا تذکرہ گول کر گیا
تھا۔ اس نے یہی کہا کہ اسے یہ ٹاسک شمائلہ نے دیا ہے کہ وہ
بابر کو تلاش کرے۔ محمود نے اس کی بات پر غور کیا۔ "تیمور! تو
میرے ساتھ چکر کر رہا ہے، کوئی بات چھپا رہا ہے۔"

"نہیں یار! اتنی سی بات ہے۔" تیمور نے اسے یقین
دلایا۔ اس دوران میں سیکریٹری نے ریفریشمنٹ کا سامان
لانا شروع کر دیا اس لیے بات آئی گئی ہوگئی۔ اس کے کچھ دیر
بعد ایک ماتحت آ کر محمود کو ایک بند لفافہ دے گیا۔ اس نے
لفافہ کھولا اور پھر اسے تیمور کی طرف بڑھا دیا۔

"تیرا کام ہو گیا ہے۔"

"وہ تو پہلے ہی ہو گیا تھا۔" شامی نے لقمہ دیا۔

تیمور نے خون کے گھونٹ پی کر لفافہ لیا اور کار کے
مالک کا نام اور پتا دیکھا۔ یہ کوئی راجا اسلم حیات تھا اور پتا
راولپنڈی کینٹ کا تھا۔ وہ کھانی چکے تھے اس لیے محمود سے
اجازت لی جو اس نے بڑی مشکل سے دی۔ باہر نکل کر شامی
نے سرد آہ بھری اور بولا۔ "کاش! میں کوئی حسینہ ہوتا تو تو
میرے لیے بھی بھاگ دوڑ کر رہا ہوتا۔"

"تیری زبان میں بہت خارش ہو رہی تھی۔" تیمور نے
خفگی سے کہا۔ "کیا تو چپ کر کے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔"

"بیٹھ سکتا ہوں بشرطیکہ تو میرے بارے میں بھی سوچ۔"

"سوچ رہا ہوں۔" تیمور نے اسے یقین دلایا۔ "مگر
اب تو دخل در نامعقولات سے گریز کرے گا۔"

تیمور نے کینٹ کا رخ کیا۔ اسے پتا ڈھونڈنے میں
خاص دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہ سارا علاقہ اس کا دیکھا ہوا
تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا اور اس کے باہر اسی نمبر کی سفید
کار کھڑی تھی جو تیمور کے پاس تھا۔ راجا اسلم حیات گھر پر نہیں
تھا۔ اس کی جواں سال بیوی نے گیٹ سے جھانکتے ہوئے
کہا۔ "وہ تو جی کسی کام سے جہلم گئے ہوئے ہیں۔"

"اچھا... کب سے گئے ہیں؟" تیمور نے پوچھا۔

"پرسوں شام سے۔" عورت نے جواب دیا۔

"لیکن کل... رات تو میں نے ان کی گاڑی دیکھی
تھی۔ میرے پاس سے نکلی تھی، میں نے نمبر دیکھ لیا تھا۔"

"جی گاڑی نکلی تھی لیکن اسے راجا صاحب نہیں چلا
رہے تھے ان کا ایک جاننے والا لے گیا تھا۔"

"آپ اس کے بارے میں بتا سکتی ہیں؟"

عورت تازہ تازہ کسی دیہات سے وارد ہوئی تھی اور
اس میں اکھڑ پن تھا۔ تیمور کے اس سوال پر وہ گیٹ سے نکل
آئی اور تن کر پوچھا۔ "نہ جی آپ کون ہو اور اتنے سوالات کا
مقصد؟"

تیمور بوکھلا کر ذرا پیچھے ہو گیا۔ اس نے شامی کی طرف
دیکھا۔ "یار، اس سے تو بات کر۔"

شامی نے آگے آ کر کہا۔ "بی بی! زیادہ غصہ کرنے کی
ضرورت نہیں ہے۔ یہ پولیس کیس ہے، اس کار نے پرسوں
رات ایک بچے کو کچل دیا تھا۔ لوگوں نے اس کا نمبر نوٹ کر لیا
تھا اور اب اس کی تلاش کی جا رہی ہے۔"

"ہائے بی بی میں مر گئی۔" عورت نے اپنے سینے پر ہاتھ
رکھا۔ "اس حرامزادے نے یہ کام کیا ہے۔"

www.pkdigest.com

"راجا بچے کو مار کر بھاگ گیا ہے؟" شامی نے پوچھا۔

"او وہ نہ جی میں اپنے مزاجی خاوند کو گالی دوں گی؟" عورت نے سخت برا منا کر کہا۔ "میں تو اس کتے کی بات کر رہی ہوں۔"

"اس کا کوئی نام تو ہوگا۔" شامی نے پوچھا، اس کا تیر نشانے پر لگا تھا۔

"نام تو مجھے نہیں معلوم۔ مجھے اس کی صورت سے نفرت ہے، جب آتا ہے مجھے نظروں سے کھانے کی کوشش کرتا ہے۔"

وہ جیسی تھی اور جس حلیے میں تھی، اس میں کوئی بھی اوباش اسے نظروں میں کھانے کی کوشش ہی کر سکتا تھا۔ "راجا کا دوست ہے۔"

"نہ جی مجھے تو ماں کا یار لگتا ہے۔" راجا کی بیوی کی زبان کھلتی جارہی تھی۔ "راجا اس کے سامنے بچھا جاتا ہے۔ منحوس رات کو بھی کالا چشمہ لگا کر رکھتا ہے۔"

تیمور چونکا۔ پان والے نے بابر کو لے جانے والے آدمی کے بارے میں یہی بات کی تھی کہ اس نے کالا چشمہ پہن رکھا تھا۔ شامی نے اگلا سوال کیا۔ "کیا راجا اس کے ساتھ گیا ہے؟"

"نہیں جی، وہ شام کو جارہا تھا۔ ادھر جہلم میں اس کے ماں پیو رہتے ہیں، ان سے ملنے جارہا تھا کہ وہ آگیا اور راجا سے کار مانگنے لگا۔"

"راجا نے اسے کار دے دی؟"

"ہاں جی، اتنا احمق آدمی ہے اسے کار دے دی اور خود بس میں دھکے کھاتا چلا گیا۔"

"کار وہ آدمی خود واپس کرنے آیا تھا؟"

"ہاں جی، رات دو بجے آیا تھا۔ اندر گھستا چاہ رہا تھا۔ میں نے بھی دروازہ نہیں کھولا۔ اس سے کہا اوپر سے چابی پھینک دے۔"

عورت نے اگرچہ کچھ کام کی باتیں بتائیں مگر اس نے زیادہ تر بکواس ہی کی تھی۔ اسے کالے چشمے والا پسند نہیں تھا مگر اس کی شناخت کے علاوہ اسے اس کے بارے میں سب پتا تھا۔ شامی نے واپسی میں کہا۔ "کس قدر واہیات عورت ہے۔"

"واہیات نہیں ضرورت سے زیادہ سادہ ہے۔" تیمور نے کہا۔

"اب کہاں جانا ہے؟" شامی نے پوچھا۔

"گھر۔" تیمور نے کہا۔ "اب مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"اور میرے مسئلے کا کیا ہوگا؟"

"تو نے سن لیا ہے، سارے قفل ساز آج چھٹی منا رہے ہیں۔" تیمور نے اسے پھر یاد دلایا۔

شامی کو اپنی ڈائری کی فکر کھائے جارہی تھی۔ اس نے تیمور سے کہا۔ "اگر مجھے ایک بار ڈائری مل گئی تو میں اسے جلا دوں گا۔"

"تجھے پہلے سے ڈائری لکھنی ہی نہیں چاہیے تھی۔"

"بس یار غلطی ہوگئی۔" شامی نے ٹھنڈی سانس لی۔

گھر آکر انہوں نے کھانا کھا کر اپنے کمروں کا رخ کیا۔ تیمور نے شائلہ سے رابطہ کیا تو وہ پریشان تھی۔ "تیمور! پاپا کو پتا لگ گیا ہے۔"

"کیا پتا لگ گیا ہے؟"

"بابر کے بارے میں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "اس خبیث نے پاپا کو بھی وہ تصویریں بھیج دی ہیں۔"

"جو تمہارے موبائل پر بھی بھیجی تھیں؟"

"ہاں وہی، میں نے تو اپنے موبائل سے اڑا دی ہیں۔"

"شائلہ! مجھے لگ رہا ہے یہ کوئی بہت بڑا چکر ہے۔" تیمور نے کہا۔ "تم آج شام مجھ سے ملو۔"

"کہاں؟"

"اسی ریستوران میں آجاؤ۔" تیمور نے تجویز دی۔

"میں آجاؤں گی۔"

"میں پانچ بجے انتظار کروں گا۔"

دوسری طرف شامی ہمت کر رہا تھا کہ نواب صاحب سے لائبریری کی چابی مانگے۔ اس نے نواب صاحب کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ دوپہر کے کھانے کے بعد لازمی قیلولہ کرتے تھے۔ انہوں نے شامی کو دیکھا اور بولے۔ "کیا بات ہے برخوردار! کچھ پریشان سے لگ رہے ہو؟"

"نہیں دادا حضور، پریشان تو نہیں ہوں لیکن بور ہو رہا ہوں اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کی لائبریری سے کوئی کتاب لے لوں۔"

"آج کل تمہیں کتابوں سے اچانک ہی دلچسپی پیدا نہیں ہوگئی ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولے۔ "خیر تو ہے برخوردار؟"

"جی بس کم بختی ہے میری۔" شامی بے خیالی میں بول گیا۔

"کیا مطلب؟" نواب صاحب گرجے تو شامی گڑبڑا گیا۔

"نہیں میرا مطلب ہے کہ میری خوش قسمتی ہے۔"

"اچھا لگتا ہے تم رات کو دیر سے سوئے تھے اور اب بھی نیند میں ہو۔" نواب صاحب ذرا ٹھنڈے ہوگئے۔

"جی دادا جان! تو کیا آپ مجھے اپنی لائبریری کی چابی عنایت کر سکتے ہیں؟"

"نہیں۔" نواب صاحب نے انکار کر دیا۔

"مگر کیوں دادا جان؟" شامی نے احتجاج کیا۔ "میں نے پچھلی بار آپ سے جو کتابیں لی تھیں، ان کو ویسے ہی واپس کر دیا۔ میرا مطلب ہے بہت احتیاط سے پڑھا تھا۔"

"ہمیں معلوم ہے مگر ہم چابی نہیں دے سکتے۔"

"کیوں دادا جان؟" شامی مایوسی سے بولا۔ "کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں ہے۔" نواب صاحب کرسی پر جھولتے ہوئے بولے۔

"پھر چابی کیوں نہیں دے رہے ہیں؟"

"کیونکہ چابی ہمارے پاس ہے ہی نہیں۔ ہمیں تو چیزیں رکھ کر بھول جانے کی عادت ہوگئی ہے اس لیے اس قسم کی ساری چیزیں نظام دین دیکھتا ہے اور وہ اس وقت چمن پور گیا ہے۔ چابی اسی کے پاس ہے۔"

"سچ۔" شامی نے خوش ہو کر کہا۔

"تو کیا ہم آپ سے غلط بیانی کر رہے ہیں؟" نواب صاحب خفگی سے بولے۔ "آپ کی ہمت کیسے ہوئی ہماری بات پر شک کرنے کی؟"

شامی نے بڑی مشکل سے معافی مانگ کر جان چھڑائی۔ اس کے لیے یہ بہت خوشی کی خبر تھی کہ نظام دین لائبریری کی چابی سمیت چمن پور گیا ہے مگر دادا جان نے فوراً اس کی خوشی رفع بھی کر دی۔ "وہ کل صبح تک آجائے گا اور ہم سب سے پہلے اس سے کہہ کر تمہیں مطلوبہ کتب نکلوا دیں گے۔"

یہ سن کر شامی کی جان پر بن گئی تھی۔ یعنی اس کے پاس کل صبح تک کا وقت تھا اور اس کے بعد ڈائری نواب صاحب کے ہاتھ آجاتی۔ اسے معلوم تھا کہ نظام دین کسی صورت اسے لائبریری کی چابی نہیں دے گا۔

"بیٹا شامیر جو کرنا ہے صبح سے پہلے کر... اس کے بعد موقع نہیں ملے گا۔" اس نے خود سے کہا۔

لائبریری دوسری منزل پر عمارت کے شمالی حصے میں تھی۔ اس کے ساتھ نواب صاحب کی اسٹڈی تھی اور اس کے برابر میں ان کا بیڈ روم تھا۔ دو سال پہلے وہ نچلی منزل پر ہی ہوتے تھے۔ مگر پھر نہ جانے کیوں وہ اوپر والی منزل پر منتقل ہو گئے تھے۔ شامی نے پہلے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ اگر لائبریری میں داخل ہونے کے لیے دروازے کے علاوہ کوئی راستہ اختیار کیا جائے تو وہ کہاں سے ممکن تھا۔ اس نے اب اسی نظر سے لائبریری کے محلِ وقوع کا جائزہ لیا اور اسے ایک راستہ نظر آگیا۔ یہ کچھ اس طرح سے تھا کہ وہ لائبریری سے کوئی سوفٹ کی دوری پر واقع بالکونی سے اوپری منزل کی پتلی سی کارنس پر اترتا اور پھر اس پر سوفٹ تک چلتا ہوا لائبریری کی کھڑکی تک جا پہنچتا اور اسی راستے سے اپنا کام کر کے واپس آجاتا۔ مگر کارنس صرف چھ انچ چوڑی تھی اور اس پر سوفٹ آنا اور جانا کسی سرکس بوائے کے لیے تو آسان ہو سکتا تھا، شامی کے لیے یہ کسی پل صراط سے کم نہیں تھا۔ مگر اسے اپنی ڈائری واپس حاصل کرنا تھی۔ اس لیے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے یہ مشن امپاسبل مکمل کرنا ہی ہوگا۔

☆☆☆

تیمور بے چینی سے شائلہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے پانچ بجے کا کہا تھا مگر شائلہ کی صورت اسے چھ بجے دکھائی دی تھی۔ اس وقت تک وہ کسی قدر جھنجلا گیا تھا۔ "اتنی دیر سے آئی ہو تم؟"

"ہاں، پاپا آج بہت خوف ناک ہو رہے ہیں۔" وہ دھڑام سے کرسی پر گر گئی۔ "سچ کہوں تو میں نے ان کا یہ روپ پہلی بار دیکھا ہے۔ ورنہ میں تو سمجھتی تھی کہ پاپا میری مٹھی میں ہیں، میں جیسا چاہوں گی وہ ویسا ہی کریں گے۔"

"امید ہے تمہاری یہ خوش فہمی دور ہوگئی ہوگی۔"

"جی نہیں، اس معاملے سے ہٹ کر میں نے کبھی پاپا سے کچھ کہا تو انہوں نے کبھی میری بات رد نہیں کی۔" شائلہ نے غرور سے کہا۔ "بس آج پاپا بہت غصے میں تھے اور مجھے ڈر ہے وہ اس منحوس کا رشتہ قبول ہی نہ کر لیں۔"

"ممکن ہے وہ تمہیں ڈرا رہے ہوں تاکہ تم رشتہ قبول کرنے میں ہچکچاؤ نہیں۔"

"شاید ایسا ہی ہو کیونکہ وہ پاپا کو بہت پسند آیا ہے۔ حال ہی میں امریکا سے پڑھ کر آیا ہے اور یہاں کوئی بزنس کر رہا ہے۔"

"کیسا بزنس؟"

"میں نے معلوم نہیں کیا، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"یہ تمہاری غلطی ہے۔ آدمی جس سے نفرت کرتا ہے اس کے بارے میں مکمل معلومات رکھنی چاہیے کیونکہ کبھی موقع پڑے تو آدمی بے خبری میں مار نہیں کھاتا۔"

"چلو اب معلوم کرنے کی کوشش کروں گی۔ یہ بتاؤ کہ تم نے کیا کیا؟"

www.pkdigest.com

تیمور نے اسے رپورٹ پیش کی۔ ”میں بابر کے گھر والوں سے ملا تھا۔ ان سے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ اسے رات کے بارہ بجے کوئی گھر سے بلا کر لے گیا تھا اور اس کے بعد وہ واپس نہیں آیا۔ اس کے باپ نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ کروادی ہے۔“

”اوہ۔“ شائلہ نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ اس کی لاش نہیں ملی۔“

”لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے، وہ شخص لاش کو فی الحال سامنے لانے سے گریز کر رہا ہے۔“

”اور کچھ معلوم ہوا ہے؟“

”ہاں، میں نے اس شخص کا پتا چلا لیا ہے جس کی کار میں بابر کو لے جایا گیا تھا مگر لے جانے والا کار کا مالک نہیں تھا، وہ ان دنوں جہلم گیا ہوا ہے۔ لے جانے والا اس کا ایک دوست تھا جس کے بارے میں کار کے مالک کی بیوی بھی نہیں جانتی۔“

شائلہ متاثر نظر آنے لگی۔ ”تم نے تو واقعی شرلاک ہومز کی طرح کام کیا ہے۔ لیکن اس شخص کا پتا چلانے کا کیا فائدہ جو بابر کو لے گیا تھا؟“

تیمور نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تم اتنی سی بات نہیں سمجھ پا رہی ہو۔ جو شخص بابر کو لے گیا تھا وہی تو اس سارے کھیل کے پیچھے ہے۔ وہ سامنے آجائے گا تو سارا معاملہ ہی حل ہو جائے گا۔“

شائلہ نے سر ہلایا۔ ”میں نے آج کاٹیج کے سارے تالے بدلوا دیے ہیں اور سب پر ڈبل لاک کر دیے ہیں۔“

”یہ تم نے اچھا کیا۔ اب وہ کم سے کم تمہارا کاٹیج استعمال نہیں کر سکتا۔“

”تم دیکھو گے؟“ شائلہ کے انداز میں دعوت تھی۔

”اس وقت؟“ تیمور نے بوکھلا کر کہا۔

”کیوں کیا میں تمہیں کھا جاؤں گی؟“

”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ خیر چلو۔“ تیمور کھڑا ہو گیا۔ وہ باہر آئے۔ شائلہ اپنی کار میں آئی تھی۔ تیمور نے اس سے کہا۔ ”میری کار میں چلو، میں واپسی میں تمہیں یہاں چھوڑ دوں گا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ شائلہ راضی ہو گئی۔

وہ کار میں بیٹھے اور جیسے ہی تیمور نے انجن اسٹارٹ کیا، کوئی سرد سی شے اس کی گردن سے آ لگی۔ ”یہ پستول ہے اور اب جیسا میں کہوں ویسا کرتے جاؤ۔“ ایک مردانہ آواز نے اسے حکم دیا۔ تیمور نے بوکھلا کر شائلہ کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

شامی نے تیمور کو تلاش کیا مگر وہ غائب تھا اور گیراج سے بی ایم ڈبلیو بھی غائب تھی۔ شامی نے اندازہ لگایا کہ وہ بابر کے چکر میں نکلا ہوگا۔ یعنی اسے اب جو کرنا تھا، خود ہی کرنا تھا۔ آٹھ بجے رات کے کھانے کے بعد نواب صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ ان کی طبیعت ناساز تھی اور انہوں نے سب کو کہہ دیا تھا کہ انہیں پریشان نہ کیا جائے۔ یہ سن کر شامی خوش ہوا۔ اگرچہ بات تو افسوس ناک تھی کہ وہ دادا کی ناسازیٔ طبیعت پر خوش تھا مگر اس طرح اس کا کام ہونے کی امید بندھی تھی۔ نواب صاحب کے اپنی خواب گاہ میں جاتے ہی شامی نے تمام نوکروں کی بھی چھٹی کر دی تھی اور ان کو حکم دیا کہ وہ اپنے کوارٹروں میں جائیں۔ ان کے جانے کے بعد شامی نے تمام دروازے خود اندر سے بند کیے اور تیمور کو کال کی مگر اس کے موبائل پر بیل جا رہی تھی اور وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ شامی نے دانت پیسے۔

”شائلہ کے ساتھ ہوں گے موصوف۔“

اصل میں اسے خطرہ تھا کہ اس کارروائی کے دوران تیمور نہ آجائے اور وہ جب دروازہ کھلوانے کے لیے بیل کرتا تو دادا جان بھی اٹھ سکتے تھے۔ رات دس بجے تک سکون ہو چکا تھا۔ سارے نوکر اپنے اپنے کوارٹرز میں جا چکے تھے اور ان کے بعد کوئی بلاوجہ باہر نہیں آتا تھا کیونکہ کتے کھلے چھوڑ دیے جاتے تھے اور وہ نواب صاحب اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ صرف اپنے رکھوالے سے مانوس تھے۔ نوکر تک ان کی موجودگی میں کوٹھی کی طرف نہیں آ سکتے تھے۔ یہ خاص رکھوالی کے کتے تھے جو خونخواری میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ ایک بار ایک چور برابر والی کوٹھی سے بھاگنے کے دوران شامتِ اعمال سے وقار ولا میں آ گھسا تھا اور کتوں نے اس کے ساتھ وہ کیا تھا کہ شامی کو آج بھی یاد آتا ہے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ جانے وہ مرنے سے کیسے بچ گیا تھا۔

شامی نے پہلے نواب صاحب کے کمرے کی سن گن لی۔ اب یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا کہ دادا جان سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں کیونکہ دونوں صورتوں میں وہ خاموشی کے قائل تھے۔ بادلِ ناخواستہ شامی نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے پہلے بالکونی کی روشنی بجھائی اور پھر کانپتے دل کے ساتھ نچلی سی کارنس پر قدم رکھا۔ زمین یہاں سے کوئی بیس فٹ نیچے تھی اور پورا پختہ فرش تھا جس پر گر کر وہ آرام سے اپنی ہڈی پسلی ایک کروا سکتا تھا۔ کچھ قدم چلنے کے بعد اسے

اندازہ ہوا کہ یہ کام اتنا بھی آسان نہیں تھا جتنا کہ اس نے سمجھ رکھا تھا۔ آسمان پر بادل تھے اور خاصی تیز ہوا چل رہی تھی۔ جب ہوا کا کوئی تیز جھونکا اس سے ٹکراتا تو وہ چند لمحے کے دیوار سے چپک جاتا تھا۔ سب سے خطرناک مرحلہ دادا جان کے بیڈروم کی کھڑکی کے سامنے سے گزرنا تھا۔ اگر وہ جاگ رہے ہوتے تو لازمی طور پر اسے دیکھ سکتے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں دعا کی کہ دادا جان سو چکے ہوں۔ مگر فی الحال اس کی دعا قبول نہیں ہوئی تھی کیونکہ جب اس نے کھڑکی کے کونے سے جھانکا تو اسے دادا جان ایک کتب کے مطالعے میں مصروف نظر آئے تھے اور ان کا رخ بھی کھڑکی کی طرف ہی تھا۔ گویا شامی اگر حرکت کرتا تو وہ متوجہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے شامی انتظار کرنے لگا کہ دادا جان رخ بدلیں یا کہیں جائیں تو وہ کھڑکی کے سامنے سے گزر سکے۔ مگر نواب صاحب نہایت مستقل مزاجی سے مطالعے میں مگن تھے۔

شامی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی معمولی سی بے پروائی اس کے لیے اتنا بڑا مسئلہ بن جائے گی۔ وہ وقفے وقفے سے کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ ایک بار اس نے جھانکا تو نواب صاحب اسی طرف متوجہ تھے۔ انہوں نے شامی کی حرکت محسوس کر لی تھی اس لیے اٹھ کر کھڑکی کی طرف آئے، شامی فوراً پیچھے ہٹا تھا۔ وہ دیوار سے چپک گیا اور سانس بھی روک لی۔ نواب صاحب کھڑکی کے پاس آئے۔ اس پر لگی فولادی گرل کی وجہ سے وہ باہر نہیں جھانک سکتے تھے اس لیے شامی کی بچت ہوئی اور نواب صاحب کچھ دیر بعد واپس چلے گئے۔ شامی نے سکون کا طویل سانس لیا تھا۔ اس نے خاصی دیر کے بعد ہمت کر کے کھڑکی سے اندر جھانکا تو نواب صاحب نہیں تھے۔ شاید وہ واش روم کی طرف گئے تھے۔ شامی نے موقع غنیمت جانا اور تیزی سے کھڑکی کے سامنے سے گزرنے کی کوشش کی مگر وہ ابھی کھڑکی کے درمیان میں ہی تھا کہ دوسری طرف سے اچانک ہی نواب صاحب نیچے سے اوپر ابھرے۔ وہ کہیں گئے نہیں تھے بلکہ کھڑکی کے نیچے ہی تھے۔

☆☆☆

”تم کون ہو؟“ تیمور نے بڑی کوشش کے بعد اپنی آواز نارمل رکھی۔ وہ شائلہ کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس لمحے ڈر گیا ہے۔

”وہی جس کی تم دونوں جستجو کر رہے ہو۔“

”تم ذلیل...“ شائلہ نے تڑپ کر مڑنا چاہا تھا کہ پستول آ کر اس کے سر سے لگ گیا۔

”نہ نہ... تمہارے حسین لبوں پر یہ گالیاں اچھی نہیں لگتیں۔“ اس کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔ ”اس لیے تم چپ رہو اور مجھے دیکھنے کی کوشش مت کرنا کیونکہ اس کے بعد تم کچھ اور نہیں دیکھ سکو گی۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“ تیمور نے پوچھا۔

”فی الحال تو جیسا میں چاہ رہا ہوں ویسا ہی ہو رہا ہے۔ اور ہاں، تم تالے بدل کر سمجھتی ہو کہ مجھے اس مکان میں داخل ہونے سے روک دو گی؟“

”اس مکان میں تمہارا کیا انٹرسٹ ہے؟“

”میرا مکان میں نہیں تم میں انٹرسٹ ہے۔“

اس بار شائلہ نے زیادہ بڑی گالی دی تھی۔ مگر وہ مڑ کر اسے نہیں دیکھ سکی تھی۔ ویسے بھی کار میں اندھیرا تھا۔ ”تمہاری یہ زبان بہت جلد بند ہو جائے گی۔“ اس نے زہریلے لہجے میں کہا اور تیمور کو حکم دیا۔ ”کار چلاؤ۔“

تیمور نے کار آگے بڑھا دی۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک تو عقب میں موجود شخص جوان آدمی تھا اور دوسرے وہ پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی پستول ان کی طرف سے نہیں ہٹایا تھا اور نہ ہی خود کو سامنے آنے دیا تھا۔ تیمور نے کار کاٹیج کی طرف جانے والے راستے پر موڑنا چاہی تو اس نے روک دیا۔

”اس طرف نہیں، ابھی سیدھے چلو۔“

”اس طرف تو ہم شہر سے باہر نکل جائیں گے۔“

”ہم نے شہر سے باہر ہی جانا ہے۔“ اس نے کہا۔

وہ جس راستے پر سفر کر رہے تھے وہ مارگلہ سلسلے میں اوپر کچھ دیہاتی علاقوں کی طرف جاتا تھا۔ یہاں کہیں کہیں زرعی زمین تھی۔ فارمز تھے اور کہیں کہیں سکون کے متلاشی افراد نے گھر بنا رکھے تھے۔ سڑک کے آس پاس کے علاقوں میں بجلی بھی تھی مگر مجموعی طور پر یہ ویران پہاڑ تھے جہاں کہیں کہیں آبادی تھی۔ شہر سے نکل کر وہ مکمل تاریکی میں سفر کرنے لگے تھے۔ تیمور نے خاصی دیر کے بعد کہا۔

”تم یہ سب کس لیے کر رہے ہو؟“

”جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔“ وہ بولا۔ تیمور کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بولتے ہوئے دانت نکوس رہا ہے۔

”کب تک؟“

پستول شائلہ کے سر سے ہٹ کر تیمور کے سر پر آ لگا تھا۔

”بہت جلد۔ اب تم اپنی زبان بند رکھنا۔“ وہ غرایا۔

تیمور چپ ہو گیا مگر کچھ دیر بعد اس کے موبائل نے بولنا شروع کر دیا۔

www.pkdigest.com

”اسے میرے حوالے کر دو۔“ اس نے مطالبہ کیا۔

تیمور نے موبائل نکال کر اسے دے دیا۔ اس نے نمبر دیکھا۔ ”یہ شانی کون ہے؟“

”میرا کزن ہے۔“

”او کے... اور مس شمائلہ تمہارے پاس بھی ایک عدد موبائل ہے، وہ میرے حوالے کر دو۔“

شمائلہ نے موبائل پرس سے نکال کر پیچھے پھینک دیا۔ اس پر اس نے غرا کر کہا۔ ”زیادہ غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ایسا نہ ہو پہلے مجھے تمہارا غصہ نکالنا پڑے۔“

”شاید تمہاری فیملی میں عورتوں سے بات کرنا نہیں سکھایا جاتا۔“ تیمور نے غصے سے کہا۔

”میری فیملی میں اور بھی بہت کچھ نہیں سکھایا جاتا اس کا تمہیں بہت جلد اندازہ ہو جائے گا۔“ اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”اس کے منہ مت لگو۔“ شمائلہ نے کہا۔

”ہاں، میں مردوں کے منہ لگتا بھی نہیں ہوں۔“ وہ ہنسا۔ ”آخر لڑکیاں بھی تو ہیں منہ لگانے کے لیے۔“

”کیا تم خود بھی چپ نہیں رہ سکتے؟“ تیمور نے بھنا کر کہا۔ ”ایسا نہ ہو میں کار کسی گڑھے میں اتار دوں۔“

”او کے! ابھی سیز فائر۔“ اس نے عقب سے کہا۔ ”اس راستے پر گاڑی موڑ لو جو سامنے آرہا ہے۔“

”یہ تو اوپر کہیں جاتا ہے۔“

”میں بھی تمہیں اوپر کہیں لے جا رہا ہوں۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔“

مجبوراً تیمور نے کار اوپر جانے والے اس کچے راستے کی طرف موڑ لی۔ شمائلہ جو دیر سے چپ تھی، اس نے کہا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے میرے پاپا کون ہیں؟“

”میرا خیال ہے کوئی مرد ہی ہوں گے، تبھی تو تمہارے پاپا بنے۔“ اس نے بے ہودہ انداز میں کہا تو شمائلہ ابل پڑی۔ اس نے بے نقط سنانی شروع کر دیں، تیمور نے اسے بڑی مشکل سے چپ کرایا تھا۔

”اس کے منہ مت لگو سمجھو کتا بھونک رہا ہے۔“

”میں صرف بھونکتا نہیں ہوں کاٹتا بھی ہوں۔“ وہ برا مانے بغیر ہنسا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ان لوگوں کے غصے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسی اثنا میں راستہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور تیمور نے کار روک دی۔

”اب کہاں جانا ہے؟“

”دائیں طرف والے راستے پر۔“ اس نے کہا۔

”کوئی سو گز کے بعد کار روک لینا۔“

تیمور نے ایسا ہی کیا۔ یہ ویران جگہ تھی اور دور دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے حکم دیا۔ ”دونوں کار سے نکل آؤ اور اپنے ہاتھ اوپر کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“

تیمور اور شمائلہ باہر آئے۔ ”میں کسی صورت ہاتھ نہیں اٹھاؤں گی۔“

”ہاں، اس صورت میں، میں تمہیں دیکھتا ہی رہ جاؤں گا۔“ اس نے پھر بے ہودگی سے کہا۔

وہ کار سے اترا تو اس نے چہرے پر ایسا ماسک لگا رکھا تھا جیسا ماسک امریکی ریسلنگ میں بعض ریسلرز لگا کر آتے ہیں۔ وہ جسم سے جوان اور مضبوط آدمی لگ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے شناخت کا خطرہ تھا اس لیے اس نے یہ زحمت کی تھی۔ اس سے تیمور کو یہ اطمینان بھی ہوا تھا کہ وہ ان کو مارنے کا ارادہ نہیں رکھتا اس لیے اس نے نقاب کی زحمت کی تھی۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”اس طرف آگے چلو اور کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ اپنی موت کے خود ذمے دار ہو گے۔“

وہ اس کے حکم کی تعمیل پر مجبور تھے۔ وہ اس طرف بڑھے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک کچے مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ ”اندر چلو دروازہ کھلا ہے۔“ اس نے کہا۔

”اگر اندر کوئی اور ہوا تو؟“ تیمور نے احمقانہ سوال کیا۔ وہ اندر جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ایک بار وہ اندر چلا گیا تو پھنس جائے گا اور پھر شاید باہر نکلنے کا راستہ نہ ملے۔ مگر وہ ابھی بول رہا تھا کہ اسے عقب سے لات لگی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے ٹکرا کر اندر چلا گیا۔ اس کے پیچھے نقاب پوش نے شمائلہ کو بھی دھکیل دیا۔ اس نے چیخ ماری اور اسے برا بھلا کہنے لگی۔

اندر سے مکان دو کمروں پر مشتمل تھا۔ نقاب پوش نے اندر آ کر ان کو دوسرے کمرے میں جانے کا حکم دیا۔ یہاں بجلی تھی اور کمروں میں بلب روشن تھے۔ اس بار انہیں حکم کی تعمیل کرنا ہی پڑی۔ جیسے ہی وہ اس کمرے میں داخل ہوئے، نقاب پوش نے عقب سے دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ اس کمرے میں قید تھے۔ دوسرے کمرے کی طرف ایک کھڑکی کھل رہی تھی اور اس میں فولادی سلاخیں لگی تھیں۔ تیمور نے کھڑکی سے جھانکا۔

”تم نے ہمیں کیوں بند کیا ہے؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ اس نے کہا اور باہر چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بیئر کا ٹن تھا۔ اس نے کمرے میں رکھی واحد کرسی سنبھالی اور بولا۔ ”اب پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”تم نے بے چارے بابر کو کیوں مارا؟“

”اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ وہ بے چارہ تھا اور مجھے بے چارے لوگ بہت برے لگتے ہیں۔ مگر اصل بات یہ تھی کہ وہ تم سے محبت کرتا تھا اور میں کسی ایسے شخص کو برداشت نہیں کر سکتا جو تم سے محبت کرتا ہو۔“

”کیوں، کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟“ شمائلہ نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

”ایسا ہی سمجھ لو۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”اسے میں نے استعمال کیا اور جب میرا کام نکل گیا تو میں نے اسے دنیا سے رخصت کر دیا۔“

”مگر کیوں؟“

”کیونکہ وہ میرے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔“

”کس قسم کا خطرہ؟“

”اسے چھوڑو... تمہیں یہاں لانے کا مقصد کیا ہے اس پر توجہ دو۔“

”کیا مقصد ہے؟“

”تمہاری اور تمہارے باپ کی بدنامی۔“ اس نے کہا۔ ”کل تک سارے ملک کو پتا چل گیا ہوگا کہ تم اغوا ہو چکی ہو اور جب تم اپنے گھر پہنچو گی تو کوئی تمہاری پاک بازی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا اور وہ نمونہ جو تم سے شادی کے چکر میں ہے وہ سب سے پہلے بھاگ جائے گا۔“

”میری طرف سے وہ جہنم میں جائے اور تم بھی۔“ شمائلہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ”کیا تم نے مجھے کوئی عام سی لڑکی سمجھ رکھا ہے جو میں اس قسم کی باتوں سے خوف زدہ ہوں گی؟“

”تم نہیں ہو گی لیکن تمہارا باپ تو ہو گا۔ اس کی معاشرے میں ایک عزت اور مقام ہے۔“

”یہ سب کر کے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟“ تیمور نے پوچھا۔

”یہ ملے گی۔“ نقاب پوش نے شمائلہ کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہاری بھول ہے۔“ شمائلہ تڑخ کر بولی۔

”وہ کیسے... تمہیں کیا پتا کہ میں کون ہوں۔“ وہ ہنسا۔ ”مستقبل میں، میں بھی تمہارا امیدوار بن کر آؤں گا اور تم کبھی نہیں جان سکو گی کہ میں وہی ہوں جس نے تمہیں بدنام کیا۔“

”میں تمہیں پہچان جاؤں گی۔ تم اپنی آواز تو نہیں بدل سکتے۔“

”اچھا، اب بولو۔“ اس نے بالکل ہی مختلف آواز میں کہا۔ ”کیا تم پہچان سکی ہو اس آواز کو۔ میں اس طرح کی دس آوازیں نکال سکتا ہوں اور تم ایک بار بھی مجھے نہیں پہچان سکتیں۔“

”تمہیں تو کسی تھیٹر میں ہونا چاہیے تھا۔“

”یہ میں نے وہیں سے سیکھا ہے لیکن میرے گھر والوں کو بھی اس بارے میں نہیں معلوم۔“

”لیکن تم بھی کبھی نہ کبھی پکڑے جاؤ گے۔“ شمائلہ نے کہا۔

”ہاں، ممکن ہے میں پکڑا جاؤں لیکن اس وقت تک دیر ہو چکی ہو گی اور میں تمہیں حاصل کر چکا ہوں گا۔“

”ایسا کبھی نہیں ہو گا۔“

”یہ دعویٰ مت کرو۔ ابھی بھی تم میرے قبضے میں ہو اور اگر میں چاہوں تو شادی کی زحمت بھی نہ کروں تمہیں ایسے ہی حاصل کر لوں مگر مجھے ضد ہے کہ تم محکوم بن کر میرے سامنے آؤ۔“

”آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں مگر ایک راز ہے یہ بھی میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“

”بعد میں کب جب تم اس سے شادی کر لو گے؟“ تیمور نے کہا۔ ”اور اگر تم نے اس سے شادی کرنی ہے تو مجھے کس لیے پکڑا ہے؟“

”تم نے کچھ زیادہ ہی جاسوسی شروع کر دی تھی اور بابر کے گھر جا پہنچے تھے۔“ اس نے کہا۔ ”جب اس کے ساتھ بدنام ہو گے تو تمہارا دماغ ٹھکانے آجائے گا اور نہیں آیا تو نواب صاحب خود ٹھکانے لے آئیں گے۔“

”تم نواب صاحب کے بارے میں جانتے ہو؟“

تیمور چونکا۔

”میں تمہارے بارے میں بھی جانتا ہوں۔“ وہ بولا۔

تیمور سوچ رہا تھا کہ کیا اسے یہ نہیں معلوم کہ وہ راجا اسلم حیات تک جا پہنچا ہے اور جیسے ہی راجا واپس آئے گا وہ اس سے اس کے بارے میں معلوم کر لیتا۔ لیکن اس صورت میں نقاب پوش اس بات کا حوالہ دیتا جبکہ اس نے صرف بابر کے گھر کا ذکر کیا تھا۔ اگر وہ سچ اس بات سے بے خبر تھا تو اس کا بے خبر رہنا ہی تیمور کے مفاد میں تھا۔ اس نے شمائلہ سے سرگوشی میں کہا۔

”اس کے سامنے ذکر مت کرنا کہ میں راجا اسلم حیات

www.pkdigest.com

تک پہنچ گیا تھا۔"
"میں سمجھتی ہوں۔" اس نے جوابی سرگوشی کی۔
نقاب پوش نے مشکوک لہجے میں کہا۔ "تم لوگ آپس میں کیا بات کر رہے ہو؟"
"ہم ہنی مون کے لیے مقام کے بارے میں بحث کر رہے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ سوئٹزر لینڈ زیادہ مناسب ہے جبکہ میرا کہنا ہے کہ اپنا ملک سب سے خوب صورت ہے۔"
"بکواس مت کرو۔" وہ غرایا اور شائلہ نے اسے چٹکی کاٹی۔
"اچھا بابا... ہم تمہارے قتل کے لیے کوئی موزوں طریقہ تلاش کر رہے تھے۔" تیمور نے بازو سہلایا۔ "ویسے ہماری بدنامی کا یہ پلان کب تک مکمل ہو جائے گا؟"
"کل تک۔" اس نے جواب دیا۔ "ابھی میں اپنے ذریعے سے میڈیا تک یہ بات پہنچا دوں گا۔ ان کے لیے یہ خبر بہت سنسنی خیز ہوگی کہ ملک کے ایک نامور بیورو کریٹ کی صاحبزادی گھر سے غائب ہے، اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے۔" وہ ہنسا۔ "ویسے میں اغوا کا مقصد عشق بیان کروں گا۔"
تیمور کو اس کا انداز اور منصوبہ بچکانا لگ رہا تھا۔ مگر اس نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "تو تم جلد از جلد اپنے منصوبے پر عمل کرو اور ہماری جان چھوڑو۔"
"اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" وہ بولا۔
"ویسے تم نے ایک بات پر غور کیا ہے۔" تیمور نے شرارت سے کہا۔ "اگر تم نے شائلہ کو میرے ساتھ بدنام کیا تو ممکن ہے مجھے ہی اس سے شادی کرنا پڑ جائے۔ تم میرے دادا جان کو جانتے نہیں ہو، وہ پرانے زمانے کے روایتی نواب ہیں اور آن پر بن آئے تو جان دینے سے گریز نہیں کرتے۔ خاص طور سے اگر جان ان کے پوتے کی ہو تو۔"
اس بات نے نقاب پوش کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے کہا۔
"او کے! میں تمہیں درمیان سے نکال دیتا ہوں اور صرف شائلہ کے بارے میں خبر ہوگی۔"
"میرا کیا کرو گے؟"
اس بار نقاب پوش کے لہجے میں شرارت تھی۔ "کیا خیال ہے تمہیں بھی وہیں نہ پہنچا دیا جائے جہاں مس شائلہ کا ایک عاشق موجود ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"میرا مطلب ہے کہ تمہیں بھی بابر کے پاس پہنچا دیا جائے۔"

تیمور کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ "تم نے بابر کو یہیں دفن کیا ہے؟"
"نہیں وہ یہاں نہیں ہے۔" نقاب پوش نے جلدی سے کہا۔ "اسے میں نے ایک اور جگہ دفن کیا ہے۔"
"یہ زیادتی ہے، تمہیں اس کی لاش اس کے گھر والوں کو دینی چاہیے۔"
"ابھی نہیں لیکن کچھ دن کے بعد میں اس کے بارے میں پولیس کو بتا دوں گا۔" اس نے جواب دیا۔
"تم نے اسے مارا کس طرح تھا کیونکہ اس کے جسم پر کوئی نشان نہیں تھا اور نہ ہی اسے زہر دیا گیا تھا۔"
"میں نے اسے زہر ہی دیا تھا۔ وہ دنیا کا خطرناک ترین زہر ہوتا ہے۔"
"کون سا زہر؟"
"میں نے اسے ہیروئن کا اوور ڈوز دے دیا تھا۔ وہ ہیروئن استعمال کرنے لگا تھا۔"
"اس لائن پر بھی تم نے اسے لگایا ہوگا۔" تیمور نے کہا۔
"ہاں، میں نے اسے ہیروئن پر لگایا تھا۔ اس کے بعد ہی تو وہ میرے قابو میں آیا تھا۔"
"تم واقعی ذلیل انسان ہو۔" شائلہ بے قابو ہو کر بولی۔
"دے لو جتنی گالیاں دینی ہیں، بعد میں سارا حساب لوں گا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں۔"
"مجھے تو چھوڑ دو۔" تیمور نے کہا۔ "میں بلاوجہ اس چکر میں پڑ گیا۔"
"اب پڑ ہی گئے ہو تو بھگتو۔" اس نے استہزائیہ انداز میں کہا اور باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی شائلہ اس کے سر ہو گئی۔
"چکر میں پڑ گئے ہو... اور اس سے پہلے ہنی مون کی سوجھ رہی تھی۔"
"اسے بے وقوف بنا رہا تھا۔" تیمور نے اطمینان سے کہا۔ "تم کیوں اتنا جذباتی ہو رہی ہو؟"
"یہاں سے نکلنے کی کرو ورنہ اس نے سچ مچ کوئی غلط حرکت کر دی تو پاپا مجھے نہیں چھوڑیں گے۔" شائلہ نے فکر مندی سے کہا۔
"تمہیں ابھی بھی شبہ ہے کہ یہ کوئی صحیح حرکت کرے گا؟" تیمور نے طنز کیا۔ "وہ قاتل ہے اور ہمارے سامنے ایک قتل کا اعتراف کر چکا ہے۔"
"مجھے لگ رہا ہے کہ یہ ہمیں نہیں چھوڑے گا۔"
"تمہیں چھوڑ دے گا، مجھے اپنے بارے میں شبہ ہے

کہ یہ مجھے بھی بابر کی طرح مارنے کا سوچ رہا ہے۔"
گفتگو کے دوران تیمور کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ پختہ اینٹوں سے بنا کمرا تھا اور اس میں داخل ہونے کا صرف ایک دروازہ تھا۔ کھڑکی بہت مضبوط تھی اور اسے توڑنا کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ اس کمرے میں کوئی چیز نہیں تھی۔ دیواروں پر پلاستر نہیں تھا اس لیے بجلی کی وائرنگ بھی اوپر سے کی گئی تھی۔ لکڑی پر تاریں لگا دی گئی تھیں اور ایک طرف سوئچ بورڈ جھول رہا تھا۔ یعنی وہ سچ سے دیوار میں فکس بھی نہیں تھا۔ تیمور اس کا معائنہ کرنے لگا تو شائلہ نے پکار کر کہا۔
"احتیاط سے... کہیں کرنٹ نہ لگ جائے۔"
"کرنٹ!" تیمور نے سوچا اور اچھل پڑا۔ اس کے ذہن میں شاندار خیال آیا تھا۔ اس نے دیوار سے لگا سوئچ بورڈ احتیاط سے اکھاڑنا شروع کیا۔ چند جھٹکوں میں بورڈ نکل گیا۔ اب اس کی تاریں لکڑی کے ساتھ لگی تھیں۔ تیمور نے اس میں سے فیز کی تار منتخب کی اور اسے بہت آہستہ سے نکال لیا۔ جیسے ہی اس نے تار نکالا کمرے میں لگا بلب بجھ گیا۔
"یہ کیا کر رہے ہو؟" شائلہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا اور اس سے ذرا دور ہو گئی۔ "کہیں کرنٹ نہ لگ جائے۔"
"دیکھتی جاؤ۔" تیمور نے تار فرش پر ڈال کر پہلے دروازے کی کنڈی کا معائنہ کیا۔ یہ دونوں طرف ایک ہی سیٹ تھا۔ یعنی لوہے کا ایک ہی ٹکڑا تھا جو دونوں طرف کنڈی کا کام دے رہا تھا۔ تیمور نے اس سے بجلی کا تار مس کیا تو چنگاری اڑی۔ شائلہ نے خالصتاً زنانہ چیخ ماری۔ یعنی بس ایسے ہی چیخ ماری۔ تیمور نے کوشش کر کے تار کو کسی طرح کنڈی سے مس کر دیا تھا۔ اب اس میں طاقت ور کرنٹ دوڑ رہا تھا اور اگر کوئی اسے چھوتا تو اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔ تیمور نے شائلہ سے کہا۔
"اب انتظار کرتے ہیں۔"
"کس بات کا؟"
"کہ مسٹر نقاب پوش آ کر کنڈی کھولے۔"
"اس سے کیا ہوگا؟" شائلہ سادگی سے بولی۔
"کنڈی پکڑ کر دیکھ لو خود پتا چل جائے گا۔"
"اوہ اچھا اچھا... لیکن وہ مر گیا تو ہمیں یہاں سے کون نکالے گا؟"
"پہلے وہ مرے تو اس کے بعد دیکھتے ہیں۔" تیمور ایک طرف بیٹھ گیا۔ "دروازے سے دور رہنا کہیں تم نہ مر جاؤ۔"
"خدا نہ کرے۔" وہ ڈر کر تیمور کے پاس آ بیٹھی۔
"تیمور! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"
"فکر مت کرو۔"
اتنے میں باہر آہٹ ہوئی تو وہ چوکنا ہو گئے۔ نقاب پوش آ گیا تھا۔ اس نے آتے ہی محسوس کر لیا کہ ان کے کمرے کی روشنی بند تھی۔ "یہ بلب کیوں بند کیا ہے؟"
"پتا نہیں خود بجھ گیا ہے، آ کر دیکھ لو۔" تیمور نے کہا۔
"تم لوگ کیا کر رہے ہو؟" وہ مخصوص انداز میں بولا تو شائلہ تپ کر بولی۔
"تمہارے ذہن میں اسی قسم کی باتیں آتی ہیں۔"
"ہاں کیونکہ میرا ذہن ایسا بنا دیا گیا ہے۔" اس نے اس بار بدلے ہوئے انداز میں کہا۔
"ہمیں یہاں سے نکالو۔" تیمور نے کہا۔ "کم سے کم مجھے تو چھوڑ دو۔"
"ہاں، میں نے تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا اور پستول نکال لیا۔ "چلو باہر آؤ۔" اس نے کہتے ہوئے باہر سے کنڈی پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

شامی کی گھگی بندھ گئی تھی۔ نواب صاحب اس کے بالکل سامنے تھے، مشکل سے ایک فٹ کے فاصلے پر۔ شامی نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ اب تک دادا جان نے کچھ کہا نہیں ہے تو اس نے پھر سے آنکھیں کھولیں اور نواب صاحب کو دوسری طرف رخ کیے پایا۔ اصل میں ان کی پشت ہی شامی کی طرف تھی۔ ان کی کتاب نیچے گر گئی تھی اور وہ اسے اٹھا رہے تھے۔ انہیں شامی کا پتا نہیں تھا۔ وہ دم سادھے کھڑا تھا اگر اسے ہلکی سی کھانسی بھی آ جاتی تو وہ پکڑا جاتا۔ خدا خدا کر کے نواب صاحب اس سے ذرا دور ہوئے تو شامی ہر ممکن تیزی سے کھسک کر کھڑکی کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ اس نے اطمینان کا دوسرا طویل سانس لیا اور اپنی پیشانی سے پسینا صاف کیا۔ اس کے بعد پھر آگے سرکنے لگا۔ اس کی خوش نصیبی کہ دادا جان نے صرف اپنی خواب گاہ کی کھڑکی میں فولادی گرل لگوائی تھی۔ شاید اس لیے کہ ان کے کمرے میں تجوری تھی جبکہ اسٹڈی اور لائبریری کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان پر صرف پٹ لگے ہوئے تھے۔ نیچے گھومنے والے کتے اس سے مانوس تھے اس لیے انہوں نے اسے دیکھا ضرور مگر اس بات پر آسمان سر پر نہیں اٹھایا تھا۔ شامی نے جب لائبریری کی کھڑکی دیکھی تو خدا کا شکر ادا کیا اور اس کا پٹ کھولنا چاہا تب اس پر انکشاف ہوا کہ پٹ تو اندر سے بند ہے۔

www.pkdigest.com

☆☆☆

نقاب پوش کے حلق سے فلک شگاف چیخ نکلی اور وہ کنڈی پکڑے پکڑے اپنی جگہ جھٹکے کھانے لگا۔ اس کے ساتھ شمائلہ بھی چیخ رہی تھی۔ تیمور نے اسے جھنجوڑا۔ ''تمھیں کیا ہوا، چپ کرو۔''

''وہ... وہ مر جائے گا۔''

''اس بدبخت کو مر جانا چاہیے۔'' تیمور نے کہا۔ ویسے اس نے محسوس کر لیا تھا کہ یہاں وولٹیج پورا نہیں آرہا تھا اور نقاب پوش کے مرنے کا چانس کم تھا۔ اس لیے وہ آرام سے اسے جھٹکے کھاتا دیکھتا رہا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ وہ نیم جان ہو چکا ہے تو اس نے تار کھینچ لیا اور نقاب پوش دروازے کے پاس ہی ڈھیر ہو گیا۔ تیمور نے دروازے کو دھکا دیا تو اسے کھلا پا کر حیرت ہوئی۔ دراصل جب نقاب پوش کرنٹ کے جھٹکے کھا رہا تھا تو اس کے جھٹکوں کی وجہ سے کنڈی اپنی جگہ سے سرک گئی تھی اور دروازہ کھل گیا تھا۔ تیمور اور شمائلہ باہر آئے۔ نقاب پوش بے ہوش تھا یا بے ہوشی کے آس پاس تھا۔ ویسے اگر وہ ہوش میں بھی ہوتا تب بھی اتنے جھٹکے کھانے کے بعد اس میں جان نہ رہتی۔ تیمور نے اس کے پاس پڑا پستول اٹھا کر چیک کیا، وہ پوری طرح لوڈ تھا۔ پھر اس نے نقاب پوش کو اٹھا کر ایک طرف کیا۔

''تیمور! یہاں سے بھاگ چلو۔'' شمائلہ نے لرزتی آواز میں کہا۔

''اتنی جلدی کیا ہے، اس کی صورت نہیں دیکھو گی؟''

''کیا کروں گی، ویسے بھی یہ میرے لیے اجنبی ہے۔''

''میرا خیال اس کے برعکس ہے۔'' شامی نے کہا اور اس کے چہرے سے نقاب کھینچ لیا۔ شمائلہ اسے دیکھ کر چونک گئی۔ اس نے چلّا کر کہا۔

''طاہر!''

''تو موصوف کا نام طاہر ہے۔'' تیمور نے چیور و کریٹ کے بیٹے کی طرف دیکھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس کا رشتہ شمائلہ کے لیے آیا ہوا تھا۔ ''یہ نفسیاتی مریض ہے؟''

''بہت اعلیٰ قسم کا۔'' شمائلہ نے تلخی سے کہا۔ ''مجھے حاصل کرنے کے لیے یہ اتنا دور چلا جائے گا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

''نہیں مس شمائلہ! بے شک تم حسین ہو اور تمہارے لیے آدمی آسمان سے تارے بھی توڑ کر لا سکتا ہے مگر یہ کام... عام طبقے کا کوئی نوجوان کر سکتا ہے۔ اس کا تعلق ہمارے ملک کے جس طبقے سے ہے... معذرت کے ساتھ یہ صرف خود سے محبت کر سکتا ہے تم سے نہیں۔''

شمائلہ نے اسے گھورا اور بولی۔ ''اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''یہ تو یہی بتائے گا۔'' تیمور نے طاہر کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آنے لگا۔ تیمور نے اسے جھنجوڑا تو وہ کراہنے لگا۔ ''پ... پانی!''

تیمور نے شمائلہ کی طرف دیکھا۔ ''یہاں کہیں پانی ہے؟''

''اس کے لیے تو نہیں ہے۔'' اس نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

مگر تیمور نے پانی تلاش کیا اور اسے لا کر پلایا۔ اس کے حواس بحال ہو گئے تھے مگر ابھی وہ اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ تیمور نے اس کے سامنے پستول لہرایا اور بولا۔ ''تم نے دیکھا کہ صورتِ حال کس طرح پلٹ گئی۔ اب تم ہمارے رحم و کرم پر ہو۔''

''میں تو کہتی ہوں اس ذلیل شخص کو گولی مارو اور چلو یہاں سے۔'' شمائلہ بولی۔ وہ تیمور کو وہاں سے لے جانے کے لیے کچھ بے چین دکھائی دے رہی تھی۔

''اتنی جلدی کیا ہے... کیا اس کی زبان سے سننا نہیں ہے کہ اس نے یہ سب کیوں کیا ہے؟'' تیمور نے طنز کیا۔

''نہیں، میں نے نہیں سننا۔''

''ہاں، اپنے باپ کے کرتوت کیوں سنو گی تم؟'' طاہر نے نحیف سی آواز میں کہا۔

''خبردار... جو تم نے میرے باپ کا نام لیا۔'' شمائلہ بپھر گئی۔ ''آئی وِل کِل یو راسکل۔''

''میں بدمعاش ہوں لیکن تمہارے باپ سے برا نہیں ہوں جو دوسروں کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتا ہے۔''

''تم جو کہو گے میرے نزدیک اس کی اہمیت کتے کے بھونکنے سے زیادہ نہیں ہے۔''

''کیونکہ تم اپنے اور اپنے باپ کے بارے میں سچ سن نہیں سکتیں۔'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ تیمور کے لیے یہ نئی صورتِ حال تھی۔ اسے بالکل پتا نہیں تھا کہ ان دونوں کے درمیان پہلے سے کوئی چکر چل رہا ہے اور وہ کسی اور وجہ سے طاہر کو ناپسند کرتی تھی۔ اس نے شمائلہ سے کہا۔

''تم ذرا چپ کرو اور مجھے اس سے بات کرنے دو۔''

''اگر تم نے اس سے بات کرنی ہے تو مجھے جانے دو۔'' شمائلہ بولی۔

''اگر اس نے مجھے تمہارے یا تمہارے باپ کے بارے میں کوئی غلط بات بتائی تو اس کی تصدیق یا تردید کون کرے گا؟''

''مجھے کچھ نہیں کرنا ہے۔'' وہ رکھائی سے بولی۔ ''میں جا رہی ہوں۔''

''ایک منٹ... تم جاؤ گی کیسے؟'' تیمور نے کہا۔

''پیدل...''

''نہیں، گاڑی میں۔''

''تم بھول رہی ہو کہ کار میری ہے اور جب میں جاؤں گا تب ہی تم جا سکتی ہو۔''

''تب میں باہر ہوں۔'' وہ بولی اور باہر چلی گئی۔

طاہر کسی قدر سرک کر دیوار سے ٹک گیا تھا۔ ''اب تم میرے ساتھ کیا کرو گے؟''

''اس کا انحصار اس پر ہے کہ تم مجھے کس حد تک سچ بتاتے ہو۔''

''اگر میں جھوٹ بتاؤں تو تم کس طرح اس کی تصدیق کرو گے؟''

''میرے پاس عقل ہے اور دوسرے اس معاملے سے میرا براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے تم جھوٹ بھی بولو گے تو میری صحت پر کیا اثر پڑے گا۔''

طاہر نے سوچا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے، تم پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''میرا صرف ایک سوال ہے اور وہ یہ کہ یہ سارا چکر کیا ہے... تم نے اتنا بڑا ڈراما کیوں کھیلا؟''

''میں نے یہ سارا چکر کیوں چلایا ہے؟'' وہ تلخی سے بولا۔ ''یہ بے وقوف لڑکی شاید سمجھ رہی تھی کہ میں نے اس کی خاطر یہ سب کیا ہے۔ لیکن میں نے یہ سب انتقام کے لیے کیا ہے۔''

''کیسا انتقام؟'' تیمور نے پوچھا۔ ''کیا شمائلہ نے تمہیں کوئی تکلیف پہنچائی ہے؟''

''اس نے نہیں بلکہ اس کے باپ نے۔ وہ ایک نمبر کا ذلیل اور گھٹیا شخص ہے جو ہر وقت دوسروں کی کمزوری کا فائدہ اٹھانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ جس وقت میں بہت چھوٹا تھا، شاید نو سال کا تب میرا باپ ایک چکر میں آگیا۔ وہ محکمہ انہار میں تھا اور کسی نہر کی کھدائی میں ہونے والے گھپلوں میں اس کا نام بھی آگیا۔''

''کیا غلط نام آیا تھا؟''

طاہر کچھ دیر چپ رہا پھر اس نے کہا۔ ''میں یہ نہیں کہتا کہ میرا باپ کوئی فرشتہ آدمی ہے، اس نے دونوں ہاتھوں سے کمایا۔ مگر اس معاملے میں اس کا کہنا تھا کہ اسے پھنسایا گیا تھا۔ دراصل وہ جس عہدے پر تھا، ایک بااثر شخص اس پر اپنے کسی منظورِ نظر کو لانا چاہتا تھا اس لیے اس نے میرے باپ کو پھنسا دیا۔ میرے باپ کی نوکری پر ہی نہیں بنی تھی بلکہ الزام ثابت ہونے پر وہ جیل بھی جا سکتا تھا اور اسے اس چکر سے ایک شخص ہی نکال سکتا تھا۔ وہ شخص شمائلہ کا باپ راشد درانی تھا مگر اس نے اس معاملے میں میرے باپ کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

''ہمارے لیے وہ دن بہت کٹھن تھے۔ میرا باپ معطل ہونے کے بعد بے تحاشہ پینے لگا تھا اور روز میری ماں سے اس کا جھگڑا ہوتا تھا۔ ان دنوں اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ لگتا تھا وہ خود کو تباہ کر کے دم لے گا۔ میری ماں اسے سمجھاتی تو وہ اس سے لڑتا اور اسے مارتا تھا۔''

''لیکن اس معاملے میں راشد درانی کہاں سے قصوروار ثابت ہوتا ہے؟''

''اس کا قصور ابھی تمہارے سامنے آتا ہے۔ میری ماں اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود جا کر راشد درانی سے ملے گی اور اس کی منت سماجت کر کے اپنے شوہر کو اس مصیبت سے نکالنے کی کوشش کرے گی۔ مگر اس نے یہ کام میرے باپ سے چھپ کر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ راشد درانی کے سخت خلاف تھا اور دن رات اسے گالیاں دیتا تھا۔ اگر ماں اسے بتا کر جاتی تو وہ اسے ہرگز نہ جانے دیتا۔ اس لیے ماں نے ایک دن اپنے کسی رشتے دار کے ہاں جانے کا بہانہ کیا اور مجھے لے کر گھر سے نکلی۔ راشد درانی کے دفتر کے باہر اسے بہت دیر انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس نے راستے میں مجھے سمجھا دیا تھا کہ میں باپ سے اس بات کا ذکر نہ کروں کہ ہم کہاں گئے تھے۔

''اس سجے سجائے سرکاری دفتر کی انتظارگاہ میں میں اور میری ماں کئی گھنٹے بیٹھے رہے۔ شاید اس وجہ سے کہ ماں نے شروع میں چپڑاسی سے کہلوا دیا تھا کہ وہ سجاد حسین کی بیوی ہے اور اس کے خلاف ہونے والی انکوائری کے سلسلے میں اس سے ملنا چاہتی ہے۔ خاصی دیر بعد جا کر ہمیں اندر بلایا گیا۔ راشد درانی اس وقت جوان آدمی تھا اور اس کے کرتوت اس وقت بھی اس کے چہرے پر تحریر تھے۔ اس نے میری ماں کو بےزاری سے دیکھا اور یک دم ہی اس کی ساری بےزاری دور ہو گئی کیونکہ میری ماں بہت خوب صورت عورت تھی۔''

طاہر یوں چپ کر گیا جیسے آگے سنانے کے لیے ہمت جمع کر رہا ہو۔ ویسے تیمور بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا بتانے والا ہے مگر اس نے بہتر سمجھا کہ اسے بولنے دے۔ طاہر نے کچھ دیر بعد پھر

www.pkdigest.com

کہنا شروع کیا۔

''میری ماں نے اس سے کہا کہ اس کا شوہر معطل ہے اور بے گناہ ہے اگر وہ اس کی رپورٹ کی کلیئرنس پر سائن کر دے تو اس کا شوہر بحال ہو جائے گا اور ان کے گھر کی خوشیاں لوٹ آئیں گی۔ اس پر راشد درانی نے پوچھا۔

''اگر تمہارا شوہر بحال ہو جائے تو مجھے اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''آپ کو میری اور میرے بچوں کی دعائیں...''

''مجھے تمہاری دعاؤں کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے ماں کی بات کاٹی۔ ماں اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

''پھر جو آپ مناسب سمجھیں بتا دیں۔''

''میرے پاس مال و دولت کی کمی نہیں ہے۔'' اس نے غرور سے کہا۔ ''میں جس کرسی پر بیٹھا ہوں یہاں مال بارش کی طرح برستا ہے۔''

''پھر آپ بتائیں؟'' ماں نے بے بسی سے کہا۔

اس نے کسی گدھ کی طرح ماں کے وجود پر نظریں گاڑ دیں اور بولا۔ ''میں کسی اور طریقے سے اپنا معاوضہ لینا پسند کروں گا۔''

''کس طریقے سے؟''

''تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔'' اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔ ''تمہارے ساتھ بچہ ہے اب کیا کھل کر بتاؤں؟''

ماں لرز گئی۔ ''خدا کے لیے میں شریف عورت ہوں۔''

''تو یہاں کیا کر رہی ہو، اپنے گھر میں بیٹھو۔'' اس نے رکھائی سے کہا اور چپراسی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔

''پلیز!'' ماں نے التجا کی۔

''میں نے بتا دیا ہے۔ اگر تمہیں منظور ہے تو میں ابھی تمہارے سامنے اس فائل پر دستخط کر دوں گا۔ ورنہ کل یہ فائل ایسے ہی واپس چلی جائے گی اور اس کے بعد تمہارا شوہر جیل میں ہوگا۔''

ماں کشمکش میں پڑ گئی تھی۔ ایک طرف اس کا شوہر تھا اور دوسری طرف اس کے اندر کی عورت تھی۔ اس اثنا میں چپراسی آ گیا تھا اور اپنے صاحب کے اشارے کا منتظر تھا۔ آخر بیوی جیت گئی اور عورت نے ہار مان لی۔ ماں نے سر ہلایا۔ ''مجھے منظور ہے۔''

''تم جاؤ۔'' راشد درانی نے چپراسی سے کہا تو وہ خاموشی سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ماں نے کہا۔

''مگر میں کہیں اور آؤں گی۔''

وہ مسکرایا۔ ''مجھے بے وقوف مت سمجھو۔ میں نقد سودے کا قائل ہوں۔ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے۔ ابھی سودا کرو ورنہ پھر کبھی نہیں ہوگا۔''

''یہاں...'' ماں نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میں اس وقت ان باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا مگر میرا ذہن سب ریکارڈ کر رہا تھا۔ راشد درانی نے کہا۔

''ہاں تو اس میں کیا حرج ہے۔ یہ برابر میں میرا ایک کمرا ہے وہاں بیٹھ کر آرام سے بات ہوگی۔''

''طاہر بیٹا! تم یہاں بیٹھو میں ابھی ان سے بات کر کے آتی ہوں۔'' ماں نے مجھ سے کہا اور اس شخص کے ساتھ برابر میں موجود کمرے میں چلی گئی۔ اس نے جانے سے پہلے چپراسی سے کہا تھا کہ ابھی وہ کسی سے نہیں ملے گا اور جو بھی آئے یا اس کا فون آئے وہ اسے ٹال دے۔ مجھے اس وقت احساس نہیں تھا کہ اس کمرے میں ماں پر کیا گزر رہی ہے اور جب اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں میرے کانوں تک آئیں تو میں نے اٹھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ میں واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتنی دیر بعد اس عقوبت خانے کا دروازہ کھلا اور ماں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح باہر آئی جو اپنا سب کچھ لٹا چکا ہو۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ کم سنی کے باوجود میں سمجھ گیا تھا کہ میری ماں پر کوئی خوفناک سانحہ گزر چکا ہے اور اس کا ذمے دار یہ شخص ہے۔

ماں نے بھرائی آواز میں کہا۔ ''اب تم اپنا وعدہ پورا کرو اور فائل پر دستخط کر دو۔''

''دل تو نہیں چاہ رہا ہے۔'' اس نے اپنے غلیظ ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''کیا تم ایک بار اور....''

''اب یہ بات مت کرنا ورنہ میں اسی جگہ خودکشی کر لوں گی۔'' ماں نے اسے دھمکی دی۔ وہ شاک کی کیفیت میں تھی۔

''ارے، تم تو ناراض ہو رہی ہو۔'' وہ بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔ ''میں ابھی دستخط کر رہا ہوں۔'' اس نے فائل کھول کر اس پر دستخط کر دیے اور فائل ماں کی طرف بڑھا دی۔ ''دیکھ لو، تم پڑھی لکھی ہو نا۔''

ماں نے فائل دیکھی اور اس کی طرف بڑھا دی۔ ''ٹھیک ہے لیکن میں نے اپنے شوہر کی بحالی کی بہت بڑی قیمت دی ہے، اب اسے بحال ہونا چاہیے۔''

''تم بے فکر رہو تمہارے ناتے اب تو سجاد حسین بھی مجھے عزیز ہو گیا ہے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اسے بحال سمجھو۔ بس چند دن میں لیٹر ایشو ہو جائے گا اور تمہارا شوہر پھر سے کہیں بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے گا۔''

''ماں میرا ہاتھ تھام کر وہاں سے نکل آئی تھی۔ اس روز اس نے شوہر کی خاطر اپنی عصمت قربان کر دی تھی مگر گھر آنے کے بعد اس پر احساس جرم اتنی شدت سے طاری ہوا تھا کہ اس نے باتھ روم میں ایک زہریلی دوا پی کر خودکشی کر لی تھی۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ میرے باپ سمیت سب یہی سمجھ رہے تھے کہ اس نے غلطی سے دوا کے بجائے زہر پی لیا تھا اور مر گئی۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ میری ماں نے خودکشی کی ہے اور اس کی موت کا ذمے دار ایک شخص ہے جس کا نام راشد درانی ہے۔'' طاہر یہ کہتے ہوئے ہی جان سے لرزنے لگا تھا۔

''تو تم نے اس سے بدلہ لینے کے لیے یہ سب کیا؟''

''نہیں یہ تو میری اسکیم کا ایک حصہ تھا۔ میرا باپ بحال ہونے کے بعد راشد درانی کا دوست بن گیا تھا اور ان کی یہ دوستی اب تک برقرار ہے کیونکہ میرے باپ کو حقیقت کا علم ہی نہیں ہے۔ میں نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ شائلہ کے لیے میرا رشتہ لے کر جائے۔''

''کیا تم شادی کر کے شائلہ سے بدلا لیتے؟''

وہ تکلیف دہ انداز میں ہنسا۔ ''نہیں، پلان تو میرا بالکل مختلف تھا۔ میں شادی کی رات کو ہی پہلے اسے طلاق دیتا اور اس کے بعد اس کے ساتھ وہی کرتا جو میری ماں کے ساتھ اس کے باپ نے کیا تھا۔ یہی نہیں میں اس کی ویڈیو بناتا اور اس کے باپ کو بھیجتا۔''

''تم نفسیاتی مریض ہو اگر تم راشد درانی کو قتل کر دیتے تو میں تمہیں حق بہ جانب قرار دیتا مگر تم نے ایک احمقانہ منصوبے کے لیے ایک بے گناہ معصوم آدمی کی جان لی اور بدلہ اس سے لینا چاہا جس کا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں ہے۔''

''یہ تو تمہاری سوچ ہے۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''لیکن خود کو میری جگہ رکھ کر سوچتے تو تمہیں پتا چلتا کہ آدمی اندر سے کس طرح ٹوٹتا ہے، بکھرتا ہے اور اس کے اندر کیسے کیسے خیالات جنم لیتے ہیں۔ میں جو کرنا چاہتا تھا اس میں ناکام رہا مگر مجھے اپنے خیال پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں، میرا ایک منصوبہ ناکام رہا ہے لیکن میں پھر کوشش کروں گا۔''

تیمور نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، تم بچ جاؤ گے؟''

''ہاں کیونکہ میرا باپ اس ملک کی سب سے طاقت ور مشینری کا ایک اہم پرزہ ہے، وہ مجھ پر آنچ آنے نہیں دے گا۔ بے شک تم مجھے پولیس کی تحویل میں دے دو مگر وہ مجھے صاف بچا لے گا۔''

''اگر میں تمہیں پولیس کے بجائے راشد درانی کے حوالے کر دوں تو؟''

''تو کیا؟'' اس نے حقارت سے کہا۔ ''وہ کیا کر لے گا؟ وہ صرف چور دروازوں سے دوسروں کے مال اور عزت پر ڈاکا مار سکتا ہے۔''

تیمور اتنی دیر میں پہلی بار مسکرایا۔ ''تو تم کیا کرنے جا رہے تھے؟''

''میں جیسے کو تیسا کرنے جا رہا تھا اور مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ میں اپنے کیے کا سامنا کر سکوں۔''

تیمور کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر باہر آ گیا۔ شائلہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور اس نے سب سن لیا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ تیمور نے اسے شرمندہ کرنے سے گریز کیا۔

''اب اس کا کیا کرنا ہے؟''

''اسے چھوڑ دو۔'' اس نے کہا۔

''تم نے اس کے عزائم سن لیے ہیں، وہ پھر کوشش کرے گا اور تمہارے باپ کو براہ راست بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''تم فکر مت کرو، پاپا اپنا دفاع کرنا جانتے ہیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔''

''تم بھول رہی ہو، یہ صرف تمہاری اور اس کی لڑائی نہیں ہے بلکہ اس نے ایک بے گناہ شخص کی جان بھی لی ہے۔''

''تب بے شک اسے پولیس کے حوالے کر دو لیکن وہ ٹھیک کہہ رہا ہے، اس کا باپ اسے بچا لے گا۔ وہ بہت بڑے عہدے پر ہے۔''

''تم لوگ خود کو اتنا فرعون کیوں سمجھتے ہو؟'' تیمور نے تلخی سے کہا۔ ''کیا اس کا باپ اسے موت سے بھی بچا لے گا؟''

شائلہ شرمندہ ہو گئی۔ ''سوری! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''میں نے اسے پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب آگے تم لوگوں کی قسمت۔'' تیمور نے کہا اور سڑک کی طرف بڑھ گیا جہاں اس کی کار کھڑی تھی۔

☆☆☆

شامی کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی جگہ سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لے۔ اس نے یہ تو سوچا نہیں تھا کہ لائبریری کی

www.pkdigest.com

کھڑکی بند ہو سکتی ہے۔ اب وہ کیا کرے؟ اسی طرح واپس نامراد لوٹ جائے۔ اس نے کھڑکی کا جائزہ لیا۔ اگر وہ اس کا شیشہ توڑ دیتا تو اس کا امکان کم تھا کہ نواب صاحب کی ایئر کنڈیشنڈ خواب گاہ میں اس کی آواز جائے۔ اس نے ہمت کی اور اپنی قمیص اتار کر اسے ہاتھ پر لپیٹا اور دوسرے ہاتھ سے کھڑکی کی چوکھٹ تھامتے ہوئے زور سے مکا شیشے پر رسید کیا۔ مگر شیشے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہ خاصا موٹا اور مضبوط شیشہ تھا۔ دوسری بار شامی نے زیادہ زور سے مکا مارا اور نیچے گرتے گرتے بچا۔ نیچے دو عدد رکھوالی کے کتے منہ اٹھائے اس کی کارروائی دیکھ رہے تھے۔ شامی نے ان کو ہش ہش کر کے بھگایا اور اس کے بعد فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاری کرنے لگا۔ یہ ابھی یا کبھی نہیں والا معاملہ تھا۔ شامی نے دل کڑا کیا اور اس بار پوری طاقت سے شیشے پر مکا مارا۔ ایک زوردار چھناکا ہوا۔

☆☆☆

شامی کو ہوش آیا تو وہ اپنے بستر پر تھا اور ان کا خاندانی ڈاکٹر اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کے بازو میں چبھن سی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اسے انجکشن لگایا گیا تھا۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں خالی سرنج تھی۔ شامی نے اس سے سوال کیا۔

''مجھے کیا ہوا تھا ڈاکٹر؟''

''یہ تمہیں ہم بتائیں گے برخوردار۔'' پاس سے نواب صاحب کی آواز آئی۔ وہ خاصے غضب ناک لگ رہے تھے اور ان کے موڈ کو دیکھتے ہوئے شامی کو اپنی عافیت سخت خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ ''اب اس کی طبیعت کیسی ہے ڈاکٹر صاحب؟''

''ٹھیک ہیں... کچھ چوٹیں آئی ہیں مگر فریکچر نہیں ہے۔ نوجوان ہیں اس لیے جلد کور کر سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا اور اپنا بیگ سنبھال کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی نواب صاحب نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔

''برخوردار! یہ کیا حرکت تھی؟''

''کیسی حرکت دادا جان؟'' شامی نے معصومیت سے پوچھا۔

نواب صاحب نے اسے غور سے دیکھا۔ ''خوب! اب آپ یادداشت گم ہونے کا بہانہ کریں گے۔''

''نہیں، میری یادداشت تو ٹھیک ہے۔''

''تب یہ بتائیں کہ آپ آدھی رات کو لائبریری کی کھڑکی کے باہر کیا کر رہے تھے؟''

''مجھے تو کچھ یاد نہیں ہے دادا حضور۔''

''دیکھیے آپ شرافت سے بتا دیں ورنہ ہم بہت بری طرح پیش آئیں گے۔'' نواب صاحب نے اسے دھمکی دی۔

''دادا جان! کیا بتاؤں، مجھے تو کچھ یاد نہیں ہے اور میں لائبریری کی کھڑکی کے باہر کیا کروں گا؟''

نواب صاحب بے چارے شک میں پڑ گئے اور پھر انہیں فکر لاحق ہو گئی تھی کہ شامی کے ذہن پر اوپر سے گرنے کا اثر تو نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے غور سے شامی کو دیکھا۔ ''تو آپ کو واقعی کچھ یاد نہیں ہے؟''

''کیا دادا جان؟'' اس بار شامی نے پہلے سے بھی زیادہ معصومیت سے کہا تو نواب صاحب جھنجلا گئے تھے۔

''اچھا برخوردار! بس صبح تک کی بات ہے جیسے ہی نظام دین آئے گا، ہم خود لائبریری میں جا کر دیکھیں گے کہ آپ وہاں جانے کے لیے اتنے بے تاب کیوں تھے؟'' نواب صاحب نے کہا اور کمرے سے چلے گئے۔ شامی نے سکون کا طویل سانس لیا۔ اسے سب یاد تھا مگر وہ اس کا اقرار کر کے فوری طور پر اپنی شامت نہیں بلوانا چاہتا تھا۔ اس نے کھڑکی پر اتنی زور سے مکا مارا تھا کہ شیشہ بھی ٹوٹ گیا تھا اور ساتھ ہی وہ بلندی سے نیچے آ گرا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے پین کلر انجکشن دے دیا تھا جس کی وجہ سے وہ فی الحال درد محسوس نہیں کر رہا تھا۔ دادا جان کے جاتے ہی تیمور اندر آیا۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ کب دادا جان رخصت ہوتے ہیں اور وہ اندر آئے۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی گھر آیا تھا اور اس وقت ہرگز موڈ میں نہیں تھا کہ دادا جان کے ہاتھوں اپنی شامت بلوائے جو شامی کی وجہ سے پہلے ہی بہت غصے میں تھے۔ شامی اسے دیکھتے ہی اچھل پڑا۔

''تو کہاں تھا؟ میں کال کر رہا تھا۔''

''بس یار ایک چکر میں پھنس گیا تھا۔'' تیمور بستر کے برابر میں کرسی پر ڈھ گیا۔ ''بس سمجھ لے مرتے مرتے بچا ہوں۔''

''میری طرح۔'' شامی نے سرد آہ بھری۔

''ہاں، میں نے اندر آتے ہوئے فولاد خان سے سنا کہ تو نے لائبریری کی کھڑکی سے کود کر خودکشی کی کوشش کی تھی۔''

شامی نے منہ بنایا۔ ''یہ فولاد خان آج کل کے میڈیا سے بہت متاثر ہے۔ میں نے لائبریری میں جانے کی کوشش کی تھی۔''

''اور نیچے کیسے گرا؟''

''کھڑکی کا شیشہ توڑنے کی کوشش میں... بس اللہ نے بچا لیا۔ اب تو بتا کہ تو کیسے بچا؟''

''تفصیل پھر بتاؤں گا اس وقت تو خلاصہ سن لے۔''

www.pkdigest.com

[تیم]ور نے کہا اور اسے بتانے لگا مگر شامی نے درمیان میں [اتن]ے سوالات کیے کہ خلاصہ اصل سے بھی کچھ زیادہ طویل ہو [گ]یا اور دو گھنٹے بعد تیمور نے بات مکمل کی۔

''اب مجھے اجازت دے، نیند اور تھکن سے میرا برا [حا]ل ہے۔''

''خدا حافظ دوست... صبح ملیں گے اگر بچ گئے [تو]۔'' شامی نے آہ بھری۔ انجکشن کا اثر کم ہونے لگا تھا اور درد [ب]ڑھ رہا تھا۔ ''آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے۔''

''اس کے بعد دادا جان کا تیر نظر دیکھیں گے۔'' تیمور [نے] باہر جاتے ہوئے مصرع مکمل کیا۔ ''بیٹے تیار ہو جا۔''

اگلے دن شامی کی حالت بری تھی۔ چوٹیں اب رنگ [دکھا] رہی تھیں اور تیمور کو اس کی تیمارداری کرنا پڑی تھی۔ اسی [د]وران میں اس نے شامی کو کل رات کے واقعات ذرا تفصیل [س]ے سنائے۔ اس کا مقصد شامی کے درد کا احساس کم کرنا تھا [و]رنہ وہ کل بھی اسے یہ سب بتا چکا تھا۔ نظام دین صبح نہیں آ سکا تھا اور اب اسے شام کو آنا تھا۔ شامی نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ نظام دین نہیں آیا تھا ورنہ دادا جان اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا چکے ہوتے۔ اس نے تیمور سے کہا۔ ''یار! تو کسی بھی طریقے سے وہ ڈائری لا دے ورنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گا۔''

''وہ تو تو اب بھی نہیں ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''اور لائبریری کی طرف جانا شیر کی کچھار میں جانے کے برابر ہے۔ اس لیے مجھے تو معاف رکھ میرے دوست۔ وہاں دادا جان نے پہرا بٹھا دیا ہے اور محاورے کے مطابق وہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی ہے۔''

''مگر تو چڑیا نہیں اس نواب خاندان کا چشم و چراغ ہے۔''

''دوست! مجھے معاف رکھ... آج دادا جان جس موڈ میں ہیں، ان کے عتاب کا سامنا کم سے کم میں نہیں کر سکتا ہوں۔''

شامی نے ایک دلدوز آہ بھری۔ ''اس کا مطلب ہے مجھے چپن پور جانا ہی پڑے گا۔''

تیمور نے تائید کی۔ ''لگتا تو ایسا ہی ہے مگر تو فکر مت کر... میں گرمیوں کی چھٹیوں میں تجھ سے ملنے آؤں گا۔''

شامی نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔ ''اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں یار! ہم کزن کے ساتھ دوست بھی تو ہیں اور میں تیرے لیے اتنا تو کر ہی سکتا ہوں۔'' تیمور نے خلوص سے کہا۔

جیسے جیسے نظام دین کے آنے کا وقت قریب آ رہا تھا، تکلیف سے زیادہ تشویش سے شامی کی حالت بری ہو رہی تھی۔ آخر اسے معلوم ہوا کہ نظام دین تشریف لے آیا ہے اور دادا جان اسے لے کر فوری طور پر لائبریری میں چلے گئے تھے۔ شامی خود کو ذہنی طور پر آنے والے وقت کے لیے تیار کرنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ دادا جان ڈائری دریافت کرتے ہی سیدھے اس کے کمرے کا رخ کریں گے۔ دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے خود پر انا للہ پڑھی کہ بعد میں اس کا موقع ملے بھی یا نہ ملے۔ مگر دادا جان کے بجائے خلاف توقع نظام دین اندر آیا تھا۔

''التجا''

بیگم کار لے کر روانہ ہونے لگیں تو شوہر نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ ''اگر تم محسوس کرو کہ گاڑی قابو سے باہر ہونے لگی ہے تو کم از کم اتنی کوشش ضرور کرنا کہ کسی سستی سی چیز کو ٹکر مارنا۔''

''حل''

لبنیٰ ایک روز دفتر سے گھر پہنچیں تو خاصا بڑا ایک کارٹن اٹھائے ہوئے تھیں جس میں چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔

''یہ کیا اٹھا لائی ہیں؟'' بہن نے پوچھا۔

''تمہیں معلوم ہے مجھے خواب میں چوہے نظر آتے ہیں۔ انہیں پکڑنے کے لیے بلی لائی ہوں۔'' لبنیٰ نے بتایا۔

''لیکن خواب میں نظر آنے والے چوہے تو خیالی ہوتے ہیں۔'' بہن نے حیرت سے کہا۔

''کوئی بات نہیں... بلی بھی خیالی ہے۔'' لبنیٰ نے اطمینان سے جواب دیا۔

''راهنمائی''

گاڑی میں سفر کرتے ہوئے ایک صاحب راستہ بھول گئے۔ انہوں نے ایک سائیکل سوار کو روک کر پوچھا۔ ''بھائی گلستان جوہر کی طرف کون سی سڑک جاتی ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں۔'' سائیکل سوار نے جواب دیا۔

''اچھا... یونیورسٹی روڈ کس طرف ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں۔''

''تمہیں کچھ معلوم بھی ہے؟'' کار والے صاحب ذرا جل کر بولے۔

''مجھے یہ معلوم ہے کہ میں اپنے راستے پر صحیح جا رہا ہوں اور راستہ نہیں بھولا ہوں۔'' سائیکل سوار نے اطمینان سے جواب دیا۔

"نواب زادے! اب طبیعت کیسی ہے؟" اس نے نستعلیق لہجے میں پوچھا۔ "سنا ہے آپ لائبریری کی کھڑکی سے گر گئے تھے۔"

"آؤ آؤ... تم بھی طنز کے تیر برساؤ۔" شامی نے کراہ کر کہا۔ "میرے انتقال سے پہلے اپنی ساری حسرتیں نکال لو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں نواب زادے۔" نظام دین نے آہستہ سے کہا۔ "ویسے آپ اس طرح سے لائبریری میں کیوں جانا چاہ رہے تھے؟"

"کیونکہ ہم نواب زادے ہیں، ہماری مرضی ہم دروازے سے جائیں یا کھڑکی کے راستے اندر قدم رنجہ فرمائیں۔" شامی نے بھنا کر کہا۔

نظام دین مسکرانے لگا۔ "میرا خیال ہے جناب نے اس کے لیے یہ زحمت کی تھی۔" نظام دین نے شامی کی ڈائری نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ شامی بھونچکا رہ گیا۔ اس نے جلدی سے ڈائری اٹھائی۔

"نظام دین! یہ تم نے کہاں سے لی؟"

"میں معذرت خواہ ہوں کہ کتابوں کے ساتھ یہ ڈائری بھی لائبریری میں چلی گئی تھی اور ایسا قطعاً غلطی سے ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا لیکن جب نواب صاحب نے آتے ہی مجھے لائبریری کھولنے کا حکم دیا تو میں کھٹک گیا۔ وہ لائبریری میں کسی خاص چیز کی تلاش میں تھے جس کے لیے آپ نے کھڑکی کے راستے اندر جانے کا خطرہ مول لیا تھا۔ اس لیے میں نے اندر جاتے ہی سب سے پہلے ان کتب میں سے آپ کی یہ ڈائری نکال لی۔ اپنی امانت سنبھال لیجیے۔"

شامی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ نظام دین اس کے لیے ایسا کام کرے گا۔ "نظام دین! میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ تم نے مجھے بہت بڑی آفت سے بچا لیا ہے۔"

نظام دین مسکرایا۔ "نواب زادے! آپ سچ مچ بھولے ہیں۔ عشق و عاشقی کے کھیل کھیلنا اور پھر ان کو ڈائریوں میں محفوظ کرنا تو نواب زادوں کے مشغلے ہوتے ہیں اور اس سے کوئی قیامت نہیں آتی ہے۔ بہر حال، اب خیال رکھیے گا۔" اس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ شامی نے جلدی سے ڈائری کا معائنہ کیا اور اس میں سب موجود پا کر سکون کا سانس لیا۔

☆☆☆

"یار! یقین نہیں آرہا۔" تیمور نے اسے غور سے دیکھا۔ "کہیں یہ کسی اندرونی چوٹ کے مابعد اثرات تو نہیں ہیں۔"

"تو ڈائری مجھے کوئی جن دے گیا ہے؟"

"ممکن ہے، وہ جن ہی ہو۔ نظام دین سے ایسی توقع محال ہے۔"

"مت مان، وہ نظام دین ہی تھا۔" شامی نے یقین سے کہا۔ "خیر چھوڑ، میرا کام تو ہو گیا اب وہ نظام دین نے کیا ہو یا کسی جن نے... یہ بتا کہ مس یونیورسٹی کے چکر کا کیا بنا؟"

"اس کا بہت برا ہوا یار۔" تیمور نے سرد آہ بھری۔

"اچھا، کیا اس کی شادی ہو گئی ہے؟" شامی مایوسی سے بولا۔

تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں بلکہ طاہر نے کل رات ان کے گھر میں گھس کر شائلہ کے باپ کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا اور اس کے گارڈ کی جوابی فائرنگ سے خود بھی مارا گیا۔"

"یعنی انصاف ہو گیا۔" شامی نے کہا۔ "ایسے موقع کے لیے کہا جاتا ہے خس کم جہاں پاک۔"

"مگر یار! مجھے پھر بھی افسوس ہو رہا ہے۔ طاہر قابل رحم تھا۔ اس نے جو برداشت کیا تھا، اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کا بھی یہی ردعمل ہوتا۔ اصل مجرم تو شائلہ کا باپ تھا۔"

"چل! اس کے مرنے سے جہاں کچھ پاک ہوا نا۔"

"کہاں پاک ہوا... یہاں ایک خبیث مرتا نہیں ہے اس کی جگہ حاصل کرنے کے لیے دس پہلے سے تیار ہوتے ہیں۔" تیمور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا مجھے اجازت دے۔ ذرا پرسے کے لیے شائلہ کے پاس جانا ہے۔"

شامی نے دانت نکالے۔ "ہاں بیٹے، اب تو پرسے کے بہانے جا۔"

اور تیمور مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔

اہم اعلان

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضائع کر دی جاتی ہے۔ قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔